خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

DILTUBE
HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

صفحات 290

Digitized by CIOQ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ ... بینا احمد
نائب مدیر ... اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 انشائیہ — جون ایلیا
اس عجیب و غریب کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار کا رابطہ

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 انتقام — علی اختر
ماضی کا آئینہ ... بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

57 جعلی وارث — تنویر ریاض
محبت میں ہوسناکی سے ڈر جانے والی ایک دوشیزہ کا لرزہ خیز انجام

67 ذہانت — نادیہ نور
انتہائی مکاری سے ڈکیتی کا منصوبہ بنانے والے احمقوں کا قصہ

72 رنگ آسماں — اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی حقیقتوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

101 محبت کا صلہ — شاہ زین رضوان
...یت کے صلے میں ... دشمنی پانے والی ایک صنف نازک کا ماجرا

110 ہمت مرداں — ملک صفدر حیات
نفس کی غلامی اختیار کرنے والے لالچی انسانوں کے ہاتھوں ایک خونی واردات کا احوال

143 ہوشیاری — سلیم انور
اعتماد کا خون کرنے والے ایک جوڑے کی بے اعتباری کا انجام

جلد 47 • شمارہ 12 دسمبر 2018 • زرسالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

150
محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

153
میٹھا زہر
ثمر عباس
تھوڑی سی چالبازی کے ساتھ
خطرناک مجرموں سے دلچسپ مقابلہ

161
تاوان
محمد طاہر عمیر
مجرم کے مکر و فریب پر مشتمل
ایک مختصر مگر دلچسپ تحریر

164
وقت
حسام بٹ
ایک عورت بازی گر کی بازی گری..... سنسنی
خیز واقعات پر مشتمل ایک طربا طویل داستان

201
ذات
عبدل جی
خون کی ہولی کھیلنے والے ایک
خوبصورت رشتے کا بدصورت عکس

219
حضرت موسیٰ ؑ
رضوانہ ساجد
مصر کی سرزمین پر فرعونی
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

231
سنگدل
ایمل رضا
ماں کی بے بسی پر مجبور ایک محبت
کرنے والی بیٹی کا انوکھا انتقام

238
پراسرار حویلی
نشور ہادی
پل پل گونجتی خون کی گردش تیز کرنے والا واقعات
اور ناقابل یقین مناظر کا احاطہ کرتی دلچسپ داستان

**
کترنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے،
اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ۔ مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

شعور

جون ایلیا

شام گہری ہوگئی ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہرۂ اوراق اور شہرۂ آفاق مثنوی ''زہرِ عشق'' یاد آرہی ہے جو میں نے آٹھ نو برس کی عمر میں سنی تھی اور دس گیارہ برس کی عمر میں پڑھی تھی۔ اس حشر انگیز مثنوی کا میرے خواب خواب لڑکپن کی دنیا، دنیا نہیں بلکہ میرے لڑکپن کی کائنات پر ایک سحر طاری تھا۔ یہ مثنوی شاعری اور مشوقانہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔

میں عشق و حسن کے رشتے کے ایک خاص احساس کی حالت میں دیوان غالب تو کیا خدائے سخن میر کی کلیات تک کو ''زہرِ عشق'' پر وار سکتا ہوں۔ آپ میں سے اگر کوئی صاحب میری اس بات کو غلو قرار دیں تو میں ان سے کوئی حجت اور تکرار نہیں کروں گا۔ یہ تو احساس اور تاثر کا معاملہ ہے اور احساس و تاثر کا بھلا حجت اور تکرار سے کیا واسطہ! ہاں تو اس وقت مجھے ''زہرِ عشق'' کا ایک شعر، ایک عجب حال خیزی کے ساتھ یاد آرہا ہے۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

''.....دونوں وقت ملتے ہیں'' سے میرے ذہن میں اچانک ایک لفظ ابھرا ہے اور وہ لفظ ہے انسان۔ یہ لفظ میرے ذہن میں اس لیے ابھرا ہے کہ انسان میں بھی دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک کیفیت خیر ہے اور دوسری شر۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ بعض اوقات یا اکثر اوقات انسان سراپا شر نظر آتا ہے۔

اس لفظ یعنی انسان کا ''مادہ'' یا عربی قواعد کی اصطلاح میں ''بنا'' الف، نون، سین یعنی ''انس'' ہے۔ انس کا ایک تلفظ ''اُنس'' ہے اور دوسرا تلفظ ''اِنس''۔ اس کے معنی ہیں خوش خلق، ملنسار اور ایک دوسرے سے مانوس ہونا۔ (وغیرہ)

یہ تو لفظ انسان کی اصل اور اس کے مادے یا بنا کی بات ہوئی۔ اب میں انسان کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ جاندار ہے جو اپنے دماغ یا مغز سر کی راست اور درست فعلیت یا اس کے رشد کامل کے سبب دوسرے تمام جانداروں سے اعلیٰ اور اشرف حیثیت رکھتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان وہ (راست قامت) جاندار ہے جو راست کار، راستی کوش اور درست راستے پر گامزن ہو اور اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اُنس رکھتا ہو۔ اس مرحلے پر آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں گے جو میں سوچ رہا ہوں اور وہ یہ کہ لغت کے اعتبار سے انسان کے جو معنی ہیں کیا ان معنی سے ہماری یعنی انسانوں کی اکثریت کوئی دور کا بھی تعلق رکھتی ہے؟

''کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو راست کار، راستی کوش اور درست راستے پر گامزن ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیا انسان واقعی وہ جاندار ہے جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے اُنس رکھتا ہو؟''

''ہرگز نہیں۔''

اس گفتگو کا جو پُر مایہ نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ ہم یکسر بے معنی اور مہمل ہیں۔ یکسر بے معنی اور مہمل۔ اور جون ایلیا! اس میں شبہ بھی کیا ہے کہ ہم سدا کے بے معنی اور مہمل موجود ہیں۔ الّا ماشاء اللہ ہم وقت کا ایک ٹھسول پن اور تاریخ کی ایک ہڑبونگ ہیں۔

انسانو! چاہے تم کہکشاؤں کو پتنگوں کی طرح اپنی کمروں پر باندھ لو، تب بھی تمہارا وجود یکسر بے معنی اور مہمل ہی رہے گا۔ تم کیا اور تمہارا نظامِ شمسی کیا، تمہاری کہکشائیں کیا اور تمہارے سحابیے کیا۔ جو کچھ بھی ہونے کے حال میں ہے، وہ عبث ہے، سرتا پا عبث ہے.....اور میں بھی عبث ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بدطور اور بے ہودہ عبثیت کا ہنجگر بھی ہوں۔ جو ذرا بھی بھلا مانس ہے اسے اس بدطور عبثیت کا ہنجگر ہونا چاہیے۔

کچھ انسان اگر کسی قدر ٹھیک ٹھاک ہونے کے طور سے کچھ ہیں تو فطرت کے اس عطیے کی وجہ سے ہیں جسے شعور کہا جاتا ہے اور اسی عطیے کی وجہ سے وہ اپنے با معنی ہونے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا یہ اصرار درست ہے۔ پر یہاں کہنے کی جو بات ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت نے فطرت کے اس عطیے سے عام طور پر بڑی بے تدبیری اور بے داشی کے ساتھ کام لیا ہے۔

تم اپنی بدطور مہملیت اور بے ہودہ عبثیت کے باوجود اگر شعور کو جز وقتی طور پر نہیں بلکہ کل وقتی طور پر کام میں لاؤ تو تمہاری وجودی مہملیت اور عبثیت کی چیرہ دستی تمہارا کچھ بہت زیادہ نہیں بگاڑ سکے گی۔

شعور ہی انسانوں کو اختیار سے نوازتا ہے اور شعور ہی آزادی عطا کرتا ہے۔ چاہے وہ اختیار بہت زیادہ نہ ہو اور چاہے وہ آزادی پوری آزادی نہ قرار پا سکے۔

ہے یوں کہ اس کائنات میں، اپنے آپ میں مگن رہنے والی اور اپنا آپا چھپانے والی اس نخریلی کائنات میں شعور کے بخشے ہوئے اختیار، ادنیٰ اختیار اور شعور کی ارزانی کی ہوئی آزادی، بہت کم آزادی کی حالت بھی فطرت کا کوئی معمولی عطیہ نہیں ہے۔

Digitized by Google

محترم قارئین کرام!

السلام علیکم!

وقت کا پہیا بالآخر سال کا دائرہ مکمل کرتے ہوئے دسمبر کے شارے تک آپہنچا۔ گزشتہ دنوں ملکی حالات کی طرح عالمی منڈی کے تناظر میں ڈالر کی قیمت میں اضافے کے سبب پاکستانی معیشت مزید آزمائش میں مبتلا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے غربت کی شرح میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے مگر..... افسوس اس بارے میں سوچنے والوں کو کب مظاہروں اور دھرنوں سے فرصت ہے کہ اس طرف بھی تھوڑی سی توجہ دے لی جائے۔ کھڑے سے پھلی پڑنے کے مانند سیاست کی بساط پر جو کھیل جاری ہے اس میں کہیں بھی عوام کے مفاد کا خیال نہیں رکھا جارہا۔ البتہ آج کل کچھ تماشا گر بہت عجیب انداز میں تماشے کرتے پھر رہے ہیں..... اکثر غربت سے تنگ آکر ایک دعا کی جاتی ہے ''یاالٰہی کہیں سے چھپن کروڑ کی ایک چوتھائی دے دے'' تو زندگی میں کچھ خوشگوار تبدیلی آجائے..... اور یہ ''چوتھائی'' کسی غریب کے کھاتے میں جس طرح ڈالی جارہی ہے..... اس کے نتائج بڑے خطرناک نکل رہے ہیں..... اچانک کبھی رکشا ڈرائیور کے اکاؤنٹ میں کروڑوں روپے کا انکشاف ہورہا ہے تو کبھی کسی کے اکاؤنٹ سے جمع شدہ رقوم کو اڑایا جارہا ہے۔ یہ کیسا نظام ہے جس میں اتنے سقم ہیں کہ کوئی بھی چور یہ آسانی چوری کرے یا اپنے حصے کا جرم کسی کے کھاتے میں لکھوادے اور پھر قانون کے ادارے حرکت میں آکر صرف غریب پر ہاتھ ڈال کر اپنا فرض ادا کردیں۔ جو دولت کسی بے خبر اور بے قصور غریب کے اکاؤنٹ میں منتقل ہورہی ہے اس ''انتقالِ پُرملال'' سے پہلے قانون کے ان اداروں کو اس کی خبر کیونکر نہیں ہوتی..... یا جس اکاؤنٹ ہولڈر کی جمع پونجی چرائی جارہی ہے اسے کسی غاصب کے لیے اتنا آسان کیونکر بنادیا گیا ہے..... بہت ضرورت ہے اس ملک کے نظام کی خامیوں پر توجہ دینے کی..... اس نظام کو چلانے والے لوگوں کی قابلیت کو پرکھنے کی..... کیونکہ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے کبھی ایسا ابتر حال نہیں سوچا ہوگا..... 25 دسمبر قائد کا یوم پیدائش ہم ہر سال مناتے تو ہیں مگر اچھے حالات جو روٹھ گئے ہیں کبھی انہیں منانے کی کوشش نہیں کرتے، نہ ہی اچھی بات ماننے پر آمادہ ہوتے ہیں..... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارضِ پاکستان کی ہمیشہ حفاظت کرے جیسا پاکستان ہمارے قائد نے سوچا تھا، اسے اس طرح بنانے میں ہماری مدد فرمائے اور ہمارے مقتدر لوگوں کی خلوصِ نیت کو جلا بخش دے (آمین) مسیحی برادری کو کرسمس کی بہت بہت مبارک باد..... جو ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں مناکر خوش ہوتے ہیں اور ہم..... اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی بزمِ دوستاں کی جانب جہاں پیارے پیارے سندیسے ہمارے منتظر ہیں۔

❁ ریاض بٹ، حسن ابدال سے کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں ''اس بار تھوڑا انتظار کروانے کے بعد 19 اکتوبر کو اپنا من پسند شمارہ بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا۔ جون ایلیا کا لکھا نجات حسب معمول دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ واقعی نوکر شاہی انگریز یہاں چھوڑ کر گئے ہیں..... ویسے یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ حکومتیں وہی کامیاب ہوتی ہیں۔ یعنی جمہوری حکومتیں۔ جو خالص عوام منتخب کریں اور اس میں کسی قسم کا تڑکا نہ ہو..... (جناب کی تڑکے سے کیا مراد ہے..... ذرا اس کی بھی وضاحت کردیں) اس کے بعد بڑھے اپنی پیاری محفل کی طرف۔ مدیرِ اعلیٰ صاحبہ نے سو فیصد صحیح لکھا ہے۔ عوام کی قسمت نہیں بدلی۔ تبدیلی نے عوام کے چھکے چھڑادیے ہیں۔ مہنگائی نے غریب عوام کا کچومر نکال دیا ہے۔ بے روزگاری مزید بڑھ گئی ہے..... بہرحال محفل میں پہلا خط ہے چلبلی ہیر کا۔ اچھا انداز بیان ہے۔ ویل ڈن..... کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ ڈاکٹر نائلہ نصر ملک کچھ عرصے کے وقفے کے بعد اچھے اور مدلل تبصرے کے ساتھ آئیں، اب غیر حاضری نہیں کرنی بہن۔ کہانیوں پر تبصرہ خوب ہے۔ زریں آفریدی اس بار مفصل تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں..... اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ساگر تو کوزے میں سمندر لیکن جاندار تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ رانا بشیر احمد آپ کا تبصرہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ خالدہ رفیع ظاہری کا تفصیل سے کیا تبصرہ محفل کی جان ہے۔ محمد اسلم کی انٹری بھی خوب رہی۔ عبدالبار رومی انصاری اچھے اور انمول لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ تبصرے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ میری انٹری پسند کرنے کا شکریہ۔ رمضان پاشا کیا حال چال ہیں۔ آپ سسپنس کے میری طرح پرانے اور مستقل قاری ہیں اور تبصرہ بھی ریگولر کرتے ہیں۔ میرا شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد صفدر معاویہ آپ نے بالکل ٹھیک لکھا کہ چیز اچھی ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کے ذوق پر میرا تبصرہ پورا اترا۔ جس کے لیے شکر گزار و ممنون ہوں۔ محفل شعر و سخن

Digitized by Google

بھی خوب بھی ہوئی ہے..... اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ تاریخ کے اوراق سے اس دفعہ مشہور و معروف مصنف الیاس سیتاپوری کی آستین کے سانپ پڑھنے کو ملی۔ اس کہانی کی کیا تعریف کروں؟ لفظ ساتھ نہیں دیتے پھر سورج کو کب چراغ دکھایا جاسکتا ہے۔ امر کہانیاں امر ہی ہوتی ہیں..... اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی کہانی جنگ آمد کی طرف اڑ کر پہنچے کیونکہ دوسرے حصے کا انتظار ایک ماہ پر محیط تھا..... اور اب یہ انتظار برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ کہانی کا دوسرا اور آخری حصہ بڑا سنسنی خیز رہا۔ عادی کا انجام عبرت ناک ہوا۔ وقت اور حریم کی وجہ سے عدیل عرف عادی ایک ایسی جگہ پھنس گیا تھا۔ جہاں کچھ بھی اس کے کام نہیں آسکتا تھا۔ آخر اسے اس کے کیے کی سزا مل گئی اور حریم اور عمر ایک ہو گئے..... سلیم انور کی کہانی ناپل بس گزارے لائق تھی۔ البتہ تنویر ریاض کی تبدیلی اچھی لگی اور انجام پر واقعی حیرت ہوئی..... اب باری ہے، مرزا امجد بیگ صاحب کی کہانی دیر آید پر تبصرے کی۔ انہوں نے بڑے ماہرانہ انداز میں اصل قاتل سے اقرار جرم کروا کے اپنے بے گناہ موکل کو باعزت بری کروالیا۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ سے زیادہ دور نہیں جاسکتے..... کیونکہ جھوٹ کے پاؤں تو ہوتے نہیں۔ انجم فاروق ساحلی کی انگریزی ادب سے لی گئی کہانی بہت خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ دوست نے اپنے دوست کے قاتل سے بہت اچھے طریقے سے بدلہ لیا..... اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہ کام کیا۔ بہت خوب..... رضوانہ ساجد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق معلومات کا خزانہ گیارھویں کڑی کی صورت میں صفحہ قرطاس پر بکھیرا..... اچھا سلسلہ ہے اور ادارہ اس سلسلے میں داد کا مستحق ہے۔ باقی کہانیاں، کمبل، کہانی کار، سبقت بھی تعریف کے قابل ہیں۔ مجموعی طور پر پورا رسالہ ہی قابل تعریف ہے۔" (بہت شکریہ پسندیدگی کا)

✿ ام عبداللہ، شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی سے اکتوبر اور نومبر کے شماروں پر تبصرہ کر رہی ہیں "رب عزوجل اپنے نور ﷺ کے طفیل سے ہماری قبروں کو نور مصطفیٰ سے جگمگا دے، منور کر دے۔ آمین۔ اکتوبر 18ء کے شمارے پر کچھ تبصرہ۔ خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ یعنی سسپنس ڈائجسٹ کی قیمت دیکھ کر جہاں شاک سا لگا وہیں اس کے صفحات اور عمدہ کہانیوں کی تعداد دیکھ کر جان میں جان آئی۔ مہنگائی کا تاثر ذہنوں پر ہمیشہ ناخوشگوار اثر چھوڑتا ہے مگر اچھی کہانیاں پڑھ کر یہ تاثر زائل ہو گیا۔ بہرحال ہم تو اس کے مستقل قاری ہیں جلد یا بدیر خرید ہی لیتے ہیں۔ "شوق کا کوئی مول نہیں" مہنگائی کی مد میں جہاں اتنا کچھ خرچ ہو جاتا ہے وہیں اپنے من پسند رسالوں پر خرچ کرنا بڑی بات نہیں۔ (یہ ہوئی نا اپنائیت بہت شکریہ) سرورق کی خوبصورت تصویر، ذاکر انکل کی شاہکار تخلیق کو دیکھ کر جہاں دل کو یک گونہ مسرت ہوئی وہیں ان کی وفات کی خبر دل کو غمگین کر گئی۔ آپ کے خط کے سب ہی تبصرے پسند آئے۔ محفل شعر و سخن کا ٹائٹل پسند آیا۔ تبصروں میں ریاض بٹ، محمد یعقوب، شہزاد خان، عروہ ملک، زریاں سلطان، نورین علی، وزیر احمد، ارم کاشف اور نازش ریحان کے انتخاب زبردست رہے۔ دیگر لوگوں نے بھی اپنا اچھا حصہ ڈالا۔ محمد طاہر عمیر کی چشم دید خوبصورت کہانی ہے۔ نادیہ نور کی احسان مند مختصر مگر پر اثر کہانی ہے۔ احسان ہو تو ایسا، اچھا تاثر دے گئی۔ ظفر اقبال کی کیکر و نشیں پیرائے میں لکھی گہری کہانی ہے۔ بعض اوقات انسان، بااختیار لوگوں کے سامنے کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ آخر میں دل کو دکھی کر گئی۔ ویلنٹن۔ مختار آزاد کی ٹھنڈی چائے کا اختتام دل کو اداس کر گیا۔ سزائے انتظار شاکر لطیف کی زبردست کہانی ہے۔ مسٹر ہارڈ نے اپنی اولاد کی بے اعتنائی سے دلبرداشتہ ہو کر جو قدم اٹھایا وہ ان کی اصلاح کے لیے کافی تھا۔ تاریخی کہانی مکافات بھی پسند آئی۔ تنویر ریاض کی ناقابل یقین سر سے گزر گئی۔ طاہر جاوید مغل کی خوبصورت آمد جنگ آمد سے ہوئی۔ معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں پر بہت عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ہر ممکن سعی کی گئی ہے۔ سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا واقعہ خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ سب کہانیاں پسند آئیں۔ اسی طرح نومبر 2018ء کا سسپنس پوری آب و تاب کے ساتھ جب ہمارے ہاتھوں میں آیا تو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ سرورق کی تصویر اچھوتی اور نرالی تھی پس منظر میں بادشاہوں کے آباد محل اب سونے اور ویران دکھائی دیے۔ ٹائٹل اپنے اندر معنویت لیے ہوئے ہے۔ اداریہ بھی وہی ڈھاک کے تین پات والی بات دہرا رہا ہے ہم عوام تو بس سالوں سے وعدوں پر ٹرخائے جاتے ہیں اور مہنگائی کی چکی کے دو پاٹوں میں مستقل پس رہے ہیں۔ حکمران طبقہ ہی فی زمانہ عیش میں ہے، آخرت میں حساب بھی تو کڑا ہوگا؟ چلیں یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا، دنیا میں کس نے ہمیشہ رہنا ہے۔ (مگر اس حقیقت کو سب نے فراموش کیا ہوا ہے) سسپنس کلاسک کی دلچسپ، معلوماتی اور انوکھی داستان الیاس سیتاپوری کے قلم سے آستین کے سانپ اچھی لگی۔ انداز بیاں بھی دلکش ہے۔ دوران مطالعہ ایسا لگتا ہے جیسے ہم اسی دور میں جا کر ان کرداروں کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ وقت اپنے دلکش و دلنشیں انداز میں سسپنس کا تاثر لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ رنگِ آسماں، موتی بکھیرتے جھرنوں کے مانند اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ اب کی بار کرتنوں کا الگ ہی مزہ تھا۔ سب لاجواب تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی پر پیچ راستوں پر چلتی دیر آید، کہانی اچھی لگی، ان کی بعض کہانیوں کے واقعات کبھی کبھی ملتے جلتے لگتے ہیں، بہرحال ملک صاحب مختلف پہاڑوں کو کھود کھود کر آخر کار کہیں نہ کہیں سے چوہا (مجرم) پکڑنے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کمبل پُرفکر اور خودداری جگانے والی خوبصورت کہانی ہے مگر اس کے اختتام میں اگر ایسا ہوتا کہ لائے ہوئے امدادی سامان کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر آگ لگانے کے بجائے، مستحقین و متاثرین کو یہ سامان بانٹ دیا جاتا تو شاید یہ زیادہ مناسب ہوتا اور مال کا زیاں بھی ہونے سے بچ جاتا۔ شاہ زین رضوان کی سبقت

Digitized by Google

دلچسپ کہانی ہے۔ ڈیوڈ کلارا سے زیادہ شاطر نکلا اور اس کی سبقت بازی لے گئی۔ مغل صاحب کی خوبصورت تحریر نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ یہ ہمیشہ اچھوتی اور پُرفکر کہانیاں لے کر آتے ہیں۔ اب کی بار کہانیوں کی تعداد کم تھی مگر سب اچھی لگیں۔

ڈاکٹر عبدالرب بھی عرصے سے غیر حاضر ہیں۔ محفل شعر و سخن میں آمنہ رشید، وزیر خان، عدنان شازل اور محمد آریز ملک کے انتخاب پسند آئے۔ کترنیں بھی کمال کی تھیں۔ خطوط کی محفل میں دلچسپی کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ چلبلی ہیر خوبصورت تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان تھیں۔ ایک بار پھر آپ کو صدارت مبارک ہو۔ بہناں! سسکتی سسی اور بلبلاتی لیلیٰ سے کب ملوا رہی ہیں؟..... آپ کی سہیلیاں بھئی..... وہی والی۔ زرین خاں! تاخیر سے سہی، حج بیت اللہ کی مبارکباد وصول کیجیے۔ ایما نے زارا شاہ اور ناہید یوسف! آپ کی موجودگی محفل میں چار چاند لگانے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر نائلہ نصر ملک کی دلکش تبصرے کے ساتھ آمد، مرحبا..... محمد صفدر معاویہ، خالد مسیح طاہری اور عبدالجبار رومی انصاری کے تبصرے پسند آئے۔ 3 ستمبر کو محترمہ یمنیٰ احمد سے ٹیلی فونک رابطہ کیا تھا۔ میں ایک عرصے سے بیمار تھی۔ شاید انہیں ٹھیک طرح سمجھا نہیں پائی۔ وہ مجھے کچھ برہم اور خفا سی لگیں۔'' (ارے نہیں..... ہم کسی سے خفا نہیں ہوتے..... اگر ایسا لگا تو نظر انداز کر دیں۔ بات کو سمجھانا پڑتا ہے..... آپ کی تحریر کے بارے میں بھی جلد ہی مطلع کر دیا جائے گا)

✻ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تشریف لائے ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ بڑا منفرد اور چنیدہ کہانیوں اور سلسلے وار اقساط کا مجموعہ ہے۔ نومبر کا سرورق ایک دیہاتی دوشیزہ کا عکس۔ کچھ پرانی عمارتوں اور ایسے اوراق پر مشتمل ہے۔ ان اوراق پر قلم دوات، خنجر، زنجیر اور کچھ اوزار ہیں۔ قلم کو زنجیر پہنائی گئی ہے۔ عجیب الگ طرح کی منظر کشی ہے، بہرحال خاتون کے چہرے پر خوشی بھری مسکراہٹ ہے۔ میں پچھلے دو ماہ سے خطوط کی محفل میں حاضر نہ ہو سکا۔ عجیب ملکی حالات ہیں۔ میرے علاقے کورنگی میں بجلی کا شدید بحران رہا۔ بجلی نہیں تو پانی نہیں۔ مہنگائی کا طوفان بلاخیز ہے۔ آپ نے اپنے شاہکار ڈائجسٹوں پر پہلے صرف 10 روپے کا اضافہ کیا اور اب پورے 100 روپے کر دیے۔ (مہنگائی کے ہاتھوں ہم سب مجبور ہیں جناب) نومبر کی کہانیوں میں الیاس سیتاپوری کے آستین کے سانپ ایک بے مثال تاریخ ہے جو صرف لکھاری کے قلم کا جادو ہے۔ تبدیلی، بڑی اعلیٰ درجے کی انسانی جذبات کے انقلاب پر مبنی ہے۔ ہمارے ملک میں تبدیلی کی صدائیں بلند ہیں اور یہ بھی اپنے ملک کی تقدیر پر مبنی ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ بالکل، اچھی کہانی اور بامعنی پوری کہانی ختم کرنے پر اصل حقائق کا پتا چلتا ہے۔ واقعی انسان کی متضاد فطرت کا کچھ اندازہ نہیں کہ بظاہر معصوم دکھائی دینے والا انسان اندر سے مجرم بھی ہوتا ہے۔ کتنی صفائی سے اور دور رس پلاننگ سے سزا تجویز کی۔ رنگِ آسماں، بڑا پُراثر اور لمحہ بہ لمحہ کروٹ لیتے ہوئے واقعات پر مبنی ہے۔ کہیں کہیں کہانی کو بڑا پراسرار بنا دیا گیا ہے۔ جو حقیقت سے ذرا ہٹ جاتا ہے۔ دیر آید، مرزا امجد بیگ کی کہانی ایک لاجواب اور کامیاب عدالتی کارروائیوں پر مبنی ہے۔ لوگ اپنی کسی مجبوری کے ہاتھوں پوش علاقوں میں رہنا پسند کرتے ہیں لیکن ان علاقوں کے مسائل بھی کچھ کم نہیں۔ زیر و زبر، تقدیر اور تدبیر بالکل ایسے ہیں جیسے کسی عمارت میں لفٹ اور سیڑھیاں۔ لفٹ تقدیر اور سیڑھیاں تدبیر۔ دونوں کی اپنی اہمیت ہے۔ تقدیر کا اچھا ہونا ہی تدبیر کی کامیابی ہے۔ اس کہانی میں مجرم کی تلاش کے ساتھ تقدیر کا بھی کمال تھا ورنہ یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ سبقت، ایک لڑکی کی ہندوانہ سمجھ بوجھ اور توہم پرستی کی تحقیق۔ آخر کالی ماتا کے خنجر نے کیا کیا۔ وہ جان سے گئی کوئی ماتا کام نہ آ سکی۔ وقت، کافی طویل اور چکردار سلسلہ۔ بڑی دلچسپی سے چلتے چلتے اچانک کیسے طلسماتی پہلو اختیار کر لیتا ہے لیکن دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ حضرت موسیٰ ایک بے حد معلوماتی سلسلہ جو بڑی تحقیق اور جستجو سے تحریر کیا گیا۔ میں ہر طالب علم اور پڑھے لکھے آدمی کو ایسی تحریر پڑھنے کا کہوں گا۔ جس سے معلومات کا خزانہ مل جائے گا۔ کہانی کار، ایک عورت جو سب کو کہانیوں میں ملوث کرتی تھی۔ اس دفعہ اس نے خود ایک کہانی میں حقیقت کا روپ بھر دیا اور ایک معصوم لڑکے کی قربانی دے ڈالی۔ بڑی دلچسپ کہانی تھی۔ اشعار کی محفل اچھی ہے۔ کچھ اشعار بہت اچھے ہیں اور لکھ لینے کے لائق۔ غیر ملکی محاورات بہت عمدہ ہیں۔ کمبل، مصیبت زدہ لوگوں کا مال کھانا اور وقت سے فائدہ اٹھانا ہمارے یہاں بے ضمیری نہیں بلکہ چالاکی اور مفاد پرستی ہے لیکن کچھ لوگوں کا ضمیر زندہ ہے، جبھی تو ہم یہاں سانس لے رہے ہیں۔''

✻ چلبلی ہیر، جھنگ سٹی سے چھم چھم کرتی چلی آ رہی ہیں ''اپنا سسپنس (بے شک یہ دنیا اچھے لوگوں کے دم سے ہی قائم ہے) ڈائجسٹ نومبر 2018ء کچھ منفرد انداز کا ٹائٹل لیے ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ زبردست بہت اچھا لگا۔ انشائیہ میں جون ایلیا جی نے لفظ نجات میں نوکر شاہی کے کارناموں پر قلم اٹھایا۔ یہ سچ ہے کہ نوکر شاہی کوئی قومی پس منظر نہیں رکھتی۔ یہ انگریز سامراج کا کرم پروردہ تحفہ تھا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو جمہوریت کو کھا رہا ہے اور اپنی من مانی کرتا ہے۔ انہی نوکر شاہی کیڑوں سے نجات کی ضرورت ہے۔ ادارہ ہمارے دلی جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔ ویلڈن مدیرہ جی۔ محفل میں اتر ہوئے تو جناب اقلیم علیم صاحب ادارہ سسپنس ڈائجسٹ اور عذرا جی کی مجبوریاں بتا رہے تھے۔ یہ دنیا ہے سر جی یہاں یہ سب چلتا رہتا ہے مگر عذرا صاحبہ سے التماس ہے کہ وہ ہم قارئین کے جذبات اور خیالات کا بھی پورا خیال رکھیں کہ زیادہ سے زیادہ ناموور رائٹرز کے شاہکار کو سسپنس ڈائجسٹ کی زینت بنائیں (عذرا رسول صاحبہ تو آپ کی پسند اور ناپسند کا بے حد خیال رکھتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ آپ کی فرمائش پوری ہوتی رہیں) اقلیم علیم صاحب آپ سے بھی گزارش ہے اپنے قلم کو جلد آمادۂ تحریر کریں۔ شکریہ۔ چلبلی ہیر کو صدارت پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور اچھا لگا۔ ڈاکٹر نائلہ نصر اور زرین آفریدی کے تبصرے بامقصد اور

Digitized by Google

اچھے تھے۔ باقی تمام نئے اور پرانے تبصرہ نگاروں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تبصرے پیش کیے۔ کترینں یا مراسلے کا معیار پہلے سے کافی بہتر ہوگیا ہے۔ کافی معلوماتی مراسلے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل جی کی جنگ آمد کی طرف توجہ دی، دوسرے اور آخری حصے میں واقعی طاہر صاحب کہانیوں کے اس ماحول میں لے گئے جو ان کا خاصہ ہے۔ مطلب ہم اپنے اردگرد کے ماحول کو بھول کر بس ان کی تحریر میں گم ہو جاتے ہیں عادی جیسے بھیڑیے کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ سے عروبہ کا ہنستا بستا خاندان مشکلات میں آگیا۔ عمر نے اپنی وفا نبھائی اور حریم کا دل جیت لیا۔ ویلڈن صاحب تحریر..... سسپنس کلاسک میں آستین کے سانپ الیاس سیتاپوری کمال لکھتے ہیں۔ عصامی قسمت کا دھنی نکلا جو اتنے پرآشوب ماحول میں خود کو بچا کر بھاگ گیا۔ تاریخی کہانی زبردست ہے۔ تنویر ریاض صاحب کی تبدیلی کافی دلچسپ رہی۔ صوفی، مارکوس اور اس کے بیٹے رک کے گرد گھومتی تحریر مزہ دے گئی۔ شاہ زین رضوان صاحب کی سبقت کافی سسپنس لیے ہوئے تھی۔ مصنف کے بقول عورتوں کی ہمت و تحمل مردوں سے کم ہوتی ہے، یہ انہوں نے کر دکھایا۔ کلارا مارٹن ابھی اپنے بھائی ڈیوڈ کو ختم کرنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ ڈیوڈ نے پہل کر دی۔ دولت کا حصول ہمیشہ سے خونی رشتوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ اے آر راجپوت کی رنگ آسماں تیرھویں قسط پڑھی، حیرت ہوئی کہ ایک سال سے بھی اوپر ہو گیا۔ سسپنس ڈائجسٹ کا پڑھنے کا یہ بھی فائدہ ہے۔ داستان تو اپنی جگہ سپر ڈوپر ہوتی جا رہی ہے۔ اس داستان میں نیوانٹری سدھا کی اپنی داستان بھی بہت دلچسپ بنا دے گی۔ حسام بٹ صاحب کی وقت تو مجھے بہت پسند ہے۔ اسد علی صاحب کچھ نیا کرنے کے لیے کرائسٹ چرچ ائرپورٹ سے نکل آئے۔ جی ایم سر کی پھر انٹری زبردست رہی۔ مرزا امجد بیگ کی دیر آید، واقعی درست آید بن گئی۔ ان کے جرح کرنے کا انداز انوکھا اور پُرزور ہوتا ہے کہ مجرم خود بول پڑتے ہیں جیسے کہ زہرہ باجی کے پڑوسی عرفان..... ویلڈن..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گیارھواں حصہ بھی ایمان آفریں تھا۔ بہت معلوماتی بھی ہے۔ مدیرہ جی آپ سے گزارش ہے کہ سسپنس کلاسک میں کوئی مزاحیہ کہانی پیش کی جائے۔ پلیز۔'' (بالکل جناب آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے..... بس تھوڑا سا انتظار وہ بھی صبر کے ساتھ درکار ہے)

✠ محمد زبیر ساگر، گوجرہ سے محفل میں شریک ہیں ''نومبر کا سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے۔ کیا ہی خوبصورت ٹائٹل ہے ایک خوبصورت حسینہ ہاتھوں میں گلاب کا پھول لیے مسکرا رہی ہے۔ بہت ہی پیاری لگ رہی ہے کیسے بیان کروں شربتی آنکھیں گلابی ہونٹ دلکش اداؤں والی حسینہ ہمیں دیوانہ بنا رہی ہے۔ سسپنس کی تعریف میں کیا کہوں، کیسے کروں بیان سسپنس ہماری جان ہے۔ ہر بار کی طرح سسپنس اس دفعہ بھی ہماری جان ہے۔ خوبصورت کہانیاں خوبصورت سلسلے سسپنس زندہ باد..... سسپنس کی قیمت میں اضافہ کوئی بات نہیں ہے۔ سسپنس کو دیکھتے ہی ہم قیمت بھول جاتے ہیں بس یہ ہی کہنا چاہتے ہیں کہ ہر بار کی طرح اللہ تعالیٰ سسپنس کو بہت ترقی دے اور لمبی عمر لمبی دے اس لیے کہ سسپنس ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ دل کا سکون ہے اس کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔'' (اوشاباش بھئی..... یہ ہوئی نا بات..... کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ سسپنس کی تحریروں کے بارے میں بھی اپنی پسند نہ پسند سے آگاہ کر دیتے)

✠ انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس بار ٹائٹل پرانے پس منظر اور مسکراتی ہوئی لڑکی کی ادا سے، قارئین کے چہروں پر مسکراہٹ لانے والا تھا۔ فہرست کا ڈیزائن بے حد جاذب نگاہ اور ہر چیز کو واضح کر دینے والا تھا۔ اپنی کہانی کے نام پر نظر کچھ دیر سے پڑی، پہلی نظر میں پتا ہی نہیں چلا۔ بہر حال بے حد شکریہ، کہانی کا رار اور ہلچل درمیانے درجے پر تھیں۔ کمبل، سبق آموز اور جھنجوڑ کر رکھ دینے والی تھی۔ رنگ آسماں، وقت اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ جنگ آمد کا دوسرا حصہ خوب تھا۔ خطوط تقریباً سبھی اچھے اور دلچسپی سے بھرپور تھے۔ تاریخی کاوش آستین کے سانپ عمدہ تحریر تھی۔ تبدیلی نئے انداز کی منفرد کہانی تھی۔ حالی دماغ کے اختتامی انکشافات خوب تھے۔ دیر آید کی جرح و دلائل بھی اچھے تھے۔ سبقت کا اختتام چونکا دینے والا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قسط وار تحریر کا تو جواب ہی نہیں۔''

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے شریک محفل ہیں ''نومبر 2018ء کے سسپنس کا سرورق خالص مشرقی تھا، پس منظر میں قبرستان بہت دلکش لگ رہا تھا اور پھر کتاب دوات قلم، خنجر، کلہاڑی وغیرہ کا اسٹیج..... قاری کو سوچ میں غوطہ زن ہونا پڑا۔ اس کے بعد انشائیہ نے بھی سوچ اور فکر کی طرف دھکیلا۔ اس دفعہ آپ کا اداریہ بھی بڑا زوردار تھا، اس پر آپ کو داد دوں گا اور شاباشی بھی۔ (دیری گڈ..... بہت شکریہ) قارئین کے لیے الگ سے ایک مضمون تحریر کیا ہے، کیا یہ اقلیم علیم وہی ہیں جو ماضی میں موت کی سوداگری کرتے تھے؟ (جی جناب بالکل وہی ہیں) ویسے نئے قلم کاروں نے ہمیں مایوس نہیں کیا، خاص کر اے آر راجپوت نے تو پالا مار لیا۔ حسام بٹ تو ہیں ہی پرانے کہانی کار۔ ان کی کہانی وقت، اس عنوان کا صحیح مفہوم اس قسط میں بیان ہوا ہے یعنی ٹائم اینڈ اسپیس۔ خطوط کی محفل میں جن دوستوں نے اس ناچیز کا ذکر خیر کیا ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اشعار کی محفل کے سارے اشعار اچھے تھے خاص کر آمنہ رشید، راحیل احمد اور کہکشاں فردوس کے اشعار دل کو بھائے۔ اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ حالی دماغ بہت ہی گنجلک اور پیچیدہ کہانی تھی، میرا تو دماغ چکرا کے رہ گیا۔ اب مجھے بھی سائیکاٹرسٹ سے علاج کرانا پڑے گا، اس کے بعد دوبارہ یہ کہانی پڑھوں گا۔ ہلچل میں

Digitized by Google

مزہ نہیں آیا۔ بچنگ آمد میں عروبہ اینڈ کمپنی جنگل میں محصور ہونے کے واقعات کافی طوالت سے بیان ہوا ہے۔ بیگ صاحب کی کہانی دیر آید بہت درست تھی۔ لطف آ گیا۔ دوسری چھوٹی کہانیاں سب اچھی تھیں۔ کترنیں بھی بہت خوب تھیں۔''
(پسندیدگی کا بے حد شکریہ)

❁ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا سے تشریف لائے ہیں ''نئی نویلی دلہن کی طرح مسکراتی ہمی سنوری دوشیزہ بہت ہی پیاری لگی۔ انشائیہ بہت اچھا لگا لیکن جونو کر شاہی رٹ ہی میں نہ مانوں کی لگائے رکھیں تو انہیں جمہوری معاشرے کے آداب کیسے سکھائے جائیں؟ باقی جون انکل کا نسخہ نجات تو بہت عمدہ ہے۔ اپنے ملک کے لیے قوم سیکھ جائے تو کافی ہے۔ چلیں ہیر جی شہزادیوں کو تو شہزادیاں ماننا ہی پڑتا ہے پر یہ شہزادیاں سسپنس بادشاہ کے حضور امان پا کے حاضر بھی ہوتی رہیں نا۔ محفل صدارت مبارک ہو۔ خواب سے حقیقت میں آتی ڈاکٹر نائلہ نصر ملک کا بے حد شکریہ۔ جو انہوں نے ہماری آواز پہ لبیک کہا، عمدہ تبصرہ۔ زرین آفریدی کی ہمنوائی اچھی لگی اور تبصرہ بھی زبردست رہا۔ کچے دھاگے سے مضبوطی سے بندھے رانا بشیر احمد ایاز کی تبصرہ نگاری عمدہ رہی۔ خالد صبح طاہری بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ زبردست رہے۔ خوشی سے سرشار ہوتے محمد صفدر معاویہ کی انٹری بھی خوب رہی۔ باقی محمد رفاقت، رمضان پاشا، ریاض بٹ، ساگر تنکو کر اور محمد اسلم کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ بچنگ آمد میں عروبہ کی فیملی کو دو دن کی اسیری نے بے حال کر دیا۔ بھیڑیوں کے خونی مناظر نے خون ہی خشک کر دیا۔ بھی حریم نے اپنے مجرم بھیڑیے عادی کو بھی بلوا کر خوب بدلہ لیا۔ قانون نے تو اسے کچھ نہ کہا تھا لیکن قدرت نے اسے ضرور سزا دے دی۔ عمر کا انتظار بھی ختم ہوا اور حریم کی صورت اسے بھی خوشیاں مل گئیں عمدہ کہانی۔ آستین کے سانپ مراعات حاصل کر کے بھی اپنی سازشوں سے بعض نہ آئے آخر میں عصامی کی جان لینے والے فضل نے اپنے بیٹے کو ہی موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود کو تباہ و برباد کر بیٹھا۔ آستین کے سانپ تاریخی دریچوں سے عمدہ کہانی تھی۔ خود کو عالی دماغ سمجھنے والے آخر ایک اور عالی دماغ سے ہار گئے اور قانون کے شکنجے میں آ گئے۔ ایک ہی طرز کی کہانی سنا کر ماہر نفسیات کو پاگل بنانے والوں کو پتا نہیں تھا، اب پاگل بننے کی ان کی باری ہے، سو دھر لیے گئے۔ کہانی اچھی رہی۔ ایک دوسرے کے کام آؤ تا کہ سنسار آگے بڑھے شوکی کی مدد کرنے والی پراسرار سدھا خود بھی مدد کی طالب ہوئی، تو شوکی کی حس محبت کو زندہ کرنے کے لیے بھی بڑھا دیا۔ دوسری طرف زمان کو گولی تو لگی لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب ٹھہرا۔ اریبہ نے رینالڈ کو اوپر پہنچا کر اس مشن کو مکمل کیا۔ رنگ آسماں زبردست رہی۔ باجی زہرہ کی بلڈنگ میں قیصر کا قتل ہو گیا اور پھنس گیا۔ بیچارہ خاور یوں بیگ صاحب کو اسے بچانے کے لیے پیشہ ورانہ داؤ پیچ چلانے پڑے اور پھر دوسروں سے عرفان کی صورت مکھن سامنے آئی جسے بیگ صاحب نے آسانی سے رام کر لیا اور پھر دیر آید کی صورت عرفان کو کٹہرے میں لے آئے اور خاور کو بری کروا لیا۔ زبردست۔ لو جی علی کا ساتھ نبھانے والی کایا کی کایا پلٹ گئی، بیچاری علی کے ساتھ وفا نہ کر سکی اور موت کے ساتھ وفا کر گئی۔ دوسری طرف جی ایم سر بھی علی کی دماغی چولیں ہلانے پہنچ گئے ہاں وہ خود اس دنیا سے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ پر اتنی جلدی کیوں؟ طویل معرکوں میں تو اس کی ضرورت پڑتی رہنا چاہیے تھی نا۔ خیر لگتا ہے جی ایم سر علی کو سب کچھ پڑھا کر ہی سدھاریں گے۔ فکر انگیز کہانی کمبل اچھی لگی خود آسودہ حال تھے تو بھیک کی صورت سامان لینا بھی اچھا نہیں تھا لیکن اس طور اس نے اچھا اقدام کیا کہ سارے سامان کو آگ لگا دی لیکن اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ سارا سامان کہیں اور مستحق لوگوں تک پہنچا دیتا۔ یوں ضائع نہ کرتا۔ تدبیر کنندہ اپنی تدبیریں آزما رہا ہوتا ہے اور تقدیر اس پر ہنس رہی ہوتی ہے تبھی تو مجرم کو زیر کر کے پیشی کے لیے مجبور... کر دیتی ہے۔ جیسے زیورات چرانے والے پام کے ساتھ ہوا۔ عارف زر گر بھی خوش ہو گیا اور شفقت اپنی ہی تقدیر کو کوستا رہا بس کوئی زیر ہو گیا تو کوئی زبر ہو گیا عمدہ کہانی۔ حضرت موسیٰ کا وقت بھی آن پہنچا اور وہ اپنی قوم کو فکر کے ساتھ نصیحت در نصیحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ پیارے موسیٰ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین پر تو جانیں سکے پر اپنی قوم کو ضرور سنبھالے ہیں دیکھو آگے چل کر لاڈلی قوم ان نصیحتوں پر کتنا پورا اترتی ہے۔ محفل شعر و سخن سے ناہید یوسف، وسیم علی اور بریرہ، کراچی کے شعرا اچھے لگے۔''

❁ شاہانہ سلطان، جامع کلاتھ، کراچی سے اپنی رائے لیے حاضر ہیں۔ ''زندگی میں جب بھی فرصت ملتی ہے تو قلم اٹھا لیتی ہوں تا کہ آپ سب ساتھیوں سے گاہے گاہے ہی سہی رابطہ تو رہے..... آپ سب کے درمیان آ کر دل کو ایک سکون سا مل جاتا ہے۔ رہا سوال سسپنس کی کہانیوں کا تو ظاہر ہے مشق بہت پرانی ہے، اسے ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے امی کہتی تھیں کہ سسپنس پڑھے بغیر تو لگتا ہے کہ تمہارا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا اور آج جبکہ میرا بیٹا ماشاءاللہ 29 اکتوبر کو پورا دو سال کا ہو گیا ہے تو یہی لگتا ہے کہ واقعی سسپنس نہ پڑھوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت ضروری کام کرنے سے رہ گیا ہے۔ بہرحال یہ تو ایک خوبصورت تعلق کا اظہار ہے۔ اب چلتے ہیں نوبر کے شمارے کے اوراق کی جانب..... سب سے پہلے پڑھی آخری صفحات کی لاجواب کہانی۔ بچنگ آمد کا دوسرا حصہ واقعی لاجواب رہا..... ایک پُرمغز اور پُرفکر کہانی..... ہمارے معاشرے کی بدصورتی کو اجاگر کرتی اور بڑھتی ہوئی برائی کو روکنے کی سعی کرتی سبق آموز تحریر تھی۔ ویلڈن طاہر جاوید مغل جی..... آپ سے گزارش ہے کہ سسپنس کے صفحات کے لیے کوئی طویل سلسلے وار داستان بھی لکھیے کیونکہ ہم آپ کو ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے سسپنس کلاسک میں الیاس سیتاپوری کی آستین کے سانپ پڑھی۔ عصامی جتنا چالاک تھا اتنا ہی خوش قسمت بھی۔ اپنی طرف بڑھنے والی موت کو بھی اس نے کتنی خوبصورتی سے دوسری جانب موڑ دیا۔ تاریخ کے یہ صفحات ہمیشہ

Digitized by Google

سے میرے علم میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں..... کیونکہ میرے پاس موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کا بالکل وقت نہیں ہوتا جو اتنی گنجلک ہوتی ہیں کہ انہیں سمجھ کر پڑھنے کے لیے بھی وقت چاہیے ہوتا ہے اور ہماری تو ویسے ہی اتنی مصروف زندگی ہے۔ سسپنس کے تاریخی صفحات پڑھ پڑھ کر یہی فائدہ ہوتا ہے کہ آسان کہانی کی طرز پر حقائق سے آگاہی ہو جاتی ہے..... ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ ایک سبق آموز تحریر لاتے ہیں۔ اس بار بھی سبل پڑھ کر بہت دیر تک سوچتی رہی کہ اگر ہر انسان کا ضمیر ایسے ہی فیصلے کرنے لگے تو یہ معاشرہ کتنی جلدی سدھر جائے مگر یہ ہم میں کوئی مذاق نہیں کی عملی تفسیر بنتا۔ انسان خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ نئے قلم کار بھی اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس بار ایمل رضا کی تحریر کہانی نے بھی بہت لطف دیا۔ وہ بھی اچھی کہانی کار تھی جسے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر کہانی سنانے کا چسکا ایسا لگا کہ حقیقی زندگیوں کو بھی اپنی تصوراتی دنیا کا کردار سمجھنے لگی۔ ایمل کی طرح شاہ زین رضوان کا قلم بھی بلندپروازی کی جانب مائل ہے۔ ماشاءاللہ کیا انداز تحریر ہے۔ دولت کا لالچ ہر ماحول، ہر مذہب کے انسانوں کو بہکا سکتا ہے۔ وقت حسام بٹ کے قلم سے لکھی جانے والی تحریر جانے کیوں ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ ہر بار علی صاحب کو ایک عدد ایسی لڑکی کا ساتھ مل جاتا ہے جو انہیں دیکھتے ہی ان پر مرمٹتی ہے پھر دو چار لوگوں کا قتل ہوتا ہے پھر اگلی جب میں یہی سب کچھ نئے انداز میں دہرایا جاتا ہے۔ اب علی کا مقصد کیا ہے اور اسکل اینڈ بونز والے اس کے پیچھے کیوں پڑے ہیں، یہ مقصد واضح ہونا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علی میں وہ ایسی کون سی اضافی ہے جس کی وجہ سے وہ اتنا خاص ہے جبکہ اسکل بونز اینڈ والے خود اس شک میں مبتلا ہیں کہ آیا یہ علی وہی ہے جسے وہ ڈھونڈ رہے ہیں یا کوئی اور۔ بہرحال یہ سارے سوال ہم وقت پر ہی چھوڑتے ہیں، شاید کبھی ان کے جواب مل جائیں۔ رنگِ آسماں بھی کبھی بہت اچھی چلتی ہے اور کبھی اسے بھی بریک لگ جاتے ہیں۔ پلیز اسے ماورائی نہ بنایئے گا۔ اب جادو اور پتا نہیں کیا کیا مرچ مسالے اس میں شامل ہونے لگے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا قصہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ بھی ہمارے علم میں اضافے کا سبب ہے۔ مرزا امجد بیگ کی دیر آید بھی خوب رہی۔ بیگ صاحب کی جرح کا انداز ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ محفل شعر و سخن کا رنگ تو خوب ہی دھنک بکھیرتا ہے۔ ہر شعر لاجواب اور معیاری ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو میں اپنے پاس محفوظ بھی کر لیتی ہوں۔ بہت خوب..... خطوط کی محفل میں تمام دوستوں کے تبصرے بھی میں انتہائی توجہ سے پڑھتی ہوں۔ سب کا انداز اگرچہ الگ ہے مگر اپنائیت کا احساس ایک ہی جیسا ہے۔"

❁ ناہید یوسف، اسلام آباد سے خط لکھ رہی ہیں۔ "نومبر کا شمارہ ملا تو سب سے ٹائٹل پر نگاہ پڑی اور ہم ماضی کے دریچوں میں کھو گئے۔ نازک سی حسینہ لبوں پر خوشی سجائے اپنے خوبصورت دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔ پیچھے قلم، دوات، خنجر نہ جانے کیا کیا ایک ساتھ رکھا تھا۔ کچھ یادگاریں بھی بیک گراؤنڈ میں نظر آئیں بہرحال ٹائٹل پسند آیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ اس سے پہلے کبھی ٹائٹل پر اتنی توجہ نہ دی مگر اس بار ہر چیز کا بغور معائنہ کیا۔ جون ایلیا صاحب نسخہ جات لے کر آئے اور کیا خوب لکھا..... زبردست۔ دانش و حکمت کی باتیں۔ ویل ڈن۔ خطوط میں اول نمبر پر چلتی ہیر صاحبہ رہیں۔ مبارکباد۔ تمام دوستوں کے خطوط جامع تھے۔ مگر یہ کیا؟ ہم تو آخر تک اس میں کہیں نہیں تھے، خیر ہم سمجھ گئے یقیناً ہمارا خط آپ کو وقت پر نہیں مل سکا ہوگا یا پھر کچھ اور مسئلہ ہوگا، کوئی بات نہیں۔ ناظم علیم صاحب کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ اس دفعہ الیاس سیتاپوری کی تحریر آستین کے سانپ پیش کی گئی۔ کافی اچھی معلوماتی تحریر تھی۔ انداز بیاں بھی خوب تھا۔ طاہر جاوید مغل کی بھنگ آمد کا بقیہ حصہ پڑھا۔ آخر کار مکافاتِ عمل ہوا اور عادی بھیانک موت کا شکار ہو کر جہنم واصل ہوا۔ عروبہ اور حریم کا حوصلہ قابلِ تقلید تھا۔ خواتین کو باہمت ہونا چاہیے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھنی چاہیے۔ عمر کا کردار بھی بہت پازیٹو رہا۔ اس کی ثابت قدمی پسند آئی۔ کہانی نے حقیقتیں بھی کیا اور خوشی بھی ہوئی۔ بہت زبردست مغل صاحب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ایمان افروز ہے۔ پڑھ کر دل منور ہو جاتا ہے۔ واقعی بنی اسرائیل کی قوم کو اتنی نعمتیں ملیں مگر ان کے نخرے ختم نہ ہوتے تھے اور وہ ہر بات میں شکوہ و حجت کرتے تھے۔ تنویر ریاض کی تبدیلی بہترین ثابت ہوئی۔ بگڑے بیٹے کے سدھار کی متمنی ماں، اپنے شوہر میں تبدیلی کا سن کر دنگ رہ گئی۔ واہ! کیا خوبصورت آئیڈیا تھا۔ بہت اچھی رہی کہانی۔ سلیم انور کی کہانی ہلکی پھلکی بس گزارے لائق لگی۔ رنگِ آسماں میں غیر حقیقی واقعات کے سبب کہانی اپنی دلچسپی برقرار نہیں رکھ پا رہی۔ رائٹر سے گزارش ہے کہ کہانی میں حقیقت پسندی سے کام لے کر حقیقی واقعات کو پیش کیا جائے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ہم کوئی جادو نگری کی داستان پڑھ رہے ہیں۔ وقت میں ہمیں واقعات کی سست رفتاری نظر آئی۔ اتنی اقساط کے بعد بھی کہانی میں تیزی نہیں آپائی ہے۔ حسام بٹ صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کا ٹمپو تیز کریں۔ محفل شعر و سخن خوبصورت رہی۔ تمام اشعار زبردست تھے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی سبل واقعی آئینہ دار تحریر رہی۔ ہم لوگ مشکل وقت میں بھی اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور دوسروں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ آذین رضوان کی سبقت بھی بہترین کہانی رہی۔ بہن نے دیر کر دی اور بھائی اسے مارنے میں سبقت لے گیا۔ انوکھا آئیڈیا تھا۔ زیروزبر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ مرزا امجد بیگ کی دیر آید میں قانونی داؤ پیچ خوب رہے۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

علیم الدین، راولپنڈی۔ عبدالرزاق، کراچی۔ غلام شبیر، سیالکوٹ۔ غلام حسین، ملتان۔ سمیعہ ناز، گوجرانوالہ۔ فہیم راجا، بھکر۔ ندیم کمال، اسلام آباد۔ قدا چانڈیو، لاڑکانہ۔

Digitized by Google

انتقام

علی اختر

عہد کوئی بھی ہو لمحہ لمحہ جُڑ کر ہمیشہ
ایک ایسی داستان ترتیب دیتا ہے جو آنے والے
لوگوں کے لیے نہ صرف دلچسپی کا باعث بنتا ہے
بلکہ بہت سے عبرت اثر واقعات حال کی درستگی کا
سبب بھی بن جاتے ہیں... بالکل اسی طرح عہد ساز
شخصیت رضیہ سلطانہ کی ہمت اور شعور و آگہی پر
مشتمل یہ حالات بھی ماضی کی فسوں گری میں گم کردیتے
ہیں... جب سازشوں کا دور دورہ تھا اور دوستوں کے روپ میں
دشمنوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ طاقت کے بل پر ہر
کمزور کو دبایا جارہا تھا، ایسے میں اس صنفِ نازک نے حالات کا
مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی رعایا کو بہت سی مشکلات سے بچالیا۔

Digitized by Google

Digitized by Google

غلام بازار کی رونقیں اس کے لیے حیرت اور خوشی کا باعث بن رہی تھیں۔ وہ خوشی کے ساتھ عجیب حیرانی سے پورے بازار میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس کے چچازاد اور تایازاد کے علاوہ سوتیلے بھائی اسے بڑی مشکلوں سے یہ بازار دکھانے کے لیے لائے تھے کیونکہ اس کے والد نے اس پر اتنی پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ کبھی اکیلا باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کے چچازاد اور سوتیلے بھائیوں پر اس قدر پابندی نہ تھی۔ وہ کئی بار اکٹھے ہوکر اس بازار میں آچکے تھے اور یہاں کی رونقوں تماشوں اور دوسرے واقعات کو وہ اکثر بڑھا چڑھا کر اس کو سناتے اور اس کا اشتیاق بڑھاتے رہتے تھے۔ گھڑ دوڑ اور گھوڑوں کا ناچ دیکھنا پھر خوبصورت لڑکیوں سے چہلیں کرنا، ان پر طنزیہ فقرے کسنا اور مذاق کرنا..... سب اس کی ایسی خواہش بن چکا تھا جسے وہ ہر حال میں پورا کرنا چاہتا تھا۔

''یار! مجھے بھی کسی روز غلام بازار لے چلو۔ میں بھی وہاں کی رونقیں اور کھیل تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''نہ بابا..... تمہارے والد سے اجازت کون لے گا۔ وہ بڑے سخت ہیں۔'' اس کے ایک چچازاد نے کہا۔

''تم پوچھو تو سہی۔ میں بھی ان سے اجازت مانگ لوں گا۔ شاید وہ آپ کے کہنے اور میرے اصرار پر مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دیں۔''

''اچھا..... تم ضد کرتے ہو تو پوچھ لیتے ہیں مگر ہمیں امید کم ہے۔'' وہی دوبارہ بولا۔

''ان کا بس چلے، تو وہ تمہیں ڈبی میں بند کرکے رکھیں۔ ہم بھی تو تمہاری عمر کے ہیں۔ ہمارے باپ اور بڑے بھائی ہم پر اس قدر پابندیاں نہیں لگاتے۔'' ایک دوسرے نے شوخی سے طنز کیا۔

''ہوں..... پتا نہیں وہ کیوں مجھ پر اتنی کڑی نظر رکھتے ہیں۔''

''ان کا نظریہ ہے کہ تم ہم سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔ زیادہ ذہین ہو اور.....'' وہی بولا۔

''اور..... تم لڑکیوں کی طرح شرماتے بھی تو ہو۔ کیا تھا اگر تم لڑکی ہی بن جاتے۔ کم از کم تمہارے والد کو تمہاری اتنی رکھوالی تو نہ کرنا پڑتی۔''

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک طرف غلغلہ مچ گیا۔ ''میں ادھر دیکھ کے آیا۔'' وہ یہ کہہ کر ادھر بھاگ گیا۔

''شمس الدین! دور نہ چلے جانا گم ہو جاؤ گے۔ ہم ادھر ہی کھڑے ہیں۔'' اس کا تیز طرار سا چچازاد بول اٹھا۔

اتنے میں ایک شخص ان کی طرف بڑھا اور اسی سے بولا۔

''یہ گورا چٹا اور معصوم سا لڑکا کس کے ساتھ ہے؟''

''ہمارے ساتھ ہے کیوں.....؟ وہی آگے بڑھتے ہوئے اس شخص کے مقابل آکر بولا۔ ''البری'' قبیلے سے ہیں۔''

''یہ غلام بچہ بیچو گے.....''

''ہوں۔ بیچیں گے، کیا دام دے دو گے؟''

''پانچ سو دینار۔''

''نہیں..... نہیں، وہ ہمارا بھائی ہے، ہم اسے نہیں بیچیں گے۔'' ان میں سے ایک نے خوفزدہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''بیچ ڈالو..... میں اس سے زیادہ دام نہیں دے سکتا۔ میں کیا کوئی بھی مجھ سے بڑھ کر اس کے دام نہیں لگائے گا۔'' ان کی گفتگو کے دوران ہی شمس الدین واپس ان کے پاس آگیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''کیا تھا ادھر.....؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''ادھر ایک بڑی خوبصورت کنیز کے خریداروں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔''

''ہوں..... تم نے ادھر دیکھا۔ ابھی ادھر بڑے اور طاقتور گھوڑوں کی دوڑ ہوگی اور ناچ بھی ہوگا۔''

''کدھر.....'' شمس الدین نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ادھر.....''

شمس الدین نے دیکھا، ادھر لوگوں کا ہجوم جمع ہو رہا تھا۔

وہ شخص اِدھر اُدھر تو ہوگیا مگر اس کی نظریں مسلسل ان پر رہیں۔ جب شمس الدین ادھر گیا تو وہ پھر ان کے پاس آگیا۔

''کسی اور طرف سے بھی دام لگوا لو۔ میں ادھر ہی کھڑا ہوں۔ اگر دام کم ملے تو میرے پاس آجانا۔ میں منتظر رہوں گا۔'' وہ یہ کہہ کر ایک طرف چلا گیا اور لڑکوں کا یہ ٹولا.... ایک طرف ہوگیا۔

''ہم نے نہیں بیچنا اسے۔ گھر جاکر اس کے والد کو کیا جواب دیں گے؟'' ان میں سے کمزور حوصلے کا مالک لڑکا بولا۔

''ہم مکر جائیں گے کہ شمس الدین ہمارے ساتھ گیا ہی نہیں تھا۔ ایک اتنے بڑے قبیلے میں اس کا کسی کو کیا پتا چلنا ہے۔'' اس نے عقل مندی بگھاری۔

''جانتے ہو اس کا باپ ہمارے قبیلے کا سردار ہے۔ وہ ہمیں جان سے مار دے گا۔'' وہ دوبارہ خوف سے بولا۔

''کچھ نہیں ہوگا.....'' وہی دوبارہ گویا ہوا۔

''اتنے پیسوں کا کیا ہوگا؟'' ایک طرف سے آواز آئی۔

Digitized by Google

''ہم آپس میں تقسیم کرلیں گے اور عیش کریں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''انہیں آپس میں گفتگو کرتے دیکھ کر وہی شخص پھر ان کی طرف بڑھا۔

''تو پھر تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''لاؤ دام چکاؤ.....''

''غلام لڑکا کدھر ہے؟''

''وہ ادھر گھوڑوں کا تماشا دیکھنے گیا ہے۔ ابھی واپس آجائے گا۔''

اس شخص نے دینار نکالے اور گن کر انہیں دینے لگا تو ایک اور لمبا تڑنگا اور بھاری بھرکم جثے والا شخص ان کی طرف آگیا۔ اس نے آتے ہی اس شخص کے دینار پکڑے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''کیا ہو رہا ہے..... میرے اڈے پر تم یہ ناجائز کر رہے ہو، تمہیں اس کا اختیار نہیں ہے۔''

''ملک صاحب! ایک غلام لڑکا خریدا ہے۔ ترکی النسل ہے.....'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''تم میری اجازت کے بغیر یہ کیسے کرو گے۔ لاؤ ادھر پیسے.....'' اس نے زبردستی اس سے دینار چھینتے ہوئے کہا۔

''لیکن ملک صاحب! یہ میرا کیا ہوا سودا ہے.....''

''ابے جا..... بڑا آیا سوداگر۔ کتنے ہیں یہ.....؟'' اس نے پیسے گنتے ہوئے پوچھا۔

''پانچ سو دینار ہیں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''لڑکو..... تم کہاں کے ہو؟'' اب وہ لڑکوں سے مخاطب تھا۔

''البری قبیلے سے ہیں۔'' وہی آگے بڑھ کر جواب دینے لگا۔

''غلام لڑکا کدھر ہے؟''

''وہ جی ادھر گیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔''

''یہ لو چار سو دینار..... اور اگر تمہیں نہیں بھی منظور تو چپ چاپ اسے لے کر اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ وگرنہ میرے ساتھی تمہیں ویسے ہی اٹھا لے جائیں گے۔ خوامخواہ خون خرابا ہوگا۔ بہتر ہے یہ لو اور یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ لڑکا میرے حوالے کر کے جانا، ورنہ گردنیں اڑا دوں گا۔''

''جی..... جی.....'' وہ پہلی بار اس کی باتوں سے خوفزدہ ہوا تھا۔

''اور تم بڑے سوداگر بنے پھرتے ہو۔ دوبارہ یہاں کھڑے ہو کر کوئی سودا کرنے سے پہلے میرا حصہ طے کرلینا۔ یہ لو ایک سو دینار۔ لڑکا میرے حوالے کر کے دائیں بائیں ہو جانا۔ سنا تم نے.....''

''جی ملک صاحب.....'' وہ بولا۔

وہ سارے ادھر ہی سہمے کھڑے تھے، جب شمس الدین ان کے قریب آگیا۔

''کدھر گئے تھے تم.....؟'' ان میں سے ایک بولا۔

''بتا کر تو گیا تھا۔'' شمس الدین آہستگی سے بولا۔

ملک نے نظروں ہی نظروں میں اس کو دیکھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ سودا مہنگا نہیں ہے تو وہ مطمئن ہوگیا۔ دونوں سوداگروں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

''دیکھو شمس الدین! اب تم یہاں رکو۔ اب ادھر جانے کی ہماری باری ہے۔ جب تک ہم واپس نہیں آجاتے تم کہیں نہیں جانا۔''

وہ سب یہ کہہ کر ادھر بھاگ گئے اور شمس الدین ان کے پاس اکیلا رہ گیا۔

''لڑکے..... پیارے دوست! تمہارے والدین ہیں؟''

''ہاں.....'' شمس الدین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا نام ہے تمہارے والد کا؟''

''ایلم خاں۔'' شمس الدین نے مختصر سا جواب دیا۔

''کس قبیلے سے ہو؟'' ملک نے دوبارہ پوچھا۔

''ہمارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ میرے والد کے بھائی، میرے سوتیلے بھائی، میرے دادا کے بھائی اور ان کی اولاد بے شمار قرابت دار اور رشتے دار، اتنے لوگ ہیں کہ ان کا شمار ممکن ہی نہیں۔''

''یہ تمہارے ساتھ کون لوگ تھے..... لگتا ہے اس غلام بازار میں پہلی بار آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔ یہ میرے چچا زاد بھائی، ان کے دوست، میرے سوتیلے بھائی بھی تھے۔ میرے والد بتاتے ہیں کہ یہاں رہنے والے سارے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ایک دوسرے سے سرداری چھین لینا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ ایک دوسرے سے جھگڑتے اور الجھتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر وہ مجھے ان کے ساتھ بھیجنے پر بھی راضی نہ تھے اور..... گھوڑوں کے تماشے اور اس بازار کی رونقوں کے بارے میں یہی مجھے بتاتے تھے۔ ان کی باتیں سن سن کر مجھے بھی یہ بازار اور ادھر کی رونقیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے کئی بار ابا سے یہ سب دیکھنے کی ضد کی مگر وہ ہر بار مجھے ٹال دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ

Digitized by Google

مجھے ادھر آنے سے روک دیتے تھے۔ اس بار بھی میں نے بڑی ضد کر کے انہیں منوایا ہے۔ یہاں آنا میرے بچپن کا شوق تھا نا..... جو بڑی مشکلوں سے آج پورا ہوا مگر آتے ہوئے انہوں نے نصیحت کی کہ کبھی ان سے الگ نہ ہونا۔ دشمن کا کیا اعتبار.....''

اس کے بچپن کہنے پر ملک مسکرانے لگا اور اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر بولا۔

''ابھی تم کونسا بڑے ہو گئے ہو۔ تمہارا بھولا پن اور معصومیت اب بھی تمہارے بچپن کی چغلی کھا رہا ہے۔ کیا تم اپنے قبیلے میں واپس جا سکتے ہو.....؟'' ملک نے پیار سے پوچھا۔

''نہیں..... میں نہیں جانتا یہ لوگ مجھے کون کون سے راستوں سے لے کر یہاں آئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے شمس الدین نے ملک کا ہاتھ اپنے چہرے سے پرے ہٹاتے ہوئے پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔ پھر کچھ توقف سے پوچھا۔

''وہ لوگ کب آئیں گے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ ساتھ اب پریشانی بھی شامل ہو چکی تھی۔

اس کا سوال سن کر ملک نے الجھا ہوا جواب دیا۔

''نہیں بتا کر گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں یا شاید کبھی نہ آئیں۔''

اس کی دوسری بات نے شمس الدین کو اور پریشان کر دیا۔

چڑھے دن کا سورج آہستہ آہستہ اپنی شکست قبول کر چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ شمس الدین اپنے ساتھیوں کے نہ آنے پر اور بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ملک جو اس کے قریب کھڑا تھا اور جس نے اس کے کندھے پر اپنا دباؤ اس طرح ڈال رکھا تھا جیسے وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ کچھ دیر کے بعد ملک دوسرے قریب کھڑے شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''او..... بیوپاری..... تم ذرا اس بچے کا دھیان کرنا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور دن ڈھلنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کوئی اور غلام خرید لوں..... دیکھو ہیرا پھیری نہیں کرنا اور نہ ہی ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرنا۔ اس بازار کے جتنے بھی بیوپاری ہیں، وہ سب میرے نام سے واقف اور میری آنکھیں ہیں۔ اگر ایسی حرکت کی تو تمہارے حق میں یہ بہت برا ہوگا۔'' پھر اس نے اپنی آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ ''جب اس کے ساتھی آ جائیں تو اسے ان کے حوالے کر دینا۔ پہلی بار اس جگہ آیا ہے۔ دیکھنا ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ گم ہو گیا تو اس کے ساتھیوں کو تم ہی جواب دو گے۔'' یہ کہہ کر ملک ایک طرف چلا گیا۔ بیوپاری نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''جی ملک صاحب۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ اس کا دھیان رکھنا اب میری ذمے داری ہے۔''

اس کے جاتے ہی اور اپنے ساتھیوں کے نہ لوٹنے پر شمس الدین نے تشویش زدہ لہجے میں اس بیوپاری سے پوچھا۔ ''وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے.....؟''

''میرے بھولے بچے اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔'' بیوپاری نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''مگر کیوں نہیں آئیں گے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا تو بیوپاری نے ہنس کر کہا۔

''اس لیے کہ وہ تمہیں میرے ہاتھ بیچ گئے ہیں۔''

''کیا.....؟'' اس کی تو جیسے چیخ ہی نکل گئی۔

''ہاں وہ تمہاری قیمت اور تمہارا مول لے کر چلے گئے ہیں۔'' بیوپاری پھر سے بولا۔

''مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔'' شمس الدین سسکنے لگا پھر اس کا سسکنا بہت جلد رونے میں بدل گیا اور وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔

اندھیرے نے غلام بازار پر پوری طرح قبضہ جما لیا تھا اور اس کی رونقیں بھی دم توڑنے لگی تھیں۔ شمس الدین کا رونا فضول جانے لگا تھا۔ اب اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا مگر سسکیاں جاری تھیں۔ جب وہ شخص جسے بیوپاری ملک کہہ کر پکار رہا تھا، واپس آ گیا۔ شمس الدین کی ہچکیاں کم نہیں ہوئی تھیں۔ ملک نے آتے ہی ایک بار پھر اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسہ دینے کی کوشش کی اور بولا۔

''ایلم خان کے بیٹے..... اتنے بہادر اور جری شخص کے بیٹے ہو کر بزدلوں کی طرح رو رہے ہو۔''

''آپ میرے والد کو جانتے ہیں؟'' شمس الدین نے روتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں! اسے کون نہیں جانتا.....'' ملک نے شاید اسے چپ کرانے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا تھا۔

''پھر آپ مجھے ان کے پاس لے چلیں۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا اور اپنے ابا سے کہہ کر انعام بھی دلواؤں گا۔ ایک بڑی رقم لے دوں گا۔'' شمس الدین نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

''کیوں نہیں بچے..... میں تمہیں ان کے پاس ضرور لے جاؤں گا مگر ابھی مجھے جلدی ہے۔'' ملک نے سادگی سے جواب دیا۔

''یہ آپ کے ساتھ دو اور لڑکے ہیں کیا یہ بھی.....'' شمس الدین نے پوچھا۔

Digitized by Google

"ہاں یہ بھی تمہاری طرح اپنوں سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ بازار میں پھر رہے تھے۔ میں انہیں بھی ساتھ لے آیا ہوں۔"

"آج تو ہم سب کو بخارا جانا ہے۔ وہاں ان کو ان کے والدین سے ملوا کر واپسی پر تمہیں بھی تمہارے والد سے ملوا دوں گا۔ اب خاموش ہو کر میرے ساتھ چلو..... یہ رونا دھونا بند کرو۔ لو اب چپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں پٹائی کر دوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ بیوپاری سے مخاطب ہوا۔

"دیکھو بیوپاری آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ کرنا۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے تمہیں چھوڑ دیا اور تمہاری جان بخش دی۔ تم جس جگہ کھڑے ہو کر غلاموں کا بھاؤ تاؤ کر رہے ہو، یہ ملک محمود کا اڈا ہے۔ یہاں خرید و فروخت کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے میرا حصہ طے کر لینا چاہیے تھا۔ میں نے تو رعایت کر لی۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو تمہاری گردن مار دی جاتی۔ اب جاؤ اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں نے اس سودے کے عوض تمہاری جان بخش دی۔" اتنا کہہ کر اس نے شمس الدین کے کندھے پر تھپکی دی اور تینوں لڑکوں کو لے کر ایک طرف چل دیا۔ شمس الدین ذہنی طور پر اگرچہ پریشان ہو چکا تھا اور رونا دھونا چھوڑ چکا تھا مگر ابھی تک اس کا ذہن یہ گتھی سلجھانے میں ناکام رہا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیوں کیا۔ اس کے جواب میں اسے اپنے والد کی سمجھائی ہوئی باتیں تازہ ہونے لگی تھیں۔ جس نے ایک بار باتوں باتوں میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"شمس الدین! ایک بات میری غور سے سنو۔ میرے قبیلے کے یہ لوگ مجھے اپنا سردار ضرور مانتے ہیں، مگر دل سے انہوں نے مجھے کبھی اپنا سردار نہیں مانا۔ انہیں اور تمہارے سوتیلے بھائیوں کو اس بات کا بھی پتا ہے کہ تم قدرتی طور پر ان سب سے زیادہ ذہین ہو۔ عقل اور سوجھ بوجھ میں بھی ان سے آگے ہو۔ ان میں سے کوئی بھی تمہارے مقابلے اور جوڑ کا نہیں ہے۔ ایسے میں لازمی امر ہے کہ میرے بعد سرداری تمہارے حصے میں آئے گی۔ اس لیے یہ تم سے بغض اور دشمنی رکھتے ہیں۔ میں ان کی فطرت سے واقف ہوں۔ اس لیے میں تمہیں ان کے سائے سے بھی دور رکھتا ہوں۔ کہیں یہ تمہیں نقصان نہ پہنچائیں مگر میری بہادری اور دلیری سے خوفزدہ ہیں۔ اس لیے میرے سامنے یہ تم سے دبے دبے اور دور رہتے ہیں۔"

اب اسے افسوس ہونے لگا تھا کہ اپنے والد کی سمجھائی ہوئی باتوں کو اس نے معمولی جانا اور انہیں اہمیت دینے کے بجائے ہر مقام پر محض اپنی ضد کو منوایا۔

اسے پھر شدت سے یہ خیال آنے لگا تھا کہ وہ لوگ کس قدر دیدہ دلیری سے اسے غلام بازار میں ان بیوپاریوں کے ہاتھ بیچ گئے ہیں۔ اب اس کے ذہن میں وہ ساری باتیں دوبارہ سے گونجنے لگی تھیں۔ اسے اپنے آپ پر بے انتہا غصہ آنے لگا تھا کہ کیسے وہ ضد کر کے یہ بازار دیکھنے ان کے ساتھ آیا تھا اور کیسے کیسے سبز باغ دکھا کر ان لوگوں نے اس کے شوق کو بھڑکایا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا، اب تو اس کی ہچکیاں بھی بند ہو چکی تھیں۔

تو کیا غلاموں کے اس بازار میں وہ بھی ایک غلام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا؟ اب وہ غلام بن کر اس شخص کی ملکیت میں آ چکا تھا۔ اب رونے یا واویلا کرنے کا کیا فائدہ..... بے سود ہو چکا تھا یہ سب..... اس لیے وہ اس کے قریب ہی خاموش اور چپ چاپ کھڑا اس کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ ملک محمود نے شمس الدین کا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ شاید اسے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ بھاگ نہ جائے جبکہ دوسرے دونوں لڑکے جو قدوقامت کے ساتھ ساتھ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے، خاموش کھڑے اسی کی طرف وحیران سے دیکھ رہے تھے اور ملک محمود نے انہیں تمام پابندیوں سے آزاد رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ملک محمود شمس الدین کو یونہی بازو سے پکڑے ہوئے بازار کی ایک طرف چلنے لگا۔ وہ تینوں اس کے ساتھ چلنے لگے تھے۔ پھر چلتے چلتے وہ ایک میدان میں پہنچے۔ جہاں ایک درخت کے ساتھ ملک محمود کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ملک محمود نے انہیں کھولا۔ ایک گھوڑے پر شمس الدین کو آگے سوار کر کے خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ جبکہ دوسرے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کے پیچھے باندھی اور اس پر دونوں لڑکوں کو سوار کر کے گھوڑوں کو ایک نامعلوم منزل کی طرف ہانک لیا۔

☆☆☆

وہ سارے انتہائی خوشی کے عالم میں غلام بازار سے واپس آتے ہوئے راستے میں بے حد طمانیت سے قہقہے لگاتے اور باتیں کرتے ہوئے اپنے قبیلے کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہنستے ہوئے بولا۔

"ہو ہو..... سردار بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا ابھی سے....."

"کیوں نہ دیکھتا..... اس کا باپ بھی تو قبیلے کا سردار ہے۔"

"تو کیا وہ ہمارا باپ نہیں ہے....." اس کے ایک سوتیلے بھائی نے جواب دیا۔ "ہم بھی اس کی وراثت کے حصہ دار ہیں۔ ہم میں سے کسی اور کو بھی وہ اپنا جانشین چن

Digitized by Google

سکتا تھا۔"

"مگر شمس الدین تو اس کی آنکھ کا تارا ہے۔ اس کی خواہش کی سوئی صرف اسی کے نام پر اٹکی ہوئی ہے۔" دوسرا بولا۔

"میری یہ سمجھ میں یہ نہیں آتا۔ جو شخص غلام بازار تک نہیں آ سکتا، وہ جنگی مہموں پر کس طرح جا پائے گا۔ سرداری آسان کام تھوڑی ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔" ایک اور نے لقمہ دیا۔

"پہلے کمائے ہوئے ان پیسوں کو تو آپس میں بانٹ لیں۔"

"ہاں..... یہ ضروری ہے۔" ایک آواز آئی۔

"یہ تو ہوتا رہے گا۔ یہ بھی سوچا ہے کہ قبیلے میں جا کر سردار کو کیا جواب دینا ہے۔"

ان کی خوشیوں پر یہ سوچتے ہی اوس پڑ گئی۔

میں تو رو کر سردار بابا کو بتا دوں گا کہ غلام بازار کی بھیڑ اور میلے میں شمس الدین ہم سے بچھڑ گیا۔ ہم نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہمیں آنے میں دیر ہو گئی۔" شمس الدین کے سوتیلے بیٹے نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا وہ تمہاری اس بات پر یقین کر لے گا؟ وہ بہت کائیاں اور ہوشیار آدمی ہے۔" دوسرا بولا۔

"ہاں یار۔ یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے شمس الدین کو ہمارے ساتھ نہ دیکھا تو ہمیں وہ کبھی نہ چھوڑے گا۔"

اب انہیں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ شمس الدین کو غلام بازار میں بیچ کر۔

"میں تو کہہ دوں گا کہ کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

"اس کی باتوں سے مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے، اس پر ذرا سی سختی کی گئی تو یہ ہم سب کو پھنسوا دے گا۔" شرف الدین جوان سب سے عمر میں بڑا اور سمجھدار تھا، بولا۔

"تو پھر تم ہی کچھ کرو....." ایک اور نے خفگی سے کہا۔

"دیکھو یہ شمس الدین کے بھائی ہیں اگرچہ سوتیلے ہیں، آپ سب میں سے صرف اکیلا میں ہی ہوں۔ جو ایلم خاں کے دور پار کے رشتے داروں میں سے ہوں اور میرے والد عالم الدین پہلے ہی ایلم خاں کے دشمنوں میں سے ہیں۔ میں تو یونہی آپ کے ساتھ غلام بازار تک چلا گیا تھا۔ جب ایلم خاں سردار کو میرے ان کے ساتھ جانے کی خبر ہوئی ہو گی تو اس کا ماتھا ضرور ٹھنکا ہو گا۔ اس نے شمس الدین کے واپس نہ آنے پر مجھے ہی اس کا ذمے دار بنا دینا ہے۔" شرف الدین نے اپنی بات ختم کی تو ان میں سے ایک اور بولا۔

"شمس الدین کو بیچ کر جو رقم ملی ہے وہ تو سب میں برابر کی تقسیم ہوئی ہے۔ پھر بد دعا ایک پر کیسے اور کیونکر ڈالا جا سکتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو..... وہ قبیلے کا سردار ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے کسی کو چھوڑ بھی سکتا ہے اور کسی کی گردن بھی مار سکتا ہے اگر وہ طاقت اور دھونس زبردستی نہ کرتا تو اس وقت قبیلے کا سردار میرے والد..... ہوتے۔ میں تو جاتے ہی اپنے والد کو سب کچھ بتا دوں گا..... پھر جو ان کا ارادہ ہو۔ ایک معمولی سی غلطی کا خمیازہ قتل و غارت کی صورت میں سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور کم از کم نہ میں اور نہ ہی میرے والد برداشت کر سکیں گے۔" شرف الدین نے تفصیل سے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

رات کا پتا نہیں کونسا پہر تھا۔ جب وہ سارے اپنے قبیلے میں پہنچے تھے۔ شرف الدین تیزی سے اپنے خیمے میں چلا گیا اور دوسرے بھی اپنے اپنے خیموں میں پہنچ گئے۔

ایلم خاں پریشانی کے عالم میں اپنے خیمے کے باہر ٹہل رہا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر اس نے اپنے ایک بیٹے سے پوچھا۔

"شمس الدین بھی تمہارے ساتھ گیا تھا؟"

"جی..... جی....." اس نے سرتاپا لرزتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کہاں ہے....." دوسرا سوال کیا گیا۔

"وہ میلے میں ہم سے بچھڑ گیا تھا۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا مگر وہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اسی کے سبب ہمیں بھی آنے میں دیر ہو گئی۔" اس نے ڈرے سہمے لہجے میں بتایا۔

"پھر تم واپس کیوں آئے ہو۔ کون کون گیا تھا۔ غلام بازار میں....." ایلم خاں دہاڑا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سب کے نام گنوا دیے۔

"تمہیں پتا ہے غلام بازار میں جا کر واپس نہ آنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔"

"جی..... جی نہیں....."

"یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ چلو میرے ساتھ، وہ کہیں تم لوگوں کے انتظار میں نہ ہو۔" اتنا کہہ کر ایلم خاں نے گھوڑا کھولا اور اسے ساتھ لے کر ایک بار پھر غلام بازار کو چلا گیا۔

اس کے غلام بازار جانے کی اطلاع جنگل کی آگ بن کر پورے قبیلے میں پھیل گئی۔

شرف الدین نے آتے ہی ساری کارروائی اپنے

والد کو بتا دی تھی۔ جس نے اسے بہت برا بھلا کہا اور دونوں سر جوڑ کر اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

"شرف الدین تو نے بہت برا کیا..... تمہیں نہیں پتا۔ ایلم خاں کس قدر طاقتور اور بغض رکھنے والا انسان ہے۔ وہ تو پہلے ہی ہم سے خار کھائے رہتا ہے۔ مقابلہ ہم اس سے اس لیے نہیں کر سکتے کہ قبیلے کے بہت سے لوگ اس کے حمایتی ہیں اور ہمارے ساتھیوں کی تعداد اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے آنے سے پہلے ہم یہاں سے کہیں اور کوچ کر جائیں۔" شرف الدین کے والد نے اپنا خوف ظاہر کرتے ہوئے ساتھ ہی کہا۔ "جلدی کرو۔ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر بہت برا کر ڈالا۔ جلدی سے ہمیں ادھر سے نکل جانا ہوگا۔"

پھر انہوں نے جلدی سے اپنا سامان سمیٹا اور جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

اس بات کا علم شرف الدین کی والدہ کو بھی ہو گیا تھا۔ جس نے نہ صرف اسے خوب برا بھلا کہا بلکہ رونا بھی شروع کر دیا۔

ایلم خاں جب اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ غلام بازار پہنچا تو اس وقت پورا بازار سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بازار کی رونقیں اجڑ چکی تھیں۔ وہ دیوانہ وار گھوڑے کو ادھر ادھر دوڑاتا رہا مگر اسے کوئی کامیابی نہ ملی تو غصے سے اس کا برا حشر ہو گیا۔ "یہ سب تمہارے ساتھ گئے میرے دشمن عالم الدین اور اس کے بیٹے کا کیا دھرا ہے۔ وہ پہلے ہی میرے اور میری اولاد کے دشمن ہیں یقیناً اسی نے شمس الدین کو کسی غلاموں کے تاجر کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ تباہ کر دوں گا اس کا سارا خاندان..... اور تم..... تم بھی یقیناً اس منصوبے میں برابر کے شریک ہو گے۔"

اتنا کہہ کر ایلم خاں نے گھوڑے کو واپس موڑ کر ایڑ لگا دی۔

سنسان اور ویران راستے میں فاصلوں سے جنگلی جانوروں کی دل دہلا دینے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر نہ جانے کیوں ایک جگہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ گھوڑا شدید کرب سے بڑے زور سے ہنہنایا اور رک گیا۔ ایلم خاں غصے کے عالم میں گھوڑے سے اترا اور اپنے گھوڑے کی گردن سے پکڑ کر نیچے کھینچ کر بڑے درشت لہجے میں بولا۔

"تم لوگوں نے میرے جگر کے ٹکڑے کو مجھ سے جدا کیا ہے۔ نہیں چھوڑوں گا تم سب کو..... ایک ایک کو چن چن کر ماروں گا مگر پھر بھی میرے پیار اور میری محبت کی پیاس ختم نہ ہو پائے گی۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنی کمر سے لگی تلوار کھینچی۔

"بابا جان معاف کر دیں اسے ہم سب نے مل کر ایک منصوبے کے تحت غلاموں کے بیوپاری کے ہاتھوں بیچ دیا اور رقم آپس میں بانٹ لی تھی۔ یہ میرے جیسے کی قسم ہے....." اس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالی اور بند مٹھی کو ایلم خاں کے سامنے کھول دیا۔

"حرام خورو..... تم....." ایلم خاں غصے سے بولا۔

اس سے پہلے کہ لڑکے کی اگلی آواز نکلتی۔ اس کا سر اس کے دھڑ سے جدا ہو کر دور جا گرا تھا۔

ایسا کرتے ہی اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔

رات کا جانے وہ کونسا پہر تھا جب وہ قبیلے میں پہنچا تو اسے پتا چلا کہ عالم الدین اپنے پورے کنبے کو لے کر قبیلہ چھوڑ کر نہ جانے کدھر روانہ ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے چند جانثار ساتھیوں کو ساتھ لیا اور ان کے پیچھے گھوڑے دوڑا دیے۔ راستے کی اڑتی ہوئی دھول اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ یہاں سے کچھ دیر پہلے بہت سے لوگ گزرے ہیں۔

ایلم خاں اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں کی رفتار کم نہ کی۔

وہ اپنے قبیلے سے خاصے دور نکل آئے تھے کہ اس کے ایک ساتھی نے اپنا گھوڑا اس کے گھوڑے کے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔ "سردار لگتا ہے وہ کسی دوسری طرف نکل گئے ہیں۔"

"وہ جہاں بھی ہوں گے ایلم خاں کے انتقام سے نہیں بچ پائیں گے۔ میں انہیں زمین کی پاتال سے بھی نکال لاؤں گا۔"

چلتے ہوئے قافلے اور سنسان راستے میں عالم الدین کی نیند سے بوجھل آواز ابھری۔

"لگتا ہے، ایلم خاں ابھی غلام بازار سے واپس نہیں پلٹا ہوگا۔ ورنہ وہ اب تک ہم تک پہنچ چکا ہوتا۔"

"بس کرو ابا۔ آپ نے تو ہمیں ڈرا ڈرا کر ادھ موا کر ڈالا ہے۔ کہہ جو دیا غلطی ہو گئی۔ اب آئندہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ انہیں اپنے پیچھے بہت سے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر جلد ہی وہ سب ان کے سر پر پہنچ گئے۔

ایلم خاں انہیں دیکھتے ہی پرجوش آواز میں دہاڑا۔

"عالم الدین! کی گودیوں اجاڑ کر بزدلوں کی طرح بھاگنا صرف تم جیسوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ تمہیں کیا لگا تھا کہ تمہارا یہ حرامزادہ بیٹا میرے لختِ جگر کو غلام بازار میں بیچ کر زندگی کے مزے یونہی لوٹتا رہے گا۔ نہیں عالم الدین نہیں..... میں قبیلے کا سردار ہوں۔ کوئی عام آدمی نہیں۔ جو یوں خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ میرے سامنے لاؤ اپنے بزدل بیٹے کو..... اسے کہو میرا شمس الدین مجھے واپس لادے۔ ورنہ اپنے انجام کے لیے تیار ہو جائے۔"

اس سے پہلے کہ عالم الدین کوئی آگے سے جواب دیتا، وہ تمام ان پر پل پڑے اور لمحہ بھر میں اس ویرانے کی خاموشی بے دریغ بہنے والے خون سے نہا گئی۔ ایلم خاں نے ان سب کو تہ تیغ کر ڈالا تھا۔

"کیا تمہارے اس انتقام سے شمس الدین تمہیں دوبارہ مل جائے گا؟" اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"زندگی ہوئی..... تو کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔ ورنہ وہ اس قدر باہمت اور ذہین ہے کہ اپنی راہیں آئندہ کے لیے خود ہی استوار کر لے گا۔" ایلم خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

☆☆☆

بخارا غلام بازار سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ رات کے درمیانی پہر بخارا میں داخل ہوئے تو شمس الدین کی آنکھیں تھکاوٹ اور نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ شہر کی مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک مکان کے قریب آ کر رکے۔ ملک محمود نے شمس الدین کو ہلکی سی تھپکی سے ہوشیار کیا تو شمس الدین نے غنودگی میں اپنی آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہم اپنے قبیلے میں پہنچ چکے ہیں؟"

"لگتا ہے سفر میں تم سوتے رہے ہو۔ یہ ایلم خاں کا گھر نہیں ہے۔ تم ملک محمود کے ساتھ بخارا میں ہو۔ اب نیچے اتر آؤ۔" شمس الدین نے ارد گرد ملک محمود نے سامنے مکان کے دروازے پر دستک دی تو کسی نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو.....؟"

"ملک محمود ہوں۔ مہمان خانے کا دروازہ کھلواؤ اور اپنے بابا کو خبر کرو۔"

آنے والا دوبارہ پلٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد اس نے مہمان خانے کا دروازہ کھول دیا۔ ملک نے دونوں گھوڑوں کی لگامیں اس کے حوالے کیں۔ وہ چاروں مہمان خانے میں آ گئے۔ ابھی وہ بہ مشکل..... بیٹھے ہوں گے کہ کچھ لمحوں بعد ایک نفیس شخصیت کا حامل بڑھاپے کی طرف مائل شخص اندر داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ چند ثانیے وہ چپ رہا تو ملک محمود بالآخر بولا۔

"میں یہ تین غلام لے کر آیا ہوں۔ انہیں آپ یا آپ کے کسی قریبی دوست عزیز نے خریدنا ہو تو یہ حاضر ہیں۔ وگرنہ آپ کو تو علم ہے میں انہیں کہیں اور ہندوستان کے کسی بھی تاجر کے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

"مجھے پتا ہے تمہارے لیے یہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہاں میرے ایک جاننے والے ہیں۔ انہیں غلام کی ضرورت تو ہے مگر ان کی ایک شرط بھی ہے کہ وہ ترکی غلام خریدنا زیادہ پسند کریں گے اور جسے وہ مہنگے داموں بھی خرید لیں گے۔ تمہارے ان غلاموں میں کوئی ترکی غلام ہے تو میں صبح اسے بلوا لوں گا۔ تمہارے سامنے ہی بات ہو جائے گی۔ مول تول خود ہی کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے پاس ایک ترکی النسل غلام موجود ہے مگر ابھی کم عمر ہے۔" ملک محمود نے جواب دیا۔

"بات پسند کی ہے صبح میں اسے بلواؤں گا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔" بوڑھے نے کہا۔

دوسری صبح اس نے پیغام بھجوا کر اس کے رشتے دار کو بلوا لیا۔ وہ بھی اسی کی طرح ضعیفی کی عمر میں قدم رکھ رہا تھا۔

"میں نے ذکر کیا تھا کہ ایک غلاموں کا تاجر میرا واقف ہے۔ یہ وہی ملک محمود ہے۔ یہ تین غلام لڑکے لے کر آیا ہے۔ تم دیکھ لو۔ ان میں ایک ترکی النسل بھی ہے۔"

اتنی دیر میں تینوں غلام لڑکے بھی اٹھ بیٹھے تھے۔

"مجھے ترکی النسل غلام چاہیے۔" اس عزیز نے کہا۔

"یہ شمس الدین ترکی النسل ہے۔" ملک نے اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "[illegible] ہزار درہم میں دے دوں گا۔" ملک نے بتایا۔

"مجھے ایک ہی خریدنا ہے اور آگے نہیں بیچنا۔ اپنے پاس رکھنا ہے۔ یہ مجھے اچھے گھر کا لگتا ہے، ٹھیک رہے گا۔" وہ بولا۔ پھر کہنے لگا۔

"میں اسے تعلیم و تربیت بھی دلاؤں گا، میری خواہش ہے کہ یہ معاشرے میں بہتر مقام حاصل کر لے۔ اس کے دام بتاؤ۔"

"دیکھیے ٹھیک ہے آپ میرے لیے بھی اتنے [illegible] ہیں، جتنے یہ....." ملک محمود نے کاروباری انداز میں اسے

جواب دیا۔ ''آپ مجھے اس کے تین ہزار دے دیں۔''

''اور باقی دونوں ایک ایک ہزار کے..... یہ اچھی ہمدردی کی تو نے.....'' وہ عزیز حیرت سے بولا پھر کچھ توقف سے گویا ہوا۔ ''نہیں بھائی میں اتنا نہ دے پاؤں گا۔''

''دوسرے خرید لیں یا ان میں سے کوئی ایک لے لیں۔ آپ کی توقع کے مطابق انہیں فروخت کردوں گا۔'' ملک محمود نے سوداگروں والی گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

''اسی کے ٹھیک سے دام لگا لو۔ اس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ بھی میں اٹھاتا ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اس مول تول کے درمیان وہ خاموش رہا۔ کچھ ردوکد کے بعد عزیز صدر جہاں نے شمس الدین کو خرید لیا اور اسے لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ شمس الدین کو اب پتا چل چکا تھا کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے انسانوں کی اس منڈی میں بکنے لگا ہے۔ اس لیے اس نے بھی خود کو قدرت کی رضا پر چھوڑ دیا اور چپ چاپ خاموشی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ ایک معزز اور شریف خاندان تھا۔ اس طرح اپنے خاندان سے جدا ہوکر شمس الدین اپنی زندگی کے کئی سالوں تک اس خاندان کے رحم و کرم پر رہا۔ انہوں نے شمس الدین کے ساتھ اپنی اولاد سے بڑھ کر سلوک کیا۔ شمس الدین کے بچپن کا ایک حصہ اسی بزرگ اور پاکیزہ خاندان میں گزرا۔ انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پھر افتادِ زمانہ کے ہاتھوں انہوں نے اسے حاجی بخاری نامی ایک تاجر کے ہاتھوں قیمتِ خرید سے زیادہ رقم پر فروخت کردیا۔ اس وقت تک شمس الدین جوانی کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ حاجی بخاری نے بعد ازاں اسے ایک اور تاجر جلال الدین چست قبا کے ہاتھ بیچ دیا۔

جلال الدین چست قبا کے پاس شمس الدین کچھ عرصہ رہا۔ پھر وہ اسے لے کر غزنی کے غلام بازار میں آگیا۔ اس زمانے میں زمیندوار، تعدار اور غزنی ہندوستان سے حق تھے۔ کابل، غزنی اور بست ہندوستان اور مشرقی اسلامی ممالک کے درمیان تجارتی سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں۔ جلال الدین چست قبا انتہائی شاطر اور موقع پرست انسان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غلاموں کے کاروبار میں کس طرح اور کس وقت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

جب جلال الدین چست قبا شمس الدین کو غزنی کے بازارِ غلاماں میں لایا تو شمس الدین کی دلربا خصوصیات اور ذہانت نے پورے بازار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ آتے جاتے غلاموں کے تاجر اسے دیکھتے ہی اس کے قریب آجاتے اور اس سے مختلف سوالات کرتے۔ جن میں اکثر کے جوابات جلال الدین چست قبا بڑھا چڑھا کر اور طمع کاری سے دیتا تو وہ اس غلام کے ظاہری حسن اور اس کی ذہانت کے قائل ہوجاتے۔ وہ اس کا مول تول کرتے مگر جلال الدین چست قبا ان سب کو اس لیے ٹرخا دیتا کہ وہ چاہتا تھا اس غلام کے دام زیادہ سے زیادہ کھرے کرسکے۔ بات پھیلی تو اس وقت کے سلطان معزالدین تک پہنچ گئی۔ سلطان معزالدین کو بھی اشتیاق ہوا کہ وہ اس غلام کو خرید کر اپنے محل کے غلاموں میں شامل کرلے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک رفیقِ خاص اخش ملک کو ترک غلام خریدنے بازار میں بھیجا۔

بازار میں اس وقت خریداروں کا ایک ہجوم شمس الدین کے گرد اکٹھا جمع تھا۔ ان میں سے کچھ خریداروں کی خواہش تھی کہ اس کا بھاؤ ہوجائے تو وہ اسے خرید لیں لیکن زیادہ تر تاجروں کی خواہش تھی کہ وہ دیکھیں کہ اس غلام کی کیا قیمت لگتی ہے۔ ایسے میں سلطان معزالدین نے اخش ملک کو بازارِ غلاماں میں بھیجا کہ وہ ترک غلام کو خرید کر لائے۔ جس کی شہرت بازار سے نکل کر اس تک جا پہنچی ہے۔ اخش ملک بازار غلاماں میں ڈھونڈتا ہوا جلال الدین چست قبا کے پاس پہنچا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''مجھے سلطان معزالدین نے خصوصی طور پر بھیجا ہے، سنا ہے تمہارے پاس کوئی ترک غلام فروخت کے لیے موجود ہے۔''

''جی..... بالکل آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ یہ ہے وہ ترک غلام شمس الدین جس کی آپ نے شہرت سنی ہے۔''

''کتنے دام لوگے.....'' اخش ملک نے پوچھا۔

''اگر آپ کو سلطان معزالدین نے بھیجا ہے تو انہوں نے یہ بھی بتایا ہوگا، ترک غلاموں کے کتنے دام لگائے جاتے ہیں۔'' جلال الدین چست قبا نے جواب دیا۔

''میں اس کے آٹھ سو درہم خالص سونے کی اشرفیاں دیتا ہوں۔'' اخش ملک نے بتایا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو سلطان نے نہیں بھیجا جو آپ ایک ترک غلام کی اتنی کم قیمت لگا رہے ہو۔ یہ غلام نہ صرف خوبصورت و حسین ہے بلکہ ذہانت و فطانت میں بھی دوسروں سے بہت آگے ہے۔ اتنے داموں میں تو میں غیر ترک غلام بھی نہیں بیچتا۔ یہ تو اصل ترک النسل ہے۔'' جلال الدین چست قبا نے اس کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں کہیں اور کو دیکھ لیتا ہوں۔'' اخش ملک جانے لگا تو پیچھے سے جلال الدین چست قبا نے آواز لگائی۔

''دوبارہ آؤ گے تو ذرا جیب کو بھر کر لانا۔''

Digitized by Google

اخش ملک کے جاتے ہی جلال الدین کو شمس الدین کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو اس نے شمس الدین کے ساتھ ایک اور غلام طمغاج کو بھی کھڑا کر دیا۔ اخش ملک بازار کا چکر لگا کر واپس اس کے پاس جلال الدین کی سوچ کے مطابق آ گیا۔ جلال الدین چست قبا نے اسے آتے دیکھا تو دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اخش ملک اس کے نزدیک آ کر رکا اور بولا۔

''ہاں تو کیا سوچا ہے تم نے.....؟''

''میں نے یہ دو غلام شمس الدین اور غیر ترک طمغاج اکٹھے بیچے ہیں۔ دونوں کے دام چکاؤ اور لے جاؤ۔'' چست قبا بولا۔

''ابھی تو میں نے اپنے سلطان کی خواہش کے مطابق ایک ہی ترک غلام خریدنا ہے۔'' اخش ملک بولا۔

''میں نے دونوں ایک ساتھ بیچنے ہیں۔ تم ان دونوں کی قیمت لگاؤ۔ ورنہ بازار میں اور بھی بہت سے خریدار ہیں۔'' چست قبا نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''دونوں کے ایک ہزار سونے کی اشرفیاں لگاتا ہوں۔ حالانکہ چاہیے مجھے ایک ہی۔'' اخش ملک بولا۔

''جاؤ میرے دوست! تمہیں ترک غلام کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔'' چست قبا نے درشتگی سے کہا۔ اخش ملک واپس چلا گیا تو معز الدین نے اسے خالی ہاتھ آتے دیکھ کر پوچھا۔

''کیا ہوا..... اخش ملک! خالی ہاتھ کیوں آ رہے ہو' غلام کدھر ہے؟''

اخش ملک نے بتایا۔ ''حضور عالی مقام..... میں نے اس غلام کے آٹھ سو درہم لگائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ میں گھوم پھر کر واپس اس کے پاس آیا تو اس نے کمال چالاکی سے اس کے ساتھ ایک اور غلام کو کھڑا کر دیا اور مجھ سے بولا کہ اس نے غلاموں کے اس جوڑے کو ایک ساتھ بیچنا ہے۔''

''تو.....؟'' معز الدین نے پوچھا۔

''تو کیا..... میں نے دونوں کے ایک ہزار سونے کی اشرفیاں دینے کا کہا۔'' اخش ملک یہ کہہ کر خاموش ہو رہا۔ چند ثانیوں کے بعد وہ دوبارہ بولا۔

''مگر اس نے پھر انکار کر دیا بلکہ کہنے لگا جاؤ تمہارے سلطان کو علم ہی نہیں کہ ترک غلاموں کی کیا قدر و قیمت ہے۔ تم اسے نہیں خرید سکتے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر اس کمبخت تاجر کو جا کر بتا دو کہ اگر سلطان معز الدین اس غلام کو نہیں خرید سکتا تو پھر وہ بھی غزنی کے اس بازار سے نکل جائے۔ اسے اس بازار میں خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہے۔ میرا یہ حکم تم اس تک پہنچا دو۔'' سلطان معز الدین غصے سے بولا۔

''جی سلطان معظم..... آپ کا پیغام ابھی پہنچاتا ہوں۔''

''اسے یہ بھی بتا دینا کہ وہ اس غلام کو غزنی میں کہیں بھی نہیں بیچ سکے گا۔'' سلطان نے غصے سے کہا۔ چنانچہ اسی وقت چست قبا کو یہ پیغام پہنچا دیا گیا۔

جلال الدین چست قبا اسی وقت بازار سے اپنے غلاموں کو ساتھ لے کر نکل گیا۔

جب معز الدین کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو ایک روز اخش ملک نے سلطان کو اکیلے میں پا کر سوال کیا۔ ''سلطان معظم! بڑے دنوں سے ایک بات میں پوچھنا چاہ رہا ہوں مگر خود میں ہمت نہیں پا رہا۔''

''کہو بے دھڑک ہو کر پوچھو..... کیا پوچھنا چاہتے ہو.....'' سلطان معز الدین نے سکون سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آخر ان ترک غلاموں میں کیا بات ہے جو ان کو دوسری قوموں کے غلاموں پر اس قدر ترجیح دی جاتی ہے اور غلام بازاروں میں بھی ان کی قیمت دوسرے غلاموں سے کہیں زیادہ لگتی ہے؟''

''تم واقعی نہیں جانتے.....؟'' معز الدین نے پوچھا۔

''میرے ذہن میں کچھ تو ہے مگر وہ اتنا واضح نہیں ہے۔ میں آپ کی زبان مبارک سے سننا چاہتا ہوں۔''

''تو سنو اخش! مسلمانوں کی تاریخ میں ترک غلاموں کا سیاسی کردار ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔''

☆☆☆

ترک غلاموں کو سب سے پہلے بطور محافظ عباسی خلیفہ المتوکل نے رکھا۔ عباسی دور کے بعد جب صوبائی خود مختار حکومتیں بنیں تو انہوں نے ترک غلاموں کو فوج اور انتظامیہ میں اس لیے رکھا کہ یہ اپنے سے سینئر اور خلفاء کی بے حد قدر کرتے تھے اور ملک و بادشاہ کے وفادار تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی تک ترک غلاموں کا ادارہ اس قدر مضبوط ہو گیا اور اس کی ضرورت کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی کہ تقریباً تمام مسلمان حکمرانوں نے انہیں اپنے دربار اور فوج میں رکھنا شروع کر دیا۔ غلاموں کے اس اثر و رسوخ میں ان کے ذاتی کردار کا بڑا دخل تھا۔ ان کی بہادری، وفاداری اور شجاعت کی وجہ سے ان کو مقبولیت ملی ہوئی تھی چونکہ ان کا کوئی خاندان نہ ہوتا تھا۔ اس لیے صرف بادشاہ کی ذات

سے یہ وفادار ہوتے تھے۔ جب غلاموں کی تعداد بڑھی تو ان کو دو درجوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ ان میں ایک قسم کے وہ غلام ہوتے تھے جو بادشاہ کی ذاتی خدمت میں رہتے ہوئے اپنی صلاحیت اور لیاقت سے بادشاہ کی توجہ حاصل کر لیتے تھے۔ انہیں بہت جلد ترقی دے دی جاتی تھی۔ یہ غلمان خاص یا غلمان سلطانی کہلاتے تھے۔

اس ضرورت کی وجہ سے حکمرانوں اور امراء میں ترک غلاموں کی مانگ دن بدن بڑھنے لگی۔ ان غلاموں کو حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ قبیلوں کی آپس میں جنگیں ہوتی تھیں جن میں شکست کھانے والے قبیلے کی عورتوں، مردوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا اور انہیں تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا تھا جو انہیں شہر کی منڈیوں میں لا کر ان کی بولی لگاتے۔ یہاں سے ضرورت مند امراء یا پھر حکمران انہیں خرید کر لے جاتے۔

ترک غلاموں کی مقبولیت کا.... یہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی شہرت اور مقبولیت کے پیش نظر امراء اور باج گزار حکمراں انہیں خرید کے بادشاہوں کو بطور تحفہ دینے لگے تھے۔ سلطان کے دربار میں غلاموں کی ترقی اور عروج میں ان غلاموں کی قسمت اور حالات کا بڑا دخل ہوتا تھا۔ بہت سے تاجر غلام بچوں کو خرید کر ان کی بہترین تربیت کا بندوبست کرتے تاکہ آئندہ ان کی اچھی قیمت مل سکے اور جن غلاموں کو سلطان خریدتا تھا، ابتدا میں وہ اس کی ذاتی خدمت پر مامور ہوتے تھے۔ جیسے ساقی خاص، چاشنی گیر، طشت دار، مشعل بردار، چتر دار، آب دار، جامہ دار، اسلحہ دار اور علم دار وغیرہ۔ جن غلاموں میں لیاقت اور صلاحیت ہوتی تھی وہ فوج کے جنرل اور صوبوں کے گورنر بنا دیے جاتے تھے۔

جمال الدین چست قبا کو سلطان معز الدین کا پیغام ملا کہ یا تو شہر سے نکل جاؤ یا پھر ترک غلام کو اس کے ہاتھ فروخت کر دو۔ جمال الدین چست قبا بڑا شاطر اور ہوشیار تاجر تھا، وہ شمس الدین اور دوسرے غلاموں کو لے کر بازار غلاماں سے نکل گیا اور اپنے کسی واقف کار کے ہاں جا کے رہنے لگا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ جونہی معز الدین کسی مہم پر جائے گا تو وہ ان غلاموں کو یا تو اسی بازار میں فروخت کر دے گا یا پھر لے کر کسی اور علاقے میں چلا جائے گا جہاں یہ بہتر قیمت پر فروخت ہو جائیں گے۔ وہ ایک سال تک اسی انتظار میں غزنی کے شہر میں چھپا رہا لیکن اسے موقع نہ مل سکا اور جب اسے موقع ملا وہ انہیں لے کر بخارا چلا گیا۔ جہاں اس نے تین سال قیام کیا۔ جب وہاں بھی اسے اچھا گاہک نہ ملا تو وہ دوبارہ غزنی آ گیا۔ اسی دوران تقریباً اس کی واپسی کے ایک سال بعد اسے خبر ملی کہ قطب الدین ایبک، ملک ناصر الدین کے ہمراہ اپنی گجرات کی مہم ختم کر کے غزنی آ رہا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ چنانچہ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور شمس الدین کے ہمراہ دوسرے غلاموں کو بھی بازار میں لے آیا جہاں شمس الدین نے اپنی دلربا خصوصیات اور ذہانت کی بنا پر پورے بازار کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس ترکی غلام کی اطلاع قطب الدین اور ملک ناصر الدین کو ملی۔ اطلاع دینے والے نے یہ بھی بتایا کہ جلال الدین چست قبا کے غلاموں کو غزنی میں فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب تک ان غلاموں کو فروخت نہیں کر سکا۔ قطب الدین ایبک چونکہ خود بھی کسی زمانے میں غلام رہ چکا تھا اس لیے اسے غلاموں کو خریدنے کا جنون تھا اور پھر خاص طور پر ترک غلاموں کا تو وہ عاشق تھا۔ جلال الدین چست قبا کے پاس چونکہ شمس الدین کی شکل میں ترک غلام موجود تھا جسے اس نے خریدنے کا ارادہ کیا۔ خریدنے کی راہ میں رکاوٹ معز الدین سلطان کا حکم تھا۔ چنانچہ اس نے سلطان سے خود اجازت لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے نظام الدین محمد کو نمائندہ بنا کر سلطان معز الدین کے پاس بھیجا اور غلام خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو سلطان معز الدین نے بتایا کہ جلال الدین چست قبا پر غزنی میں غلام بیچنے پر پابندی عائد ہے۔ وہ دہلی جا کر غلام فروخت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، جب قطب الدین ایبک کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے نظام الدین محمد کو جلال الدین چست قبا کے پاس بھیجا اور کہلا بھیجا چونکہ غزنی میں وہ غلام فروخت نہیں کر سکتا، اس لیے وہ دہلی کے بازار غلاماں میں انہیں لے چلے۔ میں تمہارے غلاموں کو وہاں خرید لوں گا۔

جلال الدین چست قبا کو اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا کہ سلطان معز الدین غزنی میں اس کے غلاموں کا گاہک نہیں لگنے دے گا اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ امراء و سلاطین کو انکار کرنے کا کس قدر نقصان ہوتا ہے لہٰذا فوراً دہلی جانے کی ہامی بھر لی۔ کچھ دنوں کے بعد جلال الدین اپنے غلاموں کو لے کر دہلی پہنچ گیا تو قطب الدین ایبک بھی دہلی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے علم ہوا کہ جلال الدین چست قبا شمس الدین کے ساتھ ایک اور غلام کو... فروخت کرے

گا۔ نظام الدین محمد نے بتایا تو قطب الدین بولا۔ ''یہ تو زیادتی ہے میں نے تو صرف اس ترک غلام شمس الدین کو خریدنا تھا۔ بہرحال اب اگر وہ کہتا ہے تو دونوں غلاموں کو خرید لاؤ جتنی رقم وہ مانگتا ہے اسے ادا کردو۔''

چنانچہ نظام الدین محمد شمس الدین اور طمغاج دونوں کو ایک ساتھ ایک لاکھ جیتل میں خرید لایا۔ قطب الدین نے طمغاج کو اپنا سب سے قابلِ اعتماد اور خاص سپاہی بنالیا اور شمس الدین کو اس کی ذہانت اور وفاداری کے سبب سرجاندار (محافظ دستے کا سردار) بنادیا۔ یہ ایک غیر معمولی ترقی تھی جن پر دونوں کی تعیناتی کردی گئی تھی۔ یہ ایسی ذمے داریاں تھیں جنہیں ایسے غلاموں کے سپرد نہیں کیا جاسکتا تھا جو ابھی ابھی بازار سے خرید کر لائے گئے ہوں۔ بہت سے گراں قدر امور جن میں غلاموں کی تعلیم و تربیت بھی شامل تھی یونانیوں میں رائج ہوئی۔ وہ یونانی غلاموں کو عام فرائض کی تعلیم دے کر پیسے کمایا کرتے تھے۔ اس طرح کی تعلیم و تربیت میں مزید اضافے کے لیے باورچی اور خانگی امور و فنون شامل ہوتے تھے مگر یونانی آقا ان غلاموں کو خانگی امور کے سوا دوسری تعلیم دینے کی اجازت نہ دیتے تھے کیونکہ خانگی امور و فنون کی تعلیم دینے کے علاوہ دوسری تعلیم دینے کا مقصد آزاد شہریوں کے حقوق پر دست درازی تھا لیکن عربوں کے علاوہ دوسرے ممالک میں ایسی کوئی پابندیاں نہ تھیں۔ یہاں کے چھوٹے سلطان اور اعلیٰ افسران ہر قسم کے فرائض کی انجام دہی کے لیے جس میں فوجی انتظام اور نظام حکومت کا کنٹرول بھی شامل تھا۔ تربیت یافتہ غلاموں کی ضرورت محسوس کرتے تھے کیونکہ حکومت کے کسی عہدے کو ایک تربیت یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ غلام کے سپرد کردینے میں ایک حکمران کے لیے تین قانونی اور دو سماجی سیاسی فوائد تھے۔ غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتا تھا۔ غلام کے بچے بھی اپنی باری میں آقا اور اس کے وارثوں کے غلام ہوتے تھے اور غلام کا ترکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقا کو ملتا تھا۔ اس کے بچوں کو نہیں۔ سماجی اور سیاسی فوائد اس حقیقت میں چھپے تھے کہ چونکہ اس کا تعلق کسی بھی گروہ سے نہ تھا۔ لہٰذا وہ پورے طور پر اپنے آقا کا ہی دستِ نگر ہوتا تھا۔ صلح و جنگ کے فنون رکھنے والے غلام کو ایک مدت کے بعد ایک نہایت ذمے دار ادارے کا نگران بنایا جاسکتا تھا مگر ایسے غلاموں کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہ تھی اور اسی لیے غلاموں کے کچھ بڑے تاجر نہایت ہنرمند ترک غلاموں کو دوسرے غلاموں پر ترجیح دیتے تھے اور ان کی تربیت بادشاہوں اور حکمرانوں کی خدمت کے طور پر کیا کرتے تھے۔ یہ چنے ہوئے مخصوص غلام عموماً آقاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہی پرورش پاتے لیکن ان کی تعلیم و تربیت پر روپے خرچ کرنا ایک ایسی جمع پونجی ہوتی تھی جو اپنی کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرتی۔ غلاموں کا تاجر خود اپنے لڑکوں پر اس طرح خرچ کرنا ایک غیر ضروری بات سمجھتا تھا..... وہ ان غلاموں کو جنگ، شہ سواری، تیراندازی، تلوار ڈھال اور نیزہ چلانے کے فنون، فنون لطیفہ کی موزوں تعلیم، فارسی ادب و نظم، بنیادی عربی ادبیات، آداب مجلس، اچھے اطوار، اسلوب بیان کی روانی، اخلاقیات، حکومت اور آقا کے ساتھ وفاداری کے اصول، تمام ضروری مضامین کی تعلیم دلواتے تھے۔ اسی لیے بادشاہوں اور اعلیٰ افسران کو ایسے ترک غلاموں کی ضرورت تھی جنہیں مناسب عسکری اور علمی تعلیمات دی جاچکی ہوں اور جنہیں چند سالوں کی آزمائش کے بعد ایک ذمے دار عہدے پر بحال کیا جاسکے۔

☆☆☆

ترکن خاتون ایک خوبصورت، مزاجاً تیز طرار، چلبلی اور زود رنج ترکی کنیز تھی جو محل میں نہ جانے کب سے موجود تھی اور اب وہ اپنی عادات و خصائل کی وجہ سے کنیزوں کے پورے گروہ میں زیادہ ممتاز تھی۔ منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے دوسری کنیزیں اس سے دور رہتی تھیں اور کچھ کنیزیں اسے اس لیے اہمیت نہ دیتی تھیں کہ اس کا تعلق ترکی سے تھا اور باقی ہندوستان سے تعلق رکھتی تھیں البتہ گلناز سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ گلناز بھی محل میں اسی کے ساتھ تھی اس کی عادتیں بھی ترکن خاتون سے تقریباً ملتی جلتی تھیں۔ شمس الدین کو جب قطب الدین کے دربار میں اہمیت حاصل ہوگئی اور وہ بہت جلد ترقی کرنے لگا تو ایک روز جب ترکن اور گلناز اکیلی بیٹھی تھیں تو دنیا جہان کی چغلیاں کرنے کے بعد اچانک گلناز کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنی بانہیں ترکن کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔

''خانم! میں ایک بات بڑے دنوں سے آپ کو بتانا چاہ رہی تھی۔''

''کہو کیا بات ہے گلناز.....'' ترکن نے بھی اسی انداز سے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ ہمارے دربار میں سلطان نے ایک ایسا غلام خریدا ہے..... جو انتہائی خوبصورت اور بانکا

Digitized by Google

سجیلا ہے۔ اس کی گفتگو کا انداز..... اس کی سپاہیانہ آن بان کے آگے سب پانی بھرتے ہیں۔ اس کے آتے ہی عالی جاہ نے اسے بڑے اہم عہدوں پر بٹھا دیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور حسن کے پورے دربار میں بڑے چرچے سنے جاتے ہیں اور کنیزیں نے جس کو بھی اس کے درشن نصیب ہوئے ہیں وہ سب اس کی دلدادہ بنی پھرتی ہیں۔''

''ارے جا..... گلناز! کوئی ایسا بھی کیا نوجوان ہوگا جو تیری خانم سے بڑھ کر حسین وجمیل ہوگا۔'' ترکن نے اتراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ بات بالکل ٹھیک کہی مگر خانم وہ بھی مردانہ وجاہت اور حسن میں باکمال ہے۔'' گلناز نے اس کی اشتہا کو بھڑکاتے ہوئے کہا۔

''ہوں..... تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟'' ترکن نے پوچھا۔

''نہیں خانم..... دیکھا تو نہیں مگر جتنی اس کی تعریف سنی ہے، دیکھنے کی تمنا ضرور ہے۔ میں تو کئی بار محل سے باہر بھی اسی لیے گئی ہوں کہ کہیں ایک نظر اس پر پڑ جائے۔ مگر ہائے ری قسمت..... میری اس سے ملاقات تو کیا میں اسے ایک نظر دیکھ بھی نہیں پائی۔''

''جب تم نے اسے دیکھا ہی نہیں تو پھر بغیر دیکھے اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو کہیں تمہاری شامت تو نہیں آئی۔'' ترکن نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''ارے ہاں..... یہ تو میں بھول ہی گئی کہ اس کا تعلق بھی آپ کے ملک سے ہے۔ ترکی نژاد ہے وہ.....''

''اچھا..... یہ تو نئی بات بتائی تو نے کہ ایک ترکی نژاد غلام اتنا ذہین وفطین کہ اسے سلطان نے خریدتے ہی اتنے اونچے عہدے پر فائز کر دیا۔'' ترکن نے تعجب سے کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں خانم..... میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ سلطان کو اس کی عادتیں اور انداز اس قدر پسند آئے ہیں کہ وہ اسے بیٹا کہنے لگے ہیں اور اس کا رتبہ دن بدن بلند کرتا چلا جا رہا ہے۔'' گلناز نے تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بتایا۔

''گلناز! بس کر دے۔ اتنی تعریفیں نہ کر، میرا تو خود دل ڈولنے لگا ہے۔ جب تم اسے دیکھ لوگی تو مجھے بتانا۔'' ترکن نے بات ختم کرتے ہوئے کہا مگر گلناز جیسی باتونی کنیز کہاں چپ ہونے والی تھی۔

''خانم! میں تو کیا پورے محل کی کنیزیں اس کے حسن کی متوالی ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں، جب اتنی کنیزیں اس کے حسن اور اس کے کردار کی معترف ہوں تو ایک گلناز اس کی تھوڑی سی تعریف کر دے گی تو کونسی قیامت آجائے گی۔''

''ہوں..... بس بس گلناز! اب اور اس کی تعریفیں نہ کرو۔ کہیں میں تمہیں اتنا جھوٹ بولنے پر مار ہی نہ بیٹھوں۔'' ترکن نے ہنستے ہوئے گلناز کا ایک کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''ارے..... رے..... خانم! میرا کان چھوڑو..... بہت درد کرتا ہے۔ توبہ ہے اتنا سخت ہاتھ ہے آپ کا.....'' گلناز نے ہنستے ہوئے اپنا کان چھڑایا اور اپنے کان کی لو کو رگڑنا شروع کر دیا۔

''چلو بس کرو یہ ڈرامے بازی، کوئی اور بات کرو.....'' ترکن نے مسکرا کر پوچھا۔

''اچھا خانم! ایک بات اور..... اگر میں نے اسے دیکھا تو کیا آپ کو بھی اسے دکھاؤں؟'' گلناز کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''ہاں..... اوں..... چلو دیکھ لیں گے تمہارے اس شہزادہ حسن کو.....'' ترکن نے جواب دیا۔

گلناز نے شمس الدین کی اتنی تعریفیں کر دی تھیں کہ بغیر دیکھے بھی ترکن کو اسے دیکھنے کا اشتیاق ہونے لگا تھا۔

اب وہ گاہے بگاہے جب گلناز دوسری باتوں میں مصروف ہوتی تو نہ جانے کس جذبے کے تحت..... اسے چھیڑتی۔

''گلناز! وہ تمہارے اس ترک غلام کا کیا ہوا؟''

''خانم! وہ غلام نہیں اور پھر آپ تو اسے غلام نہ کہیں۔ وہ تو قدرت کی طرف سے ایک بنا بنایا شہزادہ ہے، شہزادہ.....'' گلناز جواب دیتی تو ترکن بھی ہنس دیتی۔

''چلو یونہی سہی..... جب سب لوگوں کے لیے اس کی حیثیت غلام کی ہے تو میں اسے غلام کیوں نہ کہوں۔'' ترکن کے پوچھنے پر گلناز ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

خانم! اگرچہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن دوسروں کی تعریفوں نے میرے ذہن میں ایک ان دیکھا خاکہ سا بنا ڈالا ہے اور سچ پوچھیں تو کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک ہیولے کی صورت ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہنے لگا ہے۔''

''گلناز..... تم تو کسی کام سے..... بہت جلد تم پاگل ہو جاؤ گی اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں بے دیکھے ہی تم مر گئیں تو کیا ہوگا.....'' خانم ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں خانم..... میں بہت ڈھیٹ ہڈی کی بنی ہوں، جب تک اسے دیکھ نہ لوں گی، مروں گی نہیں.....'' گلناز قہقہہ لگا کر کہنے لگی تو ترکن نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی ہی

گود میں گرالیا۔

"ہائے بیچاری....." اس نے اس کے بالوں کو کھینچتے ہوئے کہا کہ اتنے میں دور سے ایک کنیز ادھر دیکھ کر زور سے بولی۔

"ارے..... یہ کیا کر رہی ہو؟ کیوں لڑھم بچار کھا ہے؟ ابھی سلطان کا کوئی آدمی ادھر آ گیا تو سب کی کھٹنی آ جائے گی۔" اس آواز پر گلناز فوراً ترکن سے اپنا آپ چھڑا کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"ہائے خانم..... تم نے مجھے ہر بات بھلا دی۔ ابھی محل میں میرے جیسے کے بڑے کام پڑے ہیں۔ پتا نہیں یہ تمہاری قربت کا اثر ہوتا ہے کہ میں جونہی آپ کے پاس آتی ہوں، سب کچھ بھول جاتی ہوں۔"

"کمبخت، یہ میری قربت کا نہیں اس بانکے کی سوچوں کا اثر ہے۔ ابھی تو بات یہیں تک پہنچی ہے۔ اس کے متعلق اور سوچتی رہیں تو اس سے بھی آگے بڑھ جاؤ گی اور آتے جاتوں کو کاٹنے لگو گی۔ کتنا اچھا لگے گا جب تمہارے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال دی جائیں گی اور محل کے کسی کونے میں ڈال دی جاؤ گی۔"

پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کم ہوتا چلا گیا۔ محل میں اور طرح کی گہما گہمیاں ہی جان نہیں چھوڑتی تھیں۔ ایسے میں اس کا ذکر کہاں تک چلتا..... بہت دن ایسے ہی گزر گئے۔ گلناز اب بھی آتی، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی بھی رہتی مگر اس کا ذکر شاید اس کے ذہن سے ویسے ہی اتر گیا تھا۔

ایک دوپہر ترکن اپنے کمرے میں بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ گلناز بھاگی بھاگی اندر آئی اور آتے ہی ترکن کے گلے لگ کر جھولنے لگی۔

"ارے گلناز! کیا ہو گیا ہے تمہیں..... کیوں بولائے بھرتی ہو؟"

"خانم! جس آدمی کی پرانی خواہش پوری ہو جائے، پرانے خوابوں کو اس کی من چاہی تعبیر مل جائے..... وہ میری طرح پاگل نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔"

"کچھ منہ سے بھی بولو گی یا یونہی مجھے جھلائے جاؤ گی۔" خانم حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"خانم! آج ان آنکھوں نے بھی آخر کار اس کا دیدار کر ہی لیا۔ خود دیکھ لیا اسے۔" گلناز اسی انداز میں بولی۔

"کسے....." ترکن شاید پچھلی تمام باتیں بھول بیٹھی تھی۔ وہ انجان بن کر بولی۔

"اس ترکی غلام کو....." گلناز خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"کس کو، بات بتاؤ۔ کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو....."

ترکن نے اکتا کر پوچھا۔

"بتایا تو ہے۔ بڑی دیر سے اس کے حسن و دانائی کی باتیں سن رہی تھی۔ آج اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا۔ خانم! وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ اس کا ذکر سنتی آ رہی تھی۔ خانم! وہ میری سوچوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ شمس الدین نام ہے اس کا....." گلناز اسی انداز میں شوخی سے بولی۔ "آپ اسے دیکھیں گی تو اس کے آگے بت بن جائیں گی۔"

"کہاں دیکھا ہے.....؟"

"سلطان معز الدین آج کھوکھروں کے ساتھ نمٹنے کے لیے اپنی سپاہ لے کر جا رہے ہیں۔ سلطان قطب الدین بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں اور وہ غلام..... کیا نام بتایا تھا۔ شمس الدین بھی اس سپاہ میں شامل ہیں جو کھوکھروں کی سرکوبی کے لیے جا رہی ہیں۔"

"میں نے ایک غلام سے پوچھا تو اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ شمس الدین ہے..... یقین کریں خانم اتنا بھرپور جوان، خوبصورت اور اس کے بدن پر سپاہ کی وردی تو اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں۔" گلناز اپنی ہی دھن میں کہے جا رہی تھی اور خانم کے دل میں ایک بار پھر شمس الدین کی سنی سنائی باتوں کی جوت جاگ اٹھی۔

"اب کے جب وہ کھوکھروں سے نمٹ کر واپس آئے، تو میں آپ کو بھی ساتھ لے کر اس کی جھلک دکھاؤں گی پھر تو آپ کو میری باتوں پر اعتبار آ جائے گا کہ نہیں۔"

"گلناز! جب تک ترکن اپنی آنکھوں سے اسے نہیں دیکھ لے گی۔ اس وقت تک وہ یقین نہیں کرے گی۔" ترکن نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... وہ وقت جلد آئے گا۔ جب آپ بھی میری طرح اس کے لیے تڑپیں گی اور میں آپ کو تڑپاؤں گی۔ مجھے پتا ہے آپ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں، آپ کے من میں بھی اسے دیکھنے کی خواہش جاگنے لگی ہے۔ حسن اگر حسن کو نہ دیکھے گا تو پھر زندہ کیسے رہے گا۔" گلناز نے شوخی سے جواب دیا۔

"چل ہٹ..... گلناز! تم زیادہ ہی شوخ نہیں ہوتی جا رہی ہو۔ دیکھا جائے گا جب وقت آئے گا۔" ترکن بولی۔

"بہت جلد خانم..... آپ میری منتیں کریں گی اور میں..... آپ کو تڑپتا دیکھ کر خوشیاں مناؤں گی۔" گلناز نخرے سے کہا اور بھاگ گئی۔

ترکن ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔ سوچوں نے ایک بار پھر مل کر اس پر حملہ کر دیا۔ کیا وہ واقعی اس قابل ہے کہ اس کی

گفتگو سنی جائے۔ اس کو دیکھا جائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچوں کا مرکز وہی غلام ٹھہرتا تھا جسے گلناز شمس الدین کہتی تھی۔ اسے کھوکھروں سے لڑنے میں کتنی دیر لگے گی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسی مہمیں بہت وقت لیتی ہیں اور پھر شکست و فتح ہونے میں بھی وقت لگتا ہے۔ کیا وہ اس وقت تک انتظار کی سولی پر لٹکتی رہے گی؟ ایک عجیب معاملہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ جس قدر ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی، یہ کسی نہ کسی صورت اس کے سامنے آجاتی تھیں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ گلناز نے اسے کس بھنور میں لاکر چھوڑ دیا ہے۔ اب نہ وہ ڈوبتی ہے اور نہ ابھرنے کی اس میں سکت موجود ہے۔ وقت ایک اکھڑے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ رہا تھا اور وہ دائرے در دائرے کی صورت میں الجھے چلی جارہی تھی۔ پھر اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔

☆☆☆

کھوکھر یا گکھڑ دریائے سندھ اور وادی کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔ یہ ایک وحشی اور پسماندہ قوم تھی۔ تاریخ فرشتہ میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب غوری ہندوستانی علاقوں کی فتح میں مصروف تھے۔ پنجاب میں گکھڑوں نے مسلسل غوری فوجوں اور آباد کار مسلمانوں کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھی۔ وہ اس حد تک متعصب تھے کہ ان کے آس پاس کی آبادی ان کے ظلم و ستم سے عاجز آچکی تھی۔ خاص طور پر پشاور اور گردونواح کے مسلمانوں کا تو جینا مشکل ہوگیا تھا۔ ان لامذہب گکھڑوں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کردیا تھا۔ یہ لوگ کسی مذہب کو ماننے والے نہ تھے۔ لڑکیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ انتہائی سفاکانہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں رواج تھا کہ جب ان کی لڑکی جوان ہوتی تو لڑکی کا باپ یا بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مکان کے دروازے پر آکھڑا ہوتا۔ راستہ چلتے والوں کو لڑکی کی خریداری کے لیے بلایا جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی شخص اس لڑکی کو پسند کرکے خرید لیتا تو وہ لڑکی اس کے حوالے کردی جاتی۔ ورنہ اس بے زبان لڑکی کو وہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کرلی جاتی تھی۔ ان لوگوں میں یہ دستور بھی رائج تھا کہ ایک عورت کئی کئی شوہروں کی بیوی بن کر رہتی تھی۔ جو شوہر اس عورت کے گھر جاتا، وہ باہر دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا کہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے۔ ایسے عالم میں کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو وہ نشان دیکھ کر اندازہ کرلیتا کہ اس وقت عورت تنہا نہیں ہے۔ لہٰذا وہ فوراً واپس چلا جاتا۔ دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں یہ قوم بڑی ماہر تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری سے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ الغرض یہ قوم ایک زمانے سے اسی وحشیانہ انداز سے زندگی بسر کررہی تھی۔

اس زمانے میں گکھڑوں کے سردار کا نام سکا تھا۔ سکا نے کسان لشکروں کی مدد سے لاہور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ انہی جھڑپوں میں ایک دیندار مسلمان گکھڑوں کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ سکا نے اس سے مسلمانوں کے مذہب، فلسفۂ حیات اور ثقافت کے بارے میں پوچھا۔ اس دیندار مسلمان نے اسلامی تعلیمات، عبادات اور تصورِ زندگی کا مفصل بیان اس کے سامنے کیا۔ سردار سکا کو یہ باتیں بے حد پسند آئیں اور اس نے کہا اگر میں اسلام قبول کرلوں تو شہاب الدین محمد میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ مسلمان قیدی نے کہا کہ وہ تم سے بہت خوش ہوگا اور کوہستان کی حکومت تمہارے حوالے کردے گا۔ ''پھر ٹھیک ہے۔'' سردار سکا نے جواب دیا۔ ''چلو تم اس سے بات کرو۔'' یہ کہہ کر سردار سکا خاموش ہوگیا۔

تب اس مسلمان قیدی نے اسی مضمون کا ایک خط سلطان شہاب الدین غوری کو لکھا۔ جس نے فوراً ایک مرصع کمربند اور گراں بہا خلعت سردار سکا کے لیے بھجوائی اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ سکا نے غوری سے ملاقات کی اور اسلام قبول کرلیا۔ اس کے نتیجے میں تمام گکھڑ مسلمان ہوگئے۔ البتہ دور دراز کے علاقے کے گکھڑ جن تک سردار سکا کا پیغام نہ پہنچا تھا، اپنی پرانی روش پر چلتے رہے۔ قطب الدین ایبک ان کی سرکوبی کے لیے دہلی سے لشکر لے کر آیا۔ شمس الدین اس وقت ایبک کا جرنیل تھا۔ اس یلغار میں وہ اس کے ساتھ تھا۔ یہ دونوں مل کر بھی گکھڑوں کی اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہورہے تھے کہ شہاب الدین غوری غزنی سے برق رفتار سے پنجاب پہنچا۔ اب ان تینوں نے مل کر پنجاب کی اس بڑی کسان بغاوت کو کچلا۔ اس طرح شہاب الدین کو بھٹنڈہ پڑی اور ایک رات کو بیس گکھڑ کسان چوری چھپے شاہی خیمہ گاہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے محمد غوری پر چھروں اور خنجروں سے حملہ کردیا اور اسے قتل کردیا۔

ادھر جشن ولی عہد ..... کے بعد ملک قطب الدین ایبک دہلی چلا گیا۔ اس نے یہ خبر دہلی ہی میں سنی۔ شمس الدین بھی قطب الدین کے ساتھ ہی دہلی پہنچ چکا تھا پھر

جب اس نے یہ خبر سنی تو وہ فوراً واپس پلٹا۔ کھوکھروں کی لڑائی میں جن گکھڑوں نے دریائے جہلم کے ایک جزیرے میں پناہ لے رکھی تھی۔ ان کی سرکوبی کے لیے شمس الدین کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ اس وقت دریائے جہلم اپنے پورے جوبن پر تھا اور بپھرا ہوا تھا۔ اس نے عین جنگ کے دوران اپنا گھوڑا دریائے جہلم میں بے خوفی سے ڈال دیا۔ اس نے بڑی مردانگی دکھائی اور دریائی لہروں کے درمیان دشمن کو تیروں کی یلغار سے ہلاک کر ڈالا۔ سلطان معزالدین نے یہ منظر دیکھا تو اس کی بہادری سے بے حد متاثر ہوا۔ جنگ کے بعد واپسی پر اس نے شمس الدین کو بلایا اور خلعتِ خاص سے نوازا اور قطب الدین کو خاص طور پر یہ حکم دیا کہ شمس الدین کو غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔

شہاب الدین محمد غوری نے اپنے جرنیلوں کے ساتھ قریب قریب سارا شمالی ہندوستان فتح کر لیا تھا۔ اس کے ایک جرنیل بختیار خلجی نے بہار بنگال کو فتح کر لیا تھا۔ ایک زمانے میں بنگال کا صدر مقام لکھنوتی تھا۔ جس کا راجا ایک بوڑھا بنگالی راجا لکشمن سین تھا۔ جس وقت غوریوں نے حملہ کیا تو یہ اپنے محل میں کھانا کھا رہا تھا۔ افغانوں نے محلوں میں گھس کر لوٹ مار شروع کی تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ کسی صورت نہیں بچ پائے گا اور اس کا قتل لازمی ہے۔ وہ ڈر کے مارے ادھر ادھر قرار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک کسی نے دروازہ کھلا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ یہ اس کی نوجوان نوکرانی پشپا تھی۔ ''یہ کیسی گڑبڑ ہو رہی ہے باہر؟'' اس نے ڈرے سہمے لہجے میں پوچھا۔

''مہاراج مسلمان سینا (فوج) نے محل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب وہ ادھر آ رہی ہے۔''

''تو میری پتنی رادھا کدھر ہے۔ میرے ملازم.....'' راجا لکشمن نے استفسار کیا۔

''وہ بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بھاگ کر جان بچائی ہے۔ مجھے آپ کا خیال آیا تو میں آپ کو بتانے آئی ہوں۔''

''پشپا! بھگوان کے لیے میرا کچھ کرو۔ تم ہی میری جان بچا سکتی ہو.....'' بوڑھا راجا سسک پڑا۔

''راجا جی..... ادھر دیکھو.....'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کرتی کا گریبان خود ہی پھاڑ ڈالا۔ وہ بالکل برہنہ ہو چکی تھی۔'' اس نے بھیانک قہقہہ لگایا اور طنز سے بولی۔

''مہاراج! ادھر دیکھو..... آؤ میرے جسم سے اسی طرح کھیلو جس طرح تم میرے اور میری بچیوں اور دوسری لڑکیوں سے ہمیشہ کھیلتے آ رہے ہو..... آؤ آج یہ جوان جسم تمہیں پکار رہا ہے۔ تمہاری ہوس زدہ نظروں کا طالب ہے۔ آؤ راجا جی..... آؤ۔''

''نہیں پشپا..... تمہیں بھگوان کا واسطہ ہے، میری جان بچا لو..... یہ دیکھو، میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا تو وہ اور بھی زور زور سے ہنسنے لگی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

''بھگوان بڑا منصف ہے۔ یاد کرو..... بھی اسی طرح میں نے بھی تمہارے قدموں پر سر رکھ کر اپنی عزت بچانے کے واسطے ڈالے تھے، بڑی منتیں کی تھیں مگر تم..... اس وقت خود بھگوان بنے بیٹھے تھے۔ اب بھگتو..... اپنی کرنی کی سزا.....''

''پشپا..... دیکھو میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔ مجھے کسی طرح بچا لو۔'' وہ پھر گڑگڑایا۔

''لیکن..... ہاں، مجھے تمہیں بچانا چاہیے کیونکہ میں تمہاری جاتی ہوں۔ تمہاری رکھیل اور تمہاری رعایا جو ٹھہری اور پھر میرے اور تمہارے ضمیر میں بڑا فرق ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے کے ایک کونے میں گئی اور اپنی چڑی کے پلو سے چور دروازے کی چابی نکالی اور اسے لگا کر دروازہ کھول دیا۔

''لے لو..... جاؤ مہاراج..... بھاگ جاؤ۔ یہ نہ کہنا کہ کم جات اور رکھیل نے تمہاری جان نہیں بچائی۔ تمہارا حکم نہیں مانا۔'' دروازہ کھلتے ہی راجا لکشمن باہر نکل گیا اور بھاگتا ہوا اڑیسہ جا پہنچا جہاں اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی جگن ناتھ جی کے مندر میں دھرم کی پوجا پاٹ میں گزار دی۔

راٹھور اور شمالی ہند کی کئی راجپوت قومیں اس وقت گنگا جمنا کے اس علاقے میں رہتی تھیں۔ جہاں ان کے آباؤ اجداد ہزاروں سال پہلے آباد تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مارواڑ اور اودل کے پہاڑ کے اس علاقے میں چلی گئیں جو ان کی وجہ سے راجپوتانہ کہلاتا ہے۔ ان علاقوں کے ہندوؤں کا یہ طریقہ خاص تھا کہ جس کے پاس روپیہ، گہنا وغیرہ ہوتا، وہ اسے گڑھا کھود کر زمین میں چھپا دیتے تھے۔ اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کوئی غنیم آئے اور چھین کر لے جائے۔ اس زمانے میں اہلِ ہند کے مختلف علاقوں اور ریاستوں میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں جن میں بے شمار جانیں تلف ہو جاتی تھیں۔ مال و دولت لٹتی اور بہت سے زمینی رقبے بے کاشت پڑے رہتے تھے کیونکہ غریب، بے کس کسان جان کے خوف سے جنگلوں اور بے آباد علاقوں کی طرف بھاگ جاتے تھے۔ اکثر لوگ زمینوں کے

مالیہ ادا کرنے سے بچنے کے لیے یا فاتح قوم کی فوج اور دفتروں میں منصب اور عہدے حاصل کرنے کی غرض سے اپنا مذہب بدل لیتے تھے۔ چنانچہ افغانوں کے عہد کے کئی مشہور جنگی سردار ایسے بھی گزرے ہیں جو کہ اصل میں ہندو تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

قطب الدین ایبک شہاب الدین کے ہمراہ رہ کر ہر جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا کر بادشاہ کی نظروں میں روز بروز عزت حاصل کرتا رہا۔ محمد غوری نے تھانیسر کی جنگ کے بعد اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ جو بطور نائب السلطنت ہند ملک پر حکمران رہا۔ اس دوران اس نے مشرق میں بنگال اور بہار تک اور جنوب میں گوالیار تک تقریباً تمام شمالی ہندوستان پر تسلط جمالیا اور نہایت دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ ملک معزالدین سام محمد غوری لاولد تھا۔ اس نے ایبک کی وفاداری اور معاملہ فہمی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اس کی وسیع ہندوستانی سلطنت کو اس کی وفات کے بعد سنبھالنے کا ایبک سے زیادہ کوئی شخص اہل نہیں۔ جب معزالدین نے اپنے خاندان والوں اور غور کے قبائلی سرداروں میں سے اپنے اعلیٰ عہدیداروں کی تقرری کی تو ان لوگوں نے معزالدین کی توقعات کو پورا نہ کیا۔ ایک بار اس نے اپنے ایک سابق افسر سے یہ کہا تھا کہ اس کی امیدوں کو اپنے خاندان اور قبائلی سرداروں سے تو پورا نہیں کیا، اب اس کی توقعات اس کے غلاموں سے وابستہ ہیں۔ صرف وہی اس کی دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کی ذمے داریوں کو نبھا سکتے ہیں۔ جب معزالدین اندخود میں مصروف تھا، تو اس نے کچھ فوج، وستوں کو آزاد غوری افسروں کی ماتحتی میں رکھا تھا۔ مگر اپنے غیر متوقع قتل کے باعث وہ اپنے جانشین کے سلسلے میں کوئی ہدایات نہ دے سکا۔ دوسری طرف پنجاب میں کھوکھروں، گکھڑوں کو دبا کر جب وہ واپس آئے تو اقتدار کی رسا کشی شروع ہو چکی تھی۔

☆☆☆

غزنی میں شمس الدین کے واپس آنے کی خبر ترکن خاتون کو سب سے پہلے گلناز ہی نے دی تھی۔ وہ پہلے کی طرح قلقاریاں بھرتی ہوئی ترکن کے کمرے میں آئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ بڑی دور سے بھاگتی ہوئی آرہی ہے یا کوئی بہت خوشی کی بات ہے جو اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ترکن گویا ہوئی۔

''آہستہ گلناز..... خود کو سنبھالو..... کیا تمہارے پیچھے دشمن کی سپاہ لگی ہوئی ہے جو یوں بوکھلائی ہوئی ہو؟''

''نہیں خانم..... ایک بہت بڑی خبر ہے تمہارے لیے.....''

''ذرا دم لو..... پھر خبر بھی سنا لینا.....''

وہ کچھ دیر ٹیٹھی، اس کی سانسیں بحال ہوئیں تو ترکن دوبارہ بولی۔

''ہاں اب کہو۔ کیا ماجرہ ہے.....؟''

''وہ خانم..... وہ شمس الدین اپنے آقا کے ساتھ کھوکھروں کو شکست دے کر واپس پلٹ آیا ہے۔'' اس نے رک رک کر بتایا۔

''تو..... اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے؟'' ترکن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''چلو پھر نہیں بتاتی.....'' گلناز بھی اب ترکن کو خوب سمجھنے لگی تھی۔ وہ اتراتے ہوئے بولی۔

''نہیں، تم بتاؤ..... میں سن رہی ہوں۔''

''وہ تری غلام شمس الدین اور اس کے مالک گکھڑوں کو دبا کر واپس آگئے ہیں اور تمام لوگ بے حد خوش ہیں۔''

''تو اس سے میرا کیا مطلب؟'' ترکن نے بے پروائی سے پوچھا تو گلناز نے بڑی مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر دباتے ہوئے پوچھا۔

''خانم..... آج تمہیں مجھے ایک بات سچ سچ بتانا ہوگی۔''

''میرے ہاتھ تو چھوڑو.....'' خانم نے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی جھوٹ موٹ کی اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں، پہلے آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے سوالوں کے سچ اور ٹھیک ٹھیک جواب دو گی۔''

''اچھا بابا..... میرے ہاتھ تو چھوڑو.....'' ترکن اکتا کر بولی۔

''خانم! جب آپ کی آنکھوں میں اس غلام کے نام پر پیاس جھلکنے لگتی ہے۔ جب آپ کے دل میں شمس الدین کا نام سن کر مدوجزر سا پیدا ہونے لگتا ہے اور آپ نت نئے بہانے پردوں میں چھپانے کی اداکاری کرنے لگتی ہیں تو یہ خدا مجھے بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ میں آج ان باتوں کا مطلب آپ سے جاننا چاہوں گی۔ اگر آپ کو اس غلام کے ساتھ دلچسپی نہیں ہے تو پھر بار بار کرید کرید کر اس کے بارے میں کیوں پوچھتی رہتی ہیں؟ میں کتنے دنوں سے آپ کی آنکھوں میں پڑھ رہی ہوں۔ جب اس کا نام آتا ہے تو ان میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔'' گلناز بلاتکان بولے جا رہی تھی۔ تب ترکن نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

Digitized by Google

''ہٹو گلناز! کیا اول فول بک رہی ہو۔ مجھے کچھ پتا نہیں تم کیا بولتی جارہی ہو۔'' ترکن نے انجان بنتے ہوئے جواب دیا۔

''خانم مان جاؤ..... کہ تم اس سے محبت کرنے لگی ہو۔ اسے دیکھے بغیر اور اس سے ملے بغیر.....''

''تم بہت شوخ اور شریر ہوتی جارہی ہو۔ کیوں اتنا شور مچا رہی ہو۔ آہستہ بولو، یہاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ باہر کسی خادم یا خادمہ نے سن لیا تو وہ کیا سوچیں گے.....''

''کچھ نہیں سوچتے۔ یہاں ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں میری اور آپ جیسی لڑکیاں اپنی خواہشات کی چپاتیاں سوچوں کے تنور میں لگا کر پکنے کی آس میں عمریں بتا جاتی ہیں اور تنور میں لگی چپاتیاں جل جاتی ہیں۔ جب انہیں ہوش آتا ہے تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں رہتا۔''

''گلناز تم تو فلسفی ہوتی جارہی ہو۔ اتنی گہری باتیں تمہیں کیسے سوجھتی ہیں۔'' ترکن نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''خانم! یہاں محل میں ایک سے بڑھ کر ایک انہی صدمات کی ماری ہوئی پھرتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ کوئی بھی اپنا دکھ اور روگ دوسرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتیں۔ میں تو آپ کی سہیلی ہوں۔ آپ پر اپنی جان نثار کرنے والی بے دام کنیز..... اگر آپ مجھ سے اپنے دل کا راز چھپائیں گی تو یقین کرو خانم! محبت ایک بہت بھاری بوجھ ہوتا ہے۔ دل پر پڑا رہے تو دل دق سا ہوجاتا ہے۔ آپ بتادیں کہ میرا اندازہ آپ کے بارے میں غلط تو نہیں۔ اقرار کرلیں گی تو بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ مجھے آزما کر دیکھیں۔ یہ کنیز بڑی وفادار ثابت ہوگی۔'' گلناز نے رکتے رکتے اپنی بات پوری کی تو ترکن ہنس دی۔ اس نے گلناز کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور آہستگی سے بولی۔

''بہت شیطان ہوگئی ہو..... ہوں..... تم ٹھیک ہو.....''

''تو پھر..... پھر میں آپ کے لیے کوشش کروں؟'' گلناز خوشی سے بولی۔

''کس بات کی؟'' ترکن نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ کے پیار کے لیے جو آج بڑی دیر کے بعد پگھلا ہے۔ میں اس غلام سے آپ کی ملاقات کا یا اسے آپ کی محبت سے آگاہ کرنے کا۔'' گلناز نے اسی انداز سے پوچھا۔

''نہیں گلناز..... بالکل بھی نہیں..... ترکن کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس معاملے میں اس کی سکی ہو۔ میں ایسے معاملات میں پڑ کر اپنے لڑکی ہونے کی تضحیک نہیں چاہتی۔'' ترکن نے جواب دیا۔

''لیکن جان گلناز..... تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ کم از کم اسے بھی تو علم ہونا چاہیے کہ قطب الدین ایبک کے اس محل میں ایک ایسی نازنین بھی موجود ہے جو اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ آپ صرف اشارہ کردیں۔ اگلا کام مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''اوں..... مجھے سوچنے دو کہ اسے پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہے۔ تم سے بس ایک گزارش ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے اسے غلام کے لقب سے نہ پکارا کرو۔ صرف اس کا نام لے لیا کرو۔ غلام کہنے سے نہ صرف اس کی تضحیک ہوتی ہے بلکہ مجھے بھی اپنی اوقات یاد آجاتی ہے۔ میں بھی تو ایک خریدی ہوئی کنیز ہوں، شہزادی تو نہیں.....''

''اوہو..... اتنی جلدی اس قدر خیال رکھنے لگی ہیں آپ شمس الدین کا.....'' گلناز نے ہنستے ہوئے اس پر چوٹ کی۔

''جو بھی سمجھ لو..... بہرحال اب یہ تالی ایک ہی ہاتھ سے بجے گی۔ جب تک میں نہ کہوں، تم نے اس کا ذکر کہیں اور کسی سے نہیں کرنا..... سمجھیں؟'' ترکن نے زندگی میں پہلی بار اپنے دل کی بات اس پر کھول دی تھی۔

''ٹھیک ہے سرکار..... خوش.....!'' گلناز نے ادا سے کہا۔

''ہوں..... اب تم جاؤ..... اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' ترکن نے مسکراتے ہوئے اسے ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے جواب دیا۔

''میں جاتی ہوں خانم..... مگر ان باتوں کے متعلق سوچنا ضرور..... محبت دو دلوں کے ہم آہنگ ہونے کا نام ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے متعلق سوچنے کا..... اگر آگ کی تپش ایک ہی طرف رہے تو سوچیں، چاہتیں، امیدیں سب کچھ اندر ہی اندر جل کر راکھ ہوجاتی ہیں۔ دوسرے تک اس کی تپش کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مزہ تو تب ہوتا ہے جب دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہو۔ میں جاتی ہوں.....'' یہ کہہ کر گلناز ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ترکن اب کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

''کس قدر آفت کی پڑیا ہے یہ گلناز بھی، آخر اس سے سچ اگلوا ہی لیا۔''

سوچوں کے دائرے پھیلتے جارہے تھے۔ محبت کی خوشبو کو گلے لگائے، اس کے ذہن میں ایک وسوسے نے اچانک سیندھ لگائی۔ کہیں اس نے شمس الدین کی محبت کا اعتراف کرکے غلطی تو نہیں کی۔ گلناز کا کیا اعتبار، وہ کہیں اور کسی وقت بھی اس کا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ کسی جبر کے تحت یا

پیار میں جذبۂ رقابت کے تحت پول کھول سکتی ہے۔ وہ جوشس الدین کو دیکھنے سے لے کر اب تک اتنی گہرائی اور مزے سے اس کا تذکرہ کرتی رہی ہے..... کیا وہ بھی تو اس سے محبت کے جذبوں میں ڈوبی ہوئی تو نہیں ہے۔ جس طرح وہ اپنے طور پر اس سے محبت کرتی ہے، کہیں وہ بھی ایسے ہی اس سے پیار نہ کرتی ہو اور یہ سب اس نے مجھ سے اگلوانے کا ڈھونگ رچایا ہو۔ وہ سوچ رہی تھی اور اب یہ وسوسہ بھی اس کی سوچوں کا ساتھی اور ہمراہی ہو چکا تھا۔

تو کیا اسے اپنی اس محبت کا احوال شمس الدین پر کسی نہ کسی طور کھول دینا چاہیے؟ ایک سوچ ابھری مگر فوراً ہی دوسری سوچ نے پہلی کا گلا گھونٹ دیا۔

''نہیں ترکن..... جیسا تم نے کہا۔ یہ واقعی تمہاری تذلیل کا باعث ہوگا۔ ایک لڑکی ہونے کے ناتے اسے اپنی شکست کا اعتراف کبھی نہیں کرنا چاہیے۔''

تو کیا وہ اسے حاصل کرنے کے لیے اکیلی ہی جلتی مرتی رہے گی؟ دوسری سوچ نے دلیل دی۔

''تمہاری عزت اور عظمت اسی میں ہے کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ اگر کبھی موقع ملا تو اس پر اپنی محبت کا اظہار کر دینا۔ ورنہ اس روگ کو تنہا اپنے بدن پر جھیلتی رہو۔'' پہلی سوچ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اسی کشمکش میں بڑی دیر تک وہ جاگتی رہی۔ پھر پتا نہیں کس وقت وہ نیند کی وادی میں جا اتری۔ اگلی صبح وہ بڑی کسلمندی سے اٹھی۔ تھکی تھکی سی بوجھل انداز میں۔ ابھی وہ اپنی تھکن کو اتار ہی رہی تھی کہ گلناز اس کے کمرے میں دوبارہ سے آدھمکی۔

''خانم! ساری رات میں ایک پل کو بھی سو نہیں سکی۔ میں ساری رات یہی سوچتی رہی کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ شمس الدین کے معاملے میں مجھے یہ اعتراف کر ہی لینا چاہیے مگر پھر میری یہ سوچ مجھ پر حاوی ہوگئی کہ آپ کو محبت کے اس معاملے میں مجھ پر فوقیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ آپ قدرتی حسن اور خوبصورتی میں مجھ سے آگے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ بھی ترکی ہیں اور شمس الدین بھی ترکی النسل ہے۔ اگر شمس الدین کو بھی چناؤ کا موقع دیا جائے تو وہ بھی آپ کو مجھ پر ترجیح دے گا۔ اس لیے مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ میں محبت میں بھی اور چاہت کے سلسلے میں بھی آپ سے بہت پیچھے ہوں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہے مگر آپ نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ صرف میری جھوٹی سچی باتوں پر یقین کر کے اسے پیار کرنا اور پوجنا شروع کر دیا۔ میں اس وجہ سے آج برملا اپنی شکست کو تسلیم کرتی ہوں مگر آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس معاملے میں، میں آپ کی کامیابی میں ہر طرح کا ساتھ دوں گی۔ یہ میرا آپ کے ساتھ اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ ہے۔''

یہ کہتے ہوئے گلناز کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

ترکن نے آگے بڑھ کر اس کی بھیگی آنکھوں کے پانی کو اپنی انگلیوں پر لیتے ہوئے چوم لیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''گلناز! تم واقعی عظیم ہو..... مجھ سے اور میری محبت کے جذبے سے بہت بلند ہو۔ میں ہمیشہ تمہیں مقدم رکھوں گی اور تمہارے اس جذبے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتی رہوں گی۔'' اتنا کہہ کر ترکن نے گلناز کو کھینچ کر اپنے گلے لگا لیا اور اس کی کمر کو پیار سے تھپتھپانے لگی۔

''خانم! اگر آپ مناسب جانیں تو کسی طرح میں یہ بات سلطان ایبک تک پہنچانے کی کوشش کروں کہ وہ آپ کی اور شمس الدین کی شادی کرا دیں؟'' گلناز نے ڈبڈبائی آواز میں پوچھا۔

''نہیں گلناز! اسے وقت پر چھوڑ دو۔ اگر میری محبت سچی ہوئی تو میرا رب میرے حق میں بہتر کرے گا۔'' ترکن نے ہولے سے جواب دیا، تو اب کی بار گلناز نے اس کا جواب سن کر اسے گلے لگا کر بھینچ لیا۔

☆☆☆

شہاب الدین کے قتل کے بعد ولی عہدی کا تاج ملک قطب الدین ایبک کے سر پر رکھا گیا۔ وہ اس وقت دہلی میں تھا۔ اسے اپنے محسن کی وفات پر دکھ تو بہت تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اصلاحِ مملکت کے ساتھ خیر خلق خدا کو اپنے دکھ اور غم پر مقدم جانا اور فی الفور لاہور کا رخ کیا۔ اس کی خبر اہالیانِ لاہور تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ لوگوں میں خوشی کی یہ لہر اس قدر اثر انداز ہوئی کہ لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت اس کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ ایبک بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لاہور میں داخل ہوا اور قصرِ ہمایوں میں اقامت اختیار کی۔ دوسرے روز جشن تخت نشینی منعقد ہوا اور سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کا فرماں روا بن گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد حاکم کرمان وشیروان، تاج الدین یلدوز جس کی بیٹی سے قطب الدین نے شادی کی تھی، اب ایک بہت بڑی فوج کی سربراہی کرتا ہوا لاہور کی طرف بڑھا اور حاکم جسے اس نے بعد میں نکال

باہر کیا تھا اس کی غداری کے باعث اس نے شہر پر قبضہ کرلیا۔ قطب الدین ایبک کو اس بارے میں علم ہوا تو وہ لاہور کو بازیاب کروانے کے لیے دہلی سے روانہ ہوا۔ شہاب الدین چونکہ اپنی زندگی میں کسی کو اپنا جانشین نہ بنا سکا تھا البتہ اس کے تین پسندیدہ غلام جن میں قطب الدین ایبک تھا، جسے اس نے دہلی اور دوسرے علاقہ جات ہند کو فتح کرنے کے بعد دلی کا تخت اس کے حوالے کردیا تھا۔ دوسرے غلام تاج الدین یلدوز کو حکومت کچ دکمران اور سندھ کی وسیع سلطنت دے دی تھی۔ تیسرے ناصر الدین قباچہ کو پنجاب ملتان کی عملداری دی گئی تھی۔ یہ تینوں خود کو برابر جانتے تھے۔ وہ تینوں ہندوستان کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی تگ ودو میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ تاج الدین یلدوز دہلی کی سلطنت کا امیدوار تھا اور چاہتا تھا کہ دہلی کی بادشاہت اسے ملے۔ جب اسے اطلاع ملی کہ شہاب الدین محمد وفات پاچکا ہے تو اسے یہ بات انتہائی ناگوار گزری کہ پنجاب کی حکومت قطب الدین کو مل جائے۔ چنانچہ وہ فوج لے کر پہلے غزنی پہنچا اور غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد وہ لاہور کی طرف بڑھا۔ حاکم لاہور اس کو روکنے کے لیے آگے بڑھا مگر شکست کھا کر دہلی بھاگ گیا۔ تاج الدین یلدوز نے کمال بے رحمی سے شہر میں قتل وغارت شروع کردی مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا کیونکہ لاہور کے لوگوں نے پہلے ہی اپنا اپنا مال شہر سے منتقل کردیا تھا۔ وہ انتہائی غضب کے ساتھ آگے بڑھا۔ ادھر قطب الدین ایبک اس کے مقابل آیا اور راستے ہی میں اس کا سامنا تاج الدین یلدوز کے لشکر کے ساتھ ہوا۔ ایک سخت لڑائی کے بعد تاج الدین شکست کھا کر غزنی کو بھاگ گیا۔ قطب الدین نے اس کا پیچھا غزنی تک کیا لیکن وہ نکمران چلا گیا۔ قطب الدین غزنی سے لاہور آگیا اور بہت سارو پیہ رعایا کو دے کر خوش کیا۔ اس کی اس فراخ دلی اور سخاوت کو دیکھ کر اسے سلطان لکھ بخش کا خطاب دیا گیا۔ اسے غزنی کا بادشاہ بنا دیا گیا لیکن غزنی پر قابو نہ رکھنے کے باعث وہ فوری طور پر واپس ہندوستان آگیا۔ یہاں اس نے باقی ماندہ زندگی اپنے علاقوں کو مربوط اور مضبوط کرنے اور سلطنت کے مالیات کو باقاعدہ بنانے میں گزار دی۔ اسی عرصے میں وہ ایک روز اپنے محل میں بیٹھا تھا۔ جب اس نے اپنے غلام شمس الدین کو بلایا۔ شمس الدین جب اس کی خدمت میں پہنچا تو قطب الدین ایبک نے اس سے کہا۔

''شمس الدین تم نے ایک عرصہ میری خدمت گزاری کی۔ میں نے جو کچھ تمہیں دیا، جن علاقوں کی عمل داری تمہارے سپرد کی، یہ تمہاری خدمات کے صلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں ان سب سے بڑا انعام دینا چاہتا ہوں۔''

''جہاں پناہ! آپ نے جو کچھ میرے لیے کیا اور جو عنایات مجھ پر کیں، وہ میری اوقات سے کہیں بڑھ کر ہیں۔'' شمس الدین نے انکساری سے جواب دیا۔

''نہیں شمس الدین، یہ تمہاری وفاداری اور انکساری بول رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے جب تک حاکم اور خریدار اپنے غلام کو اجازت نہ دے، وہ شادی کے بندھن میں نہیں بندھ سکتا۔'' قطب الدین بولا۔

''میں جانتا ہوں عالی جاہ..... خوب واقف ہوں اس قانون سے.....''

''تو پھر میں تمہیں آج اجازت دیتا ہوں کہ اپنی پسند کی کسی لڑکی کا انتخاب کرکے اس سے شادی کرلو۔ میرے محل میں بے شمار کنیزیں موجود ہیں جو تمہاری طرح اسی اجازت کی منتظر ہیں۔'' قطب الدین نے اسی لہجے میں کہا۔

''حضور! آپ نے ساری عمر میری راہنمائی کی اور ساری عمر مجھے اپنی نوازشات کے سائے میں رکھا۔ کیا میں اتنی گستاخی کرکے آپ کا اور اپنے رب کا گناہ گار ہوسکتا ہوں۔ آپ کو نہ صرف مجھ پر بلکہ اس فیصلے کا بھی اختیار ہے۔'' شمس الدین نے جواب دیا۔

''پھر بھی اگر کوئی تمہاری نظر میں ہو۔ وگرنہ مجھے یاد پڑتا ہے، میرے محل میں ایک ترکی نژاد لڑکی بھی موجود ہے جس کا نام شاید ترکن ہے۔ اگر تم چاہو.....'' اس نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔

''مالک..... میں یہ اختیار پہلے ہی آپ کو دے چکا ہوں۔ اب آپ بار بار مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں اس کنیز سے بھی بات کرلوں پھر کوئی اگلا قدم اٹھائیں گے۔ بہرحال تم تیار رہو۔ اگلی باتیں تب ہی ہوں گی، جب میں اس بارے میں پوچھ نہ لوں.....''

''ٹھیک فرمایا آپ نے مالک.....'' شمس الدین نے جواب دیا اور واپس آگیا۔

اس کے کچھ ہی روز بعد محل میں بڑی ہلچل ہوئی۔ محل کا ہر خاص وعام خادم اور کنیزیں راہداریوں میں بڑی تیزی سے ادھر ادھر آجارہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آج سلطان خصوصی طور پر محل میں آنے والے تھے۔ اس لیے اس کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ کنیزیں اور باندیاں بڑے اجلے اور

رنگین وخوبصورت لباس پہنے بڑی خوش نظر آرہی تھیں۔ گلناز تو خاص طور پر بڑی تیاری کر چکی تھی۔ اس کی نسبت ترکن خاتون بڑے سادہ لباس میں تھی کہ معاً چوبدار نے آواز بلند کی کہ سلطان معظم قطب الدین ایبک کی تشریف آوری ہو چکی ہے اور تمام کنیزوں کے علاوہ خادمین کو ایک کمرائے خاص میں بلایا گیا ہے۔

جب تمام لوگ آ چکے تو قطب الدین ایبک اپنی زوجہ ملکۂ عالیہ کے ہمراہ آ کے کمرائے خاص میں براجمان ہوئے۔ شہاب الدین غوری کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ اس لیے اس نے ایبک کو شجاع ودلیر، سخی، فیاض اور فرماں پذیر دیکھ کر اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ ترکی نژاد ہونے کی وجہ سے شجاعت تو قطب الدین کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ فیاضی میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کو لکھ بخش اور لکھ داتا کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ اس روز سلطان ملکۂ عالیہ کے ہمراہ کمرائے خاص میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بے شمار کنیزیں اپنی شادی کی عمروں کو پہنچ چکی ہیں۔ ''میں بھی کس قدر بدنصیب ہوں کہ میری زیر کفالت اتنی کنیزیں ابھی تک غیر شادی شدہ بیٹھی ہیں۔ مجھے اس کی پہلے کیوں خبر نہ ہوئی۔'' سلطان نے اپنی ملکہ کے کان میں کہا۔

''آج اگر قدرت نے آپ کو موقع فراہم کر دیا ہے تو اپنے اس فرض سے بھی عہدہ برا ہو جائیں۔'' ملکۂ عالیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا چنانچہ اس نے فوری طور پر شاہی نکاح خواں کو طلب کیا۔

جب وہ آ چکا تو کنیزوں سے پوچھ پوچھ کر ان کے نکاح غلاموں سے کر دیے۔ آخر میں صرف ترکن خاتون رہ گئی تھی جو کمرے کے ایک کونے میں زمین پر نظریں گاڑے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ اس کو بھی طلب کیا گیا۔

''یہ میری خاص کنیز ہے سلطان معظم..... اس کو اس کی پسند کا بر ملنا چاہیے۔ یہ میری خصوصی التجا ہے۔'' ملکۂ عالیہ نے سلطان معظم کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''آپ کیوں فکرمند ہو رہی ہیں۔ میں نے اس کے لیے خوبصورت اور ذہین نوجوان چن رکھا ہے۔ وہ نوجوان جس نے میرے لیے ہمیشہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر میری تابعداری کی ہے۔ اسے ذرا قریب بلواؤ۔''

ملکۂ عالیہ نے اسے اشارہ کیا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

''ملکۂ عالیہ نے آپ کی بڑی سفارش کی ہے۔ سنا ہے آپ ان کی کنیز خاص ہیں۔'' سلطان نے مسکراتے ہوئے ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ان کی کرم نوازی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔'' ترکن خاتون نے اردو اور فارسی کے ملے جلے لہجے میں جواب دیا۔

''خوب! آپ کا تعلق ترکی سے بتایا جاتا ہے۔''

''جی عالم پناہ.....'' ترکن نے آہستگی سے جواب دیا۔

''آج میں آپ کو جو تحفہ دینے والا ہوں، وہ ظاہری شکل وصورت میں بھی اتنا ہی خوبصورت ہے جتنا اپنی سیرت اور اپنے کردار کی وجہ سے کیونکہ اس کی تربیت شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحادالدین کرمانی اور اس زمانے کے محترم بزرگوں نے کی۔ اس نے اپنا کچھ وقت بغداد میں بھی گزارا جو منگولوں کے ذریعے دیے گئے خونی غسل سے پہلے اپنی متمدن زندگی کے آخری دور سے گزر رہا تھا۔ صوفیا سے اس تعلق نے اس کے نوخیز ذہن پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ وہ اپنے بچپن کا ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتے ہوئے بتانے سے بھی نہیں ہچکچاتا کہ ایک مرتبہ جس معزز خاندان نے اسے خریدا تھا، ان کے ایک فرد نے اسے ایک معمولی سی رقم دی کہ بازار جاؤ اور ان کے لیے کچھ انگور لے آؤ۔ راستے میں اس سے پیسا گم گیا۔ چونکہ اس وقت وہ بہت کم عمر تھا، لہٰذا ڈر کے مارے رونے لگا۔ اسے روتے دیکھ کر راہ چلتے ایک درویش نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

''کیوں رو رہے ہو بچے۔ کیا کچھ گم ہو گیا ہے یا پھر راستہ بھول گئے ہو؟''

''مجھے میرے مالک نے انگور لانے کے لیے پیسے دیے تھے مگر وہ پیسا مجھ سے کہیں گم ہو گیا ہے۔ اب واپس جاؤں گا تو مالک مجھ سے ناراض ہوگا۔'' اس نے روتے ہوئے درویش کو بتایا۔

''چلو آؤ میرے ساتھ میں تمہیں انگور دلواتا ہوں مگر مجھ سے وعدہ کرو جب تمہیں طاقت واقتدار حاصل ہو جائے گا تو تم پرہیزگاروں اور درویشوں سے عزت واحترام سے پیش آؤ گے اور ان کی بھلائی کا خیال رکھو گے۔ چنانچہ اس نے درویش کو قول دیا اور آج تک وہ اپنی اس بات کو نبھا رہا ہے۔ میں اسے بیٹوں کی طرح پیار کرتا ہوں، اس کا تعلق بھی تمہارے ملک ترکی سے ہے۔ تمہیں تجسس ہوگا کہ وہ کون ہے تو سنو..... اس کا نام شمس الدین تھا مگر آج سے وہ السلطان معظم شمس الدنیا والدین ابوالمظفر التمش ہے۔ مرکز دہلی پر چم سیاہ وسرخ ہے اور تمہارے ساتھ اس کے لیے خوشخبری ہے کہ آج سے میں اسے اپنی غلامی سے آزاد کر رہا ہوں کیونکہ یہ میرے

مالک کی خواہش تھی اور تم ترکن خاتون آج سے اس کی زوجیت میں آنے کے بعد ترکن خاتون نہیں بلکہ شاہ ترکان ہو۔ کہو تمہیں نیا لقب پسند آیا اور کوئی اعتراض تو نہیں؟'' قطب الدین ایبک نے اس سے پوچھا تو شاہ ترکان نے اظہارِ تشکر سے اپنا سر جھکا لیا اور نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

''میری خوش بختی ہے، سلطانِ معظم اور مجھے آپ نے یقیناً ایک بہت عظیم اور بڑے تحفے سے نوازا ہے جس کے لیے میں آپ کی زندگی بھر شکر گزار و ممنون رہوں گی۔'' شاہ ترکان نے انکساری سے جواب دیا۔ تب سلطان قطب الدین ایبک نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ارے، وہ شمس الدین کدھر ہے؟ اسے بلاؤ تاکہ دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔'' سلطان کی آواز سن کر ایک غلام بھاگتا ہوا گیا اور کچھ ہی لمحوں بعد شمس الدین التمش کو بلا لایا جو اس وقت مردانے میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آقا سلطان قطب الدین کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔ غلام اسے لے کر آیا تو قطب الدین نے وہی بات اس کے سامنے دہرا دی۔ پھر شاہی نکاح خواں کو اشارہ کیا جس نے دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ اس کے بعد شاہی جشن میں اور تندی و تیزی آگئی۔ ہر چہرے پر خوشیاں رقصاں تھیں، نئے بیاہتا جوڑے شرماتے مسکراتے ایک دوسرے کو دیکھ اور خوش ہو رہے تھے۔

''خوش قسمت ہیں خانم..... میں نے کہا تھا نا کہ آپ محبت میں مجھ سے ارفع ہیں۔ یقیناً آپ کی ثابت قدمی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کبھی کبھی تالی ایک ہاتھ سے بھی بج اٹھتی ہے۔ آج آپ کو آپ کا پیارل گیا ہے جو آپ کا حق تھا۔ میری طرف سے بھرپور مبارک باد قبول کیجیے۔'' گلناز نے اس کے چہرے کے قریب آکر آہستگی سے کہا تو شاہ ترکان نے اسی وقت بلا خوف و خطر اس کے اپنے اوپر جھکے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کے چہرے کو سمیٹا اور خوشی کے ساتھ پیار بھرے انداز میں اسے چوم لیا۔

''آج کا دن بلاشبہ ایک نہایت سعادت مند اور نیک ساعتوں سے بھرا ہوا ہے عالم پناہ..... آج واقعی آپ نے برسوں کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا ہے۔ اس کی جزا آپ کو خدا دے گا۔ آپ نے بہت سی نیکیوں کو اپنی جھولی میں ڈال لیا ہے۔'' ملکۂ سلطان نے کہا تو قطب الدین مسکرا دیا۔

سلطان قطب الدین ایبک چوگان (پولو) کا ایک منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ اس کھیل کے لیے اس نے کئی نسیم کے اعلیٰ نسلوں کے عربی، ترکی اور ہندوستانی گھوڑے پال رکھے تھے۔ اسے جب اپنے حکومتی کاموں سے فرصت ملتی تو وہ چوگان کھیلنے میں وقت گزارتا۔ کھیل کے لیے اس نے لاہور میں ایک وسیع میدان وقف کر رکھا تھا۔ ایک دن..... وہ اپنے بہترین گھوڑے پر سوار ہو کر چوگان کھیل رہا تھا کہ اچانک اس کا توازن بگڑا اور وہ گھوڑے سے گرا اور زین کا اگلا حصہ جو لوہے کا بنا ہوا تھا اس کے سینے پر اس زور سے لگا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا اور وہیں فوت ہو گیا۔ ایبک کے دور میں پنجاب کا دارالخلافہ لاہور مسلمان علما و فضلاء کا مرکز تھا۔ اس زمانے میں شہر لاہور نیک و صالح اور بزرگ و ولی اللہ شخصیات سے بھرا پڑا تھا اور یہاں کی نوے فیصد آبادی زیورِ علم سے مزین تھی۔ یہاں فخر مدبر، مبارک شاہ اور تاج الدین حسن نظامی جیسے محققین اور مؤرخین، شیخ عبدالعزیز مکی، شیخ احمد تونسہ ترمذی، شیخ یعقوب زنجانی جیسے صوفیا اور ولی اللہ شامل تھے۔ اس وقت تمام شمالی ہندوستان مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا اور لاہور مرکزِ اسلام ہندوستان شمار کیا جاتا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے رعایا پروری اور عدل و انصاف میں ایک مثال قائم کر رکھی تھی اور کسی شخص کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ رعایا کو ستائے یا ان سے زبردستی خراج و تاوان وصول کرنے کی جرأت کر سکے۔ قطب الدین ایبک کو لاہور ہی میں دفن کیا گیا۔ بعد میں سلطان شمس الدین التمش نے اپنے آقا کا ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا جو آج بھی اپنی آن بان کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

جب التمش ہندوستان کا سلطان بنا، اس وقت اس کا پہلا حریف علاؤالدین یلدوز تھا جس نے اسے غزنی سے چترشاہی (سائبان) اور دوربا ش (شاہی سواری کے آگے آگے جانے والا دوشاخہ برچھا) سے شرف بخشا۔ محض یہ جتانے کے لیے کہ اس کی وفاداریاں التمش کے ساتھ ہیں مگر بعد میں وہ بغاوت پر اتر آیا۔ اسے یہ گھمنڈ بھی تھا کہ قطب الدین ایبک اس کا داماد ہے۔ اس لیے دہلی کی سلطنت اس کا حق ہے۔ جب خلاف توقع شمس الدین التمش کو حکومت ملی تو وہ اس کا مخالف ہو گیا۔ چنانچہ التمش نے سب سے پہلے اس کی سرکوبی کی۔ التمش کا دوسرا بڑا مخالف پنجاب کا حاکم ناصر الدین قباچہ تھا۔ وہ نہایت زیرک، قابل اور عقل مند تھا۔ اس نے ہر موقع پر سلطان معزالدین کی خدمات انجام دیں۔ وہ فوجی اور ملکی معاملات میں بے حد لیاقت رکھتا تھا۔ جب سلطان معزالدین کا قراختا کی سلطنت کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو ملک ناصر الدین تمیر جو اُچ کا حاکم تھا۔ اس جنگ میں مارا گیا تو اس کے بجائے سلطان معزالدین نے

Digitized by Google

ناصر الدین قباچہ کو اچ میں حاکم بنا دیا۔ چنگیز خاں کے وسط ایشیا، میں یہ ترکان قراختا کی قدیم سلطنت تھی جس کی حدود وہی تھیں جو آج مشرقی ترکستان کی ہیں۔ یہاں اس وقت گورگانی یا گورخانی شاہوں کا سلسلہ حکومت کرتا تھا۔ جو ہمسایہ ملک ایران اور ماوراالنہر کے باج گزار تھے۔ چنگیز خاں کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ گورگانیوں کی غلامی کرے یا ان کے خلاف بغاوت کرے چنانچہ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور تھوڑے عرصے میں کاشغر، ختن اور یارقند کو فتح کرنے کے بعد آہستہ آہستہ قراختائیوں کے باقی علاقے بھی چھین لیے۔ پھر اس نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ خوارزم خراسان اور افغانستان پر چڑھ دوڑا۔ دوسرا حصہ آذربائیجان، گرجستان اور جنوبی روس پر حملہ آور ہوا اور ایک دستہ چین میں گھس گیا۔ قراختا لشکر تاتاریوں کی یلغار سے بچتا ہوا شکست خوردہ ہو کر بھاگا تو سلطان معزالدین کو محسوس ہوا کہ یہ لوگ ہندوستان میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لیے اس نے ان کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ ناصر الدین قباچہ بھی معزالدین کے ساتھ تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اچ، ملتان، سندھ اور ہسند کی مملکتیں کہرام سے سرستی تک کا علاقہ اس نے اپنے قبضے میں کر لیا اور چند مرتبہ لاہور پر بھی قبضہ کیا اور سلطان تاج الدین یلدوز کے لشکر سے جو غزنی سے آیا تھا کے ساتھ مقابلہ کیا اور ایک بار خواجہ موید ملک سنجر سے جو غزنی کا وزیر مملکت تھا، اس سے بھی شکست پائی۔ جب سندھ کی حکومت پر اس کا قبضہ ہو گیا تو بہت سے اکابر چنگیز خاں کے حملے کے ڈر سے اس کے پاس آ گئے۔ اس نے ہر ایک کے مرتبے کے مطابق ان کو انعام واکرام دیا۔ 1224ء میں مغلوں نے چالیس دن تک ملتان کا محاصرہ رکھا۔ ناصر الدین قباچہ نے اس موقع پر نہایت ہمت و مردانگی سے کام لیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد خوارزم کے ساتھ جنگ میں اسے شکست دی اور خلیج کے خان کو ہلاک کر دیا۔ ناصر الدین قباچہ کی شمس الدین التمش کے ساتھ پنجاب اور سندھ کے علاقوں میں مڈبھیڑ رہی۔ بالآخر سلطان شمس الدین التمش نے قباچہ کو بیاس کے کنارے شکست دی۔ مزید علاقوں پر حملے اور ان میں شکست کے بعد قباچہ نے بیٹے کو سلطان شمس الدین کی خدمت میں بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ سلطان شمس الدین اس سے پہلے یلدوز کے ساتھ صلح اور پھر اس کی بغاوت سے سبق حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے یہ شرط لگائی کہ قباچہ اگر صلح کا خواہش مند ہے تو وہ خود آئے۔ بہادر اور جری سلطان کو یہ کہاں گوارا تھا کہ وہ خود سلطان شمس الدین التمش کے پاس جا کر صلح کی بھیک مانگے۔ چنانچہ وہ بھکر کے قلعے کی فصیل پر چڑھا اور دریا میں کود کر جان دے دی۔

اس سے پہلے.... سلطان نے لکھنوتی کی جانب لشکر کشی کی تو غیاث الدین عوض خلجی نے ہتھیار ڈال دیے اور وفاداری قبول کر لی، اس نے اڑتیس ہاتھی اور اسی لاکھ روپے نذر کیے اور شمس الدین کے نام کا خطبہ لکھنوتی میں جاری کر دیا۔ جب سلطان نے اچ کا قلعہ فتح کیا تو اس کا خزانہ اور قباچہ کا باقی ماندہ لشکر بھی سلطان کے قبضے میں آ گیا۔ قباچہ کا بیٹا بہرام شاہ پہلے ہی سلطان التمش کی بارگاہ میں آ چکا تھا۔ اس طرح سندھ ساحل سمندر تک التمش کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سلطان شمس الدین جہاں بغاوتوں اور اردگرد کی سلطنتوں کو فتح کر رہا تھا۔ وہاں اسے اپنی رعایا اور سپاہ کا بھی بے حد خیال رہتا تھا۔ یہ اسی کی بہادری کا صلہ تھا کہ جہاں ناصر الدین قباچہ کے ساتھ قطب الدین ایبک نے یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں بیاہی تھیں۔ وہیں اس کی ایک بیٹی نادرہ بیگم شمس الدین کے عقد میں بھی آ چکی تھی جس کا شاہ ترکان کو بے حد رنج تھا۔

☆☆☆

شاہ ترکان جب سے سلطان شمس الدین التمش کی بیوی بنی تھی، اسے ملکہ کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اب اس کی عادات میں بھی خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب وہ ہر معاملے میں خود کو دوسروں سے منفرد اور اونچے رتبے کی مالک سمجھنے لگی تھی۔ اس کی ان عادات کو بگاڑنے میں اس کی کنیز خاص گلناز کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کے خلاف شاہ ترکان کے کان بھرتی رہتی۔ اس طرح دونوں مل کر دن رات سازشوں میں مصروف رہتی تھیں۔ شاہ ترکان کو مزید رنج اس وقت ہوا جب التمش کے ساتھ اس کی شادی کے کچھ عرصے بعد قطب الدین ایبک نے اپنی بیٹی نادرہ بیگم کو سلطان کے عقد میں دے دیا۔ تب ہی گلناز نے ایک رات اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک انکشاف کیا اور بولی۔

''خانم! اب آپ یہ پوچھیں گی کہ میں اتنے اتنے دن کہاں رہتی ہوں اور آپ کی خدمت میں بھی کوتاہی کیوں برتنے لگی ہوں؟ یہ بدبخت نصیبوں ماری بھی کیا کرے۔ اب وہ چھوٹی ملکہ عالیہ ہی میری جان نہیں چھوڑتیں۔ کبھی کسی کام میں کوتاہی ہو جائے یا پھر تاخیر ہو جائے تو ڈانٹنے لگتی

Digitized by Google

ہیں۔ مجھے تو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں میری شکایت سلطان معظم سے نہ کر دیں۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں ہوں نا.....'' شاہ ترکان نے اسے تسلی دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، میری تو ہر وقت یہی دعا رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم پر سدا سلامت رکھے۔ ایک آپ ہی تو ہیں جو ہمارا دھیان رکھتی ہیں۔ سلطان معظم کو تو فرصت ہی نہیں رہتی اور پھر وہ چھوٹی بیگم صاحبہ کے اگلے تگلے کریں یا دوسری طرف دھیان دیں۔ ان کی بھی مجبوری ہے۔ چھوٹی ملکہ سلطان ایبک کی بیٹی جو ہوئی۔ میں بڑے دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ آپ کی طرف بھی کم کم توجہ دیتے ہیں، کیا میرا اندازہ درست ہے؟'' یہ کہہ کر گلناز چپ ہوئی تو شاہ ترکان نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔

''نہیں گلناز! تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں بھی کتنے دنوں سے یہی محسوس کر رہی ہوں۔''

''آپ نے اس کا گلہ نہیں کیا؟'' گلناز نے اگلا سوال کر دیا۔

''کیا تھا مگر وہ میری باتوں پر دھیان ہی کب دیتے ہیں۔ میری باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ اگر ذرا سا اصرار کروں تو آگے سے ان کا جواب ہوتا ہے۔''

''شاہ ترکان عورت جب بچوں کے جھمیلے میں پڑ جاتی ہے تو اسے تمہاری طرح کے وسوسے ستانے لگتے ہیں۔ اللہ کی طرف دھیان دیا کرو۔ خود بخود ایسے شکوے شکایت ختم ہو جاتے ہیں۔'' شاہ ترکان نے گلہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تو سمجھتی تھی کہ سلطان التمش آپ کی خوبصورتی اور حسن کی مٹھی میں بند ہوں گے۔'' گلناز نے ایک اور ہوائی اڑائی۔

''ارے کہاں کا حسن اور کہاں کی خوبصورتی۔ پہلے تو ایک ہی سوتن تھی۔ سنا ہے اب ایک اور اس سے بھی اوپر کی آ گئی ہے۔'' شاہ ترکان شکوے کے موڈ میں تھی۔

''ہاں..... مجھے بھی خبر ملی ہے کہ نادرہ بیگم کے اوپر کوئی قطب بیگم بھی آ پہنچی ہیں۔ لگتا ہے یہ بھی کسی امیر یا سلطان کی بیٹی ہوگی۔ اب تو مجھے تشویش یہ ہونے لگی ہے کہ آپ کے رتبے میں اور بھی کمی آ جائے گی۔ یہ بھلا ملکاؤں والا حال ہے۔ نہ بادشاہوں والا رہن سہن ان کی طرح ٹھاٹ باٹ خانم! اللہ جھوٹ نہ بلوائے، وہ آپ کے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ کچھ تو کیجیے اپنے لیے نہ سہی اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے..... ورنہ سب دوسری بیگمات لے اڑیں گی اور آپ صرف ہاتھ ملتی رہ جائیں گی۔ لیجیے میں تو چلی، کہیں میری ڈھنڈیا نہ پڑ جائے۔'' اتنا کہہ کر گلناز چلی گئی اور شاہ ترکان کو اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا چھوڑ گئی۔

یہ گلناز کا معمول بن چکا تھا۔ اسے جب بھی ذرا فرصت ملتی، وہ شاہ ترکان کے پاس ہلاحیل وحجت آ جاتی اور ایسی باتوں سے اس کے کان بھر کر چلی جاتی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ شاہ ترکان کا مزاج چڑچڑا اور شکی ہونے لگا تھا۔ وہ جب بھی تنہائی میں بیٹھتی، یہی سوچتی رہتی کہ سلطان التمش کو کس طرح اپنے قابو میں لا پائے گی۔ اس نے کئی بار تنہائی میں اپنی نازوادا کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلطان التمش کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

''ہندوستان کا ایک بااختیار شہنشاہ ہو اور اتنی سادہ زندگی گزارے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے۔ آپ سلطان ہی نہیں ہیں۔'' ایک رات وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

''پھر آپ کو میں کیا نظر آتا ہوں؟'' سلطان التمش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کسی خانقاہ کا مجاور یا کوئی درویش فقیر.....'' شاہ ترکان نے ادا سے کہا۔ وہ اپنے آپ کو اب بھی ہندوستان کی تنہا وارث سمجھتی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ سلطان کے سامنے گستاخ بھی ہو جاتی تھی۔

''درویشی ہی اصل زندگی ہے۔'' سلطان نے نہایت شیریں لہجے میں اپنی کم فہم ملکہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''بھلا شاہوں کو یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ وہ فقیرانہ زندگی اختیار کریں۔'' شاہ ترکان نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''پھر تم ہی مجھے مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' سلطان التمش نے استفسار کیا۔

''ایسے جاہ وجلال کا مظاہرہ کریں، ایسا پُرشکوہ دربار لگائیں کہ ایک عالم اس کے سامنے آ کر سر کو جھکائے اور آپ کے دربار کی دوسری مثال نظر نہ آئے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میرے پاس وافر خزانے اور دولت ہو۔ سونے چاندی اور جواہرات پر میرا اوپر اوپر تصرف ہو مگر ہمارے ہاں کیا ہے۔ نہ محفل رقص وسرود، نہ بزم ناؤنوش نہ ہنگامہ خیز تقریبات، نہ جشن اور نہ کوئی تفریحی پروگرام۔ کوئی تو ایسی بات ہو کہ انسان کا دل بہلے اور تو اور ہمارے دربار میں تو رسم سجدہ کا بھی اہتمام نہیں ہوتا۔ یقین کیجیے جان ترکان، ایسی تقریبات سے خواہ مخواہ انسان میں جینے کی امنگ بڑھتی ہے۔'' شاہ ترکان بولے جا رہی تھی، تب سلطان التمش نے اس کو ٹوکتے

Digitized by Google

ہوئے کہا۔

''میں انسان ہوں شاہ ترکان کوئی خدا نہیں کہ لوگوں کے سر میرے دربار میں جھکے ہوئے رہیں۔ میں تو خدا کا حقیر بندہ ہوں جو اس قدر نوازے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔'' سلطان نے انکساری سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کے اسی انکسار نے تو آپ کی رعایا کو خودسر بنا دیا ہے۔ یہ روز روز کی بغاوتیں اسی وجہ سے ہیں۔'' شاہ ترکان نے گفتگو کا زاویہ بدلا۔ ''میں آپ کو بھی دنیا کے دوسرے شہنشاہوں کی طرح جاہ وجلال اور کروفر سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میرے لیے بھی ایسا کچھ نہیں کرسکتے.....'' شاہ ترکان نے اپنی گفتگو کو جذباتی رنگ دیتے ہوئے پوچھا۔

''بغاوتوں کی وجہ میرا انکسار نہیں شاہ ترکان..... لوگ بھی تمہاری طرح قناعت پر گزارہ نہیں کرتے اور وہ مزید کے بعد اور کے چکروں میں ہوتے ہیں۔ ان کی یہی خواہشیں انہیں جینے نہیں دیتیں اور وہ اپنی بڑھتی ہوئی خواہشوں کو گھٹانے کے بجائے انہیں پورا کرنے کے لیے غلط حربے استعمال کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہی وہ بغاوتیں ہوتی ہیں جو تمہیں اور مجھے امتحانوں میں ڈالتی ہیں۔ یہ بغاوتیں سیاسی کھیل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی رنگ وروپ میں ہر سلطنت اور حکومتوں میں جاری رہتے ہیں۔'' التمش نے بڑے دھیمے اور باوقار انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔

''مگر میں کچھ نہیں جانتی۔ میں آپ کو شاہانہ جبروت کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' شاہ ترکان کی سوچ وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

اس روز کی ناکامی کے بعد بھی شاہ ترکان نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے کچھ ہی دن بعد گلناز پھر شاہ ترکان کے پاس آئی اور آتے ہی بولی۔

''توبہ ہے خانم! پتا نہیں تمہاری محبت کا کونسا جادو ہے جو آپ نے مجھ نگوڑی پر کر ڈالا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے مجھے تو ہر وقت آپ ہی کی فکر رہتی ہے اور ایک آپ ہیں کہ خود سے بھی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ خانم! میری باتوں پر دھیان دو۔ آپ جس جگہ رہ رہی ہیں۔ وہاں ایک نہیں، دو دو سوتنیں آپ پر بیٹھی ہیں۔''

''مجھے کیا فکر ہے۔ میری فکر کرنے والی میری عزیز ترین سہیلی گلناز جو موجود ہے۔ جس کی نظریں کل کی ہر ہر خبر پر ہیں۔ اب کیا ہوگیا؟'' شاہ ترکان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر جو مقام آپ کا ہے، وہ میرا تو نہیں ہے۔ ابھی نئی سنو، کل مجھے چھوٹی ملکہ نادرہ بیگم نے بلایا تھا۔ میں ادھر گئی تو دونوں ملکائیں کمرائے خاص میں محفل جمائے بیٹھی تھیں۔ میرے جاتے ہی دونوں باتیں کرتے کرتے خاموش ہوگئیں اور اشاروں میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے لگیں۔ اب بتاؤ بھلا خانم! تمہاری یہ باندی اندھی ہے کہ وہ ان اشاروں کو نہ سمجھ سکے۔ کچھ دیر بعد نادرہ بیگم بولیں۔

''اری گلناز! تو کیا ہر وقت اس کنیز کے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ تجھے پتا بھی ہے کسی کو بھی تجھ سے کام ہوسکتا ہے۔ یاد رکھو، اگر وہ ملکہ بن گئی ہے تو یہ اس کی قسمت ورنہ تم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے.....''

کنیز کا نام سن کر شاہ ترکان بھڑک اٹھی۔ ''تو کیا انہوں نے یہی لفظ کہے تھے؟ تم نے یہ الفاظ خود سنے ہیں۔'' شاہ ترکان غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں خانم..... میں نے دوسرے لوگوں سے سنا ہے کہ وہ آپ کو اس سے زیادہ حیثیت نہیں دیتیں۔''

''ہوں..... ان کی یہ مجال.....'' شاہ ترکان کا غصہ اسی طرح برقرار تھا۔

''میں تو جانتی ہوں خانم کہ کم نسبت ہونے کی وجہ سے سلطان بھی آپ کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور دوسری بیگمات بھی اسی لیے آپ کی قدر نہیں کرتیں۔ اب پتا نہیں آپ کیا سمجھیں لیکن میرے ذہن میں لاکھ سوچنے کے بعد یہی نکتہ سامنے آتا ہے۔'' گلناز نے اپنا نیا حربہ استعمال کرتے ہوئے اپنی اہمیت جتائی۔

''تم درست کہتی ہو گلناز..... میں آج تک اپنی سوتنوں کو ایک باوقار مقام دیتی آئی ہوں اور انہیں ہر بات میں عزت دی ہے۔ لیکن میں نے ان کی طرف سے اپنے ساتھ رویے کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ آج تمہارے بتانے پر وہ سارے معمولی معمولی واقعات بھی میرے ذہن میں آنے لگے ہیں جنہیں میں اپنے بڑے پن سے نظر انداز کرتی چلی آئی ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا پیار ہی دیکھا ہے، ان پر نچھاور ہونے والی میری محبت دیکھی ہے، میرا انتقام نہیں دیکھا۔ گلناز! اگر میں کسی سے محبت کرتی ہوں تو انتہا درجے کی محبت کرتی ہوں اور اگر نفرت کرنے لگوں تو نفرت بھی انتہا کی کرتی ہوں۔ میری محبت کی تم گواہ ہو۔ بتاؤ کیا میں نے غلط کہا ہے؟'' شاہ ترکان غصے سے بولی۔

''میں جانتی ہوں خانم! آپ نے سلطان عالم سے محبت کی۔ اگرچہ آپ کی محبت یکطرفہ تھی مگر اس میں انتہا تھی

Digitized by Google

اور میں تو اکثر آپ کا اس سلسلے میں مذاق اڑایا کرتی تھی مگر آپ کی محبت میں استقامت دیکھ کر کبھی کبھی میں خود حاسد ہو جاتی تھی مگر یہ ساری باتیں ان کو..... کون سمجھائے۔''

''وہ اگر حساس ہوئیں اور ذی شعور ہوئیں تو آئندہ میرا رویہ انہیں خود سمجھا دے گا کہ میں انہیں کیا سمجھتی ہوں۔ رہی بات سلطان التمش کی..... تو میں جانتی ہوں کہ پانی کا قطرہ قطرہ بھی کسی پتھر پر پڑے تو بالآخر اس میں گڑھا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میں اپنی باتوں کے پانی کا قطرہ قطرہ ان کے جذبوں کے سخت پتھر پر مسلسل گرا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی جاؤں گی لیکن مجھے تمہارے ساتھ کی اس معاملے میں ضرورت رہے گی۔'' شاہ ترکان نے بالآخر اپنے ذہن کی بات زبان پر لا ہی رکھی۔

''میں تو کیا خانم، میری جان بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ نے میرے لیے آج تک جو کچھ کیا ہے، جو احسانات میری زندگی پر کیے ہیں، میں تو دوسرے جنم میں بھی ان احسانات کو نہیں بھلا پاؤں گی۔ آپ کسی بھی کٹھن سے کٹھن حالات میں مجھے آزما دیکھیں۔ انشاء اللہ میں آپ کی آزمائش پر پورا اتروں گی۔'' گلناز نے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے پرجوش انداز میں جواب دیا۔

''بس گلناز! مجھے یہی چاہیے تھا۔ اب اگر وہ امیر زادیاں اور سلاطین کی صاحبزادیاں خود کو اتنا شاطر جانتی ہیں تو ہم بھی ان سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ بس آج سے تمہاری یہ ذمے داری ہے کہ تم ان پر ہر طرح کی نظر رکھو۔ ان کی باتوں پر دھیان دو۔ باقی میں خود دیکھ لوں گی۔'' شاہ ترکان نے جواب دیا تو گلناز کو ایک دم یوں لگا جیسے اس کا برسوں کا منصوبہ کامیاب ہو گیا ہو۔ اب وہ ہر طرح سے شاہ ترکان کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی تھی اور اپنے مقاصد حاصل کر سکتی تھی۔

اس روز ایک بار پھر شاہ ترکان کو سلطان التمش کے ساتھ تنہائی کا موقع مل گیا۔

''پھر جانِ ترکان آپ نے میری باتوں سے متعلق کیا سوچا؟ آپ کی خاموشی اور مجھ سے بے اعتنائی مجھے کوئی اور عندیہ دے رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ میری باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔'' شاہ ترکان نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی۔

''نہیں شاہ ترکان! میں بہت اہمیت دیتا ہوں اپنی شریکِ حیات کی باتوں کا..... مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے لیے یہ ممکن نہیں جو تم چاہتی ہو کیونکہ میری سرشت میں ہی ایسی باتیں اور سوچیں نہیں ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، میں فرماں روائے ہند ہونے کے علاوہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید بھی ہوں۔'' سلطان التمش نے پھر سے وہی بات دہرائی تو شاہ ترکان سٹپٹا کر بولی۔

''اسی فقیر کی محبتوں نے تو آپ کی عادتوں کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' شاہ ترکان کو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ جذبات میں کتنی بڑی بات اور کس کے بارے میں کیا کہہ گئی ہے۔

''حدِ ادب..... شاہ ترکان حدِ ادب۔'' سلطان التمش پہلی بار اپنے مرشد کے بارے میں ایسی اہانت آمیز گفتگو پر غضب ناک ہو کر بولا۔ ''تمہیں اندازہ ہے کہ اس مردِ کامل کی صحبتوں نے مجھے بگاڑا نہیں بلکہ اجلا کر رکھ دیا ہے۔ اسی نے مجھے ایک حقیر غلام سے شہنشاہ بنا دیا۔ کل تک گلی کوچوں کی اڑتی بکھرتی خاک تھا میں..... مگر جب میں نے اس کے قدموں کو چھوا تو میں اکسیر بن گیا۔''

حضرت قطب بختیار کاکی کا نام لیتے ہی سلطان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

شوہر کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر شاہ ترکان سہم گئی۔ تھوڑے توقف کے بعد سلطان التمش پھر بولا۔

''تجھے کیا معلوم شاہ ترکان میرا ماضی کس قدر تاریک تھا۔ اس دور کو سوچتے ہوئے میں خود کانپ جاتا ہوں مگر عشق کے اندھوں کو کیا پتا کہ یہ درویش لوگ کون اور کیا ہوتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ ان کی نگاہِ کیمیا میں کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے آج بھی وہ واقعہ نہیں بھولتا۔ وہ واقعہ آج بھی روزِ روشن کی طرح مجھ پر واضح اور صاف ہے، جب میں بغداد میں اپنی ابتدائی زندگی کا زمانہ بسر کر رہا تھا۔ ایک دن میرے مالک نے کچھ درویشوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ پھر محفلِ سماع آراستہ ہوئی۔ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری اس مجلسِ عرفانی کے صدر تھے۔ میں رات بھر شمع لیے ان کے درمیان کھڑا رہا۔ صوفیاء کبھی کبھی حالتِ وجد میں نعرہ ہائے مستانہ بلند کرتے رہے۔ صبح کے قریب قاضی صاحب نے مجھ پر نگاہِ کرم کی۔ میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ قاضی صاحب مسکرائے پھر بڑی شفقت سے فرمایا۔ لڑکے..... فقیروں کو تیری یہ ادا بہت پسند آئی۔ عنقریب دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ جو پست تھے، انہیں بلند کر دیا گیا۔''

پھر کچھ دیر کے لیے سلطان خاموش ہو گیا۔ پھر مختصر وقفہ سکوت کے بعد اپنی بات وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔

''مجھے اس وقت ان کی بات سمجھ نہ آسکی تھی پھر جب میں مختلف بازاروں میں فروخت ہوتا ہوا اپنے آقا قطب الدین ایبک کے پاس ہندوستان پہنچا تو ایک روز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفہ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے ملنے کے لیے دہلی تشریف لائے۔ مجھے اس وقت بھی نہیں علم تھا کہ یہ عظیم الشان ہستیاں کون ہیں۔ غلامی کا مخصوص لباس میرے جسم پر تھا۔ میں اسی حالت میں حضرت خواجہ کے سامنے سے گزرا تو آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔

''خدا اس لڑکے کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھائے گا جب تک ہندوستان کا تخت اس کے قدموں کے نیچے نہیں آجاتا..... اور دیکھ لو، ان ہی دعاؤں کے طفیل ہندوستان کا تخت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ دردر کی ٹھوکریں کھانے والا ایک غلام لڑکا آج ہندوستان کا شہنشاہ ہے۔ کیا کوئی یہ سوچ سکتا تھا کہ زمین کی خاک کبھی آسماں کو پہنچے گی۔'' یہ کہہ کر سلطان التمش نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر سے بولا۔

''شاہ ترکان! تو اپنی طرف کیوں نہیں دیکھتی۔ ایک لونڈی سے ملکۂ ہند کے درجے تک کیسے پہنچی ہو۔ یہ سب اسی فقیر کی دعاؤں کا نتیجہ ہے جس سے تو حسد رکھتی ہے۔ خدا سے ڈر شاہ ترکان خدا سے ڈر اور اس کا جس قدر بھی شکر ادا کرسکتی ہے، کر اور قطب شاہ سے معافی مانگ۔ کہیں تجھ پر کوئی قہر نہ ٹوٹ پڑے۔''

شاہ ترکان یہ باتیں سن کر اس وقت تو خاموش رہی مگر دل ہی دل میں نئی سازشوں اور منصوبوں کو ترتیب دیتی رہی۔ دراصل وہ اپنے شوہر کو دوسرے بادشاہوں کی طرح دنیا کی رنگ رلیوں میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک کنیز ہونے کی وجہ سے اور پستیوں سے نکل کر بلندیوں پر پہنچنے کا جذبۂ خودنمائی اسے کسی پل بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ تو چیخ چیخ کر لوگوں کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میری طرف دیکھو، کبھی میں ایک حقیر سی کنیز تھی۔ آج میں پورے ہندوستان پر حکمرانی کر رہی ہوں۔ پھر اس کے نزدیک یہی معیارِ شہنشاہیت بھی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ سلطان التمش پر اس کی باتوں کا کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس نے اپنی ان توقعات کو اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کی شکل میں پورا کرنے کی ٹھانی۔ اس نے اس پر عائد پابندیوں کو دھیرے دھیرے ختم کرنا شروع کردیا جو التمش اپنے بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے لیے عائد کرتا تھا۔ التمش ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کے گیارہ بیٹے ہیں۔ خدا نے مجھے کثیر اولاد سے نوازا ہے مگر حقیقتاً ناصرالدین محمود کے سوا کوئی عادت وخصائل میں مجھ پر نہیں گیا۔ وہی میرا حقیقی بیٹا ہے اور یہی میرا وارث اور محبوب ہے۔ اسی کے چہرے میں مجھے ہندوستان کا معمار نظر آتا ہے۔

جب شاہ ترکان اپنے شوہر کے یہ الفاظ سنتی تو حسد کے مارے اس کا پورا وجود جل اٹھتا اور وہ دل ہی دل میں شہزادے ناصرالدین محمود کے لیے بددعائیں مانگنے لگتی۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ جب تک ناصرالدین محمود مر نہیں جاتا، اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ ولی عہد نہیں بن سکتا۔ وہ ناصرالدین محمود کو کسی صورت زندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ملک ناصرالدین محمود نہایت دانشمند و عاقل، بہادر و شجاع اور انتہائی فیاض تھا۔ سلطان التمش نے پہلے اسے ہانسی کی جاگیر دی۔ پھر اودھ کی حکومت اس کے سپرد کردی۔ اس نے اپنے حسنِ انتظام اور بہادری کی بدولت بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ اس نے رنتگ پور کے راجا برتوہ کو شکست دے کر اسے قتل کردیا۔ اس نے اپنی رعایا خاص طور پر مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا اور ہزاروں مسلمانوں کو بے گناہ مار چکا تھا۔ شہزادے نے اس کے بعد اودھ کے اطراف میں بھی سرکش ہندوؤں کی سرکوبی کی۔ ناصرالدین محمود کا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے راجا برتوہ کا سرکاٹ کر سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان التمش نے اس سے پہلے راجا برتوہ کی سرکوبی کے لیے اپنے کئی سالار روانہ کیے تھے مگر بنگال کے پُرپیچ اور دشوار گزار راستوں کے باعث کسی کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ آخر شہزادے ناصرالدین محمود نے باپ کو خط لکھا۔

''سلطان ذی وقار! اللہ تبارک تعالیٰ نے مجھے دنیا کی ہر نعمت سے اور آسائش سے سرفراز کیا ہے مگر پھر بھی میرے دن شدید اضطراب میں گزرتے ہیں اور راتیں بے خواب ہیں۔ دن کو دربار آراستہ کرتا ہوں تو مجھے ہر گوشے سے لکھنوتی کے شہیدوں کی تڑپتی سسکتی لاشیں دکھائی دیتی ہیں اور جب رات کو بستر پر پہنچتا ہوں تو مجھے اپنے دینی بھائیوں کی چیخیں اور سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مسلمان مقتولین میری خواب گاہ کے دروازے پر کھڑے فریاد کررہے ہوں کہ کیا ہماری بے گور و کفن لاشوں کا حساب لینے والا کوئی نہیں۔ اگر حضورِ والا اجازت دیں تو میں قسمت آزمائی کروں اور اللہ کی زمین کو اس برتوہ ظالم سے نجات دلاؤں.....''

سلطان نے بھیگی آنکھوں سے خط پڑھا اور فوراً ہی شہزادہ ناصرالدین محمود کو لکھنوتی کا حاکم مقرر کردیا۔

شہزادے نے کچھ دن تک صورتِ حال کا جائزہ لیا اور پھر کئی دنوں کی جنگ کے بعد راجا رتوہ کو شکست ہوئی۔ بیٹے کی تاریخی فتح پر سلطان التمش نے بہت سے قیمتی تحائف اسے ارسال کیے اور اس کے اختیارات میں مزید اضافہ کردیا۔ سلطان التمش بیٹے کی بہادری، بلند کرداری اور انتظامی صلاحیت سے مطمئن تھا۔ وہ اکثر بھرے دربار میں اپنے امراء کو مخاطب کرکے کہتا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہندوستان کے وارث کا مسئلہ حل کردیا۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں کہ میرے بعد کیا ہوگا.....'' جس روز سلطان التمش نے امراء کے سامنے یہ الفاظ کہے، اسی دن گلناز..... شاہ ترکان کے پاس آئی اور آتے ہی بولی۔

''خانم! کچھ سنا آپ نے.....؟''

''گلناز! تم جب بھی آتی ہو ہڑبڑائی ہوئی آتی ہو اور مجھے بھی پریشان کردیتی ہو۔ اب بتاؤ کونسی آفت آگری ہے۔'' شاہ ترکان حیران ہوکر بولی۔

''خانم! اب میں کیا بتاؤں، آپ کی لگائی ہوئی ذمے داری نبھا رہی ہوں۔ آج تو سلطانِ معظم نے حد کردی۔ بھرے دربار میں کہنے لگے کہ اب مجھے فکر نہیں رہی کہ ہندوستان کا وارث کون ہوگا۔'' گلناز بتانے لگی تو شاہ ترکان نے اس کی بات کو درمیان سے ہی کاٹ دیا۔

''کون ہوگا ہندوستان کا وارث..... آگے بھی کچھ بتاؤ۔'' شاہ ترکان نے تجسس سے کہا۔

''ناصرالدین محمود..... اور کون ہوگا۔''

''اس کا تو مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ یہی ہوگا۔ سلطان التمش کو اس کے علاوہ کوئی اور نظر بھی تو نہیں آتا۔ ایک میرا بیٹا بھی تو ہے مگر سلطان کو وہی سب سے زیادہ محبوب نظر آتا ہے۔ میں نے کئی بار باتوں باتوں میں اس کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی مگر مجال ہے میری باتوں پر ان کا دھیان بھی گیا ہو۔ اب کی بار میں بھی سختی اختیار کرلوں گی۔ چاہے مجھے اس کا نقصان ہی ہو۔'' شاہ ترکان غصے سے بولی۔

''بالکل خانم..... اب آپ کو بھی اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔ وگرنہ سب ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''اس ناصرالدین محمود کا تو میں بندوبست کرتی ہوں جس نے سلطانِ اعظم کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ سنو..... امیر چاشنی کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟'' شاہ ترکان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''خانم! آپ جانتی ہیں، حسن اور جوانی کے آگے پتھر بھی پانی بھرتے ہیں۔'' گلناز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، آج میں تم سے ایک بہت ہی عزیز چیز کا سوال کرتی ہوں۔ کیا وہ تم میرے لیے داؤ پر لگانے کو تیار ہو؟'' شاہ ترکان نے سنجیدگی سے کہا۔

''خانم! آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔ ہم کنیزیں اور باندیاں تو اپنے مالکوں کے لیے وفاداری کی کسی حد کو بھی عبور کرنے کو تیار رہتی ہیں۔'' گلناز نے سب جانتے ہوئے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے..... کان ادھر لاؤ.....''

گلناز نے کان اس کے نزدیک کردیے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے اپنی گفتگو مکمل کرلی تو گلناز کہنے لگی۔

''خانم..... گو یہ کام بہت مشکل ہے۔ امیر چاشنی نے بھی یہ کام اپنے کسی ماتحت کے ذمے لگانا ہے۔ اس کے لیے مجھے دو..... دو گھاٹیوں سے گزرنا ہوگا۔ بہرحال میں اپنی مالکن اور اپنی پیاری خانم کے لیے یہ بھی کرگزروں گی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

مگر قدرت نے اسے یہ سب کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد شہزادہ ناصرالدین بے حد بیمار ہوگیا۔ شاہی طبیبوں کے علاوہ دوسرے معالجوں سے بھی اس کی بیماری کو آرام نہ آیا۔ تمام انسانی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں، مگر فرشتۂ اجل کے بڑھتے قدم نہ رک سکے۔ یہاں تک کہ 1228ء کو ناصرالدین محمود نے وفات پائی۔ جب یہ دلگداز خبر دہلی پہنچی تو پورے دارالحکومت میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ شہزادے کی موت پر ہندو مسلمان، اپنے پرائے سبھی سوگوار تھے۔ مگر شاہ ترکان کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔ بظاہر وہ خود کو اس غم میں شریک رکھے ہوئے تھی اور سب خواتین کے ساتھ کمرۂ خاص میں صفِ ماتم پر بیٹھی تھی اور تمام کنیزوں نے اپنے گریباں چاک کرڈالے تھے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس کے بیٹے کے راستے کی فولادی دیوار ہوا کے ایک ہی جھونکے سے یوں گر جائے گی۔

جب اس جانکاہ صدمے سے وہ سب نکلے تو ایک دوپہر کو گلناز اس کے پاس آئی۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا رونے سے ابھی تک متورم تھیں۔ وہ آتے ہی شاہ ترکان کے گلے لگ گئی اور صدمے سے دوبارہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''خانم! بہت بڑی قیامت گزر گئی ہے۔ یہ صدمہ بھولنے والا نہیں ہے۔''

''صدمہ تو تمہارے شوہر کا بھی بھولنے والا نہیں ہے۔ رنگ پور لکھنوتی والا بھی فراموش کر دینے والا نہیں تھا جس میں تیرے سر کا سائیں مارا گیا۔''

''خانم..... ہم غریبوں کا کیا ہے۔ ہماری حیثیت تو ان کیڑے مکوڑوں کی طرح ہوتی ہے جو ہمیشہ انسانی پاؤں کے نیچے رہتے ہیں اور کبھی بھی کچلے مسلے جاتے ہیں۔ بہرحال میں آپ کو پُرسہ دینے آئی تھی۔ میں ادھر دوسری بیگمات کو بھی مل کر آرہی ہوں۔''

''گلناز! پُرسہ ان لوگوں کو دو جن کا وہ کچھ لگتا تھا۔ دنیا تو ان کی اجڑی ہے۔ ہمارے لیے تو یہ دن خوشیوں بھرے ہیں۔ میرے بچے کے راستے کے پتھر کو موت کے فرشتے نے اٹھالیا۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ خوشیاں مناؤ کہ تم ہی میری رازدار سہیلی اور محبوب کنیز ہو.....''

''یہ تو اچھا ہوا کہ وہ اپنی آئی موت سے مرگیا۔ وگرنہ میں نے تو امیر چاشنی کو اس کام کے لیے اپنے حسن کے دام میں پھنسالیا تھا اور اس نے میرا کام کرنے کی ہامی بھی بھر لی تھی۔''

''اب آگے کی سوچو گلناز..... میری خواہش ہے کہ اب میرے بیٹے کی ولی عہدی کا اعلان ہو جانا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہا..... اب کونسی رکاوٹ رہ گئی ہے۔'' گلناز نے جواب دیا۔

''مگر اب بھی ایک رکاوٹ ہے جس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ بہرحال ایک خدشہ تو ہے۔ گو ابھی معتز الدین میرے بیٹے رکن الدین سے کہیں چھوٹا ہے مگر سلطان اسے بھی اپنا ولی عہد نامزد کرسکتا ہے۔'' شاہ ترکان نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا تو گلناز نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے، بھلا سلطانِ معظم کو روکنے والا کون ہے۔''

''مگر میری ایک بات سن لو۔ اب کی بار اگر سلطان معظم نے کوئی ادھر اُدھر کا فیصلہ کیا تو میں کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ جان سے مار ڈالوں گی ایک ایک کو..... جس نے بھی میرے بیٹے کا حق چھیننے کی کوشش کی وہ زندہ نہیں بچے گا۔'' شاہ ترکان کے آتشیں لہجے کی آواز گونجی تو ایک لمحے کے لیے گلناز بھی تھرا گئی۔ وہ شاہ ترکان کی انتقامی فطرت اور کینہ پروری سے بخوبی واقف تھی۔ چنانچہ اس نے دورانِ گفتگو ہی اٹھ کر اپنے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے جھاڑنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو.....؟'' شاہ ترکان نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے کپڑوں سے امیر چاشنی کی ہوس بھری نظروں کو جھاڑ رہی ہوں۔ جب سے میں اس سے مل کر آئی ہوں، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے کپڑوں میں کہیں اس کی شہوت بھری نظریں چمٹی ہوئی رہ گئی ہیں۔''

''پھر ذرا دور ہٹ کر جھاڑو، کہیں ان کی تپش مجھ تک نہ پہنچ جائے۔'' شاہ ترکان نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ جب ذرا ان کی ہنسی رکی تو شاہ ترکان ایک بار پھر بولی۔

''سلطانِ معظم کو تو میرے بیٹے سے ایک ہی شکایت رہتی ہے کہ وہ اوباش فطرت کا مالک ہے۔ حسن اور جوانی کی رنگ برنگ تتلیاں اس کے اردگرد رہتی ہیں۔ وہ شراب کا دلدادہ ہے۔ وہ رقص و سرود کی محفلیں جماتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ وہ جوان ہے۔ خوبصورتی میں بھی کسی سے کم نہیں ہے اور پھر ہندوستان کے سب سے طاقتور اور بہادر شہنشاہ کا بیٹا ہے۔ اب اگر اس کے والد کو ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور..... اس کی عمر ہی کچھ ایسی ہے کہ لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اس پر گرتی ہیں۔'' شاہ ترکان نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے خانم..... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ اس میں سرزنش بھی بڑی تکلیف دہ لگتی ہے۔'' گلناز نے شاہ ترکان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا خانم! میں جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ شاہ ترکان کی کہی ہوئی باتیں ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کے بستر پر آگری۔ اس کی سوچوں کا بھنور پھیلتا جارہا تھا اور وہ اس بھنور میں خود ڈبکیاں کھانے لگی تھی۔ پھر اچانک ایک نئی سوچ نے ڈوبتے ابھرتے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور اسے نئی راہوں پر لا پھینکا۔

شہزادہ رکن الدین حسن اور جوانی کا دلدادہ ہے اور اوباش فطرت کا مالک ہے۔ وہ بھی حسین و خوبصورت اور دلکش خدوخال کی مالک ہے۔ اگر وہ شہزادے کو اپنے حسن اور بھرپور جوان دلکش اداؤں کا اسیر بنالے تو وہ بھی اپنی مالکن ترکان کی طرح ایک معمولی کنیز سے ملکۂ ہند بن سکتی ہے۔ وہ ملکۂ ترکان کے رحم و کرم پر کب تک پڑی رہے گی۔ شاہ ترکان بھی تو اسی کی طرح ایک معمولی کنیز تھی۔ اب وہ ہندستان کی ملکہ بن کر عیش کر رہی ہے۔ وہ کب تک اس کی آلۂ کار بنی رہے گی۔

''تو پھر تمہیں بھی کوشش کر دیکھنی ہوگی۔'' اس کی دوسری سوچ نے جواب دیا۔

''ہوں..... مجھے آگے بڑھنے کے لیے یہی کرنا ہوگا۔'' یہ سوچتے سوچتے وہ سوگئی اور خواب میں بھی وہ شہزادے رکن الدین کی بانہوں میں جھومتی رہی پھر جب خوابوں کا طلسم ٹوٹا تو وہ اس وقت اپنے کمرے کی معمولی چارپائی پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ کتنی دیر تک اپنی سوچوں میں گم رہی۔ پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ اسے اب ہر حال میں رکن الدین کو جیتنا تھا۔ کسی بھی قیمت پر..... اب وہ اپنے نئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ کوئی اس کے لیے مشکل کام بھی نہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہتی تھی تاکہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو اور اس کے منصوبے کا علم شاہ ترکان کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وگرنہ وہ بڑی کینہ پرور عورت ہے۔ وہ اس کی تمام تر قربانیوں کو بھول کر اس کی نئی منزل تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جائے گی۔

بڑے دنوں کے بعد اس نے چوبدار کی آواز سنی تھی کہ سلطانِ معظم محل میں آرہے ہیں۔ وہ ابھی اپنے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ بھاری قدموں کی آوازیں محل کی راہداری میں آنے لگیں۔ لگتا تھا کہ سلطانِ معظم اپنے کمرائے خاص کی طرف جارہے ہیں۔

اللہ کرے وہ اب شہزادہ رکن الدین کو ولی عہد بنانے پر رضامند ہوجائیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو منصوبے کا اگلا حصہ خود اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ وہ یہ سوچ کر ہی خوشی سے سرشار ہوگئی اور اٹھ کر کمرے کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی جو راہداری میں کھلتا تھا۔

☆☆☆

سلطان التمش ملک ناصر الدین محمود کی وفات کے کتنے ہی دن بعد محل میں تشریف لائے تھے۔ وہ آتے ہی سب سے پہلے تعزیت کے لیے ناصر الدین محمود کی والدہ کے پاس گئے۔ وہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد باری باری تمام ملکاؤں سے اظہارِ غم کرکے شاہ ترکان کے کمرے میں آگئے۔ انہیں آتے دیکھ کر شاہ ترکان سنبھل کر بیٹھ گئی۔ شاہ ترکان ایک والد کے غم کو خوب سمجھتی تھی اور موقع شناس تھی۔ اس لیے وہ غم زدہ زبان میں بولی۔ ''شہزادے ناصر الدین کی وفات یقیناً ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ کاش! ولی عہد سلطنت کی جگہ میرے بیٹے رکن الدین کو موت آجاتی.....'' شاہ ترکان یہ کہہ کر خاموش ہوگئی اور سلطان التمش کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ سلطان التمش سلطان شاہ ترکان کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ شاہ ترکان کا یہ انداز کس قدر مصنوعی ہے۔ وہ اس کے انداز سے ہی پیچ وتاب کھا کر رہ گیا اور بولا۔

''اس نمائشی دکھ سے بھلا اب کیا حاصل ہوگا شاہ ترکان۔ اگر تمہیں واقعی دکھ ہوتا تو تمہاری آنکھیں اس طرح خشک نہ ہوتیں۔ ذرا آئینہ تو دیکھو کہ تمہاری پلکوں پر ہلکی سی نمی تک نہیں ہے۔ چہرے پر کسی ملال نہیں ہے۔ پھر یہ کیسا سوگ اور ایسی غم میں ڈوبی گفتگو کرنے سے کیا حاصل..... ایک ادھر دیکھو ناصر الدین محمود کی والدہ کو جو اب بھی غم میں نڈھال ہوئی جارہی ہے۔''

''آپ نے تو ہمیشہ میری رفاقت پر شک ہی کیا ہے۔'' شاہ ترکان نے گھبرا کر کہا۔ اسے لگا اس کی شخصیت کا سارا طلسم اتر گیا ہو۔

''سچا رفیق اور ساتھی وہی ہوتا ہے جو اپنے شوہر اور ساتھی کے فیصلوں کو دل سے قبول کرے۔'' سلطان التمش نے جواب دیا۔

''کیا ایسی کوئی مثال موجود ہے جب میں نے سلطانی فیصلے سے اختلاف کیا ہو؟'' شاہ ترکان نے چرب زبانی کا سہارا لیا۔

''میں نے جب ناصر الدین محمود کو ولی عہد نامزد کیا تو تم نے اس فیصلے پر بڑا احتجاج کیا تھا حالانکہ میرا انتخاب قطعی درست تھا۔''

سلطان التمش کے اس جواب پر شاہ ترکان خاموش رہی۔

''میں اب کوئی فیصلہ کروں گا تو پھر تمہیں پسند نہیں آئے گا۔ سلطنت کا کوئی بھی فیصلہ میں جب کرتا ہوں تو وہ غلط نہیں ہوتا ہے کسی بار کوئی معمولی سی غلطی کا احتمال تو ہوسکتا ہے مگر وقت اسے درست ثابت کردیتا ہے۔ میں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ شہزادہ معزالدین کو ولی عہد سلطنت نامزد کردوں۔'' سلطان التمش نے ٹھہر ٹھہر کر شاہ ترکان کو آگاہ کیا۔

''یہ کھلی ناانصافی ہوگی۔ ایک بڑے بیٹے کی موجودگی میں چھوٹے بیٹے کو اس اہم ترین منصب پر فائز کیا جائے۔'' وہ بدحواس ہوکر چیخی۔

''سب کچھ ممکن ہے شاہ ترکان.....'' التمش نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''سلطنت کا مالک خوب جانتا ہے کہ کس کے کاندھے وراثت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ شہزادہ معزالدین نوعمر ہونے کے باوجود تیرے ناخلف بیٹے سے زیادہ مضبوط ارادوں اور کندھوں کا مالک ہے۔'' شاہ

Digitized by Google

ترکان غصے میں تلملا کر بولی۔

''آپ اسے کوئی بھی نام دے لیں مگر اسے دانش مندانہ فیصلہ نہیں کہا جاسکتا۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تو ملکۂ ہند نے کہا تھا کہ وہ سلطان کا ہر فیصلہ مانتی اور اس کا احترام کرتی ہے۔'' التمش کے لہجے میں تیز کاٹ تھی۔

''کچھ بھی ہو مگر میں اس بار رکن الدین کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔'' شاہ ترکان نے سرکش لہجے میں جواب دیا۔

''تیرے بیٹے کا حق نہیں مارا جائے گا ترکان مگر ایسے باپ کی مجبوری اور بدنصیبی تو دیکھو جو ایک نالائق اور ناکارہ سپاہی کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنانے پر مجبور ہے۔''

کمرائے خاص میں ابھی سلطان التمش کی آواز کی گونج باقی تھی کہ شاہ ترکان غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔ التمش بڑی اداس نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جو ابھی ابھی اپنے شوہر کی وفاداری کا دم بھر رہی تھی لیکن جب اولاد کا معاملہ آیا تو ہر رشتے کو ٹھکرا کر چلی گئی۔

سلطان التمش بھی اس کے کچھ وقفے کے بعد اٹھ کر دربار میں چلا گیا۔

اسی شام گلناز ایک نئے جذبے کے ساتھ شاہ ترکان کے کمرے میں موجود تھی۔

''آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے خدشہ تھا.....'' شاہ ترکان نے گلناز سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کیا ہوا؟ سنا تھا آج سلطانِ معظم محل میں آئے تھے۔'' گلناز نے ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے سلطانِ معظم کو آتے دیکھ چکی تھی۔

''ڈھاک کے وہی تین پات..... والی ہند ہیں نا' انہیں اپنے فیصلوں پر بھی ناز ہے۔ یہ سب حکمران ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کے تابع اور اپنی مرضی کے مالک، حق داروں کے حق چھیننے والے اور اپنے حاشیہ برداروں کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے۔'' شاہ ترکان نے اپنے دل کا غبار نکالا۔

''ہوا کیا ہے خانم.....'' گلناز نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''وہی ہونے والا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔'' شاہ ترکان نے غصے میں سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''سلطان نے مجھ سے کہا کہ تیرے بیٹے کا سوتیلا بھائی معزالدین بھی ولی عہد ہوسکتا ہے۔''

''یہ تو سراسر ناانصافی نہ ہوگی۔'' گلناز نے احتجاجی انداز اپنایا۔

''میں نے بھی یہی کہا تھا..... مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کو کون اہمیت دیتا ہے۔'' شاہ ترکان ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

''گویا وہ پہلے ہی مرحلے میں شکست کھا گئی ہے.....'' گلناز نے اپنے من میں سوچا مگر وہ تو اسے ہر حال میں جیتنا چاہتی تھی۔ بہرحال وہ اپنی سی کوششیں تو کر دیکھے..... ہار جیت کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ یہ سوچ کر خاموش رہی۔

''کچھ بولتی کیوں نہیں ہے گلناز..... کچھ تو جواب دے۔ ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' شاہ ترکان نے پوچھا۔

''آپ کسی طرح سلطانِ معظم کو یہ یقین دلا دیں کہ شہزادہ رکن الدین ان کی ساری باتوں اور اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کو تیار ہے۔'' گلناز نے مشورہ دیا۔

''اس سے کیا ہوگا؟ سلطانِ معظم کو پوری طرح یقین ہوچکا ہے کہ رکن الدین اب اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کے سدھار کا وقت بھی ختم ہوگیا ہے۔''

''آپ سارا معاملہ شہزادہ رکن الدین کے سامنے رکھ کر انہیں کہیں کہ وہ چند روز کے لیے اپنی عادتوں کو درست کرلیں۔ جب تک سلطانِ معظم کو یقین نہیں ہوجاتا۔'' گلناز نے اگلی تجویز اس کے سامنے رکھی۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر ازل سے بگڑے ہوئے کبھی بھلا سدھرے بھی ہیں۔ بہرحال تیرے کہنے پر بات کر دیکھتی ہوں۔'' شاہ ترکان نے جواب دیا۔

''آپ کو کسی معاملے میں بھی میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' گلناز نے اگلا پتا پھینکا تو شاہ ترکان نے اس کے جسم اور خوبصورتی پر ایک دزدیدہ نظر ڈالیں اور بولی۔

''ہوں..... ضرور کہوں گی۔ ایک تم ہی تو اس سارے محل میں میری ہمدرد اور غم خوار ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر وہی نگاہیں گلناز پر ڈالیں..... جنہیں گلناز کا بدن محسوس کرنے لگا تھا۔

ناصر الدین محمود کی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اختیار الدین بلکا نے بغاوت کردی۔ 1230ء میں التمش اس کے خلاف روانہ ہوا اور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا اور لکھنوتی کا تخت ملک علاؤالدین جانی کو دے دیا۔ اگرچہ سلطان معزالدین کے زمانے میں ہی گوالیار پر قبضہ ہوگیا تھا اور التمش کو سب سے پہلی اسی کی ذمے داری دی گئی

Digitized by Google

تھی لیکن وہ اس کو قائم نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے گوالیار ہاتھ سے نکل گیا۔ 1231ء میں التمش گوالیار کی طرف روانہ ہوا تو وہاں کے حکمران منگل دیو نے گیارہ مہینے تک سخت مدافعت کی۔ بہرحال دسمبر 1232ء میں بالآخر ایک رات ..... اجانک قلعے سے غائب ہوگیا۔ التمش نے موقع غنیمت جانا اور گوالیار کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

گوالیار فتح ہونے کے دو سال بعد التمش نے سلطان کوٹ اور بیانہ کی ریاستیں ملک نصرت الدین تائسی کو دیں۔ وہ معزالدین غوری کا ایک ترکی غلام افسر تھا اور اپنی عمدہ خدمات کی بنا پر کافی ترقی حاصل کرچکا تھا۔ تائسی اگرچہ اپنی جسامت اور شخصیت کے لحاظ سے کم تھا لیکن بہادر اور باہمت و عقل مند تھا۔ قنوج اور سمہ کے ساتھ مہاجن کے دستے بھی اس کی ماتحتی میں دے دیے گئے۔

سلطان التمش اپنے باغیوں سے نبٹنے میں مصروف تھا کہ شاہ ترکان نے ایک روز رکن الدین کو بلالیا۔ وہ جس وقت آیا ملکہ ترکان پہلے سے جلی بھنی بیٹھی تھی۔ اس کے آتے ہی اپنے چہرے پر لاچارگی اور مظلومیت لاتے ہوئے بولی۔

''میں نے تمہیں کئی بار سمجھانے کی کوشش کی مگر تم نہ سمجھ سکے۔ اب وہی ہوا نا..... جس کا مجھے کئی روز سے خوف تھا مگر تمہیں ان سب سے کیا۔ تم تو اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو۔'' شاہ ترکان نے کہا۔

''آخر ہوا کیا ہے مادرِ گرامی۔'' رکن الدین حیرت زدہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہی ہونے والا ہے۔ جو نہیں ہونا چاہیے۔'' شاہ ترکان کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ ''سلطان نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تیرے بجائے تیرے سوتیلے بھائی معزالدین کو ولی عہدِ سلطنت بنانے والا ہے۔''

''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمام امرائے سلطنت تو میرے حق میں ہیں۔ میں ان سے گفتگو کرچکا ہوں۔ وہ دربار سے لے کر خلوتِ سلطانی تک میری ہی تائید کریں گے۔'' رکن الدین نے بتایا۔

''میرے بیٹے.....'' شاہ ترکان نے جذباتی ہوکر رکن الدین کو گلے لگالیا۔ ''گویا میرا بیٹا اب سیاست کی چالیں سمجھنے لگا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں مادرِ محترم! آپ کا بیٹا اتنا بھی کند ذہن نہیں کہ سیاسی چالوں کو نہ سمجھ سکے۔ میں ناکارہ اور نالائق نہیں ہوں۔'' رکن الدین نے اپنی اہمیت جتائی۔

''یہ میرا نہیں تمہارے باپ کا خیال ہے۔ وہ تمہیں نالائق ہی نہیں، عیاش بھی سمجھتا ہے۔ اسی لیے عنانِ حکومت تیرے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس چھوٹے معزالدین کو دینے پر تلا بیٹھا ہے۔''

''وہ یہ سب اکیلے کیسے کرسکتے ہیں۔ آپ کے مشورے کے بغیر..... آخر آپ ملکۂ ہند ہیں۔ وہ آپ سے مشورہ لینے کے پابند ہیں۔'' رکن الدین تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''یہی تو بات ہے۔ انہوں نے کبھی میری حیثیت کو قبول نہیں کیا۔ آج تک جو کچھ کیا صرف اپنی مرضی سے کیا۔ جب ناصرالدین محمود کو انہوں نے ولی عہدِ سلطنت بنایا' میں اس وقت بھی لڑی تھی کہ یہ حق میرے بیٹے رکن الدین کا ہے مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ یہاں میری حیثیت ہی کیا ہے۔ تمام بیگماتِ سلطانی تیری ماں کو ایک حقیر لونڈی سے زیادہ حیثیت نہیں دیتیں۔ تجھے کیا علم ہے کہ میں پچیس سال سے کس آگ میں جل رہی ہوں۔ میں نے بارہا تمہیں کہا کہ ہاتھ سے جامِ شراب چھوڑ دے۔ عیش وعشرت کے لیے بڑی عمر پڑی ہے۔ ایک بار تاج وتخت حاصل کرلے پھر جو جی چاہے کرنا۔ ایک بار..... صرف ایک بار اپنے باپ کو وہ بن کر دکھادے جو وہ چاہتا ہے۔ مان لے میری بات، یہ سب تکلیفیں اور مصیبتیں میں اپنے لیے نہیں بلکہ تیرے حق کی خاطر جھیل رہی ہوں۔ مجھے ایک بار تو سلطان کے سامنے سرخرو کردے۔'' شاہ ترکان کہتے ہوئے رو پڑی۔ تب رکن الدین بے قرار ہوکر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔

''مادرِ گرامی..... آپ جیسا کہیں گی میں وہی کروں گا مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ ایسا کرنے سے مجھے میرا حق مل جائے گا؟''

''اگر پھر بھی نہ ملا تو..... پھر تمہیں حق حاصل ہے کہ تم اسے ان غاصبوں سے تلوار کے زور پر حاصل کرلو۔ تمہاری والدہ تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں تیرا یہ حق کسی اور کو نہ لینے دوں گی، سمجھے.....''

ماں کے آنسو دیکھ کر رکن الدین بھی بے قرار ہوگیا تھا۔ وہ جذباتی انداز میں بولا۔

''میں قسم کھاتا ہوں مادرِ گرامی کہ اگر منصبِ شاہی تک پہنچ گیا تو آپ کی ایک ایک محرومی کا ازالہ اس طرح کروں گا کہ ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔'' رکن الدین پُرجوش لہجے میں بولا۔

''اور اگر تجھ سے تیرا حق چھیننے کی کوشش کی گئی.....؟'' شاہ ترکان نے اپنی تند وتیز باتوں کا ہتھوڑا

Digitized by Google

رکن الدین کے جذباتی لوہے پر پھر سے مارا۔

''تو پھر میں تلوار سے کام لوں گا۔ ولی عہدی میرا حق ہے، مجھے بابا محترم بھی اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔

''شاباش میرے بیٹے! تیری عمر دراز ہو۔'' شاہ ترکان نے خوش ہو کر اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے اور اسے مزید پکا کرنے کے لیے کہنے لگی۔ ''میں بھی تمہیں یقین دلاتی ہوں اگر تجھ سے تیرا حق چھیننے کی کوشش کی گئی تو سلطان کی ایک اولاد بھی زندہ نہیں بچے گی۔ میں اس کے خاندان کو تہ تیغ کر دوں گی۔'' سلطان رکن الدین اپنی والدہ کے تیور دیکھ کر گھبرا سا گیا اور جلدی سے بولا۔

''نہیں یا درگرامی! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' رکن الدین نے تسلی دی۔

''تو ابھی بچہ ہے۔ تمہیں نہیں پتا اس اقتدار کی خاطر کیسے کیسے بھیانک کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ اس اقتدار کے لیے اپنے پیاروں کو بھی قربان کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ مائیں اپنے بچوں اور بچے اپنے بھائی بہنوں کو، شوہر اپنی چہیتی بیویوں اور بیویاں اپنے شوہروں کو اس کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔ بہر حال تم یقین رکھو، اگر میرا بیٹا تخت ہندوستان تک نہ پہنچ سکا تو سلطان کی کوئی اولاد بھی اس پر نہیں بیٹھ پائے گی۔ میں ان سب کو خونی کفن پہنا دوں گی اور پورا قلعہ معلی مقتل بن جائے گا۔ میں شاہ ترکان ہوں..... شاہ ترکان.....''

رکن الدین نے اپنی والدہ کا یہ ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ اپنی والدہ کو تسلی دے کر رخصت ہو گیا۔ ''آپ اس قدر فکر مند نہ ہوں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

اسی رات کے آخری پہر جب رکن الدین کی محفل ناؤ نوش اور رقص و سرود اپنے پورے جوبن پر تھی، گلناز نے بناؤ سنگھار کر کے..... بہترین اور خوبصورت لباس پہنا..... اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی رکن الدین کی خلوت گاہ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ کر اور منصوبے کے تحت اٹھایا تھا۔

''کون.....؟'' نشے میں دھت رکن الدین کی آواز سنائی دی۔

''آپ کی داسی.....'' گلناز نے بڑی محبت سے جواب دیا۔

لڑکھڑاتے ہوئے رکن الدین نے دروازہ کھولا تو وہ گلناز کے اس خوبصورت انداز کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔

وہ محل میں آتے جاتے کئی بار گلناز کو اپنی والدہ کے پاس دیکھ چکا تھا۔ اس نئے روپ میں دیکھ کر اس کی زبان مزید لڑکھڑا گئی۔

''تو یہ آپ ہیں گلناز..... میں تو ایک عرصے سے تمہاری آمد کا منتظر تھا۔ میں تمہارے قیامت خیز حسن اور خوبصورت سانچے میں ڈھلا ہوا بدن بڑی دیر سے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ خوش آمدید..... آؤ..... آج کے اس جشن کے تم بھی مزے لوٹو..... پاگل ہے میرا باپ جو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر فقیروں میں شامل ہو جاؤ۔ اسے کیا پتا کہ یہی تو زندگی ہے۔ آؤ جانِ رکن الدین.....'' یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور گلناز کو اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

''شکریہ سلطان محترم..... اس حوصلہ افزائی کا شکریہ..... میں چند باتیں کرنے آئی ہوں۔ یوں جانیے کہ اپنے من میں دبی ہوئی برسوں سے قید خواہش تھی جس نے میرے قدم یہاں تک لا کے چھوڑے ہیں۔''

''آؤ..... اندر تو آؤ..... ہم تخلیے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ تم اپنی کہو، کچھ ہماری گزارشات پر توجہ دو۔'' رکن الدین پیار سے بولا اور اپنا بازو اس کی کمر میں حمائل کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

''اب کہو..... یہاں کی دیواریں اندھی ہیں اور گونگی بھی اس لیے بلا خوف جو چاہو کہہ سکتی ہو۔'' رکن الدین نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پیار سے کہا۔

''سنا ہے کہ شہنشاہیت کا تاج عنقریب میرے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے سر سجنے والا ہے۔'' گلناز بڑے انداز سے بولی۔

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔'' رکن الدین نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''میں آپ سے ایک چیز مانگنے آئی ہوں..... وعدہ کیجیے کہ آپ مجھے وہ ضرور دیں گے۔'' گلناز آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھی۔

''یہاں تو سب بے دام آتی ہیں اور اپنی آنکھوں میں حسین سپنے لے کر چلی جاتی ہیں۔ تم کس وعدے کا یقین لینا چاہتی ہو؟''

''میں نے آپ کی والدہ کی بڑی خدمت کی ہے۔ میں ان کی اس حیثیت سے لے کر ملکۂ ہند تک کے فاصلوں میں ان کی ہمیشہ سے ہم قدم رہی ہوں۔ میں یہ وعدہ ان کی

Digitized by Google

سفارش پر نہیں حاصل کرنا چاہتی۔ حالانکہ ایسا بھی کر سکتی ہوں مگر یہ میں اپنی حیثیت میں آپ سے مانگتی ہوں۔'' گلناز نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

''اس تمہید سے آگے کی کہو..... جہاں تم اس وقت بیٹھی ہو، اس جگہ ہر بات اور ہر کام تمہیدی کلمات کے بغیر کیے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں معاوضے کی فکر ہے تو تمہیں تمہاری توقعات سے بڑھ کر ملے گا۔ اگر نعمتوں کا ذکر ہے تو دنیا جہان کی نعمتیں آپ کو عطا کر دی جائیں گی مگر اس کے لیے آپ کو بھی ہماری خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔''

''جانتی ہوں سلطانِ محترم! میری صرف ایک ہی خواہش ہے کہ مجھے اپنے قدموں کی داسی بنالیں اور وعدہ میں یہ چاہتی ہوں کہ تاجِ سلطانی پہن کر بھی مجھے اپنے سے کبھی جدا نہ کریں۔'' گلناز نے اپنی خواہش کا اظہار کھلے لفظوں میں کر تو دیا مگر اب اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی خواہش ٹھکرا ہی نہ دی جائے۔

''بس..... بہت پنگی ہو۔ جس جگہ تم بیٹھی ہو، یہاں خواہشوں کے سودے خواہشوں سے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں تو حسن آس لے کر آتا ہے اور خواب لے کر چلا جاتا ہے مگر جس حسین پیکر میں تمہارا یہ صندلیں بدن ڈھلا ہے، اس کے عوض مجھے تمہاری یہ خواہش بہت چھوٹی لگی ہے۔ بہرحال مجھے تمہارا مانگنے کا یہ انداز بہت اچھا لگا ہے اور ہم وعدہ بھی کر لیتے ہیں۔ اب خوش.....؟'' رکن الدین آخر شاہ ترکان کا بیٹا تھا۔ اسی کی طرح چرب زبان اور گفتگو کے انداز بدلتا ہوا۔

''میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے ایک حقیر سی خواہش کی لاج رکھ لی۔ یقین کریں، آپ مجھے ہمیشہ اپنا وفادار پائیں گے۔'' محفل کی خرمستیاں ایک طرف مگر وہ دونوں پتا نہیں کب تلک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نجانے وہ رات کا کونسا پہر تھا، جب وہ محبت کے جذبوں سے سرشار نکل کر اپنے کمرے کی طرف آرہی تھی کہ معاً ہمایوں محل کی راہداری سے شہزادی بڑی پھرتی سے نکلی اور ایک طرف کو ہولی۔ گلناز اسے دیکھ کر ایک طرف چھپ گئی تھی اور یقین کے لیے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ غالباً وہ سلطان العتش سے ملاقات کر کے واپس پلٹی تھی۔ دونوں بیٹی اور باپ کی ملاقاتوں کے بارے میں وہ پہلے بھی کئی کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے سن چکی تھی مگر آج اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ رضیہ خوفزدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سلطان العتش کو مل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا ذہن تھکا ہوا ضرور تھا مگر اس نئے انکشاف نے اس کو پھر سے تازہ کر دیا۔ نہ جانے دونوں باپ اور بیٹی کس معاملے پر بات چیت کر رہے تھے۔ اس نے ذہن کو جھٹکا اور تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں بستر پر آگری۔ رات بھر جاگنے سے اس کا دماغ سن ہو چلا تھا۔ بستر پر گرتے ہی وہ اتنی گہری نیند میں چلی گئی کہ اسے تب ہوش آیا، جب دن کا آدھا فاصلہ سورج طے کر چکا تھا۔ اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے حلیے کو درست کر کے شاہ ترکان کے پاس چلی گئی۔

شاہ ترکان بھی شاید اپنے کمرے میں اسی کی منتظر تھی مگر گلناز تو آج ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ وہ ساری رات رکن الدین کے ساتھ محبت کی باتیں کرتی رہی تھی۔ رکن الدین کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ بھی ایک عرصے سے اس کا بڑی شدت سے منتظر تھا۔ پیار کے یہ لمحے کیسے بیتے ان دونوں کو بالکل پتا نہ لگا۔ بہرحال خوشی کی بات یہ تھی کہ رکن الدین نے اسے اپنے نکاح میں لانے کا وعدہ ہی نہیں کر لیا تھا بلکہ ابھی سے اسے ملکۂ عالیہ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ آج اس کے بدن کا رواں رواں خوشی سے ناچ رہا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ شاہ ترکان کے کمرے میں آکر بیٹھ رہی۔ تب شاہ ترکان نے ہی گفتگو کی ابتدا کی۔

''کہاں گم ہو گلناز.....؟''

''ہوں کہیں نہیں..... یہیں موجود ہوں آپ کے پاس۔''

''رات سلطان معظم آئے تھے۔ میری ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں، آخر میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ناصر الدین کے بعد معز الدین کو ولی عہد کا عہدہ دینا چاہتے ہیں۔ تمہارے کہنے پر میں نے رکن الدین کو بھی سب کچھ بتا دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنے کردار کی اس خامی کو دور کر لے۔ اس نے ہامی تو بھری ہے مگر اس کی یہ عادتیں اس قدر پختہ ہو چکی ہیں کہ مشکل سے چھوٹیں گی۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ تیز اور ہوش مند ہے۔ کہہ رہا ہے اگر اس کو منصب شاہی ہو جو اس کا حق ہے، آسانی سے نہیں ملا تو وہ تلوار کے زور پر ان سے چھین لے گا۔ مجھے اس کا یہ جذبہ دیکھ کر خود جوش آگیا تھا۔'' شاہ ترکان نے تفصیل بتائی۔

''خانم! آپ جذباتی ہو کر اپنے اردگرد سے نگاہیں چرا جاتی ہیں۔ رات اچانک میری آنکھیں کھلیں تو اس وقت شاید پو پھٹنے والی تھی۔ جب میں نے باہر آکر دیکھا تو شہزادی رضیہ اپنے والد سلطان العتش کے محل سے واپس آرہی تھی۔ مجھے اور بھی کئی کنیزوں نے بتایا تھا کہ دونوں باپ بیٹی نہ جانے کون سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔

آج رات تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آپ کو معزالدین سے زیادہ اس پر دھیان دینا چاہیے۔ وہ بہت تیز معاملہ فہم اور بہادر لڑکی ہے۔ اس کے حالات نہیں دیکھے، کتنے عرصے سے وہ اپنے والد کے ساتھ دربار میں بیٹھتی ہے۔ وہ توفنِ حرب کی بھی ماہر کہی جاتی ہے اور ... پردے کے بغیر دربار کے علاوہ ادھر ادھر آتی جاتی ہے۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے معزالدین کا نام سلطان التمش نے صرف آپ کا رویہ دیکھنے کی خاطر لیا ہو۔ اصل میں اقتدار کے تخت پر وہ رضیہ سلطانہ کو بٹھانا چاہتے ہوں کیونکہ اس وقت وہی سلطان کے خاندان میں سب سے اہل ہے۔'' گلناز نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا تو شاہ ترکان بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''یہ ایک نئی مصیبت کہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔'' شاہ ترکان بے بسی سے بولی۔

''میرا اندازہ ہی ہے، غلط بھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک نیا خطرہ ہے جو آپ کے سر پر منڈلانے لگا ہے۔''

''گلناز! تم جب بھی آتی ہو، کسی نہ کسی نئے خطرے سے آگاہ کر جاتی ہو۔'' شاہ ترکان نے کہا۔

''خانم! حقیقت سے آنکھیں موند لینے سے کیا حقیقت ختم ہوجاتی ہے؟ میں تو آپ سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہی ہوں۔'' گلناز نے جواب دیا۔

''رضیہ سلطانہ شاہی محل میں اپنی سوتیلی والدہ شاہ ترکان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ دانش مند، عادل، کریم اور رعایا پرور تھی۔ وہ لشکر کشی اور حملہ آوری کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ سلطان التمش کی زندگی میں ہی اسے بڑی عظمت حاصل تھی۔ سلطان نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے باجود اس کے کہ وہ اس وقت پردے میں رہتی تھی، گوالیار کی فتح کے بعد تاج الملک محمود دبیر اعلیٰ کو حکم دیا کہ رضیہ سلطانہ کی ولی عہدی کی دستاویز تیار کی جائے، یوں اسے اپنا ولی عہد مقرر کردیا۔

جب بعض مقرب امراء نے اس تجویز پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تو سلطان نے کہا۔ ''میرے بیٹے عیش وعشرت کے دلدادہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی سلطنت کو سنبھال نہیں سکے گا۔ میرے بعد میرے اس فیصلے کے درست ہونے کا سب کو یقین ہوجائے گا۔''

سلطان التمش نے تمام بغاوتوں پر قابو پانے کے بعد رعایا کے اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دینا شروع کردی تھی۔

☆☆☆

امیر چہل گانہ سلطان التمش نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے وفادار غلاموں کا ایک طبقہ تشکیل دیا جو امیر چہل گانہ کہلاتے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

''بندگانِ شمس چونکہ ایک ہی آقا کے غلام تھے اور چالیس کے چالیس ایک ہی وقت میں بلند مقام پر پہنچے تھے، اس لیے وہ ایک دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کے سامنے سر جھکاتے تھے اور ریاستوں، لشکر اور بزرگی و مرتبے میں سب کے سب برابری اور مساوات کا مطالبہ کرتے تھے۔''

یہ تمام غلام بادشاہِ وقت کے وفادار ہوتے تھے۔

خاندانِ غلاماں کے زمانے میں صرف ترک ذات کے لوگوں کو اعلیٰ عہدے دیے جاتے تھے۔ باقی دوسروں کو کم ذات اور کم اصل سمجھا جاتا تھا۔ سلاطین دہلی کے عہد میں امراء کو زمین بطور جاگیر دی جاتی تھی جو اس وقت ''اقطاع'' یعنی زمین کا ٹکڑا کہلاتی تھی۔ جنھیں یہ زمین دی جاتی تھی، وہ اقطاع دار کہلاتے تھے۔ یہ زمین موروثی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ خود بخود حکومت کے پاس آجاتی تھی۔ اقطاع دار اس زمین کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اور ضرورت پڑنے پر سلطان کو فوج فراہم کرتا تھا لیکن جب کمزور سلاطین آتے تھے تو اقطاع داروں کے خاندان اسے موروثی بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ سلطان التمش کے بعد ایسا ہی ہوا۔ جب یہ بات بلبن کے علم میں آئی تو اس نے سب زمینیں منسوخ کردیں جس کی شکایت اور مقدمہ فخرالدین کوتوال کے سامنے پیش ہوا جس میں کہا گیا۔

''شمس الدین کے عہد سے آج تک جو پچاس سال سے زیادہ کی مدت ہوتی ہے، دوآبہ کے اطراف میں ہمارے اقطاع تھے جو ہمیں بادشاہ نے دیے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ ہمیں انعام کے طور پر دیے گئے ہیں اور ہمارے اہل وعیال کی گزر بسر کا انحصار ان پر ہی تھا۔ جتنی ہم میں ہمت تھی، لشکر کی تیاری کے لیے گھوڑے اور اسلحہ ہم دیوان عرض میں پیش کرتے تھے۔ بادشاہوں کے درباروں میں حاضری بھی دیتے تھے۔ جو لوگ اس قابل ہوتے کہ لشکر میں شریک ہوسکیں، وہ لشکر میں بھی شامل ہوتے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ پیرانہ سالی میں ہم کو یوں راندۂ درگاہ کردیا جائے گا۔''

سلطان بلبن کو جب ان کی مشکلات کا علم ہوا تو اس نے اپنا حکم منسوخ کردیا۔ پھر یہ نظام مغلوں کے آنے تک

ہندوستان میں قائم رہا۔ سلطان التمش کے زمانے میں نہ صرف امن وامان قائم ہوا بلکہ بدایوں، بنارس، قلعہ رنتھبور، قلعہ مندر اور بہار، دہیل، بکھر، ملتان، اُچ، سیوستان، اجین نگری، بھیلسہ، گوالیار، سیالکوٹ کے علاقہ جات اور قلعہ جات نہ صرف فتح ہوئے بلکہ انہیں دوبارہ ہندوستان کی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ التمش نے عوام کے دلوں میں اپنے خاندان کے لیے ایک گہری عزت ولگاؤ پیدا کردی تھی۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی سیاسی استحکام کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ التمش عہد وسطیٰ کے شہر دہلی کا حقیقی معمار تھا جو چند درمیانی عہد چھوڑ کر 1857ء تک برابر سیاست کا مرکز رہا۔ تعمیرات وترقی اس دور میں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ التمش نے دنیا کے مختلف گوشوں سے اہل ہنر، تعلیم یافتہ، صالح اور بہترین اشخاص کو ایک پناہ گاہ میں جمع کیا۔ اس زمانے میں ترک اور غیر ترک غلاموں اور افسروں کو بہترین روزگار حتیٰ کہ تخت نشیں کرایا۔ یہ التمش ہی تھا جس نے سلطنت کی فوج کو ''بادشاہ کی فوج'' کی حیثیت سے منظم کیا۔ اس نے پہلی بار شکہ کا سکہ ڈھالا۔ اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ جانشین کا تھا۔ جب اس نے شہزادی کی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانچا اور پرکھا اور گوالیار کی مہم پر روانہ ہوتے وقت اسے دہلی نظام حکومت کا انچارج بنادیا۔ اس نے اپنی ذمے داری اتنی اچھی طرح نبھائی کہ گوالیار سے واپسی کے فوراً بعد اسے اپنا ولی عہد مقرر کردیا۔ جب دستاویز کا مسودہ تیار ہوگیا تو چند امیروں نے سلطان کو سمجھایا۔

''حضور کے پاس نوجوان بیٹے ہیں جو بادشاہت کے لائق ہیں۔ ایسی حالت میں سلطان کے ذہن میں لڑکی کو ولی عہد نامزد کرنے کا کیا مقصد ہے!''

تو اس کے جواب میں التمش نے کہا۔

''میرے بیٹے جوانی کی دلفریبی میں مست ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ملکی امور کے انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میری موت کے بعد یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان میں سے کوئی بھی ولی عہد ہونے کے لائق، میری اس بیٹی سے زیادہ نہیں۔''

سلطان التمش اپنی آخری سرحدی مہم پر روانہ ہوا تو رکن الدین فیروز کو لاہور سے اپنے ساتھ لے گیا اور اسے لاہور کی حکومت دے دی اور 1228ء میں اسے سبز چتر کے ساتھ بدایوں کی جاگیر ملی تو عین الملک حسین اشعری کو اس کا وزیر بنایا۔ سلطان نے ضعف وبیماری کے باعث بنیان کی جانب لشکر کشی سے مراجعت (واپسی) کی تو رکن الدین کو اپنے ساتھ دہلی لے کر آیا کیونکہ شہزادہ محمود کی وفات کے بعد لڑکوں میں وہی سب سے بڑا تھا۔ چنانچہ سلطان التمش کی وفات کے بعد 30 اپریل 1236ء کو اسے تخت دہلی پر بٹھایا گیا تو شاہ ترکان نے بڑی خوشیاں منائیں کیونکہ اس کی دیرینہ خواہش آج پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے ساتھ گلناز بھی بے حد خوش تھی۔ اب اسے بھی امید ہوچلی تھی کہ بہت جلد وہ بھی ملکہ ہندوستان کہلائی جانے لگے گی۔ تخت پر بیٹھتے ہی شاہ ترکان کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ رکن الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی پرانی عادتوں کو شدومد سے دوبارہ شروع کردیا اور خزانۂ عامرہ کو بے جا استعمال کرنا شروع کردیا۔ جب اس کی سواری نکلتی تو وہ سونے اور چاندی کے سکے لٹاتا ہوا شہر سے گزرتا۔ سلطنت کا کاروبار آہستہ آہستہ ابتری کا شکار ہوگیا۔ اس کی والدہ شاہ ترکان خود کو رکن الدین کی ماں نہیں، سلطنتِ ہند کی فرماں روا سمجھنے لگی تھی۔ اس کی فرعونیت میں اضافہ ہوچکا تھا اور وہ خود فرمان جاری کرنے لگی تھی۔ ان ہی دنوں گلناز اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھی۔ ایک روز اس نے شاہ ترکان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ملکۂ عالیہ! برسوں کے انتظار کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس اقتدار کے تخت پر بٹھایا ہے۔ اس میں آپ کی محنت بھی شامل ہے۔ مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ اب بھی محل میں ایسی خواتین، کنیزیں اور ملکائیں دندناتی پھرتی ہیں جو ماضی میں آپ کی مخالفت کرتی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کو طنز وتضحیک کا نشانہ بناتی رہی ہیں۔ وہ آج بھی خود کو سلطان التمش کے محفوظ حرم میں سمجھتی ہیں۔ کیا ان کو کہیں زوال نہیں؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''ارے ہاں، مجھے تو یہ یاد ہی نہیں تھا۔ تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب میں انہیں بتاؤں گی کہ میں ایک حقیر کنیز نہیں، ہندوستان کی ملکہ ہوں۔ یقیناً اب میری باری ہے۔ تم ایسی کنیزوں، باندیوں کی فہرست مجھے دو۔ ملکاؤں کو میں خود جانتی ہوں کہ انہوں نے کس کس موقعے پر مجھے تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔ میں ان سب کو نشانِ عبرت بنادوں گی۔ انہوں نے مل جل کر میرے بیٹے کا حق چھیننے کی کوشش کی تھی۔'' شاہ ترکان نے گویا فرمان جاری کردیا تھا۔ اس کے دو ایک دنوں کے بعد گلناز ایک فہرست لے کر شاہ ترکان کے حضور پہنچ گئی۔ شاہ ترکان نے ایک سرسری نظر فہرست پر ڈالی اور دوسری طرف پھینک دی۔

Digitized by Google

گلناز کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس نے شاہ ترکان کا یہ ایک نیا انداز دیکھا تھا۔ پہلے تو اس کی ہر بات اور ہر کام کو اہمیت دیتی تھی۔ لیکن آج یوں بے اعتنائی سے فہرست کو پھینک دیا۔ گویا اب اس کی بھی تفتیش کا دور شروع ہونے والا تھا۔ پھر بھی اس نے برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فہرست اٹھا کر پہلے دوناموں پر اپنی حنائی انگلی رکھی۔ شاہ ترکان نے اس کی خوبصورت انگلی کو پکڑ کر اس کا ہاتھ اپنے آگے کرلیا اور اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھنے لگی، جو مہندی کے دلفریب نمونے سے بھری پڑی تھی۔

''ارے گلناز! تو نے دوسری شادی کرلی ہے جو دلہنوں کی طرح اپنی ہتھیلیاں رنگی ہوئی ہیں؟'' شاہ ترکان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں خانم! ہم کوئی آزاد ہیں جو اپنی مرضی سے اپنا کوئی کام کرسکیں۔ ہم تو غلام ابن غلام ہیں۔'' گلناز نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں کس نے آزاد کرنا تھا؟ سلطان نے..... وہ تو قبر... میں جالیٹا ہے۔ اس کی جگہ اب میرا بیٹا رکن الدین تمہارا مالک ہے۔'' شاہ ترکان یہ کہہ کر چپ ہوگئی تو گلناز نے فوراً اس کے الفاظ اچک لیے۔

''کاش ایسا ہوجائے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہے بھئی..... ایسا ہوچکا ہے۔ میں آج ہی اسے کہہ کر تمہیں آزاد کروادوں گی بلکہ اسے کیوں کہوں، حکم تو میرا چلتا ہے اور میرے حکم کو کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔ جاؤ آج سے تم آزاد ہو۔''

''یہ کنیز آپ کی عنایات کے سامنے سر اٹھانے کی مجال نہیں رکھتی۔ آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔'' گلناز نے اپنا سر خم کرکے آداب کہا تو شاہ ترکان دوبارہ بولی۔

''ہاں تو تم کچھ بتارہی تھیں؟''

گلناز نے زمین پر پڑی فہرست دوبارہ اٹھائی اور پہلے دوناموں پر انگلی رکھ دی۔ ''یہ دونوں کنیزیں حضور والا سے بہت حسد کرتی ہیں، ان میں سے ایک ملکۂ عالیہ نادرہ بیگم اور دوسری ملکۂ قطب بیگم کی جاسوس ہیں۔ محل میں ہونے والی ایک ایک بات ان کے کانوں تک پہنچاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو سلطان رکن الدین کی باتیں اور چغلیاں بھی کرنے لگی ہیں۔''

''ہوں.....'' شاہ ترکان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''جب یہ نہیں رہیں گی تو ہماری باتیں ان تک کیسے پہنچیں گی۔ میں آج ہی انہیں ان کے انجام تک پہنچادوں گی۔'' پھر اس نے تالی بجائی تو فوراً ایک تیس پینتیس سال کا خواجہ سرا اندر آگیا۔ آتے ہی آداب بجالا کر بولا۔

''جی ملکۂ عالیہ میرے لیے کیا حکم ہے؟'' گلناز حیرانی سے شاہ ترکان کا یہ نیا انداز دیکھ رہی تھی جو ایک مخملیں گدے پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھی۔

''کمال الدین! ان دو کنیزوں رضیہ اور فیروزہ کو بالوں سے کھینچتے ہوئے پکڑ کر لاؤ۔'' گلناز یہ سن کر کانپ اٹھی تھی۔ اب ان کا انجام اس کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کو بالوں سے پکڑے واپس آگیا۔

''جب انقلاب آتا ہے تو سلطنت کے قانون بھی بدل جاتے ہیں، تمہیں چاہیے تھا کہ اس کے ساتھ خود کو بھی تبدیل کرلیتیں۔ وہ دونوں نواب زادیاں جن کی تم مخبری کرتی آرہی ہو، اب مجھ سے کہیں نچلے درجے پر ہیں۔ میں ملکۂ ہند ہوں اور وہ..... ان کی حیثیت میرے سامنے کنیزوں سے بھی کمتر ہے۔ لے جاؤ انہیں میرے سامنے سے اور ان کے سر اڑادو تاکہ انہیں مخبری کرنے کی سزا مل جائے۔''

''رحم ملکۂ ہند..... رحم ملکۂ عالم.....'' وہ دونوں چلانے لگیں۔ مگر انہیں غلام بڑی بے دردی سے کھینچتے ہوئے باہر لے گیا۔

گلناز پر شاہ ترکان کی بربریت پوری طرح سے آشکار ہوچکی تھی۔

''یہ شاہی طبیب ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ بہرحال گلناز! تم ایک کام کرو۔''

''جی شاہ ترکان.....'' گلناز گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ شیشی لو اور اسے شاہی باورچی تک پہنچادو مگر اس کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔''

''ان بادشاہ زادیوں کو بھی دیکھ لوں جنہوں نے ہر مقام پر مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کی، بہت بے عزتی سہہ لی ہے میں نے۔ لے جاؤ اسے .. اور اسے کہنا، جیسا ملکۂ جہاں نے کہا ہے آج ہی سے اس پر عمل شروع کردو۔'' شاہ ترکان نے غصے سے کہا تو کانپتے ہاتھوں سے گلناز نے وہ شیشی پکڑی اور بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی اب شاہ ترکان کا اگلا شکار محل کی بیگمات ہوں گی۔

اس کی تصدیق اگلے ہی دن ہوگئی جب محل میں افراتفری مچ گئی۔ گلناز اس وقت بھی شاہ دوراں کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ باہر ہونے والی گڑبڑ کی اطلاع اس وقت ملی۔ جب ایک بھاگتی ہوئی کنیز نے آکر شاہ ترکان کو بتایا کہ کسی نے سب سے چھوٹی ملکہ کو زہر دے دیا ہے۔ فوری طور پر

باورچی خاص کو پکڑ لیا گیا اور شاہی طبیب کو بھی طلب کر لیا گیا ہے۔ گلناز دیکھ رہی تھی کہ اس کا کوئی بھی اثر شاہ ترکان پر نہیں ہوا، وہ بدستور مطمئن تھی۔

''ملکہ عالیہ کچھ سنا آپ نے.....؟'' گلناز نے شاہ ترکان سے پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں گلناز! ایسا ہوتا ہے اور پھر یہ تو ابتدا ہے۔ میں نے حکم دیا ہے کہ شاہی باورچی کے اس خادم کو پکڑ کر کٹہرے میں لایا جائے، جو بیگمات کو کھانا مہیا کرتا ہے۔''

''مگر میں نے تو سنا ہے اسے فرار کرا دیا گیا ہے۔'' گلناز نے بتایا۔

''کس نے اسے بھگایا ہے اور شاہی طبیب کیا کرتا ہے؟ اپنی ذمے داریوں کو کیوں نہیں نبھاتا؟ اس کو اس کا تدارک کرنا چاہیے تھا۔'' تب شاہ ترکان کو کسی نے اطلاع دی کہ ملکہ عالیہ کو کسی نے نہایت مہلک زہر دے دیا تھا اور شاہی طبیب کی کوششوں کے باوجود ان کو نہیں بچایا جا سکا۔ بھاگ کر جاتے ہوئے باورچی کو ایک سپاہی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ محل کے مکین حیرت زدہ تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر ان سے الگ گلناز جانتی تھی کہ اس سارے سانحے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور سارے منصوبے کو کسی نے کس ہنرمندی سے ترتیب دیا ہے۔ اب تو گلناز کو بھی شاہ ترکان سے خوف آنے لگا تھا۔ پتا نہیں کون اس کا اگلا شکار ہو۔

ادھر رکن الدین اپنی عیاشیوں میں پوری طرح مصروف تھا۔ اب تو اسے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ البتہ اس کی شکایات وقتاً فوقتاً رضیہ سلطانہ کو دی جاتی تھیں مگر وہ ابھی کوئی قدم نہیں اٹھا رہی تھی کیونکہ شاہ ترکان کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس کے علاوہ بھی جب سے سلطان التمش فوت ہوا تھا، سلطنت میں بغاوتوں اور لاقانونیت کے واقعات بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رکن الدین کی جانب سے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا جا رہا تھا۔ جب حالات بے قابو ہوتے دیکھے تو رضیہ سلطانہ نے جرأت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سرخ جامہ زیب تن کیا۔ جو عموماً ان دنوں مظلوم لوگ انصاف کا مطالبہ کرنے کے لیے پہنا کرتے تھے۔ اس نے باپ سلطان التمش کے نام سے دہلی کے لوگوں سے براہ راست..... انصاف کے لیے اپیل کی کہ وہ رکن الدین کے ساتھ ساتھ شاہ ترکان کی سازشوں سے مملکت کو نجات دلائیں۔

شاہ ترکان اس وقت خود ایک منصوبے کو ترتیب دینے میں مصروف تھی۔ وہ جشنِ نجات کے تحت نہ صرف رکن الدین کی تخت نشینی بلکہ پرانے بادشاہوں سے عوام کی نجات کے سلسلے میں محافل منعقد کروانے کا منصوبہ بنا رہی تھی جب گلناز نے اسے اطلاع پہنچائی۔

''اف کیا مصیبت ہے۔ جب بھی میں نے ذرا اپنی ذہنی تفریح کا کوئی پروگرام بنایا کسی نہ کسی طرف سے میرے سارے منصوبے کو برباد کر دیا گیا۔ اب اس لڑکی نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ گویا مجھے سب سے پہلے اب اسی سے نبٹنا ہوگا۔''

سلطان رکن الدین کے بعد رضیہ سلطانہ کے حمایت شدہ افسران اور وفاداران سلطان التمش نے رضیہ سلطانہ کو تخت نشیں کر دیا لیکن وزیر جنید نے اس کی سلطانی سے اتفاق نہ کیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد حالات اور بگڑ گئے جب ملک جانی، ملک کوچی، ملک کبیر خاں، ملک سالاری بھی وزیر جنید کے ساتھ شامل ہو گئے اور اطرافِ دہلی میں جمع ہونے لگے۔ ادھر ملک تاتسی کو پتا چلا تو وہ اودھ کے حاکم سے مل کر رضیہ سلطانہ کی مدد سے لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا لیکن جب اس نے گنگا کو عبور کیا تو مخالفین رضیہ اس کے مقابلے کے لیے جا پہنچے اور اسے گرفتار کر لیا۔ اسی اثنا میں بیماری نے ملک تاتسی پر غلبہ پا لیا اور وہ فوت ہو گیا۔ رضیہ سلطانہ آخر مخالفین سے فیصلہ کرنے کے لیے خود شہر سے باہر نکلی اور دریائے جمنا کے کنارے خیمہ زن ہو گئی۔ اس کے حامی ترک امرا اور مخالفین میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر صلح ہو گئی۔ جب رضیہ سلطانہ کے معاملات درست ہوئے تو رضیہ سلطانہ نے وزارت کا منصب خواجہ مہذب کو دے دیا۔ رضیہ سلطانہ نے پردہ ترک کر کے مردانہ لباس اختیار کیا اور ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلنے لگی۔

دوسری طرف رکن الدین اور شاہ ترکان نے مل کر بیگماتِ محل کے علاوہ دوسرے لوگوں کو تختۂ مشق بنا لیا۔ شاہ ترکان ہر روز کسی ایک کو مروا دیتی جس کے سبب عمال حکومت پریشان ہو گئے۔

☆☆☆

یہ محل پر چھائے انہی سفاک دنوں میں سے ایک دن تھا۔ جب محل میں بے حد افراتفری مچی ہوئی تھی۔ خواتین کے اونچی آواز میں بین کرنے کی دلخراش آوازیں آ رہی تھیں۔ گلناز اپنے کمرے سے جلدی سے نکلی اور بھاگتی ہوئی شاہ ترکان کے کمرے میں آ گئی۔ وہاں صرف شاہ ترکان موجود تھی جو پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی۔

''میں نے انتقام لے لیا۔ دیکھا میں نے اپنا انتقام

مکمل کرلیا۔ آج ایک معمولی کنیز جیت چکی ہے اور یہ بادشاہ زادیاں شکست خوردہ ہو کر بین کر رہی ہیں۔ گلناز آؤ..... جتنا مالِ غنیمت سمیٹ سکتی ہو، سمیٹ لو۔ آج خوشیوں کا دن ہے۔ آج میں نے اپنے بیٹے کے سب سے بڑے رقیب قطب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دی ہیں۔ بڑا مان تھا نا سلطان التمش کو اس پر۔ وہ کہا کرتا تھا یہ اس کا لائق اور ہونہار بیٹا ہے، دیکھا میرا انتقام..... یہ مجھے حقیر جانتی تھیں اور میرا مذاق اڑاتی تھیں۔ شاید نہیں جانتی تھیں کہ عورت جب انتقام لینے پر آجائے تو اس کے آگے پہاڑ بھی موم ہو کر پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

''ذرا باہر جا کر محل کی راہداریوں میں دیکھو وہ جو سلطان التمش کا ہونہار بیٹا تھا، کس طرح محل کی دیواروں سے ٹکریں کھاتا پھرتا ہے اور چیخ چیخ کر نشانِ عبرت بنا ہوا ہے۔ مگر ابھی میرا انتقام ختم نہیں ہوا۔ ابھی میرے دل میں بھڑکتا ہوا جوش اسی طرح موجود ہے اور اس کے سلگتے شعلے ٹھنڈے نہیں پڑے.....'' جب یہ خبر محل سے باہر نکلی تو اکثر سرداروں اور حکام مخالفت پر اتر آئے۔ سلطان التمش کے ایک اور بیٹے غیاث الدین محمد شاہ نے اودھ میں علمِ بغاوت بلند کر دیا اور لکھنوتی سے جو خزانہ دہلی آرہا تھا، اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے علاوہ کئی قصبوں میں لوٹ مار بھی کی۔ اسی طرح ملک عزالدین محمد سالاری جاگیردار بدایوں بھی باغی ہو گیا۔ ملک علاؤالدین جانی حاکم لاہور، ملک کبیر... والیِ ملتان، ملک سیف الدین کوچی جاگیردار بھاسی نے متحد ہو کر بغاوت کردی۔ سلطان رکن الدین فوج لے کر کہرام کی طرف چلا گیا۔ اس کے خاص غلاموں نے جو فوج کے درمیانی حصے میں تھے، انہوں نے ترائن اور منصور پور کے حوالی میں تاج الملک محمود، بہاء الملک حسین اشعری، کریم الدین زاہد، نظام الدین .... اور کئی دوسرے سرداروں اور عمال کی ایک جماعت کو ہلاک کر ڈالا۔

دوسری طرف شاہ ترکان شاید پاگل ہو چکی تھی۔ اس نے التمش کی کئی بیویوں کو بڑے سفاکانہ انداز میں قتل کروا ڈالا تھا۔ ترکی کی معزز خواتین جو سلطان التمش کے حرم میں داخل تھیں، انہیں اس قدر ستایا کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی کے دن گزارنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ نظام الدین ملک شاہ ترکان کے حکم پر بڑی پابندی سے عمل کر رہا تھا۔

قطب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھروانے کے بعد اسے زنداں میں ڈال دیا گیا تھا۔ شہزادی رضیہ سلطانہ کو جب اس کی خبر ملی تو وہ صدمے سے اپنے آپ میں نہ رہی اور بھاگتی ہوئی زنداں تک پہنچی۔ زنداں پر سپاہیوں کا پہرا تھا۔ وہ ہر حال میں شاہ ترکان تک پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ جذبات میں ڈوبی بھاگتے ہوئے شاہ ترکان کے کمرے کی طرف بھاگی جس کے حکم پر چند دنوں بعد قطب الدین کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش جب زنداں سے باہر آئی تو قصرِ سلطانی کے بام و در پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ اب شاہ ترکان اور رضیہ سلطانہ کے درمیان بھی ٹھن چکی تھی کیونکہ ایک سازش کے تحت اس نے رضیہ سلطانہ کو بھی قتل کروانا چاہا تھا۔ رکن الدین کو جب اس کی خبر ملی تو وہ فوراً دہلی لوٹا۔

رضیہ سلطانہ جب سراپا احتجاج بنی شاہ ترکان کے سامنے کھڑی تھی۔

''مادرِ گرامی! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ قطب الدین کو کس جرم میں قتل کیا گیا ہے اور کس غلطی کی پاداش میں اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائی گئیں؟'' رضیہ سلطانہ نے اپنے شدتِ غم کو برداشت کرتے ہوئے محل سے پوچھا۔

''تو شدتِ جذبات سے اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔ جانتی ہے تو کس سے مخاطب ہے اور میں تیری ماں نہیں ہوں ملکۂ عالیہ شاہ ترکان ہوں۔ یہ دیا ستوں کی باتیں ہیں جو تو نہیں جانتی۔ یہاں محبتیں اور نفرتیں ایک ساتھ چلتی ہیں اور یہ سب خدشات کے کاندھوں پر بیٹھ کر آگے بڑھتی ہیں۔'' شاہ ترکان نے جواب دیا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں شاہ ترکان .....''

اب شہزادی رضیہ سلطانہ نے اسے اسی نام سے پکارا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔

''تو سنو..... میں نے ساری زندگی نفرتوں کے کانٹوں پر گزاری ہے۔ قصرِ سلطانی کا ایک ایک مکین جانتا ہے کہ حرمِ شاہی میں میری کیا حیثیت تھی۔'' شاہ ترکان نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''آپ تو ملکۂ عالیہ شاہ ترکان تھیں۔ آپ نے کن کانٹوں پر زندگی گزاری ہے۔ اس کا کیا مجھے علم نہیں ہے۔'' رضیہ سلطانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو..... بھی ایک عورت ہے رضیہ سلطانہ..... تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ یہاں عورت ہمیشہ دہری زندگی گزارتی ہے۔ ایک زندگی وہ ہوتی ہے جو بظاہر سب کو نظر آتی ہے مگر وہ اس کی زندگی نہیں ہوتی اور دوسری زندگی اس کے اپنے اندر کی ہوتی ہے جہاں خواہشوں اور امیدوں کی یورش ہوتی ہے، جن سے اس نے خود ہی نمٹنا

ہوتا ہے۔ میرے سر پر ملکۂ عالیہ کا تاج ضرور تھا مگر میں اندر سے محبت اور چاہت کے لیے ترسی ہوئی عورت تھی۔ مجھے تیرے باپ کا سلوک کبھی نہیں بھولے گا جس نے میری خواہشوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ تیری ماں وقت سے پہلے مرگئی تھی۔ ورنہ وہ بھی دیکھ لیتی کہ ملکۂ عالیہ کا انتقام اور غیظ وغضب کیا ہوتا ہے۔ یہ اسی ماں کا بیٹا تھا جو ہمیشہ میرے خاندان اور میری حیثیت پر طعنہ زن رہتی تھی اور تیرا باپ جو مجھے ہمیشہ ایک احمق عورت جانتا رہا اور اپنی دوسری بیویوں کو محض اس لیے اہمیت دیتا رہا کہ وہ اچھے خاندانوں اور بادشاہوں کی بیٹیاں تھیں اور میں محض ایک کنیز تھی جسے اس نے غلاموں کے بازار سے خریدا تھا۔ مجھے بتاؤ رضیہ سلطانہ کیا غلاموں یا بادشاہوں کے گھروں میں پیدا ہونا بچے کے اپنے بس میں ہوتا ہے؟'' شاہ ترکان غصے میں زرنگار کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''مجھے تیرے باپ نے ہمیشہ خدشوں اور وسوسوں کے دریا میں لاچھوڑا۔ میں اتنی شاطر تو نہ تھی۔ پھر سب سے بڑی زیادتی میرے ساتھ یہ کی کہ میرے بیٹے کا حق بھی چھینا۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔ اس کی تند وتیز آواز سن کر گلناز بھاگی چلی آئی۔

''ملکۂ ہند! باندی آپ کی مدد کو حاضر ہے۔ کوئی مسئلہ ہے کیا جو آپ یوں.....'' گلناز نے پوچھا۔

''ہاں..... ہاں، میں پاگل ہوگئی ہوں۔ سالار افواج سیف الدین ایبک کہاں ہے؟ اسے کہو لے جائے اس سلطان زادی کو اور زنداں میں ڈال دے۔''

''کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں، خواہشوں کے غلام لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو اس وقت شاہ ترکان کا ہے۔ میں جارہی ہوں۔'' یہ کہہ کر رضیہ سلطانہ کمرے سے نکل گئی۔

''تم گلناز اسی وقت رکن الدین کو میرا پیغام دو کیوں اس نے ایسے لوگوں کو ڈھیل دے رکھی ہے۔ انہیں لگام کیوں نہیں ڈالتا۔'' شاہ ترکان اسی لہجے میں بولی۔

''جی خانم! ابھی جاتی ہوں۔'' وہ جانتی تھی کہ شاہ ترکان اس وقت نہایت غصے میں ہے۔ اس لیے ایسے غلط سلط احکام دے رہی ہے۔ وہ بھی خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئی۔ باہر اندھیرا چھا چکا تھا مگر وفادار ان سلطان التمش اور رضیہ سلطانہ شہزادے قطب الدین کی تجہیز وتدفین میں مصروف تھے۔ وہ نہ جانے کس جذبے کے تحت تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے سلطان رکن الدین کے کمرے تک جا پہنچی۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے موسیقی اور گھنگروؤں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ آہستگی سے اندر داخل ہوئی۔ رات بڑی تیزی کے ساتھ اپنے آخری پہروں میں داخل ہو رہی تھی۔ اندر محفل ناؤنوش برپا تھی۔ ایک ہندو ناری اپنے فن کا مظاہرہ کررہی تھی۔ نظام الملک سلطان رکن الدین کے بائیں ہاتھ پر مسند نشیں تھا۔ وہ نظام الملک سے دھیمی آواز میں گفتگو کررہا تھا۔

''اسے وقارِ شاہی کہتے ہیں کہ سارا عالم سلطان کے سامنے رقص کررہا ہے۔ آج یہ غلام بھی بے حد خوش ہے کہ آج اس نے جنت، زمین پر اتری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ یہ صرف آپ ہی کے دم سے ہوا ہے۔'' نظام الملک خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''بوڑھا تھا میرا باپ جو دنیا جہان کی لذتوں سے کنارہ کشی کر کے جوگ لینے کی باتیں کرتا تھا۔ اسے کیا پتا کہ دنیاوی جاہ وجلال کیا ہوتا ہے۔ مرگیا اچھا ہوا۔ کہتا تھا کہ رکن الدین نااہل ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور پھر ایک نوخیز وحسین مطربہ کو اشارہ کیا جو ساقی گری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور سلطان کے روبرو پہنچ کر ذرا سا جھکی پھر اس نے اونچے کیے ہاتھ میں پکڑے بلوریں ساغر کو شراب سرخ سے لبالب بھر دیا اور ناز وادا کے ساتھ رکن الدین کی خدمت میں پیش کیا جس نے اس کے دست حنائی سے جام لے کر نظام الملک کی طرف بڑھا دیا۔ معاً اس کی نظر گلناز پر پڑی تو وہ حیرت سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا مگر نشے کی زیادتی سے لڑکھڑا گیا۔ ایسے میں اگر نظام الملک اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتا۔

''آؤ..... آؤ پری پیکر خوش آمدید۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں گلناز کو اشارہ کرتے ہوئے بلایا۔

''لو نظام الملک! ایک اور ہوش ربا کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ وہ ہے جسے ملکۂ ہند بننے کا شوق ہے اور میں نے اسے ہمیشہ ملکۂ عالیہ کہہ کر ہی پکارا ہے۔ تم ہی بتاؤ نظام الملک بھلا خواب دیکھنے پر کوئی پابندی ہے۔ نہیں نا، تو پھر میں کون ہوتا ہوں اس کے خوابوں پر پابندی لگانے والا۔'' اتنا کہہ کر رکن الدین نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور نظام الملک کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ ''چلی آؤ ملکۂ عالیہ۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر گلناز کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں حمائل کردیا تھا۔

''چلو شریک ہوجاؤ آج کے جشن میں۔ تمہیں پتا ہے

یہ جشن کس خوشی میں منایا جارہا ہے؟ تمہیں تو یقیناً علم ہوگا۔ تم تو میری والدہ شاہ ترکان کی بڑی عزیز کنیز ہو۔''

''وہ تمہاری والدہ.....!'' یہ کہہ کر گلناز خاموش ہوگئی۔

''کیا ہوا مادرِ گرامی کو؟ وہ بھی یقیناً میرے حریف قطب الدین کے قتل کی خوشیاں منارہی ہوگی؟''

''نہیں، وہ خوشیاں نہیں منارہی۔ وہ پاگل ہوگئی ہے۔''

''کیا بکواس کررہی ہو کنیز۔'' رکن الدین شدتِ جذبات سے چیخا۔ ''تمہیں یقیناً کسی نے غلط بتایا ہوگا۔''

اس ایک لفظ نے گلناز کو آسمان سے زمین پر لا پھینکا تھا۔ گویا وہ اتنا کر گزرنے کے بعد بھی کنیز کی کنیز ہی رہی۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ رکن الدین کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں..... نہیں ملکۂ عالیہ۔''

''معاف کیجیے سلطان محترم! اچھا ہوا آپ نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی۔ مجھے آج پہلی بار بڑی شدت سے احساس ہوا ہے کہ خوابوں کے نگر میں رہنے والوں کے خواب جب چکنا چور ہوتے ہیں تو انہیں کتنا دکھ ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ نے شہزادہ قطب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں اور پھر اسے قتل کروادیا۔ آپ کو علم ہے کہ اس واقعے پر عوام وخواص کس قدر غم و غصے میں ہیں؟'' گلناز نے بتایا۔

''تو پھر میری جان مجھے اب کیا کرنا ہوگا؟ وہ جو میرا دشمن تھا وہ تو مر گیا۔'' رکن الدین ہنستے ہوئے بولا اور پھر نظام الملک کی طرف گردن جھکا کر بولا۔ ''نظام الملک! میرے دوست تم ہی کچھ کرو۔ اس بے چاری کی دادرسی کرو، اس کی ہمارے خاندان کے لیے بڑی خدمات ہیں۔ چچ..... چچ بے چاری..... میں اس کی خوب صورتی پر مرمٹا ہوں۔ حوروں کی طرح بدن ہے اس کا، یار کچھ کرو۔'' وہ ہنستے ہوئے کہے جارہا تھا۔

''میرے لیے نہیں، اپنی والدہ کے لیے کچھ کرو۔ مشتعل عوام نے شاہی محل پر ہلا بول دیا ہے اور شاہ ترکان کو گرفتار کر کے وہ شاید دہلی لے گئے ہیں۔ اس کے لیے کچھ کرلو۔'' گلناز نے غم زدہ لہجے میں بتایا۔

''لو اور سنو..... مادرِ محترم کو گرفتار کرنے کی کس میں جرأت ہے، کس نے اپنی موت کو آواز دی ہے؟'' وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا بولا۔ نظام الملک ابھی اپنے ہوش و حواس میں تھا اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

جب رکن الدین کو احساس ہوا تو وہ بھی اول فول بکتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ محفل اجڑ گئی اور گلناز بھی غم زدہ انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے تک آن پہنچی۔ شاہ ترکان کو جب زندان میں ڈالا گیا تو اقتدار سے محروم ہوجانے کے صدمے سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اور زندان کی سنگی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی۔ رضیہ سلطانہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے بہترین طبیبوں کو اس کی نگہداشت پر بٹھادیا۔ سنگی دیواروں سے زور زور سے سر ٹکرایا تو اس کے دماغ سے خون بڑی مقدار میں بہہ گیا جس کے سبب وہ بے ہوش ہوگئی اور بے چارگی کے عالم میں دنیا سے منہ موڑ گئی۔

سلطان رکن الدین بھاگتا ہوا کیلوکھری میں پہنچ گیا تھا جسے رضیہ سلطانہ کے حکم پر گرفتار کرلیا گیا اور اسے دہلی لا کر رضیہ سلطانہ نے زندان میں ڈال دیا۔ زندان ہی میں وہ مستقل بیمار رہنے لگا۔ کثرتِ شراب نوشی نے اس کی صحت کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اب وہ مسلسل خون تھوکنے لگا تھا۔ رضیہ سلطانہ نے اسے علاج کی تمام تر سہولتیں فراہم کیں مگر کوئی بھی طبیب اسے بہتر نہ کرسکا۔ رضیہ سلطانہ اس کے باوجود اس کی تیمارداری میں مصروف رہتی۔ ایک روز جب وہ اس کی تیمارداری کے لیے آئی تو رکن الدین بڑی آزردہ آواز میں بولا۔ ''میں بہت شرمندگی سے تمہارے سامنے التجا کرتا ہوں۔ بہت حقیر سی خواہش ہے اگر تم میرے لیے..... اپنے بدنصیب بھائی کے لیے پوری کردینے کی ہامی بھرلو تو میں بتاؤں۔''

''ہاں ہاں، کہو میرے بھائی! تو میرا بھائی ہے، کیا ہوا سوتیلا تھا۔ میں تیری ہر خواہش پوری کروں گی اگر میرے بس میں ہوئی تو۔'' رضیہ سلطانہ نے اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا تو رکن الدین دھیرے سے بولا۔

''بہت دنوں سے پیاسا ہوں، میرے لیے شراب اور رقص کا بندوبست کردے۔ میں فقیروں کی طرح نہیں، شہنشاہوں کی موت مرنا چاہتا ہوں۔''

طبقات ناصری۔ منہاج الدین جوزجانی (ترجمہ)۔
تاریخ ہند۔ ای مارسیڈن (ترجمہ)۔
تاریخ مبارک شاہی۔ یحییٰ بن احمد سرہندی (ترجمہ)
تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی (ترجمہ)۔
تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ۔
جامع تاریخ ہند۔ محمد حبیب۔ خلیق احمد
تاج المعاصر۔ ضیاء الدین برنی (ترجمہ)۔
حاکمان پنجاب۔ اسد سلیم شیخ۔

جعلی وارث

تنویر ریاض

طمع چاہے جس روپ میں ہو... ہمیشہ رشتوں اور احساسات کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ جو نازک خیالات اور انتہائی دلکش حسن کی مالک تھی، جو بلند پرواز کرنا چاہتی تھی کہ اچانک اس کے اپنوں نے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی... گویا آسمان اور زمین کے درمیان معلق زندگی گزارنے پر مجبور کردی گئی اور... رشتوں کی یہ بلیک میلنگ اسے زندگی سے بہت دور لے گئی۔

محبت میں رسوائی سے ڈر جانے والی ایک دوشیزہ کا

لرزہ خیز انجام

میری مایوسی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ جائداد اور اثاثے جنہیں میں اپنا سمجھ رہا تھا، اچانک ہی کسی اجنبی نے مجھ سے چھین لیے اور کئی برس مفلسی کی زندگی گزارنے کے بعد جو خوشی مجھے ملنے والی تھی، وہ وقت سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ میں اپنے چچا کا واحد قانونی وارث تھا کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور یہ بات سب لوگ جانتے تھے۔ گو کہ چچا نے کبھی پلٹ کر میری خبر نہ لی کہ میں کس حال میں ہوں اور مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ اس

کے باوجود میں نے ان کی موت کی خبر سن کر انہیں معاف کر دیا اور بے چینی سے اچھی خبر کا انتظار کرنے لگا کہ کب یہ جائیداد اور اثاثے میرے نام منتقل ہوتے ہیں لیکن میری بدقسمتی کہ اچھی کے بجائے بری خبر آگئی اور وکیل نے مجھے اطلاع دی کہ چچا کی ایک بیٹی سامنے آئی ہے اور اس کے دعوے پر شک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے نظر انداز کرنا ممکن ہے۔ یہ جائیداد بجا طور پر اس کی ہے اور میں اب بھی پہلے کی طرح ایک غریب مصور ہوں۔

کئی برس پہلے میں نے اپنے چچا کی شادی کی خبر سنی پھر ان کے یہاں ایک بیٹی کی پیدائش اور اس کی موت کے بارے میں سنا۔ وہ خود بھی اچانک ہی انتقال کر گئے اور انہوں نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی لیکن ان کے آخری الفاظ تھے۔ ''میرا سب کچھ سیسل کا ہے۔'' واضح طور پر ان کا اشارہ میری جانب تھا جس پر سب لوگوں نے یقین کرلیا لیکن اچانک ہی اس خوب صورت لڑکی کے آنے سے صورتِ حال بدل گئی جو ان کی بیٹی ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی اور ثبوت کے طور پر اپنا نام سی سیلیا بتا رہی تھی جس نے چچا کے آخری الفاظ کو ایک نیا مفہوم دے دیا اور لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ چچا دراصل اسی کا نام لے رہے تھے لیکن ان کی زبان سے سیسل ہی ادا ہو سکا تھا۔

اس لڑکی نے دعویٰ دائر کیا اور وہ جیت گئی۔ میری اتنی استطاعت نہیں تھی کہ میں اپنے حق کے لیے لڑ سکتا۔ لہٰذا صبر کر کے بیٹھ گیا۔ البتہ میری کوشش تھی کہ اٹلی چھوڑنے سے پہلے کچھ پیسے کمالوں اور جب میری تمام امیدیں ختم ہو چکی تھیں تو مجھے اس نامعلوم کزن سے ملنے کا موقع مل گیا۔ اس کے علاوہ میرے وکیل نے بھی امکان ظاہر کیا تھا کہ میں اب بھی چچا کے اثاثوں میں سے اپنا حصہ حاصل کر سکتا ہوں۔

میں جوان، خوب صورت اور اچھی شہرت رکھنے والا مصور تھا اور باصلاحیت ہونے کی وجہ سے اس میں پہلے ہی اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس خوب صورت کزن سے پیار کی پینگیں بڑھا کر اس دولت و جائداد کا مالک بن جاؤں جسے میں اپنا سمجھ رہا تھا۔

یہ آئیڈیا مجھے پسند آیا۔ ویسے بھی میرے پاس کچھ وقت تھا اور فی الوقت ..... میری کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے میرے دل میں اپنے آپ کو آزمانے کی خواہش ابھری اور میں نے ایک غیر معروف مصور کا روپ دھارنے کا فیصلہ کرلیا۔

میرے انکل کے دوست نے مجھے ایک تعارفی خط دیا اور میں نے آرٹ گیلری میں جا کر اپنے آپ کو ایک ایسا مصور ظاہر کیا جو نامور اطالوی مصور تی تیان کی تصویروں کی نقل اتارنا چاہتا ہے۔ گیلری کی انچارج مس اسٹین ہوپ موجود نہیں تھی لیکن مجھے اس کی واپسی تک تصویریں دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ وہاں پرانی خاندانی تصویروں کے درمیان ایک نامکمل تصویر بھی تھی جو واضح طور پر کسی نوجوان عورت کی تھی۔ میں اسے اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

وہ ایک بہت ہی پیارا چہرہ تھا لیکن کوئی چیز اس کی خوب صورتی کو متاثر کر رہی تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ میری بدگمانی ہے لیکن میں نے اپنے فطری تلخ احساسات کو ایک طرف رکھ کر اور اسے محض ایک آرٹ کا نمونہ سمجھتے ہوئے دیکھا تو میں اس خیال سے بچا نہ سکا کہ ان مغرور آنکھوں سے نفرت جھلک رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ مصنوعی ہے اور اس کے ہاتھوں میں پڑے ہوئے گڑھے کسی مرد کے لیے بربادی کا سبب بن سکتے ہیں تاہم اس کے خوب صورت بال، پُرکشش جسمانی خطوط اور شوخ رنگ کا لباس اس عمدگی سے بنائی ہوئی تصویر کو ایک شاندار اور دلفریب خوب صورتی عطا کر رہا تھا جسے میں نے بھی محسوس کیا۔

میں تی تیان کو بھول کر اس تصویر کے سحر میں کھو گیا جو مجھے اپنی ہونے والی بیوی یعنی کزن جیسی لگ رہی تھی۔ اسے میں اپنے خیالوں اور خوابوں میں بیوی کا درجہ دے چکا تھا اور جلد از جلد اس سے ملنا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے سامنے حالِ دل بیان کر سکوں۔

اچانک ایک قہقہے کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں اپنے سامنے کھڑی مورت کو حیرت سے دیکھنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ وہ تصویر فریم سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہو۔ وہی مغرور آنکھیں جو پوری طرح میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، مکاری سے مسکراتے ہوئے سرخ ہونٹ، لہراتے ہوئے بال جو اس کے گورے شانوں پر جھول رہے تھے۔ ہاتھوں میں پڑے گڑھے اور گلابی رنگ کا شوخ لباس اور وہی نازک پیر جن کا ابھی تصویر میں صرف خاکہ کھینچا گیا تھا۔

میں اس کی اچانک آمد، اس کے قہقہے اور خود اپنی جذباتی کیفیت کی وجہ سے اتنا گھبرا گیا تھا کہ میں نے اس سے بات کرنے کے لیے جو فقرے سوچے تھے، وہ سب میرے ذہن سے نکل گئے اور میں خاموشی سے احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میری پریشانی دور کرنے کے لیے اپنا خوبصورت ہاتھ میری طرف بڑھایا اور دل نشین لہجے میں بولی۔

''خوش آمدید کزن۔ تم نے اپنے آپ کو غیر معروف ظاہر کرنے کے لیے بہت عمدہ پلاٹ بنایا تھا لیکن ایک عورت کو دھوکا دینا بہت مشکل ہوتا ہے، خاص طور پر جب تم جیسا نمایاں چہرہ ہو جس پر تم نے ماسک چڑھانے کی کوشش کی تھی۔''

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اطالوی رواج کے مطابق اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ''ان خوبصورت اور روشن آنکھوں کو دھوکا دینے کی کوشش پر ہزار مرتبہ معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں لیکن جلاوطن شہزادے نے نئی ملکہ کو دیکھنے کے شوق میں بھیس بدل کر گھر میں داخل ہونے کی جسارت کی۔''

''میں تمہاری جسارت کو معاف کرتی ہوں کیونکہ تم نے جس لہجے میں ''گھر'' کہا، اس سے لگتا ہے کہ تم بھی میری طرح تنہائی محسوس کرتے ہو۔ یہ ایک بہت بڑا تنہا مکان ہے اور اس میں ہم دونوں کے لیے کافی گنجائش موجود ہے پھر کیوں نہ اجنبیت ختم کر کے اس گھر میں آجائیں۔''

اس کے انداز اور لہجے میں جو سادگی اور مٹھاس تھی، اس نے میرے دل کو چھو لیا۔ گو کہ اس کی تصویر اور جیتے جاگتے چہرے کی جانچ کرتے ہوئے میرے اندر بدگمانی کے جو احساسات پیدا ہوئے تھے وہ ابھی تک میرے دماغ میں موجود تھے پھر بھی میں نے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''مس اسٹین ہوپ بھول گئی کہ میں یہاں پناہ لینے کے حق سے محروم ہو چکا ہوں لیکن جب سے میں نے اسے دیکھا ہے میری مایوسی بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ ایک خوب صورت اور جوان عورت کے لیے ایک ایسے مرد کے مقابلے میں روٹی کمانا بہت مشکل ہوتا ہے جس کی غربت اور تنہائی سے برسوں پرانی آشنائی ہو۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور اچانک ہی اس کی مغرور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ لمحہ بھر کو خاموش کھڑی رہی اور پھر وہ مسکرائی۔ اس نے میری طرف دیکھا پھر انتہائی شائستہ لہجے میں بولی۔

''کزن سیسل! تم میرے پاس ایک ہفتہ رہ کر دیکھو۔ اس طرح تم مجھے بہتر طور پر جان جاؤ گے۔ میں اسے تمہاری طرف سے ایک حمایت سمجھوں گی اور کیونکہ تمہیں اسٹین ہوپ کی طرف سے اجازت مل گئی ہے، اس لیے تم میری تصویر مکمل کر کے مجھے اپنا مقروض بنا لو۔ جس مصور نے اسے شروع کیا تھا، وہ واپس نہیں آئے گا۔ میں اسی لیے تمہیں روک رہی ہوں۔''

''میں رک جاؤں گا۔'' میں نے مختصر الفاظ میں جواب دیا پھر وہ مجھ سے اٹلی کی زندگی کے بارے میں پوچھنے لگی اور بڑی خوبصورتی سے مجھے اعتماد میں لے لیا کہ اگر میں کوئی راز تھا تو وہ لامحالہ اس تک پہنچ گیا ہوگا۔

میں وہاں ٹھہرا رہا۔ ہم روزانہ اس گیلری میں بیٹھتے جو ہر طرح کی خوبصورتی سے آراستہ تھی۔ ہماری گفتگو میں بے تکلفی کا عنصر دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بڑی گرم جوشی سے اپنی خوب صورت کزن کی تصویر مکمل کر رہا تھا جو دل کو چھوئے بغیر میری عقل کو حیران کر رہی تھی۔

وہ بوڑھی عورت جو اس کی حفاظت پر مامور تھی، ہمیں تنہا چھوڑ کر چلی جاتی اور اس کی معمولی سی مداخلت بھی رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف تھی جو مجھے بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اسی لیے سی سیلیا نے میری برہمی کو بھانپتے ہوئے اس بوڑھی عورت کو تاکید کر دی تھی کہ وہ کام کے دوران انتہائی ضرورت کے تحت مداخلت کرے۔

سی سیلیا کے دماغ میں ایک خیال نے قبضہ جما لیا کہ تصویر میں جدید کے بجائے قدیم لباس پینٹ کیا جائے کیونکہ پرانے زمانے کی خوبصورت عورتوں کے ملبوسات ابھی تک محفوظ تھے۔ اس نے وہی پہن لیے اور قیمتی بروکیڈ، قدیم زیورات اور پرانے زمانے کی بیلوں کے ذریعے اپنی خوبصورتی میں چار گنا اضافہ کر لیا۔

''اگر اس جوتے کو تصویر میں دکھانا ہے تو اس میں ایک بکل بھی ہونا چاہیے اور میرے خیال میں یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ لوہے کی صندوقچی لے کر آؤ مارتھا۔ اس میں شاید ہمیں اپنے مطلب کی چیز مل جائے۔'' اس نے اپنی خادمہ سے کہا۔

اس نے اپنے سفید سلک کے جوتوں سے پیر باہر نکالے اور مختلف زیورات پہن کر دیکھتی رہی کہ ان میں سے کون سا مناسب رہے گا۔

''یہ تصویر کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔'' میں نے ایک چھوٹا جوتا ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔ اس میں چاندی کا بکل لگا ہوا تھا اور دونوں جانب ہیرے جڑے ہوئے تھے اور درمیان میں انگریزی حرف S کی شکل میں ڈبل ناٹ لگی ہوئی تھی۔

''یہ ان بکل میں سے ایک ہے جو ہمارے آباؤ اجداد پہنا کرتے تھے۔ تم اسے اس زمانے کی تصویروں میں دیکھ سکتے ہو اور بتایا جاتا ہے کہ یہ بکل اسے اس کی محبوبہ نے دیا

Digitized by Google

تھا۔'' اس نے ہمارے عقب میں لگی ہوئی سرسٹنی اسٹین ہوپ کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک کی جگہ تین ہفتے ہوگئے اور میں ابھی تک اس تصویر میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ تو پہلے دن سے ہی واضح ہوگیا تھا کہ وہ اپنی کسی غرض کے لیے مجھے الجھائے رکھنا چاہتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آئیڈیا اس کے دماغ میں اس روز ہی آگیا ہوگا جب اس نے گرگٹ کی طرح بدلتے رنگ اور مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے مجھے رکنے کے لیے کہا۔ اس کے دل میں اچانک ہی خاندانی تعلق کو بڑھانے کا خیال آگیا تھا۔

میں نے اس سے محبت کرنے کی کوشش کی اور یہ جاننا چاہا کہ اس کی قربت کے سحر کے باوجود میں اپنے دل کو اس کی طاقت ماننے پر قائل کرسکتا ہوں۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ کیا وجہ تھی کہ میں اس خوبصورت لڑکی پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بظاہر ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ تاہم میں نے اتنا ضرور کیا کہ باقاعدگی سے اس کی نگرانی کرنے لگا۔ شاید کوئی ہلکا سا اشارہ مل جائے جس میں مجھے ہوشیار رہنے کی وارننگ دی گئی ہو۔

اس عادت اور بے چینی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں رات کی تاریکی اور خاموشی میں گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگا۔ میں نے اتنی مہارت سے یہ مشق جاری رکھی کہ رکھوالی کے کتوں میں سے کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ وہ کتے مجھے جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بھونک کر یا غرا کر میرا راز فاش نہیں کیا۔

ایک شام مجھے ایزل پر کام کرتے ہوئے اتنی دیر ہوگئی کہ اندھیرا چھانے لگا۔ اب سی سیلیا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ڈنر پر جانے کے لیے لباس تبدیل کرتی چنانچہ ہم ایک دوسرے کے لباس کا مذاق اڑاتے کھانے کی میز پر پہنچ گئے اور جب میں نے اس خوبصورت لڑکی کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا تو قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا تو اس کا بھی پتا چل جاتا اور میری امید جو دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی، اس کا بھی ایک ہی دفعہ میں خاتمہ ہوجاتا۔

کھانے کے بعد میں اسے ٹیرس پر لے گیا اور ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے چہل قدمی کرتے رہے اور پھر میں نے ہمت کرکے اسے بتا دیا کہ میں نے اس سے کیا امید وابستہ کررکھی ہے اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر نمودار ہوا جیسے اسے میری بات سن کر سکون ملا ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

''مجھے امید تھی کہ تم یہ بات کرو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن یقین کرو کہ میرے پاس تمہارے ساتھ اس جائداد میں شراکت کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''لیکن میں تم سے کوئی قربانی نہیں مانگ رہا۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میں اپنا حصہ قبول کرلوں گا ورنہ ایک پینی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ چلائی۔ ''یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں جب اس وسیع وعریض دنیا میں تم سب کے ہوتے ہوئے میں تم سے دور رہی.....''

پھر اس نے کچھ الفاظ ادا کیے جو اس کے ہونٹوں پر تھرتھرا کر رہ گئے اور اس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں میں گرا دیا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

میں نے اسے تسلی دی اور چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس اچانک پھٹ پڑنے کی کچھ وضاحت کرے گی لیکن اس نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پالیا اور بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں نے ساری زندگی گھر سے دور تنہا گزاری۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ والدین اور دوستوں نے مجھے نظرانداز کیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایک کرکے چلے گئے۔''

اس وقت اس کی آیا اسے ایک خط دینے آئی۔ سی سیلیا نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے آنے والی روشنی میں جا کر اس خط کی چند لائنیں پڑھیں جو لگتا تھا کہ کسی رف کاغذ پر لکھ کر بھیجا گیا ہے۔ اس نے مارتھا سے کہا۔ ''اسے بتا دو کہ میں کل آؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے خط پرزے پرزے کرکے پھینک دیا اور دوبارہ میرے پاس آکر بے پروائی سے بولی۔

''یہ میری بوڑھی نرس الزبتھ کی طرف سے پیغام تھا۔ وہ بیمار ہے اور اس نے مجھے بلایا ہے۔''

میں نے اس خط کے بارے میں کچھ نہیں سوچا لیکن جب میں نے دوبارہ اسے اپنی طرف کھینچا تو اس کا دل اتنی تیزی سے کیوں دھڑک رہا تھا؟ اس کی آنکھوں میں ویرانی کیوں تھی؟ اس کے چہرے پر غصے، خوف اور حقارت کے آثار کیوں نظر آرہے تھے اور وہ اس گرم رات میں بھی بری طرح کیوں کانپ رہی تھی لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا پریشانی ہے تو وہ شرماتے ہوئے بولی کہ خوشی کی وجہ سے اس کی یہ کیفیت ہورہی ہے پھر وہ مجھے اندر لے گئی اور سونے کا وقت ہونے تک مجھے گانے سناتی رہی پھر جب ہم رات کو جدا ہونے لگے تو اس نے اپنی آنکھیں میرے

Digitized by Google

چہرے پر جاذبیت جن میں ایک عجیب سی اداسی جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی میٹھی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''آرام سے سو جاؤ سیسل اور یقین رکھو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

میں اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اگلے سیدھے خیالات مجھے پریشان کر رہے تھے۔ جب گھر میں پوری طرح خاموشی چھا گئی تو میں کھڑکی کے راستے باہر نکلا اور پارک میں ٹہلنے چلا گیا۔ طوفان کے آثار تھے اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تیز گرم ہوا چل رہی تھی اور مغرب کی جانب کافی دور بجلی کڑک رہی تھی۔ مجھے ایسی شور مچاتی راتیں اچھی لگتی ہیں۔ میں اپنے خیالوں میں گم آگے بڑھتا رہا، تبھی ایک زوردار گرج نے میرے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے اور میں پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کیونکہ میں اپنے گھر سے کافی دور نکل آیا تھا۔ تبھی میں نے تھوڑے فاصلے پر روشنی دیکھی۔ میں اس جانب چل دیا۔ وہ ایک جنگ گھاٹی تھی۔ مجھے قریب ہی ایک چھوٹا سا سائبان مل گیا جو درختوں کے درمیان آدھا چھپا ہوا تھا۔

میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک موم بتی روشن تھی اور ایک بہت بوڑھی عورت چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دوسری عورت کی جانب تھا جو دروازے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس کی آواز تند اور تیز تھی۔ اس کا رویہ حاکمانہ اور جو الفاظ اس نے ادا کیے، وہ اتنے خاص تھے کہ انہوں نے فوراً ہی میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

''اگر تم نے کچھ کہنے کی جرأت کی یا اپنے آپ کو ظاہر کیا تو میں تمہاری زبان بند کرنا جانتی ہوں۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں اور یہ خطرناک کھیل کھیلنے کے بعد میں اس کامیابی کو ایک مجبور بوڑھی عورت کی دھمکیوں کی وجہ سے ضائع نہیں ہونے دوں گی۔''

''میں اتنی مجبور بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو احسان فراموش لڑکی اور اگر تم نے اس احسان کا صلہ نہیں دیا جو میں نے تم پر کیا ہے تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے گا اور تم کہیں کی نہ رہو گی۔''

وہ تیز اور غصیلی آواز میں بول رہی تھی۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم میری ہر ضرورت اور آرام کا خیال رکھو گی اور جو کچھ تمہیں ملے گا، اس میں سے ایک معقول حصہ مجھے دو گی لیکن تم نے مجھے ایک اجاڑ اور ویران جگہ پر رکھا ہوا ہے جہاں بات کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے کبھی ملنے نہیں آئیں اور نہ ہی مجھے کچھ دیا۔ تم جانتی ہو کہ مجھے چلنے میں دشواری ہوتی ہے اور تم مجھے دھمکی دے رہی ہو لیکن میری بات غور سے سنو لڑکی..... جس طرح میں تمہیں اوپر لے کر آئی ہوں، اسی طرح نیچے بھی گرا سکتی ہوں اور اگر تم نے مجھے قتل کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم کبھی نہیں بچ سکو گی کیونکہ میں نے سب کچھ ایک کاغذ پر لکھ کر ایسی محفوظ جگہ پر رکھ دیا ہے جو تمہاری پہنچ سے دور ہے۔''

جیسے ہی وہ بوڑھی عورت سانس لینے کے لیے رکی، جوان عورت نے آگے بڑھ کر اس کا دبلا پتلا ہاتھ تھام لیا اور قدرے نرم لہجے میں بولی۔ ''مجھ پر بھروسا کرو دادی۔ میں تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گی تاوقتیکہ تم مجھے غصہ نہ دلاؤ جس پر میرا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ تم جاننا چاہتی ہو کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتی؟ اس لیے کہ وہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ تم بوڑھی ہو گئی ہو۔ تمہیں بھول جانے کا مرض ہے اور ہر وقت بڑبڑاتی رہتی ہو۔ اس طرح تمہاری زبان سے وہ لفظ بھی ادا ہو جاتے ہیں جو کسی کو نہیں بتانا چاہئیں۔ اس لحاظ سے یہ جگہ محفوظ ہے جبکہ وہاں میرے چاروں طرف ٹوہ لینے والے نوکر موجود ہیں اور تمہارے وہاں رہنے سے ہم دونوں کو ہی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کیا تم تھوڑا انتظار نہیں کر سکتیں؟ اور یاد رکھو اگر تم نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گی کیونکہ تم مجھ سے بڑی مجرم ہو۔''

''یہ ہم دونوں کے لیے ہی نقصان دہ ہے لیکن میں اس عمر میں یہ نقصان برداشت کر لوں گی البتہ تم اس بھری جوانی میں نفرت کی علامت بن جاؤ گی اور موت بھی تمہیں اس سے نجات نہ دلا سکے گی۔ میں انتظار کر لوں گی لیکن مجھے پیسا چاہیے۔ اپنا جائز حصہ۔ میں اسے دیکھنا اور چھونا چاہتی ہوں تاکہ مجھے یقین آ جائے۔ تم مجھے دھوکا دے کر غائب ہو سکتی ہو۔''

''جیسے ہی مجھے اپنا حصہ ملا، میں تمہارے پیسے دے دوں گی۔ بہت جلد ایک موقع ملنے والا ہے اور میں تمہیں نہیں بھولوں گی۔''

''تمہارا مطلب شادی سے ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا تم واقعی اس سے شادی کرو گی؟''

''ہاں کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح ہم سب محفوظ

ہوجائیں گے۔ اب تم جاؤ لڑکی۔ اس سے پہلے کہ طوفان آجائے لیکن کبھی بھی آتی رہنا ورنہ میں تمہیں بلاؤں گی اور اگر کوئی بھی بے ایمانی ہوئی تو میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے تمہیں بھی دھوکا دے سکتی ہوں۔''

''مجھے منظور ہے۔'' اس کے بعد وہ عورت جس نے اپنے جسم کو سیاہ لبادے میں چھپا رکھا تھا، ایک سائے کی طرح نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں اس کا تعاقب کرنا چاہ رہا تھا لہٰذا میں نے کچھ توقف کیا تاکہ میرے اور اس کے درمیان ایک فاصلہ رہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے پیچھے جاتا، اس بوڑھی عورت کی نقل و حرکت نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے چولہے پر لگا ہوا ایک سپاٹ پتھر اٹھایا اور اس کے نیچے سے کاغذوں کا ایک پیکٹ نکال لیا اور بڑبڑاتے ہوئے اس میں لکھے ہوئے کاغذ دیکھنے لگی۔

''میں بوڑھی ضرور ہوں لیکن میں نے اپنا بندوبست کرلیا ہے اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک مجھے لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ نہ مل جائے۔ وہ سمجھتی ہے کہ مجھے خوفزدہ کرلے گی لیکن کیٹ کو معلوم ہے کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو یہ کاغذات کہاں سے ملیں گے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا ہے اور بالآخر اس عورت کو مات ہوگی۔''

اس بوڑھی عورت نے وہ خزانہ واپس اپنی جگہ پر رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں لائٹ بند ہونے کا انتظار کرنے لگا تاکہ وہ کاغذات حاصل کرسکوں۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کاغذات مجھ سے متعلق ہیں یا میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔ میں اس جوان عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا اور اس نے اپنے آپ کو لبادے میں چھپا رکھا تھا لیکن مجھے پورا شک تھا کہ وہ پراسرار عورت سی سلیا اور شیطانی ذہن والی بوڑھی عورت الزبتھ تھی۔

طوفان شروع ہوچکا تھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی کیونکہ اب میرے سامنے ایک اور مقصد تھا۔ میں نے آہستہ سے جالی ہٹائی اور اندر داخل ہوگیا۔ میرا رخ چولہے کی طرف تھا۔ میں نے سلگتے ہوئے انگاروں کو ہلایا تو ایک چھوٹا شعلہ بھڑکا اور اس کی روشنی میں مجھے وہ چپٹا پتھر نظر آگیا اور جہاں وہ نامعلوم لڑکی کھڑی ہوئی تھی، اس جگہ چاندی کا ایک بکل چمک رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر مدھم روشنی میں دیکھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ سرسٹڈنی کا قدیم بکل تھا جو جلدی میں سی سلیا کے جوتے سے نکل گیا تھا۔ اس نے یہاں آنے کے لیے بروکیڈ کی جگہ سادہ لباس تو پہن لیا لیکن جوتے بدلنا بھول گئی۔ اب میں ان کاغذات کو اپنے قبضے میں لینے میں حق بجانب تھا لہٰذا کوئی آواز پیدا کیے بغیر میں نے انہیں چرا لیا۔

رات بھر طوفانی بارش ہوتی رہی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا ان کاغذات کو پڑھتا اور ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اپنے ذہن میں جس خوشگوار مستقبل کا نقشہ کھینچا تھا، وہ اندھیروں میں ڈوبتا نظر آیا۔ میرا اسٹرپسنا ٹوٹ چکا تھا اور ایک تلخ حقیقت میرے سامنے منہ کھولے کھڑی تھی۔ اب میرے اور میری کزن کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوچکی تھی اور میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔

حوانج ضرور یہ سے فارغ ہوکر میں نے غسل کیا اور کوشش کی کہ میرے چہرے پر شب بیداری اور سوچ بچار کا عکس نمایاں نہ ہونے پائے لیکن میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ آئینے میں مجھے زرد گال، آنکھوں میں غصہ اور سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹ نظر آرہے تھے۔

میں اکثر اکیلے ہی ناشتا کیا کرتا تھا اور دوپہر سے پہلے ہماری بہت کم ملاقات ہوتی کیونکہ سی سلیا کو دیر تک سونے کی عادت تھی۔ اس روز میں بے صبری سے گیلری میں اس کا انتظار کرتا رہا جہاں ہماری ملاقات طے تھی۔ اس انتظار کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی مہلت مل گئی۔ چہرے کی زردی پُرجوش گرماہٹ میں بدل چکی تھی اور بھنچے ہوئے ہونٹ ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھے۔

''صبح بخیر سیسل۔'' اس نے دل موہ لینے والے انداز میں مجھے دیکھا اور شرماتے ہوئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ کا بوسہ نہیں لیا بلکہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں پکڑ کر اس کی انگلیوں کو دیکھتا رہا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں سوچ رہا تھا کہ تمہاری انگلی میں کوئی انگوٹھی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اس کی محبت کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔

''میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں منگنی کی انگوٹھی پہننے پر راضی ہوسکتی ہوں جو میرے لیے زنجیر بن جائے، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ مجھے اپنی آزادی بہت عزیز ہے لیکن اگر تم مجھے یہ انگوٹھی پہناؤ گے تو یہ مجھ پر بوجھ نہیں ہوگی کیونکہ میں تمہیں ایک نرم خو اور فیاض شخص سمجھتی ہوں۔''

''مجھ میں بھی کئی خامیاں ہیں۔ میں بہت سخت گیر اور

اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ مجھ میں کسی کو معاف کرنے کا جذبہ نہیں ہے اور مجھے اپنی اس شیطانی خصلت پر فخر ہے۔ اس لیے تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کزن۔''

وہ تصویر بنوانے کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھی اور جب میں نے اس بوڑھی عورت کے الفاظ دہرائے تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن میں بڑے سکون سے اپنی رنگوں کی پلیٹ تیار کر رہا تھا۔

''کیا تم اس بوڑھے سرگائے، کی طرح کٹھور ہو سکتے ہو جس نے اپنی اکلوتی اولاد کو صرف اس لیے بدعا دی کہ اس نے اسے دھوکا دیا تھا۔'' اس نے ایک سخت چہرے والے فوجی کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا جو سر سڈنی کی تصویر کے ساتھ آویزاں تھی۔

''ہاں اگر اس کی دھوکا دہی میرے دل کو پتھر بنا دے۔''

میں نے دیکھا کہ اس کے جسم پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوئی تاہم وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے اس کی تصویر میں مختلف رنگوں سے ٹچنگ شروع کر دی اور اس کے خوب صورت بالوں میں سنہری رنگ کا اضافہ کیا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا تھا کہ اس کی دھوکا دہی نے میرے دل کو پتھر بنا دیا تھا اس لیے میں نے اسے بھی معاف نہیں کیا۔

''آج تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو جانِ من۔ میں تمہاری تفریحِ طبع کے لیے اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کی کہانی سناؤں گا۔ یہ پرانا قلمی مسودہ مجھے حال ہی میں ملا ہے۔''

''شکریہ۔ مجھے پرانی کہانیاں پسند ہیں بشرطیکہ وہ جاندار اور المیہ ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور شاہانہ انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''تم وہ چھوٹا جوتا پہننا کیوں بھول گئیں؟ اس کو دیکھ کر مجھے تمہاری تصویر میں بکل کی ٹچنگ اور ایڑی میں گہرے قرمزی رنگ کا اضافہ کرنا تھا۔ کیا مارتھا کو بھیج کر اسے منگوا لوں؟'' میں نے اس کے سیاہ سائن کے سلیپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو نارنجی کشن پر پڑے ہوئے تھے۔

''نہیں، ان سے میرے پاؤں میں تکلیف ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے انہیں پھینک دیا۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''مجھے امید ہے کہ تم نے وہ بکل نہیں پھینکا ہوگا۔ وہ قیمتی ورثہ ہے۔''

''وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اب تم مجھے تصویر

سال کا آخری شمارہ.....خاص شمارہ

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ دسمبر 2018ء
کی جھلکیاں

باغی قلمکار
اس مصنف کی داستان جس کی کہانیوں کو برا کہا جاتا تھا پھر بھی سب اسے ہی پڑھتے تھے

گولڈن گرل
ایک سپر ہٹ اداکارہ کا زندگی نامہ جسے پڑھ کر آپ چونک جائیں گے

رکشے والا
غربت کے بوجھ تلے دبے ایک انقلاب برپا کر دینے والے کی داستانِ زیست

فریبی
ایک دلچسپ سچ بیانی جو سبق آموز بھی ہے

شمشال سے ٹورنٹو
اپریل 2016ء سے شروع ہونے والے مقبول سفرنامے کی آخری قسط

اور بہت سی عمدہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچی داستانیں، سچے واقعات۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

بنانے کے دوران وہ کہانی بھی سناتے رہو کیونکہ آج میں بہت سستی محسوس کررہی ہوں۔''

وہ مسلسل جھوٹ بول رہی تھی اور میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا کیونکہ اس وقت بھی وہ بکل میری جیب میں موجود تھا لیکن میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور وقفے وقفے سے اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا کہ میرے کہے ہوئے الفاظ کا اس پر کیا اثر ہورہا ہے۔ اسے دکھانے کے لیے میں بے رنگ کا برش تصویر پر پھیرتا رہا۔

''سرمار ماڈیوک ایک سخت گیر انسان تھے۔ ان کی شادی کافی دیر سے ہوئی لیکن انہوں نے اپنی بیوی کو اتنا تنگ کیا کہ وہ اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔ اس بچی سے بھی انہیں کوئی محبت نہیں تھی۔ ان دونوں بدنصیبوں کی دیارِ غیر میں موت واقع ہوئی اور بوڑھے کا خوبصورت بھتیجا سڈنی یونڈر، جائداد کا وارث قرار پایا۔ اس بوڑھے کے آخری الفاظ سے بھی اس خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ بھتیجا وارثت کا دعویٰ کرنے ہی والا تھا کہ بوڑھے کی بیٹی نمودار ہوگئی اور اس نے جائداد پر اپنا حق ثابت کردیا۔ تمہارا چہرہ کیوں زرد ہورہا ہے..... کیا میری یہ بور کہانی تمہیں پسند نہیں آئی؟''

''نہیں۔ دراصل مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ تم بولتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ سے اپنا آدھا چہرہ چھپالیا۔ اس کی اداس آنکھیں اور بے رنگ چہرہ اس کے جذبات چھپانے سے قاصر تھا۔

''گو کہ مسودے میں واضح طور پر نہیں لکھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی نے اپنے ظالم باپ سے پناہ حاصل کرنے کے لیے اپنی موت کی خبر پھیلائی تھی۔ بہرحال اس کا دعویٰ تسلیم کرلیا گیا اور بے چارہ سڈنی ایک بار پھر مفلس ہوگیا۔ یہاں سے اس کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ وہ اپنی نو دریافت شدہ کزن سے ملنے گیا۔ وہ بہت خوب صورت اور فیاض تھی۔ اس نے دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سڈنی کو اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کی اور اس طرح اس نے سڈنی کا دل جیت لیا۔ جلد ہی وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ گو کہ وہ اس پر پوری طرح بھروسا نہیں کرتا تھا تاہم اس نے محبت کا جواب محبت سے دیا۔''

میرے آخری الفاظ سن کر اس کے چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر میرے چہرے پر جمادیں اور اس کے سرخ ہونٹ یوں تھرتھرائے جیسے اسے جذباتی الفاظ ادا کرنے میں مشکل پیش آرہی ہو۔ میں نے سرد لیکن نرم لہجے میں کہا۔

''تمہارے زانوؤں پر جو پنکھا پڑا ہوا ہے، اسے اٹھالو۔ یہ گرمی تمہیں پریشان کررہی ہے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ یہاں پہنچ کر میرا تجسس بڑھ گیا اور میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگیا کہ وہ شخص کیسے اس لڑکی کا دلدادہ ہوگیا۔''

اس نے اچانک کرسی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑا تو اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان گڑھے نمایاں ہوگئے۔ میں نے گزشتہ شب اس ویرانے میں سیاہ لبادے میں ملبوس عورت کا بھی ایسا ہی ہاتھ دیکھا تھا۔ اس طرح میرے ایک اور شبہے کی تصدیق ہوگئی اور میں دل ہی دل میں مسکرادیا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہاں سے وہ المیہ شروع ہوگیا جو تم ضرور پسند کرو گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہوگئے۔ ایک رات سڈنی ٹہلتا ہوا دور نکل گیا۔ وہ اپنی محبوبہ کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک گرج چمک شروع ہوگئی۔ وہ پناہ لینے کی خاطر جنگل میں واقع ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف بڑھا لیکن اندر سے آنے والی آوازیں سن کر رک گیا۔ وہ ایک بوڑھی عورت اور جوان لڑکی کی آوازیں تھیں جو سیاہ لبادے میں ملبوس تھی۔ اس لیے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔'' یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور آخری الفاظ سن کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

''ان کی گفتگو سن کر سڈنی کا تجسس بڑھ گیا اور جب وہ عورت اپنے پیچھے ایک ثبوت چھوڑ کر چلی گئی تو بوڑھی عورت کی بڑبڑاہٹ نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ اس کے سونے کا انتظار کرتا رہا اور اسے وہ کاغذات مل گئے جس میں ان دونوں کی دھوکا دہی کا اعتراف تھا۔''

وہ بالکل ساکت اپنی کرسی پر بیٹھی رہی اور اس دوران اس نے ایک مرتبہ بھی میرے چہرے سے اپنی نظر نہیں ہٹائی۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کمزوری یا پچھتاوے کی کوئی علامت مجھے متاثر کرسکتی تھی لیکن اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا اور اس کے منہ زور گھمنڈ نے مجھے سنگدل بنادیا۔ مصوری کا سامان یونہی پڑا ہوا تھا اور میں اپنے سامنے ایک جھوٹے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی کہانی ختم کی جسے ایک قدیم نامور شخص کی زبان میں شروع کیا تھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ بوڑھی عورت سرمار ماڈیوک کی بیوی کی بااعتماد ملازمہ رہ چکی تھی اور کسی وجہ سے وہ اپنی مالکن سے نفرت کرتی تھی۔ جب بوڑھے کی بیوی اور بیٹی کا انتقال

ہوا تو اس عورت نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تمام خطوط، کاغذات اور دیگر ثبوت اپنے قبضے میں کر لیے تاکہ وقت آنے پر انہیں استعمال کیا جاسکے۔ جب سرمار ماڈیوک کا انتقال ہوا تو اس نے اپنی پوتی کو بوڑھے کی بیٹی بنا کر بھیج دیا۔ اس لڑکی نے اپنا کردار بڑی خوبی سے نبھایا اور یہ ڈراما کامیاب ہوگیا اور اگر اس عورت کی ننھیا فطرت اس لڑکی کو پریشان نہ کرتی اور اسے بے نقاب کرنے کی دھمکی نہ دیتی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔

''اس لڑکی نے سخاوت کی آڑ میں سنڈنی کو جائداد میں آدھا حصہ دینے کا ارادہ کرلیا کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ اس طرح اس غلطی کا کفارہ ادا ہوجائے گا۔ اس طرح اس نے سنڈنی کو دھوکا دہی سے لاعلم رکھ کر اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ یہ ایک خطرناک غلطی تھی اور جب سنڈنی کو اس فریب کا پتا چلا تو اس کی پرانی بے اعتمادی، حقارت، شکرگزاری شدید غصے اور محبت نفرت میں بدل گئی۔''

''پھر اس نے کیا کیا؟'' اس نے سرگوشی میں کہا اور آنکھوں میں درد سمیٹے مجھے دیکھتی رہی۔

''اس نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق اسے سرزنش کرنا بھی اپنی توہین سمجھا حالانکہ وہ اسے تباہ کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی پیشکش کی۔ اس کی پُرفریب اور شرمناک حرکت کے باوجود وہ یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ وہ ایک عورت اور اس کی کزن ہے۔''

''کیا وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس پیشکش کو قبول کرلے گی؟'' اس نے روتے ہوئے اپنا سر اٹھایا جو میرے بولنے کے دوران نیچے ہی جھکتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے لمبے بال زمین کو چھونے لگے تھے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ ''ہاں۔ اس کے علاوہ اور اسے کہاں سے مدد مل سکتی ہے؟''

وہ اس طرح اچھلی جیسے میری ہمدردی اس کی ذلت سے زیادہ تلخ تھی۔ میرے خلاف اس کے جذبات بھڑک اٹھے اور محبت اس کے غرور کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔

''میں تمہاری ہمدردی کی پیشکش قبول نہیں کروں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ تم اپنی جگہ سنبھال لو اور اس سے لطف اٹھاؤ البتہ تمہیں وہ دھبا بار بار یاد آئے گا جو میں نے اس نام پر لگایا ہے جس پر تمہیں بہت فخر ہے۔''

اس نے اتنی جلدی دکھائی جیسے مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو لیکن وہ ایزل کے پاس رکی اور اچانک ہی اس نے اپنی تصویر کی طرف دیکھا جیسے وہ اپنی کوئی بھی نشانی وہاں نہ چھوڑنے کے لیے بے چین ہو۔ اس نے میری رنگوں کی پلیٹ سے چاقو اٹھایا اور کینوس پر اوپر سے نیچے مارتی رہی جب تک وہ تار تار نہ ہوگیا۔ پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جو دیر تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

وہ آہستہ آہستہ گیلری میں چلتی ہوئی اس کھڑکی تک پہنچی جو بالکونی کے اختتام پر تھی اور اس کے بالکل نیچے صحن تھا۔ وہ وہاں کھڑی ہوگئی۔ سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا، اس کے چہرے پر ایک ایسا تاثر تھا جو ہمیشہ کے لیے میری یادداشت میں محفوظ ہوگیا۔

ایک شاندار تصویر کی طرح وہ وہاں کھڑی تھی اور سورج کی روشنی اس کے چہرے بازوؤں اور خوبصورت جسم پر پڑ رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے الوداعی انداز میں دیکھا تو میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اسے روکنے کے لیے تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ اس نے اپنا سفید ہاتھ ہلایا اور چھلانگ لگادی۔

جب میں بھاگم بھاگ اس کے پاس صحن میں پہنچا تو اتنی بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ بری طرح زخمی ہوچکی تھی اور آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی فخریہ مسکراہٹ تھی۔

''مجھے یہیں مرنے دو۔ میرا کوئی اور گھر نہیں ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا اور جب اس نے میرے زرد ہوتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا تو بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''مجھے معاف کردینا۔ اس محبت کے لیے جو میں نے تم سے کی تھی۔''

یہ اس کے آخری الفاظ تھے اور جیسے ہی یہ اس کی زبان سے ادا ہوئے، میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت کی لاش میرے پیروں میں پڑی ہوئی تھی اور سر سنڈنی کا ہیروں والا بکل سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا جو میری جیب سے گر گیا تھا۔ میں نے اس کے احترام میں سر جھکا دیا اور اس لڑکی کے دردناک انجام پر افسوس کرتا ہوا واپس آگیا۔ کاش اس لالچی بڑھیا نے اسے بلیک میل نہ کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

Digitized by Google

ذہانت

نادیہ نور

سیانے کہتے ہیں ذہانت کسی کی میراث نہیں اور سو فیصد درست کہتے ہیں... بالکل اسی طرح حماقت پر بھی کسی کا بس نہیں چلتا... یہ جب دل چاہے کسی کی بھی جھولی میں پکے ہوئے پھل کے مانند گر جاتی ہے... وہ جو خود کو بہت عقل مند سمجھ رہے تھے لیکن ایک معصوم عورت کے فریب میں اس طرح آئے کہ ساری عقل مندی دھری رہ گئی کیونکہ... قدرت نے مظلوم کی حمایت کا فیصلہ کر کیا تھا...

انتہائی مکاری سے ڈکیتی کا منصوبہ بنانے والے احمقوں کا قصہ

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ماریا کچن میں صاف برتنوں کو الماری میں رکھتے ہوئے مقامی گیت گنگنا رہی تھی۔ آج کے روز وہ پورے چالیس سال کی ہوگئی تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر نے اس پر کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ وہ مناسب قدوقامت، صاف شفاف رنگت اور دلکش نقوش کی مالک تھی۔ ماریا چائے کی پتیوں سے قسمت کا حال بتاتی تھی۔ وہ اپنے شوہر آرچر کے ساتھ الاسکا کے دور دراز پہاڑوں اور گھنے سرسبز جنگلات والے علاقے میں ایک شاندار سے فارم ہاؤس میں رہتی تھی۔ ان کے فارم ہاؤس میں بے شمار مویشی تھے جن کی تمام تر دیکھ بھال آرچر کے سپرد تھی۔ آرچر وفادار اور باصلاحیت انسان تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی صلاحیتیں صرف اسی وقت تک ہی کارآمد رہتی تھیں جب تک کوئی اس کی راہنمائی کرتا رہے اور اسے بتاتا رہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ ماریا اچھی طرح جانتی تھی کہ آرچر میں اپنے محور پر مرکوز رہ کر کچھ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ آرچر کمزور دل اور نازک مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ کافی بے وقوف بھی تھا۔ کسی بھی مشکل اور مصیبت میں گھبرا جاتا اور بدحواس ہو کر ماریا کی طرف دیکھتا لیکن آرچر کی ایسی تمام خامیوں

کے باوجود ماریا اور اس کی زندگی اچھی گزر رہی تھی اور وہ دونوں قصبے میں مثالی جوڑا کہلاتے تھے.....

کچن سے فارغ ہو کر ماریا چائے لے کر ٹی وی لاؤنج میں آگئی جہاں آرچر فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ ماریا کو ٹی وی میں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے میگزین اٹھالیا۔ پانچ منٹ بعد ڈور بیل بجی۔ ماریا چونک گئی۔ عام طور پر اس وقت کوئی بھی ان کے گھر نہیں آتا تھا کیونکہ ماریا رات کے وقت کسی کی آمد کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ قصبے والے بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ رات کے وقت ماریا نہ تو کسی سے ملاقات کرتی ہے اور نہ ہی کہیں جاتی ہے۔ ملاقات کے لیے اس نے دن کا وقت طے کیا ہوا تھا۔ ڈور بیل دوبارہ بجی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہو۔ ماریا نے آرچر کی طرف دیکھا۔ اردگرد سے بے نیاز آرچر کی پوری توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ ماریا نے اسے پکارا۔ ''آرچر!''

''ہاں..... کیا بات ہے؟'' آرچر مصروف انداز میں بولا۔

''باہر کوئی ہے، جاؤ دیکھو کون ہے؟''

''ماریا، میں میچ دیکھ رہا ہوں۔'' آرچر التجائیہ انداز میں بولا۔ اسی دوران بیل پھر بجی۔ ماریا غصیلی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ بادل ناخواستہ آرچر اٹھا۔ زیرلب بڑبڑاتا ہوا پورچ میں آیا، وہاں کی لائٹ جلائی اور آگے بڑھ کر تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک طویل قامت کا صحت مند شخص تھا۔ نصف آستین سے اس کے مضبوط بازو عیاں تھے۔ اس کا رنگ گوراء بال کرلی کٹ اور آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ دوسرے نے شوخ سرخ رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ آرچر کچھ پوچھتا، وہ دونوں پھرتی سے دروازہ دھکیل کر اندر گھس آئے۔ آرچر بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ طویل قامت والے شخص نے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے شخص نے جیکٹ سے ریوالور نکال کر آرچر پر تان لیا۔ ''کون..... کون ہو؟'' خوف کی وجہ سے آرچر کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

''کسی نے ہمیں دیکھا تو نہیں نا؟'' ریوالور والے شخص نے طویل قامت والے سے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں رابرٹ۔'' طویل قامت والا بولا۔ ''قصبے والے جلد گھر میں بند ہو جاتے ہیں، راستہ بالکل ویران ہے اور ویسے بھی..... ماریا کا گھر دوسرے مکانات سے ہٹ کر ہے۔ ہم اپنا کام اطمینان سے کر سکتے ہیں۔''

آرچر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں تھے، تھوڑی سی ہمت مجتمع کر کے آخرکار آرچر نے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو..... کیا چاہتے ہو؟'' ریوالور والے نے اسے سرد مہری سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں مگر طویل قامت والا آگے بڑھا اور ایک زوردار مکا آرچر کے منہ پر رسید کر دیا۔

''جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں۔ تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ بحث مباحثے میں وقت ضائع مت کرو اور خاموشی سے اندر چلو۔'' آرچر کے چہرے پر پڑنے والے مکے نے اس کا پورا جبڑا ہلا کر رکھ دیا۔ تکلیف پر قابو پاتے ہوئے وہ چپ چاپ اندر کی طرف ان دونوں کے ہمراہ چل پڑا۔ دہشت و خوف سے آرچر پر ہیجان کی سی کیفیت طاری تھی۔ سرد موسم میں بھی وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

جب وہ تینوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو ماریا کو صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا۔ دو اجنبی، ریوالور اور آرچر کی مظلومیت خطرے کا الارم بجا رہی تھی، ماریا کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنی مرتعش کیفیت پر قابو پایا اور قدرے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''کون ہو تم دونوں؟''

''کیا بات ہے تمہاری؟'' طویل قامت والے نے تعریف کی۔ ''ہمیں دیکھ کر تم بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوئیں حالانکہ تمہارے شوہر کی تو حالت خراب ہو رہی ہے، دیکھو کیسے اس کی سٹی گم ہے۔''

''میں رابرٹ ہوں اور یہ میرا ساتھی چارلس۔ ہمیں تم سے کام ہے۔ بہتر ہوگا اگر بیٹھ کر بات کی جائے۔'' ریوالور والے شخص نے ماریا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ماریا خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چارلس خود بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور آرچر کو بھی ماریا کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آرچر ڈرتے ڈرتے ماریا کے برابر میں بیٹھ گیا۔ رابرٹ سپاٹ تاثرات لیے ریوالور کا رخ آرچر اور ماریا کی جانب کیے کھڑا رہا۔ ''کیا چاہتے ہو؟'' ماریا حتمی انداز میں بولی۔

''تم اس پورے قصبے کی سب سے دولت مند عورت ہو۔ تمہارا چائے کی پتیوں سے قسمت کا حال بتانے والا بزنس اور فارم ہاؤس بے حد ترقی کر رہا ہے۔ ہر سال تمہیں لاکھوں ڈالرز کی آمدنی ہوتی ہے۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟'' چارلس ٹھوس انداز میں بولا۔

''میرے پاس کوئی دولت نہیں ہے۔'' ماریا نے سختی سے جواب دیا۔

''تمہارے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' چارلس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے بارے میں ہمارے

پاس مکمل معلومات جمع ہیں۔''

''کیسی معلومات؟'' ماریا نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم اپنے احمق شوہر کے ساتھ اس شاندار فارم ہاؤس میں رہتی ہو۔ تم دونوں کی اولاد نہیں ہے۔ تمہاری ڈھیر ساری دولت تمہارے پاس تمہارے گھر میں ہی موجود ہے۔ ہاں..... یہ الگ بات ہے کہ تم اعلیٰ درجے کی کنجوس ہو، ایک ایک پیسا بچا کر رکھتی ہو۔ گھر میں ملازم تک نہیں رکھا۔ نہ تو کسی تقاریب میں جاتی ہو اور نہ ہی اپنے ہاں مہمانوں کو بلاتی ہو۔ تمہارا خرچ برائے نام ہے اور آمدنی مسلسل بڑھ رہی ہے۔''

''تمہاری اس میں کیا غرض ہے۔'' ماریا خفگی سے بولی۔

''برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' چارلس درشت لیکن دھیمے لہجے میں بولا۔

''تمہارا سارا پیسا اسی گھر میں ہے، ہمارے ساتھ تعاون کرو..... ورنہ تمہیں اور تمہارے احمق شوہر کے سر میں سوراخ کرنے میں رابرٹ کو کوئی قباحت نہیں ہوگی۔''

''مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔'' ماریا غصے سے دہاڑی۔

چارلس ماریا کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کھلا ہوا اور پتلون کی جیب سے چھوٹا سا لیکن تیز چاقو نکال کر ماریا کی گردن پر رکھتے ہوئے بے رحمی سے بولا.....

''احمقانہ باتیں مت کرو، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم نے اپنی ساری آمدنی گھر میں ہی چھپا رکھی ہے، اس لیے وقت ضائع مت کرو، میں کم وقت میں زیادہ کام نمٹانے کے موڈ میں ہوں۔'' بات ختم کرکے چارلس نے چاقو کو معمولی سی حرکت دی۔ ماریا کی شہ رگ کے مقام پر دو انچ کی لکیر بن گئی جس سے خون کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔

''نہیں.....'' ماریا سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''اسے ہٹالو۔''

''امید ہے، اب تم وقت گزاری اور حیلہ سازی نہیں کروگی۔'' چارلس خطرناک تیوروں سے بولا اور چاقو ہٹا کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ معاملہ واقعی سنگین تھا۔ ماریا کے جب حواس بحال ہوئے تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ زندگی میں آج سے پہلے اتنی بے بسی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جس مقام پر وہ آج تھی یہ مقام قسمت نے اسے طشتری میں سجا کر نہیں دیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے ماریا نے طویل محنت کی تھی۔

ماریا دس سال کی تھی، جب اس کی ماں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوکر اگلے جہان رخصت ہوگئی اور پھر جب اس نے ہائی اسکول پاس کیا تو اس کے باپ کا اپنے پڑوسی کے ساتھ پانی کے تنازعے پر جھگڑا ہوگیا۔ وہ دونوں فارم کے لیے ایک ہی نالے سے پانی حاصل کرتے تھے۔ ایک دن پڑوسی نے بددیانتی سے سارا پانی اپنے فارم کی طرف موڑ لیا۔ ماریا کے باپ نے پیار سے پڑوسی کو سمجھایا لیکن وہ اپنی ڈھٹائی پر قائم رہا۔ آخرکار جب وہ معقولیت کی زبان نہیں سمجھا تو طیش میں آکر ماریا کے باپ نے رائفل استعمال کردی۔ ماریا کے باپ کو قتل کرنے کے جرم میں بیس سال کی سزا ہوئی مگر اسے جیل سے رہائی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ سزا کے تیسرے سال ہی اسے دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

یوں ماریا پر رشتوں کا باب بند ہوگیا۔ وہ اکیلی رہ گئی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ کسی سے توقعات وابستہ نہیں کیں اور آج یہ دو شیطان اس کی محنت سے حاصل کی گئی دولت کو اتنی آسانی سے لوٹنے آگئے۔ ماریا پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اپنے دفاع کے لیے اس کے پاس اپنے باپ کی رائفل تھی مگر وہ اوپر اسٹور میں پڑی تھی لیکن ان دونوں کی موجودگی میں وہ اوپر کیسے جاسکتی تھی۔ پولیس کو اطلاع بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ فون کچن میں تھا، وہاں تک رسائی ممکن نہ تھی۔ مجبوراً وہ دل ہی دل میں بچاؤ کے لیے کوئی تدبیر سوچنے لگی۔ ماریا کو افسردہ دیکھ کر چارلس طمانیت سے بولا۔

''تمہاری بھلائی اسی میں ہے..... کہ رقم ہمارے حوالے کردو۔ میرا یقین کرو تم دونوں پر کسی قسم کا تشدد نہیں ہوگا۔ جاتے وقت بھی تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا کرکے نہیں جائیں گے۔ بس بے ہوشی کی دوا سونگھا دیں گے۔ آدھے پونے گھنٹے میں ہی تم دونوں کو ہوش آجائے گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' ماریا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''واقعی رقم تمہارے حوالے کرنے کے بعد تم ہمیں نقصان نہیں پہنچاؤ گے.....؟''

''بالکل میرا یقین کرو۔'' چارلس نے اپنے لہجے میں نرمی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں صرف تمہاری دولت سے غرض ہے، تم مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو۔ اگر تم زندہ رہتی ہو تو دولت دوبارہ سے جمع کرسکتی ہو۔ واحد حل اب یہی ہے کہ رقم..... ہمارے حوالے کردو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ماریا نے اعتراف کیا۔

''ہم دونوں ہمیشہ تمہارے شکر گزار رہیں گے۔'' چارلس قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے تمہارے گھر واردات کا منصوبہ رابرٹ کے سامنے رکھا تو یہ فوراً

رضامند ہوگیا۔ اس واردات میں خطرات کا معمولی سا بھی تناسب نہیں تھا۔ تمہاری دولت سے ہم لمبے عرصے تک اپنے مالی حالات سے بے فکر ہوجائیں گے۔''

''تمہارے ہاں کوئی چوکیدار کوئی ملازم نہیں جو تمہاری مدد کرسکے؟ اگر..... بُرا نہ مانو تو تمہاری کنجوسی تمہیں لے ڈوبی۔''

ماریا نے سر جھکا لیا۔ شکست خوردگی کے گہرے بادل اس کے چہرے پر چھا گئے۔ گم صم اور خاموش آرچر نے اپنا ہاتھ ماریا کے کندھے پر رکھا جیسے تسلی دے رہا ہو۔ آرچر کی اس حرکت پر ماریا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''میرے خیال سے اب تمہیں دولت کی تجوری ہمارے حوالے کردینی چاہیے۔'' چارلس بے تابی سے بولا۔

''لیکن پہلے میں چائے پینا چاہتی ہوں۔'' ماریا نے کہا۔

چارلس اور رابرٹ کے ساتھ ساتھ آرچر بھی چونک کر ماریا کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے سر میں شدید درد شروع ہوگیا ہے۔ چائے ہی میرے سر درد کا علاج ہے۔ اسی لیے پہلے میں چائے پیوں گی۔'' ماریا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

چارلس اور رابرٹ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میرے ساتھ تم بھی پی لینا۔ یہ چائے تمہارے اعصاب پر خوشگوار اثر چھوڑے گی۔'' ماریا نے ٹھوس دلیل دی، تو چارلس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم دونوں بھی چائے پئیں گے اور مفت میں قسمت کا حال بھی معلوم کریں گے۔''

ماریا خوش ہوگئی۔ ''میں ابھی چائے تیار کرتی ہوں۔''

''نہیں، تم نہیں۔'' رابرٹ بولا۔ ''چائے تمہارا شوہر تیار کرے گا۔''

''آرچر کیسے چائے تیار کرے گا؟'' ماریا ہچکچائی۔

رابرٹ کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ ''میں کہہ رہا ہوں نا۔ تمہارا شوہر ہی چائے تیار کرے گا۔ تم ادھر ہی رہو گی۔ اب تم اٹھو اور میرے ساتھ کچن میں چلو۔''

رابرٹ نے آرچر کی طرف دیکھتے ہوئے ریوالور کو خطرناک انداز میں جنبش دی۔ آرچر جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ جاتے جاتے رابرٹ نے چارلس کو ہوشیار کیا۔ ''اس پر نظر رکھنا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس اشارہ کررہی ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور کرے گی۔''

''بے فکر رہو۔ اس نے ہوشیاری دکھائی تو سنگین انجام کی ذمے دار ہوگی۔''

چارلس نے رابرٹ کو تسلی دی اور ماریا کو دیکھتے ہوئے چاقو کی دھار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ماریا اس ساری گفتگو کے دوران سنجیدہ رہی۔ اس لاچار صورتِ حال میں اس کا دل غم و غصے سے بھر گیا تھا۔

رابرٹ اور آرچر کے جانے کے بعد چارلس، ماریا کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ڈاکے یا لوٹ کے ڈر سے تم نے اپنی دولت بینک میں نہیں رکھی نا؟''

''ہاں۔'' ماریا نے اداسی سے جواب دیا۔ ''حفاظت کے لیے میں نے اپنے گھر کو محفوظ جانا۔ میں سمجھتی تھی کہ مضافات میں جرم نہیں ہوتے۔ وہاں ڈاکے نہیں ڈالے جاتے۔ لوگ قتل نہیں ہوتے، وارداتیں نہیں ہوتیں لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ چائے سے قسمت کا حال کیسے بتاتی ہو؟'' چارلس نے تجسس سے پوچھا۔

''میں سبز چائے استعمال کرتی ہوں جس کی پتیاں صحیح سالم ہوتی ہیں۔ ان پتیوں کو پیالی میں تیرتے دیکھ کر میں پینے والے کی قسمت کے بارے میں بتاسکتی ہوں۔ اسی سبز چائے کے پودے میں نے فارم میں کاشت کیے ہوئے ہیں۔'' ماریا نے جواب دیا۔

''خوب۔'' چارلس مسکرایا۔ ''اس چائے سے تم تو دونوں ہاتھوں سے کمارہی ہو۔'' ماریا نے چارلس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر بعد آرچر ایک خوب صورت سی ٹرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آگیا جس میں چار پیالیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ کچھ مطمئن لگ رہا تھا۔ کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ حسبِ توقع رابرٹ ریوالور سمیت اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

آرچر نے ایک بے حد نفیس اور قیمتی کیتلی سے پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ سبز چائے کا رنگ بہت عمدہ تھا۔ اس کی خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ چارلس نے ماریا کے ذوق کو داد دی۔ آرچر نے غور سے ماریا کو دیکھا جس کے لبوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ پہلے کے مقابلے میں وہ اب پُراعتماد نظر آرہی تھی۔

''لو بھئی چائے تو آگئی۔ اب قسمت کا حال بھی بتا دو۔'' چارلس نے کہا۔

''پہلے یہ تو فیصلہ کرلو کہ کون سی پیالی کس کی ہے۔''

''کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے؟'' چارلس نے پوچھا۔

''جب یہ طے ہوجائے گا کہ کون سی کس کی پیالی ہے؟

تو میں اس پیالی میں موجود پتیوں کی ترتیب دیکھ کر قسمت سے متعلق بتا سکوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ پیالی میری ہے۔" چارلس نے ایک پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ رابرٹ کی ہے۔"

"باقی پیالیاں ہم دونوں کی ہیں۔" ماریا نے کہا۔ "یہ والی میری ہے اور وہ آرچر کی ہے۔"

"اب تم جلدی سے قسمت کا حال بتاؤ۔" چارلس بولا۔

ماریا اپنی جگہ سے اٹھی اور چارلس کی پیالی کا جائزہ لے کر بولی۔ "تمہاری پیالی میں چائے کی پتیوں کی ترتیب بتا رہی ہے کہ تم مضبوط قوت ارادی کے مالک ہو۔"

پھر ماریا نے آرچر کی پیالی دیکھی اور کہا۔ "آرچر! اس پیالی میں پتیوں نے ایک سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں تمہیں کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوگا اور اس پر عمل بھی فوراً کرنا ہوگا۔"

آرچر نے غور سے ماریا کی جانب دیکھا۔ ماریا بھی اسے دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرائی۔ رابرٹ کی پیالی کو دیکھنے کے بعد ماریا الجھن زدہ انداز میں بولی۔ "شاید تمہاری پیالی میں پتیاں نہیں ہیں، ٹھہرو..... میں اس میں اور چائے ڈالتی ہوں۔" اتنا کہہ کر ماریا نے چائے کی نفیس اور قیمتی کیتلی اٹھائی اور آرچر کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے نہایت پھرتی سے وہ کیتلی رابرٹ کے سر پر دے ماری۔

رابرٹ کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا اور وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے گر گیا۔ یقیناً گرم گرم کھولتی ہوئی چائے اس کی آنکھوں میں گری تھی۔ اسی دوران میں آرچر نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی اور چائے کی ٹرے اٹھا کر بجلی کی سی تیزی سے چارلس کے اوپر انڈیل دی۔ چارلس بے خبری میں مارا گیا کیونکہ وہ رابرٹ کی طرف متوجہ تھا جب آرچر نے اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔

چند لمحوں بعد جب چارلس اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا تو منظر ہی بدل چکا تھا۔ ماریا کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو کچھ وقت پہلے رابرٹ کے پاس تھا۔ ماریا دانت پیستے ہوئے چارلس کو گھور رہی تھی، ریوالور کا رخ اسی کی طرف تھا۔ ایسی صورت حال کی چارلس کو توقع نہیں تھی وہ دم بخود رہ گیا۔ رابرٹ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

ماریا نے پوری قوت سے کیتلی اس کے سر پر ماری تھی جس سے اس کی نفیس اور نادر کیتلی ٹوٹ کر کرچیوں میں تبدیل ہو گئی تھی، اس کی پیالیاں بھی ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔

"تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔ اب اٹھو اور ادھر اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" ماریا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

چارلس کے پاس حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا..... اس کا چہرہ اور خاص طور پر آنکھوں کے گوشے جھلس گئے تھے۔ تکلیف کی شدت کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

ماریا کی آنکھوں میں خواہش انتقام مچل رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ چارلس پر گولی چلانے ہی والی تھی کہ آرچر نے اسے ٹوکا..... "نہیں ماریا۔ اسے گولی مت مارنا۔"

"اور اس نے جو ہمیں اتنی دیر سے ذہنی دباؤ اور شدید اذیت میں مبتلا رکھا اور ہماری مے نوشی سے محروم کرنا چاہا؟ کیا اس کی سزا اسے نہیں ملنی چاہیے۔" ماریا زہریلے لہجے میں بولی۔

"کسی کے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگتی ہو؟" آرچر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "تم بس اسے کور کیے رہو، میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔ اسے اور اس کے ساتھی کو قانون ہی سزا دے گا یہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"مگر اس کی وجہ سے میری پیالیاں اور خاص طور پر میری یہ قیمتی اور نادر کیتلی ٹوٹ گئی۔ اب اس کیتلی کا معاوضہ کون دے گا؟"

"اب چھوڑو بھی۔" آرچر بے پروائی سے بولا۔ "ہمیں اس کیتلی کی ضرورت ہی کب تھی..... یہ تو تم نے محض شوق میں خرید لی تھی۔ ورنہ کون نہیں جانتا..... کہ ہم دونوں کو چائے کس قدر ناپسند ہے تقریباً سب کو معلوم ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی تو ناشتے میں بھی چائے نہیں پیتے۔"

آرچر کی بات پر چارلس نے چونک کر ماریا کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "آرچر بالکل درست کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں چائے سے نفرت کرتے ہیں۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم نے ہمارے بارے میں پوری معلومات حاصل کی تھیں، وہاں اتنی عام سی بات پر غور کیوں..... نہیں کیا؟"

سرد آہ بھر کر چارلس نے سر جھکا لیا۔ آرچر کچن سے فون اٹھا لایا تو ماریا پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگی اور چارلس سوچ رہا تھا کہ اپنی دانست میں اس نے اور رابرٹ نے دونوں میاں بیوی کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں لیکن کتنی اہم اور ضروری بات وہ جان نہیں سکے تھے۔

Digitized by Google

چودھواں حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل ہے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگلوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ محوِ سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وضع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً تجسس پسند اور مہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اُوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیا بھی ساتھ ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیڑ عمر خانساماں میاں بیوی نندو اور شانتا کے علاوہ ایک بانکا سجیلا کڑیل نوجوان شوکت حسین بھی اس قافلے میں شامل ہے۔ یہ جنرل مائیکل شاہ کے سائیس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت حرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً گھمنڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عناد ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم جوئی کے دوران ایک پراسرار بستی کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خودمختار ریاستوں پر فرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں معروف ہیں اور انہی سازشوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے پانچ مسلم اور جری جانباز گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی ریحان ہے جو فوجِ آزادی کے سپہ سالار جنرل ظہیر خان کے ایک خاص کمانڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذاتِ خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ''کاروانِ مجاہد'' کہلاتا ہے۔ باقی دو ساتھی شرنجیل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شہ تھا کہ منتشر مسلم باغی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کرسکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک مقصد اپنا ''سلسلۂ تسلط'' کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابلِ ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لپڈا مکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف بہ ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی مجو بائی اپنے بیٹے ایش کمار کو ولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی مجو بائی کی ایک جواں سال خوبصورت بیٹی سوہنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایش کمار کا راستہ صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہا پجاری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پجاریوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کرا دیتا ہے۔ مہارانی مجو بائی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملوا دیتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا پی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کرواتا ہے۔ شک مجو بائی پر ہوتا ہے تاہم پرتاب مجو بائی کو سزا نہیں دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سراج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سراج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کوتوالیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر ماریہ کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہوجاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے خیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، نندو بابا اور شانتا جل کر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار بستی کے عجیب وغریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کرلیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بلی چڑھا دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بالی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا ہے مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ راجا پرتاب کمار ماریہ کو بری کردیتا ہے جس کے باعث وہ انگریزوں سے دشمنی پال لیتا ہے۔ ادھر بچھو رام ماریا کے باپ کرنل اینڈرسن کو خبر دیتا ہے کہ اس کی بیٹی کے غیاب میں مندر کے پجاریوں کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ پھر بچھو رام کرنل کو حتمی خبر دیتا ہے کہ ماریا کے غیاب میں مندر والوں کا ہاتھ ہے۔ انگریز کوہِ شالیہ پر چڑھائی کی منظوری دے دیتے ہیں۔ ادھر بدری ناتھ اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس گوری حسینہ رینا کو اغوا کرلیں۔ دو پجاری رینا کو

اغوا کر کے مندر لے آتے ہیں۔ اریبہ اور شاہ زمان سی ہاک نامی جہاز کو تباہ کرنے کے مشن پر روانہ ہوتے ہیں تاہم وہ دھر لیے جاتے ہیں۔ ادھر شوکی رینا کی تلاش میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ وہاں اسے پجاری گھیر لیتے ہیں، اسی وقت گولی چلنے کی آواز فضا میں ابھرتی ہے۔ انگریز وہاں حملہ کر دیتے ہیں۔ شوکی کا مقابلہ بدری ناتھ سے ہوتا ہے۔ شوکی کی مدد ایک نادیدہ قوت کرتی ہے جس کے نتیجے میں کالی کا مندر تباہ ہو جاتا ہے اور شوکی ملبے تلے دب جاتا ہے۔ ادھر شاہ زمان آزاد ہو کر اریبہ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ شاہ زمان فرنگیوں کے کیمپ تک پہنچ جاتا ہے اور اریبہ کو وہاں سے رہا کروالیتا ہے۔ ادھر رابرٹ اپنی بہن گارشیا کا گلا دبا کر سونجا کو راج محل سے بھگا لے جاتا ہے۔ تاہم گارشیا بچ جاتی ہے۔ اس پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے راج محل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شوکی کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک غار میں ہوتا ہے وہ غار سے نکلنے میں نیچے کھائی میں گر جاتا ہے تاہم وہی پراسرار ہستی اس کی جان بچاتی ہے۔ شوکی کے سامنے ایک حسین و جمیل عورت ہوتی ہے جسے دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ ادھر شاہ زمان اور اریبہ سی ہاک پر پہنچ جاتے ہیں، رینالڈ بھی وہاں پہنچتا ہے اور کیپٹن جیمس اور شاہ زمان کو زخمی کر دیتا ہے۔ رابرٹ سونجا کو لے کر بذریعہ جہاز انگلستان کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر زمان زخمی حالت میں رینالڈ سے مقابلہ کرتا ہے تاہم رینالڈ اریبہ کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ طمانیت بھرا..... مگر آخری منظر اس نے اپنی ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے پر شاہ زمان کو اپنی نورِ نظر کا چہرہ نظر آیا۔

محبوب کی شبیہہ میں، اس کے دیدار میں، قدرت نے نہ جانے ایسا کیا جادو رکھا ہے کہ اس کے دیدار سے ساری ذہنی و جسمانی کلفتیں اور تکان دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔

زمان بھی اریبہ کا رخِ ماہ روشن دیکھتے ہی اپنے اندر ایکا ایکی پرجوش توانائی کی لہر دوڑتی محسوس کرنے لگا لیکن یہ تحت الشعور کی کارستانی ہوتی ہے، جس کا پلڑا اگر لاشعور کی طرف بھاری ہوتا ہے تو انسان کے اس تخیلاتی تصور کو مہمیز کرتے ہوئے جس کی شبیہہ اس کے دل و دماغ میں بسی ہوتی ہے، وہی اسے حقیقت کے روپ میں دکھاتی ہے، لیکن جب اس کا شعور پوری طرح جاگا تو اسے ایک جھٹکا لگا۔

اس پر جھکا ہوا وہ نسوانی چہرہ شناسا ضرور تھا مگر وہ اریبہ کا نہیں بلکہ وہ ازابیلا تھی۔ کیپٹن جیمس کی نوجوان اور نوبیاہتا بیوی..... ازابیلا۔

''اریبہ کہاں ہے؟'' زمان ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ اس نے خود کو ایک نرم گرم بستر پر لیٹے ہوئے پایا تھا۔ ماحول اور منظر وہی تھا۔ یہ لانچ کا ہی رہائشی کیبن تھا۔

''پلیز! لیٹے رہو۔ تمہارا زخم ابھی تازہ ہے۔'' ازابیلا نے ملامت آمیز رسانیت سے کہا۔ زمان کو اپنے دائیں شانے پر درد کی ٹیس کے ایک دم ہی جاگنے کا احساس ہوا اور بے اختیار اس کے حلق سے کراہ سی نکل گئی۔ وہاں اس نے بڑی سی بینڈیج بندھی ہوئی دیکھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے بیڈ پر لٹکی اس کی کہنیوں نے اس کے مضروب جسم کو سہارنے سے انکار کر دیا اور وہ دوبارہ ڈھے سا گیا۔

تب ہی اس کی نظر دائیں جانب ایک اور بستر پر پڑی، جہاں ازابیلا کا شوہر کیپٹن جیمس بھی نیم دراز تھا۔ اس کی حالت قدرے بہتر نظر آتی تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر پہلو کے بل، اسی جانب رخ کیے زمان کے بیڈ کی طرف تکے جا رہا تھا۔

''اسے ہوش آ گیا ڈارلنگ؟'' اس نے پوچھا۔

''ہوش تو آ گیا ہے مگر اپنی ساتھی کی وجہ سے کچھ بے چین سا ہو رہا ہے۔'' ازابیلا نے جواب میں کہا۔ ''یہ اپنی اس بہادر ساتھی کی وجہ سے فکرمند ہے، جس نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچایا تھا۔''

''تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو؟ اریبہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟'' زمان نے ان دونوں کو باتوں میں مشغول پایا تو دوبارہ بے قراری سے اور قدرے بلند آواز میں بولا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس پر دوبارہ غشی سی طاری ہونے لگی اور ازابیلا کا چہرہ ہی نہیں اردگرد کا منظر بھی دھندلانے لگا۔

وہ خون زیادہ بہہ جانے کے سبب بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا، لہٰذا ایک بار پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

''دوبارہ بے ہوش ہو گیا بے چارہ.....!'' ازابیلا بولی پھر اپنے شوہر کے قریب جا کر تفکر سے کہا۔ ''ہنی! اس کی حالت زیادہ تشویش ناک تو نہیں ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں۔'' جیمس نے جواب دیا۔ وہ ایک کہنی کے بل پر اب بستر پر لٹکے شاہ زمان کے بیڈ کی جانب دیکھنے لگا۔ ''خون بہنے کی وجہ سے ذرا کمزوری

Digitized by Google

ہوگی، وہ رفتہ رفتہ ہی ٹھیک ہوگی لیکن میرا خیال ہے یہ اپنی اس بہادر ساتھی کی وجہ سے پریشان ہے جس نے اس کے بے ہوش ہوتے ہی سمندر میں چھلانگ لگادی تھی۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے جیمس، یہ دونوں کسی مشن پر.....''

ازابیلا اپنا جملہ پورا نہ کرسکی۔ جیمس درمیان میں بولا۔

''ہاں..... ابھی وہ دونوں مرد عورت کمانڈو تھے جن کے بارے میں ہمیں اطلاع تھی لیکن یہ بدبخت آفیسر رینالڈان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا اور ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا۔''

''اچھا ہی ہوا وہ مردود مارا گیا۔'' ازابیلا نے بھی آفیسر رینالڈ کو کوسا۔ ''اس خبیث نے تو ہماری بھی پروانہ کی اور ہمیں بھی موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کررہا تھا۔''

''ہاں! وہ اس طرح اپنی نااہلی اور غلطیوں پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ کرنل اینڈرسن کا کچھ زیادہ ہی سر چڑھا تھا اسی لیے مجھے بھی اکثر خاطر میں نہیں لاتا تھا۔'' کیپٹن جیمس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور مزید بولا۔

''دراصل میں تو اس مشن پر زبردستی بھیج دیا گیا۔ جب مجھے جنرل مائیکل شا کی طرف سے اس جزیرے ٹریژر آئی لینڈ میں بھیجا گیا تھا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس جزیرے کی حقیقت کیا ہے۔ وہ تو جب مجھے کرنل اینڈرسن نے بریفنگ دی تو پتا چلا کہ یہاں پورے ہندوستان کے خزانے کو چوری کرکے جمع کرنے کا اڈا بنایا گیا ہے تاکہ یہاں سے سارا خزانہ رفتہ رفتہ انگلستان منتقل کیا جائے۔''

''ہم ایسا کیوں کررہے ہیں ہنی؟ ایک تو ہم نے ان پر ناجائز ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں اور انہی کی زمین ان پر اس قدر تنگ کردی ہے کہ اب ان کے خزانے پر بھی ڈاکا مار رہے ہیں، کیا یہ ساری دنیا میں ہماری بدنامی اور آنے والے وقتوں میں ہمارے تشخص کو برباد کرنے کا سبب نہیں بنے گا؟''

اپنی خوبصورت اور حسین نو بیاہتا بیوی کو اپنے ہم خیال تاثرات پیش کرتے دیکھ کر کیپٹن جیمس مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے خوشی بھی کہ اس کی محبوب بیوی بھی اس کی طرح اپنے ضمیر کا قیدی نہیں بننا چاہتی تھی۔

''ہنی! تم کسی طرح اپنی اس ڈیوٹی سے کوئی عذر پیش کرکے خود کو یہاں سے ہٹا کیوں نہیں لیتے جو ہمارے ضمیر پر ایک بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔'' ازابیلا نے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ اپنے شوہر سے کہا۔

''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ڈارلنگ!'' کیپٹن جیمس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب دیکھو نا..... ڈیوٹی نبھاؤ تو ضمیر ملامت کرتا ہے، نہ نبھاؤ تو اپنے۔'' اس کی بات پر ازابیلا پورٹ ہول تک گئی اور ذرا جھک کر باہر دور تک تاریک سمندر کا جائزہ لینے لگی۔

اپنے شوہر کی طرح اب وہ بھی شاہ زمان اور اریبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی، جنہوں نے محض انسانیت کی خاطر اس کی جان بچائی تھی مگر اپنے کاز سے بھی پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ اس دہری ذمے داری کو ان دونوں بہادروں نے اپنی جان پر کھیل کر پورا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اب اسے اپنے اس ''محسن جوڑے'' کی فکر بھی ستا رہی تھی اور شاہ زمان سے زیادہ اسے اس کی ساتھی اریبہ کی طرف سے تشویش ہورہی تھی کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ آفیسر رینالڈ کو اپنی موٹر بوٹ پر موجود ساتھی کو کوئی شے پھینکتے اور کچھ چیخ کر کچھ کہتے پا کر اس نے بھی پانی میں چھلانگ لگادی تھی۔

ان دونوں میاں بیوی کے خیال میں اریبہ نے جوش تلے ایک خطرناک غلطی کر ڈالی تھی۔ موٹر بوٹ اجازت نامہ لے کر اسی وقت ''سی ہاک'' کی طرف روانہ ہوچکی تھی۔ اریبہ تیر کر بھلا وہاں تک کیسے پہنچ سکتی تھی؟

''کیا دیکھ رہی ہو ڈارلنگ؟'' اچانک اسے پیچھے سے جیمس نے ہولے سے پکارا۔

''پتا نہیں وہ بیچاری کہاں چلی گئی؟'' ازابیلا پلٹ کر دکھی لہجے میں بولی۔

''کاش! ہماری لانچ (پاؤس بوٹ) اس سارے ہنگاموں میں نہ خراب ہوئی ہوتی تو میں اس بہادر خاتون (اریبہ) کی ضرور مدد کرنے کی کوشش کرتا مگر.....'' یہ کہتے ہوئے جیمس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا ہمارے پاس کوئی بوٹ بھی نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے لائف بوٹ؟''

''کیا تم اس بہادر خاتون کی مدد کو جانا چاہتی ہو؟'' جیمس نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں، مجھے ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''اس خاتون کو بہرحال جوش میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''وطن کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھنے والے ایسے سرفروش، سرپھرے ہوتے ہیں ڈارلنگ!'' کیپٹن جیمس نے کہا پھر بستر سے اٹھنے کی کوشش میں مزید بولا۔

''میں خود کوئی بوٹ دیکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے ایک ربر کی کشتی تو ضرور موجود ہوگی۔'' کہتے ہوئے وہ بستر سے

اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو ازابیلا یک دم اس کے پاس آگئی۔

''کیا کہہ رہے ہو ابھی؟ تم ایسی حالت میں بوٹ لے کر سمندر میں اترو گے؟ ہرگز نہیں۔'' ازابیلا نے شوہر کو ٹوکا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس بہادر خاتون کی خدا ضرور مدد کرے گا۔'' یہ کہتے ہوئے ازابیلا نے اپنے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔

☆☆☆

بے ہوش شاہ زمان کو وہیں چھوڑ کر اریبہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا جانے کا لیکن اسے زمان کی یہ ہدایت، ایک وعدے کی صورت میں اچھی طرح یاد تھی کہ.....

''اریبہ.....! وعدہ کرو کہ ہم پر جب بھی ایسا کوئی وقت کڑی آزمائش بن کر سامنے آجائے اور تمہیں کاز اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو تم میری بجائے اس مشن کو ہی ترجیح دو گی۔''

اور اریبہ نے زمان سے مشن کو ترجیح دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔

ایک زوردار چھپاکے سے پانی میں گرتے ہی اس نے بلا دیر تیزی سے تیرنا شروع کر دیا تھا۔ ہر سو گہری تاریکی کا راج تھا، جزیرے کی سمت بھی اندھیرا ہی نظر آرہا تھا۔

تیرنے کے دوران میں پانی کی سطح سے ڈوبتے ابھرتے سر کے ساتھ اس نے جنگم واصل فرنگی آفیسر کی موٹر بوٹ کی روشنی کو تیز رفتاری کے ساتھ..... دور گہرے پانیوں میں لنگر انداز ''سی ہاک'' کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

یہ حقیقت وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ..... تیر کر وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

وہ درحقیقت اس چوبی پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی جو جزیرے کے ساحل سے سمندر میں کافی اندر تک خصوصی طور پر بنایا گیا تھا اور وہیں وہ مذکورہ بار بردار لانچ لنگر انداز تھی جس میں ساحل سے اس لانچ تک خزانہ لاد کر دور گہرے پانیوں میں لنگر انداز جہاز پر منتقل کیا جاتا تھا۔

ٹریژر آئی لینڈ کا سارا نظام بہ شمول افراد و عسکری قوت سب کچھ اریبہ اور شاہ زمان نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر نہایت بہادری، دلیری اور ہوشیاری سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ ہاتھ پیر مارتی ہوئی بالآخر اس لانچ کے قریب جا پہنچی، وہاں خاموشی اور سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اریبہ نہتی تھی۔ وہ لانچ میں دبے پاؤں کی طرف سے سوار ہوئی اور اندر داخل ہو گئی۔ وہاں سے اس نے کیبن کا رخ کیا۔ اسے پتا تھا اسی طرف وہیل کیبن بھی ہو سکتا تھا۔

لانچ میں سیلن اور کائی زدہ سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ لانچ میں اسے وہاں کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک اس نے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں۔ یہ ایک مستول کی دوسری جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نہایت گربہ قدمی کے ساتھ نیچے جھکتی ہوئی ذرا قریب گئی اور ایک زینے کی ریلنگ کی آڑ سے دوسری جانب جھانک کر دیکھا تو ٹھٹک گئی۔

دو مسلح افراد وہاں عرشے کی ریلنگ سے لگے بیٹھے شراب پینے میں مگن تھے اور ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے گنیں پڑی تھیں۔ اریبہ کو ان دونوں فرنگیوں کو یوں مست الست بیٹھا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تب ہی اس نے ایک فرنگی کو دوسرے سے کہتے سنا۔

''لگتا ہے اب اس تباہی کے بعد یہاں کی خشک زندگی سے جان چھوٹ جائے گی اور ہمیں اب واپس شہر بلا لیا جائے گا۔ کیوں جوزف! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے نہیں لگتا۔'' جوزف نامی اس کے دوسرے شرابی ساتھی نے نشے کی ترنگ میں جواب دیا۔ ''ایک آفیسر کی ناکامی سے کیا ہو جاتا ہے؟ یہاں کا اصل نظام تو کرنل اینڈرسن کے ہاتھ میں ہے۔ اب لگتا ہے اسے ہی بھیجا جائے گا، کیونکہ کیپٹن جیمس اور رینالڈنا کام ہو گئے ہیں۔''

''بڈی! لگتا ہے تم پر ابھی وہ اکتاہٹ طاری نہیں ہوئی جو مجھ پر ایک عرصے سے طاری ہے۔'' پہلے والا بوتل سے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے مست لہجے میں بولا۔ ''یہاں رکھا ہی کیا ہے؟ خشکی، جنگل، نمکین پانی اور یکسانیت سے بھرا پڑا بے رونق ماحول جبکہ ادھر شہر میں کتنے مزے تھے۔ کلب، شراب اور شباب، مستیاں اور رونقیں۔''

اریبہ سمجھ گئی کہ یہ دونوں بیئر پیے بیٹھے تھے۔ اس نے ہلکا سا کھٹکا کیا۔ دونوں چونکے اور اپنی رائفلیں سنبھالے ہوئے اس طرف بڑھے، جدھر اریبہ موجود تھی، وہ اب ''کھٹکا'' کر کے ایک طرف کو جا چھپی تھی۔ پھر جیسے ہی ایک شرابی فوجی اس کی پہنچ میں آیا اس نے اس کی پشت پر تاک کر لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرا کر گرا اور کراہنے لگا۔ دوسرا چونک کر پلٹا ہی تھا کہ اریبہ نے خونخوار شیرنی کی طرح اس پر جست لگا دی۔ دونوں نیچے گرے مگر اریبہ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھوں سے رائفل اچک لی تھی۔

یہ دونوں بہت شراب پیے ہوئے تھے، ورنہ اریبہ

کا تن تنہا اس طرح ان پر قابو پانا مشکل ہی ہوتا۔

گن ہاتھ میں آتے ہی اریبہ نے اسے لاٹھی کی طرح گھما کر اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ ایک پٹاخا سا چھوٹا اور چیخ بھی گونجی۔ وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اس صورتِ حال پر پہلے والے کا نشہ ٹوٹا اور وہ عرشے کی ریلنگ کی جانب دوڑا۔ اریبہ نے گن کا رخ اس کی جانب کیا، وہ ریلنگ پر چڑھ کر سمندر میں کودنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کر اریبہ نے اس پر گولی نہیں چلائی اور اس کے سمندر میں چھلانگ لگانے کا انتظار کرتی رہی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ پانی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

اریبہ ہونٹ بھینچے اور گن دونوں ہاتھوں میں سنبھالے وہیل کیبن کی طرف دوڑی۔ اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔

وہاں بھی ایک صحت مند سا انگریز قریب ایک بنک بیڈ پر دراز تھا اور اس کے قریب شراب کی خالی بوتل فرش پر لڑھکی پڑی تھی۔ اس کے لباس سے اریبہ کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ..... ''وہیل مین'' تھا۔

اریبہ نے اس کے پہلو میں گن کا ٹھوکا مار کے اسے جگایا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور اریبہ کو گن تانے دیکھ کر وہ بت بن گیا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' اریبہ نے غرا کر اس سے کہا۔ ''لانچ اسٹارٹ کرو اور مجھے سی ہاک تک پہنچاؤ۔ جلدی!''

اس نے اریبہ کے خطرناک تیور محسوس کر لیے تھے اور یوں موت کے خوف سے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لانچ..... گہرے پانیوں کی جانب بڑھی چلی جا رہی تھی جدھر سی ہاک لنگر انداز تھا۔

☆☆☆

علی ریحان اس روز سارا دن آرام کرتا رہا تھا۔ بڑے عرصے بعد آج اسے گہری اور بے فکری نیند آئی تھی۔ اسی سبب وہ رات گئے تک سوتا رہا۔

اسے وقار الحسن نے ہی جگایا تھا اور عندیہ دیا کہ جنرل شمیر اور کرنل نہال خان اپنی میٹنگ ختم کرنے کے بعد اپنے مذکورہ خفیہ ٹھکانے سے واپس لوٹ آئے ہیں۔ دو جانباز بھی ان کے ساتھ ہیں۔

''تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' علی ایک دم بولا۔ ''نجانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟''

وقار اس کی بات پر ملائمت آمیزی سے مسکرایا۔ بولا۔ ''بے فکر رہو، وہ کچھ نہیں سمجھ رہے۔ جو تم نے بتایا تھا وہ میں ان کے تفصیلاً گوش گزار کر چکا ہوں۔ وہ یہاں آئے اور تمہیں سوتا دیکھ کر دونوں نے تمہیں فخر سے سیلیوٹ کیا تھا۔''

''طنز کر رہے ہو مجھ پر؟'' علی نے اسے معصومی خفگی سے گھورا۔

''ارے نہیں برادر! سچ کہہ رہا ہوں۔'' وقار سنجیدہ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ اتنا بڑا معرکہ کامیابی سے ہمکنار کرنے کے بعد تھکا ہارا آدمی اپنے ٹھکانے پر ہی تو آرام و سکون کی نیند لیتا ہے۔''

''اچھا چلو، اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔'' علی بھی دوستانہ مسکراہٹ سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''سردی بڑھنے لگی ہے۔'' وہ دونوں بازو لپیٹتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، آپ ساتھ والے کمرے میں تشریف لے جائیں، میں تب تک آپ سب کے لیے گرما گرم قہوہ لاتا ہوں۔'' وقار نے کہا تو علی سر ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرا کمرا نسبتاً کشادہ تھا۔ اگرچہ فرنیچر نام کی یہاں بھی کوئی شے نظر نہیں آتی تھی، لیکن کمرا صاف ستھرا اور چھوٹی موٹی اشیائے ضرورت سے مزین تھا۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بستر بند لپٹے پڑے تھے۔ کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کمرے میں اس وقت چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں ایک چوڑے شانوں مگر چھریری قامت کا بارعب شخص تھا۔ اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہی نظر آتی تھی۔ رنگت گندمی تھی۔ چہرہ بھی دبلا مگر عزم و ہمت کا نمونہ نظر آتا تھا۔

اس کی آنکھوں سے بھی جاہ و جلال ساٹپک رہا تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی جس کا رنگ ہلکا براؤن تھا۔ اس نے اپنے چوڑے شانوں پر گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔

یہ حریت پسند باغی گروپ کا سپہ سالار جنرل شمیر خان تھا۔ علی ریحان اسی گروپ کا کمانڈر تھا۔ ان میں دوسرا شخص پہلے کے مقابلے میں قدرے بھاری بھرکم اور اس کا ہم عمر ہی نظر آتا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی تھیں اور بھویں بھی گہری تھیں۔ ان میں سفید بالوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عقاب جیسی چمک بلکورے لے رہی تھی۔ رنگ اس کا بھی صاف تھا اور چہرہ بارعب۔ بلاشبہ وہ اپنی باوقار شخصیت میں پہلے والے فرد سے کم نہیں نظر آتا تھا۔

یہ کرنل نہال خان تھا..... ''حریت'' گروپ کا سربراہ۔

جیسا کہ مذکور ہوا، اس وقت فرنگی سامراجوں کے خلاف یہی دو گروپ بھرپور مگر خفیہ طریقے سے فعال تھے۔ باقی دو ان کے ساتھی تھے۔ یہ نوجوان اور علی کی عمر کے ہی تھے۔

ان کا اسلحہ قریب ہی دری پر دھرا پڑا تھا۔ علی ریحان نہایت احترام کے ساتھ مسکراتا اور سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

سب نے اس بہادر نوجوان کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور چند رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد علی ریحان اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اب تک کی مہمات کے بارے میں دھیرے دھیرے اور نہایت صراحت کے ساتھ انہیں آگاہ کرتا رہا پھر اس کی داستان سرفروشی سننے کے بعد سب نے کھلے دل کے ساتھ پرتپاک انداز میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

''ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شاہ زمان اور ہماری نئی ساتھی اریبہ بہن کو بھی ان کے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔'' جنرل شمیر خان نے دعائیہ لہجے میں کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کا مشن خطرناک بھی ہے اور اس سے زیادہ اہم بھی.....''

''بلاشبہ.....'' کرنل نہال خان نے بھی کہا۔ ''ان غاصب فرنگیوں نے ہماری دھرتی پر تو دھوکے سے قبضہ جمایا ہی تھا، ظلم و ستم کا بھی یہاں بازار گرم رکھا اور اب..... یہ رذیل گورے ہمارے ہی دیس کا خزانہ لوٹ کر اپنے ملک انگلستان لے جا رہے ہیں۔ ہماری دھرتی کو ان فرنگی سامراجوں نے لوٹ کا مال سمجھ لیا ہے۔''

کرنل نہال خان کا چہرہ جوشِ غیظ سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اس خبر پر وہاں موجود سب کی یہی دلی کیفیات تھیں۔ کوہِ شالیہ کی فتح یابی اور اس کے منفی یا مثبت اثرات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا گیا، تاہم انہیں اب تسلی تھی کہ فرنگیوں کی وہاں سے پسپائی کے بعد یہ لوگ اب کوہِ شالیہ میں اپنے خفیہ ٹھکانے بنا سکتے تھے۔

دراصل یہ مجاہدین اب نئے سرے سے اپنی منتشر طاقتوں کو یکجا کر کے فرنگی سامراجیوں کے خلاف متحد ہونے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے اور اس کے لیے کوہ شالیہ سے بہترین جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

بہ قول جنرل شمیر خان کے اب وہاں کی تینوں ریاستوں کو ان کی حمایت بھی حاصل ہونے لگی تھی۔ وہاں کے راجے مہاراجے اور نوابین وقت کی ضرورت اور ان انگریز سامراجیوں کی مکارانہ اور غاصبانہ چال کو سمجھ چکے تھے۔ اب انہیں خود بھی ایسے حریت پسند باغی گوریلوں کی ضرورت کا احساس ہو چلا تھا۔

''نوجوان علی!'' تھوڑی خاموشی اور مختلف عسکری امور اور حکمتِ عملی پر تبادلہ خیال کے بعد جنرل شمیر نے علی ریحان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ ہمیں ابھی ایک نئی مہم درپیش تھی اور تمہاری کوہ شالیہ والی مہم سے کامیاب واپسی کے بعد ہمارا ارادہ تمہیں ایک نیا مشن سونپنے کا تھا، لیکن ٹریژر آئی لینڈ والے حساس اور نازک معاملے میں صرف دو مجاہدین کا جانا میرا خیال ہے، ناکافی ہوگا۔ ایسے میں ان دو مجاہدین میں صرف شاہ زمان ہی تربیت یافتہ ہے، جبکہ اس کی ساتھی مجاہدہ اریبہ..... محض اپنے سچے جذبۂ ایمان کی بدولت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس خاتون کی بہادری اور جذبۂ حب الوطنی سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ غیر تربیت یافتہ.....''

''قطع کلامی کی معافی چاہوں گا جناب!'' علی نے درمیان میں کہا۔ ''اریبہ بے شک کوئی باقاعدہ تربیت یافتہ کمانڈو نہ سہی لیکن آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کوہ شالیہ جیسے عظیم مشن کی کامیابی میں اریبہ کی جاں نثاری، ذہانت اور دلیری کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ پھر شاہ زمان کی سنگت میں اس نے بھی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ رہی بات ٹریژر آئی لینڈ والی حساس اور اہم مہم کی تو میں خود بھی کوہ شالیہ سے واپسی میں ادھر ہی کی راہ لینے والا تھا لیکن سوچا پہلے آپ لوگوں سے ایک ملاقات کر لینا ضروری ہے، لہٰذا میں اب روانگی کے لیے تیار ہوں۔'' علی نے اپنی بات ختم کی۔

جنرل شمیر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔ کرنل نہال خان کی نظریں علی ریحان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی شاید اس کی بات پر غور کر رہے تھے۔ بالآخر یہی طے پایا کہ علی کو فی الفور اپنے دونوں ساتھیوں شاہ زمان اور اریبہ کی مدد کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔

علی اس مہم کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ وہ رات اس نے آرام میں گزاری اور اگلا سارا دن اس نے منصوبہ بندی تیار کی۔ اس کے بعد وہ بھی مچھیرے کے بھیس میں بمبئی کی بڑی مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان کے دو جاسوس عبدالرحمان اور شاکر حسین اس کی مذکورہ جزیرے تک راہنمائی کے لیے موجود تھے۔ یہ دونوں وہی جاسوس تھے جو اس سے پہلے شاہ زمان اور اریبہ کی بھی اس سلسلے میں مدد کر چکے تھے۔

☆☆☆

سدھا اپنی داستان ..... سنا رہی تھی اور شوکت حسین شوکی ..... بڑے غور سے سامع بنا اس کی جیون کتھا سن رہا تھا۔ ادھر سدھا بھی جیسے کہیں دور ماضی کے خواب و خیال کی فسوں گری میں مستغرق شوکی کو سنائے جا رہی تھی۔

''منڈل سجنے کی تاریخ ابھی دور تھی۔ تاہم بات پکی ہونے کا مطلب سگائی (منگنی) ہی ہوتا تھا۔ میرے ہونے والے پتی کا نام موہن داس تھا۔ وہ شانتی نگر کے سیٹھ کروڑی داس کا بیٹا تھا۔ جب ولی محمد کو یہ پتا چلا تو وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے ایک دن مجھ سے ملاقات کی اور مجھ سے شکوے شکایت کرنے لگا، بے وفائی کا بھی طعنہ دینے لگا لیکن میں خاموشی سے اس کی لعن طعن کو سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔ مجھے ہنستے مسکراتے دیکھ کر اسے اور بھی غصہ آ گیا۔ بولا۔

''بہت خوش ہے نا تو..... کہ اس سالے موہن داس سے تیری سگائی (منگنی) طے ہو گئی ہے، ہیں نا.....؟ میرے ساتھ تو نے کیوں پریم ناٹک کیا تھا؟'' وہ چپ ہو گیا۔

''میں محبت بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ شرمیلا اور چپ چپ رہنے والا ولی محمد کس قدر دلیر ہو گیا تھا۔ موہن داس کے لیے اس کے دل میں رقابت کی آگ کو سلگتے محسوس کر کے میں ہنس دی لیکن من ہی من میں مجھے ایک فخر کا احساس ہو رہا تھا کہ ولی مجھے اس قدر چاہتا تھا کہ میری چاہت نے اسے دلیر بنا ڈالا تھا۔

''اس لیے کہ مجھے پتا ہے۔''

''کیا پتا ہے؟''

''یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔'' یہ کہہ کر میں ہنستی کھلکھلاتی بھاگ گئی۔ وہ مجھے کھڑا حیران پریشان سا دیکھتا رہ گیا۔

''لیکن سچی بات یہی تھی کہ جو میں جانتی تھی، وہ ولی نہیں جانتا تھا۔ وہ اندر سے دکھی ہو گیا تھا۔

''ولی کو یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ سیٹھ کروڑی داس کا جواں سال بیٹا موہن داس خوش شکل بھی تھا۔ ولی بھی خوبروئی میں کسی سے کم نہ تھا اور تعلیم یافتہ بھی تھا۔ حالانکہ میرے باپو نے ان دونوں باپ بیٹوں، سیٹھ کروڑی داس اور موہن داس سے میری یہ پراسرار حقیقت بھی نہیں چھپائی تھی کہ میں انسان نہیں بلکہ ایک سنپنی (سانپ) ہوں تو وہ دونوں باپ بیٹا خوب ہنسے تھے، وہ لوگ یہ قول ان کے میرے باپو کی طرح کچے عقیدے کے نہیں تھے۔ یوں دیوالی میں منڈل سجانے کا پروگرام پکا کیے ہوئے تھے۔

''ولی میں ایک خوبی تھی، وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے آ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ موہن داس کو پہلے سے ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ذہین تو نہ تھا، کیونکہ اسکول میں ہمیشہ اس کے نمبر ولی سے کم ہی رہے لیکن خوب صورت بہت تھا اور شاید اسی لیے ولی کو اس سے جلن بھی ہوتی تھی۔ مذہبی اختلافات کے باعث ولی جانتا تھا کہ وہ مجھے کبھی نہیں پا سکتا۔ اسی لیے اس نے مجھ سے دور بھی ہونے کی کوشش کی مگر اس کا من میرے لیے بے چین ہی رہتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ موہن داس اس کے پاس آیا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ ولی کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

''جانے کیا بات ہے یار! سدھا کماری کے ساتھ منگنی کے بعد سے مجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آ رہی ہے۔ بڑے عجیب اور ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں اور پھر نیند اچٹ جاتی ہے۔''

''طبیعت کچھ خراب ہو گی تمہاری۔'' ولی نے بے رخی سے جواب دیا۔

''نہیں یار! طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے، مگر خواب .....'' پھر وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ''یار! مجھے لگتا ہے کہ میں زندہ نہیں بچوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' ولی پہلی بار اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں، یار ولی!'' وہ بولا۔ ''بات یہ ہے کہ میں کئی بار خواب میں دیکھ چکا ہوں کہ میں جلتی ہوئی چتا پر لیٹا ہوا ہوں اور سدھا کہہ رہی ہے، تم..... میرے اور .....اور..... ولی کے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

''پھر.....؟''

''پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے، پہلے تو میں اسے وہم ہی سمجھتا رہا، مگر رات جب وہی خواب پھر دیکھا تو تشویش ہوئی اور تم سے یہ بات کہہ ڈالی۔'' پھر کچھ توقف کے بعد وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہارے اور سدھا کماری کے بیچ ایسا کچھ ہے؟''

''کیا ایسا کچھ؟'' ولی اس سے نظریں چرانے لگا۔

''یہی کہ..... پریم؟''

''ارے چل یار! تیرا دماغ چل گیا ہے۔'' ولی نے بات آئی گئی کرنا چاہی۔

''مجھے تو اس میں دیوتاؤں کا کوئی بھید لگتا ہے۔''

''دیوتاؤں کا بھید!'' ولی ہنسا اور آگے بولا۔ ''موہن داس! تم بھی نرے بدھو ہو۔ خواب کی بات پر اتنا ڈر گئے۔

ارے شادی سے تو نہیں ڈر گئے؟''

''نہیں یار! مذاق مت کرو اور سنجیدگی سے میری بات کا جواب دو۔''

''تو سن لو۔'' بالآخر ولی نے کہا۔ ''تمہارے دیوتاؤں کا بھید وہی جانیں۔ میں ایسے واہموں پر اپنا دماغ نہیں خراب کیا کرتا بلکہ میرے نزدیک تو تم بڑے خوش قسمت ہو جو سدھا کماری جیسی لڑکی تمہاری پتنی بننے والی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ولی نے جیسے بات ہی ختم کردی۔

''اس کے دو روز بعد ہی موہن داس کو سانپ نے ڈس لیا۔ اسے بچانے کی کوشش کی گئی مگر وہ جانبر نہ ہوسکا۔ ولی کے والد محمد اختر بھی بدقسمتی سے گاؤں میں موجود نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ ولی میرے پاس بھاگم بھاگ چلا آئے گا۔ مگر وہ نہ آیا تو میں ڈری کہ کہیں وہ مجھ سے خوف زدہ تو نہیں ہوگیا لیکن پھر مجھ سے ملے بغیر اس سے بھی نہ رہا گیا۔ موہن کی چتا کے اگلے روز وہ ملنے آیا اور شاکی شاکی سا نظر آرہا تھا۔ حالانکہ اس کا ابتدا سے ہی دعویٰ تھا کہ وہ ایسی باتوں پر بالکل بھی یقین نہیں رکھتا میں بھی خاموش رہی اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

''تمہیں افسوس نہیں ہوا؟'' اس نے میری جانب... بہ غور تکتے ہوئے پوچھا۔

''کس بات کا؟'' میں جیسے انجان بن گئی۔

''موہن داس کے مرنے کا۔''

''اسے تو مرنا ہی تھا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا، حالانکہ جو میں تھی، اس کے لیے مجھے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ لیکن اب میں مجبور تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ولی کا حشر بھی ویسا ہی ہو۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے لیکن ان تاعمر کوں، جوتشیوں اور پنڈتوں کی یہ باتیں، جنہیں خرافات سمجھا جاتا رہا تھا۔ غلط نہیں تھیں کہ میں واقعی ایک ناگن نسل سے تعلق رکھتی ہوں اور مزید یہ کہ اگر کوئی انسان مجھ سے شادی کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسی طرح ناگ پنچمی کی نسل کے کسی زہریلے سانپ سے ڈسا جائے گا لیکن میں ولی کو خود سے دور ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلی ہوئی بات پر وہ بری طرح چونک کر بولا۔

''میرا مطلب یہی تھا کہ..... جو لوگ اس طرح کی توہمات والی باتوں پر وشواس کریں گے تو کسی بھی اتفاقی حادثے کی موت کو یہی نام دیں گے۔''

وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''سدھا! تم کون ہو؟ کیا..... کیا..... تم واقعی سانپ ہو؟''

''میں تمہیں کیا نظر آتی ہوں؟''

''انسان..... لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ میری طرف سے تذبذب کا شکار ہوگیا ہے۔

''ٹھیک ہے اگر تم بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو تو یہی سہی، نہ آیا کرو مجھ سے ملنے۔''

میں یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھتا رہ گیا لیکن حقیقت یہی تھی کہ ولی مجھے بہت شدت کے ساتھ چاہنے لگا تھا اور اس کی محبت میں خود میری اپنی یہی حالت تھی۔ ہم دونوں ہی شاید ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ خود میں چند دنوں سے اپنے اندر کچھ پراسرار تبدیلیاں بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

ایک دن بستی میں بڑی طوفانی بارش ہوئی۔ ولی کے بابا ڈیوٹی کے سلسلے میں جھانسی گئے ہوئے تھے۔ ولی کے گھر کی حالت کمزور ہونے کے سبب اس طوفانی بارش سے ان کے کمرے کی ایک چھت گر گئی۔ شکر تھا وہ خالی تھا۔ میرے باپو کا چونکہ محمد اختر سے دوستانہ ایسا تھا کہ انہیں اپنے عزیز ترین دوست کے گھر والوں کی حالت کا پتا۔ چلا تو وہ بارش میں برساتی لیے بھاگم بھاگ ان کے گھر جا پہنچے اور دونوں ماں بیٹے کو اپنے ہاں لے آئے۔

''اس سے اگلے روز بستی میں ناگ پنچمی کا میلا تھا۔ جس کی تیاریاں ایک ہفتے پہلے ہی خوب زور وشور سے جاری تھیں۔ اس رات ولی اور میں نے آپس میں خوب جی بھر کر باتیں کیں۔ اس کے بعد اپنے اپنے کمروں میں سو گئے۔

''یہ اسی رات کا ذکر تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوا کیا تھا مگر اگلے دن جب ولی نے مجھے بتایا تو خود میرے اپنے بھی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اب تو اس میں کوئی شبہ ہی نہ رہ گیا تھا کہ میری اصل حقیقت کیا تھی۔ میں بہت روئی بھی، دکھ تھا اس بات کا مجھے کہ ولی اور میرے راستے جدا تھے۔ چاہنے کے باوجود ہم کبھی ایک نہیں ہوسکتے تھے۔

ولی نے مجھے بتایا کہ اگلے روز جب وہ صبح سویرے جاگا تو میں اپنے کمرے سے ہی غائب تھی۔ وہ میری تلاش میں گھر سے باہر آیا۔ ناگ پنچمی کے سبب صبح ہی سے ہر طرف بین کی آوازیں گونجنے لگی تھیں اور گلی کوچوں میں جھولیاں اور سانپ کی پٹاریاں لٹکائے ہوئے گیروے کپڑوں والے سپیرے ہر طرف بھیک مانگتے پھر رہے تھے۔

''ہندو مرد، عورتیں اور بچے گھروں کے سامنے انہیں

رکوا کر بین سنتے اپنے ناگ دیوتا کے درشن کرتے اور انہیں دان دیتے۔ گھر گھر پکوان تلے جارہے تھے اور خوشیاں منائی جارہی تھیں مگر اسے عجیب بات یہ لگی کہ ہمارے گھر کے سامنے دروازے پر ہر سپیرا جھک جاتا اور کوشش اور ترغیب کے باوجود وہاں ٹھہرنے یا بین بجانے پر آمادہ نہ ہوتا۔

''ولی ہمارے گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھے بیٹھے گھبرا سا گیا۔ اندر صحن میں ایک بستر پر میری اور ولی کی ماں بیٹھی سبزی ترکاری کاٹ رہی تھیں۔

''ولی سہ پہر کے بعد سیر کے لیے نکل گیا۔ شہر سے باہر بڑے تالاب کے کنارے ناگ پنچمی کا میلا لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں جگہ جگہ سپیروں کو گھیرے ہوئے تھیں۔ دکانیں سجی ہوئی تھیں، جھولے اور ہنڈولے گھوم رہے تھے اور ہر جانب خوشی اور مسرت کا دور دورہ تھا۔ ایک جگہ بہت بڑا ہجوم دیکھ کر وہ بھی رک گیا۔ دریافت کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ کوئی عجیب قسم کا بڑا سانا گ ہے جسے لوگ تعجب سے دیکھ رہے ہیں۔ ولی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو بوڑھے سپیرے کی اچانک ولی پر نگاہ پڑی۔ جلدی سے پٹاری بند کرنے لگا جس میں سے ایک بڑے پھن کا سیاہ ناگ جھانک رہا تھا۔ سانپ نے پٹاری کے اندر جانے کے بجائے سر اٹھایا اور چوڑا پھن پھیلا کر لہرانے لگا۔

''بوڑھے نے پٹاری کا ڈھکنا اس کے سر پر رکھ کر پوری طاقت سے دبایا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا سارا وزن اس ڈھکنے پر ڈال دیا۔ پھن کے ساتھ اس پر لدے ہوئے سپیرے کو جھولتا ہوا دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے اور بھگدڑ مچ گئی۔

''ناگ میں بلا کی طاقت تھی۔ آخر اس نے سپیرے کو خوفناک پھنکار ماری۔ وہ الگ ہوا اور گر پڑا، ناگ بپھرا ہوا ولی کی جانب لپکا۔ وہ بھاگا مگر مڑ کر دیکھا تو سانپ اس کا بدستور تعاقب کر رہا تھا۔ اسی دوران میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر وہ گر پڑا۔

''سانپ اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور ڈسنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر ایک تانگے پر بیٹھے شخص پر پڑی۔ وہ کوئی اور نہیں میرا باپو سیٹھ مرلی لال تھا۔ ان کے ہمراہ ولی کو میں بھی زرد رنگ کا گھونگٹ نکالے بیٹھی نظر آئی۔ یوں بھی میں جب بھی باہر نکلتی اسی طرح پردہ کیے رہتی۔ ولی نے مجھے پکارا۔

''سدھا.....!''

''ولی کے مطابق اس نے چلتے تانگے سے مجھے کودتے دیکھا لیکن جب میں نے اپنا گھونگٹ سرکایا تو ولی کو اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ بتاتا ہے کہ اسے صرف اتنا یاد ہے کہ اس نے سانپ کو بھاگتے ہوئے دیکھا جبکہ میرے حسن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگوں کے ہجوم نے تانگے کو گھیر رکھا تھا۔ پھر مجھے ہوش آیا تو یہ دیکھا کہ سارے سپیرے مجھے گھیرے ہوئے جھوم جھوم کر بین بجا رہے ہیں اور خوشیاں منا رہے ہیں اور میں ناگن کی طرح لہرا لہرا کر رقص کر رہی ہوں۔ تعجب تھا کہ کہ ولی نے بتایا اس کی جانب کسی کا دھیان تک نہ گیا۔

''ولی اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ اتنے ہجوم میں اسے میرا اس طرح رقص کرنا ناگوار گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر جھنجوڑا مگر اس کے کہنے کے مطابق میں تو گویا اپنے ہوش ہی میں نہ تھی۔ جبکہ ولی کی میرے باپو مرلی لال اور چاچی یعنی میری ماتا پر نگاہ پڑی تو وہ رو رہے تھے۔ ولی کو غصہ آگیا اور اس نے مجھے گھسیٹ کر تانگے میں ڈال دیا۔ بوڑھے سپیرے کے اشارے پر سپیروں نے بین بند کر دی اور تانگا روانہ ہو گیا۔

''گھر پہنچ کر مجھے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اب میں بے ہوش تھی۔ ولی نے بتایا کہ میرے پتا نے روتے ہوئے ولی سے معذرت کی۔

''بیٹا! ہمیں معاف کرنا۔ صرف اسی لیے ہم تجھے روکنا نہیں چاہتے تھے۔ ناگ پنچمی کی شام سدھا پر اسی طرح کا دورہ پڑتا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے مگر وہ خود کو اپنے کمرے میں بند کر کے اسی طرح ناچتی ہے اور نہ جانے کہاں سے بین کی آواز بھی آرہی ہوتی ہے۔ ہم یہی بات تجھ سے چھپانا چاہتے تھے، مگر آج بیچ چوراہے پر ہنڈیا پھوٹ گئی۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ پھر تجھے ڈھونڈتی رہی پھر ضد کر کے ہمیں میلے میں لے آئی، صاف دکھتا تھا کہ وہ اپنے حواس اور ہوش میں نہیں تھی۔ پھر یہاں بھی اسے یہی دورہ پڑ گیا۔''

''مگر چاچا! سدھا نہ پہنچتی تو سانپ تو مجھے ڈس ہی چکا ہوتا۔'' ولی نے باپو کو بتایا۔

''کیسا سانپ؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ شاید ہنگامے میں انہوں نے سانپ کو نہ دیکھا تھا پھر میں نے تفصیل بتائی تو وہ اور حیران ہوئے۔ ''تو وہ احمد آباد سے یہاں بھی پہنچ گیا۔'' چاچی یعنی میری ماتا کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''کون پہنچ گیا؟'' ولی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری

ماتا سے پوچھا۔

''کک..... کوئی بھی نہیں۔ وہ..... وہ تانگے والا ہے نا۔'' ماتا نے بات بنانا چاہی اور ولی نے بھی زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہ سمجھا اور مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر میرے ماتا سے بولا۔

''سدھا بے ہوش پڑی ہے، میں کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟''

''نہیں بیٹا! اس پر کوئی دوا اثر نہیں کرے گی۔ وہ صبح تک خود ہی ہوش میں آجائے گی۔ اب تم بھی اپنے کمرے میں جاؤ اور بھوجن کر کے آرام کرو۔''

''بھوجن کی ضرورت نہیں ہے چاچا! مجھے بھوک نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ولی دوسرے کمرے میں آگیا۔

وہ لیٹا ہوا میری اس پراسرار بیماری اور شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ مجھے یہ سب بتانے کے لیے بے قرار تھا کہ معاملہ وہی ہے جسے اب تک وہم اور غیر حقیقی سمجھا جاتا رہا ہے پھر اسے نیند آگئی۔ آدھی رات کے لگ بھگ بین کی ہلکی سی آواز سن کر ولی محمد کی آنکھ کھل گئی۔

☆☆☆

اندھیری رات اپنے جوبن پر تھی۔ بمبئی کے دور ہوتے ساحل کی روشنیاں اب معدوم ہونے لگی تھیں۔

یہ مسافر بردار ''وائٹ فالکن'' تقریباً ایک سو بیس فٹ لمبا، تیز رفتار اور مضبوط جہاز تھا۔ بحری قزاقوں سے مڈبھیڑ کے خدشے کی بنا پر اس میں دو توپیں بھی نصب تھیں۔ ان کے گولے ''فقل زنجیر'' کو جھٹکا دینے سے دشمن پر داغے جاتے تھے۔

بمبئی کے ساحل سے روانگی کے بعد اس کی رفتار پانچ جہازی میل تھی۔ اب راتوں رات بحیرۂ عرب سے نکل کر اس نے بحر ہند سے مغربی افریقا کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر شروع کیا تو اس کا دوسرا بوائلر کھول دیا گیا۔

اب اس کی رفتار پندرہ جہازی میل کر دی گئی تھی۔ تیسرا بوائلر ضرورت کے وقت ہی دہکایا جاتا تھا۔

بمبئی سے لندن کا بحری سفر تقریباً سات ہزار سے زائد ناٹیکل میل پر محیط تھا۔ اس حساب سے یہ سفر پچیس سے تیس دنوں تک طے ہوتا۔

ایک آبی گزرگاہ نہر سوئز سے بھی گزرتی تھی۔ یہ بمبئی سے انگلستان تک کا شارٹ کٹ تھا۔ اس میں ایندھن اور کرایہ کم لگتا تھا لیکن ابھی یہ گزرگاہ کارآمد نہیں تھی۔ دوسرے یہاں کے صومالیائی اور پرتگالی ساحلوں سے بحری ڈاکوؤں کے حملے کا خطرہ بھی زیادہ ہوتا تھا۔

جہاز کی رفتار رات میں تیز ہی رکھی جاتی تھی۔ جوار بھاٹے اور طوفانوں کے خطرات بھی رات میں ہی زیادہ ہوتے۔ ایسی صورت میں چاند اپنے طیاتی پر ہوتا تھا اور اس کی ''مد''..... اور نقیض جزر عروج پر ہوتی تھی۔

بوائلروں کے جہنمی گوشے میں موجود، پسینے میں شرابور نیم برہنہ جہازی اب تیسرا بوائلر بھڑکانے کی تیاری میں تھے۔ آدھے ٹن کوئلے کو راکھ بنانے کے عمل سے گزارا جا رہا تھا۔ جہاز کی رفتار کو بتدریج بڑھانے اور ہموار رکھنے کے لیے بادبانوں کے مثلث کھول دیے گئے تھے۔

اوپر..... تاروں بھرے آسمان کے نیچے..... بیکراں پھیلے سمندر کے ہلکورے لیتے سینے پر ''وائٹ فالکن'' کی دو چمنیوں سے دھوئیں کی سیاہ لکیریں موٹی ہوتی آسمان کی طرف اٹھتی عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ چمنیوں کے دوزخی دہانوں سے اٹھتے گاڑھے اور کثیف دھوئیں کے بطن میں چنگاریاں بھی بھڑکتی نظر آنے لگی تھیں۔

وائٹ فالکن نامی یہ بحری جہاز اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بمبئی (ہندوستان) سے انگلستان (لندن) کی جانب روانہ ہونے والے اس بحری جہاز میں کتنی خطرناک بساط بچھ چکی تھی۔

رات اپنے تیسرے پہر میں قدم رکھ چکی تھی۔ عملے کے ارکان اپنی ڈیوٹیوں پر تعینات تھے۔ مسافر اپنے اپنے کیبنوں میں گہری نیند سو رہے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔

ایک کیبن میں دو جوان مرد عورت پورٹ ہول کے قریب لگے، آمنے سامنے کے دو بنک بیڈز پر پاؤں جھلائے بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے بیچ میں میز نصب تھی۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی سی پتلی کن مور..... سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

یہ دونوں جنرل مائیکل شاک کے بھیجے ہوئے اور شیورائے بھولکر کے جاسوس کیرتن اور شوبھا تھے۔ کیرتن دبلا پتلا اور قدرے چھوٹے قد کا ایک بے کشش سا آدمی تھا مگر بلا کا شاطر اور چالاک تھا۔ اپنے مقصد کی برآری کے لیے وہ انسانی جان سے بھی کھیل جانے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

اس کی ساتھی شوبھا بھی بہ ظاہر ایک نرم و نازک مگر قدرے شباب انگیز جسم کی مالک اور پرکشش عورت تھی۔ اس نے اپنے بھرے بھرے بدن پر بنگالی طرز کی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ رنگت سانولی مگر شراب کی سی تیز تمتماہٹ دیتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ بھی اپنے ساتھی کیرتن سے کم خطرناک

اور چالاک نہ تھی۔

دونوں میاں بیوی کے روپ میں بمبئی سے لندن تک سفر کررہے تھے۔

''تمہیں رات سے ہی چیتن شربا (فرستادہ) کے قریب ہونے کی کوشش شروع کردینی چاہیے تھی۔'' کیرتن نے سگریٹ کا ایک کش لے کر اس سے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

''دھیرج کیرتن! ابھی بہت سفر پڑا ہے۔'' شوبھا نے بھی ہولے سے جواب میں کہا۔ ''ایک دم یوں کسی اجنبی کے گلے کا ہار بن جانا اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت کا، دوسرے کو خوامخواہ ہی شبہے میں ڈال دیتا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک کش لیا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔'' کیرتن معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ ''کام ہوجائے تو انگلستان کی سیر بھی خوب ٹھاٹھ سے کریں گے، ناکامی میں کیا خاک مزہ آئے گا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ذرا دھیرج ہوکر چلو۔ کام پیچل کرنا ہے تو چال بھی دھیمی رکھو۔'' شوبھا نے کہا۔ کیرتن تنبیہی انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگا۔

پھر سگریٹ کو پتھر کی ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ''میں ذرا یونہی ایک چکر عرشے کا لگا کر آتا ہوں۔ تم بھی آنا چاہو تو آجاؤ۔''

''نہیں، میں تو ابھی سونا چاہتی ہوں۔'' شوبھا جماہی لیتے ہوئے تو بہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ساڑی میں اس کا بھرا بھرا کسا ہوا بدن کمان کی طرح کھنچ گیا تھا۔ کیرتن سر دھنتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہاں ایک، دوسرے کیبن میں رابرٹ اور سوجنا لیٹے ہوئے تھے۔ رابرٹ تو پڑا خراٹے لے رہا تھا مگر..... سوجنا کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔

وہ پہلے تو بے چینی سے بیڈ پر کروٹیں بدلتی رہی اس کے بعد اس نے شیشے کی گول بند کھڑکی (پورٹ ہول) سے باہر جھانکا۔ اسے دور تک سمندری اندھیاروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے دل میں جانے کیوں اس پُرہیبت منظر کو دیکھ کر ایک ہول سا اٹھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ابھی کوئی اسے اٹھا کر سمندری لہروں میں پھینک دے گا۔

وہ اپنے بنک بیڈ پر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سامنے کے بیڈ پر رابرٹ کو بے سدھ سویا ہوا، ایک نگاہ دیکھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ وہ رابرٹ کو جگادے تاکہ وہ اس سے باتیں کرکے اپنا دل بہلا سکے۔ یہ سوچ کر اس نے دو تین بار اسے جگانے کی کوشش بھی کی لیکن رابرٹ تو ایسے گدھے گھوڑے بیچ کر سویا تھا کہ جاگنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

سوجنا نے دروازے کی طرف دیکھا اور اس طرف بڑھی۔ دروازہ دھیرے سے کھولا تو سبک خرام سمندری مرطوب ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ ایک ہی جھونکے نے اس کے اندر کی نامعلوم بے چینیوں اور کثافتوں کو جیسے دور کردیا۔

وہ باہر آگئی اور سیدھا عرشے کی طرف رخ کیا۔ وہاں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس منظر کا اپنا ایک سحر تھا۔ وہ ریلنگ کے پاس آکر یک ٹک چاند کو تکتی رہ گئی۔

''رابرٹ کی محبت اور اس کی سنگت کے باوجود مجھے ایک لمحے کے لیے بھی دلی سکون نصیب نہیں ہوا ہے۔ کیوں.....؟''

وہ جیسے آپوں آپ..... چاند سے باتیں کرنے لگی۔

''محبت تو ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ جو اسے پالے تو ساری دنیا کے غم دور ہوجاتے ہیں۔ پھر کیوں.....؟ پھر کیوں.....؟ میرے اندر خوشیوں کے بجائے بجز غم متلاطم رہنے لگا ہے۔''

''من سے باتیں کرنے والا منش، دل کی گہرائیوں تک سچا ہوتا ہے۔''

اچانک ایک مردانہ اور اجنبی سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور سوجنا چونک کر پیچھے مڑی۔ ایک جوان اور خوبرو سانولی رنگت مگر روشن اور بڑی آنکھوں والا لڑکا اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

یہ نوجوان شفیق تھا۔ کپڑے کے بنگالی سوداگر متبول مٹھون کا جواں سال اور خوبرو بیٹا۔

ایسے ہی وقت میں جب سوجنا اپنے کیبن سے نکل کر عرشے کی ریلنگ کے پاس تنہا آن کھڑی ہوئی تھی، اتفاقاً شفیق بھی، قریب ایک مستول کے پاس کھڑا سمندر کا نظارہ کرنے میں معروف تھا، پھر جب اس نے سوجنا کو اس طرف بڑھتے دیکھا تو چونک پڑا۔ وہ اسے پہچان چکا تھا، اگرچہ یہ ''پہچان'' صرف چند گھنٹوں پہلے ڈائننگ ہال میں ہی خاموش اور یک طرفہ نگاہ پر ہوئی تھی لیکن اسی ایک نگاہ نے شفیق کو اس کا گرویدہ بناڈالا تھا۔

وہ بالکل خاموشی سے اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا اور اسے خود سے بڑے غور سے باتیں کرتے سنتا رہا۔

''آآ..... آپ..... کک..... کون؟'' سوجنا کے تھرتھراتے لبوں سے گویا غیر ارادتاً برآمد ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک طرف کو راستہ پاکر آگے بڑھی تو شفیق نے

Digitized by Google

اسے پکارا۔

''ٹھہر جاؤ..... پلیز!''

وہ رک گئی۔ سمندری ہوائیں اس کے دراز اور بکھرے بکھرے سے گیسوؤں کو لہرا رہی تھیں۔ شفیق بولا۔

''میں بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر ہوں۔ اکیلے پن سے گھبرا کر ادھر نکل آیا تو آپ کو خود سے باتیں کرتے پا کر مبہوت سا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے برسوں بعد کوئی اچھے اور سچے شبد بول رہا ہو۔ کیا آپ کو کوئی دکھ ہے؟'' شفیق کہتا چلا گیا۔ اس کا ایک ایک لفظ سوجنا کے دل میں کھبا جا رہا تھا۔ چوری پکڑے جانے اور ''اندر'' کا حال ظاہر ہونے کے خیال نے اسے بوکھلا سا دیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ شفیق نے جملوں نے اس کے دل کا کوئی تارِ غم ہلا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔

''ارے.....! آ..... آپ تو رو پڑیں.....'' شفیق گھبرا سا گیا پھر اس سے پہلے کہ مزید اس سے کچھ کہتا، سوجنا ہلکی سی سسکاری خارج کرتی ہوئی اپنے کیبن کی جانب تیز تیز قدموں سے بڑھتی چلی گئی۔

اندھیری اور بھیدوں بھری رات کے بعد..... وائٹ فالکن کی اگلی صبح بڑی دل فریب تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ آسمان نیلا اور صاف تھا۔ کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے راج ہنسوں کی طرح فضائے بسیط میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دور جیسے سمندر کے آخری کنارے سے سورج کا اپنا نارنجی ارتھ دھیرے دھیرے اٹھ رہا تھا۔

کچھ مسافر جہاز کے عرشے پر موجود ریلنگ سے لگے کھڑے حدِ نگاہ پھیلے سمندر کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کچھ ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔

چیتن شرما صبح سویرے ہی ناشتا کر کے دوبارہ اپنے کیبن میں آ بیٹھا تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ وہ دیگر مسافروں کے درمیان گھل مل نہیں سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے کاندھوں پر کیسی حساس اور نازک ذمے داری تھی۔

اس خط کو اس نے ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کے غسل کے لیے بھی جاتا تو وہ خط اس کی جیب میں ہوتا۔

نہا کر کپڑے بدلتا تو پرانے کپڑوں سے وہ خط باتھ روم میں ہی نئے کپڑوں کی جیب میں منتقل ہو جاتا تھا۔

تنہائی میں اپنا دل بہلانے کے لیے وہ چند کتابیں ساتھ لے آیا تھا۔ ان میں سے ایک کے مطالعے میں وہ اس وقت مصروف تھا۔ ایک دو گھنٹے بعد اسے چائے کی طلب ہوئی۔

اس نے پہلے تو سوچا کہ عملے کے کسی اسٹیوارڈ وغیرہ سے چائے یا کافی کا ایک پیالہ منگوا لے، لیکن ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے وہ خود بھی تھک اور اکتا سا گیا تھا، لہٰذا کتاب کو بک مارک لگا کے ایک طرف رکھا اور اپنے کیبن سے باہر آیا تو چمکیلی سی خوش گوار دھوپ میں جہاز اسے چمکتا نظر آیا۔

اس نے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔ وہاں اب چند ہی لوگ لمبی لمبی بینچوں پر بیٹھے نظر آئے۔ ان کے درمیان میزیں نصب تھیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی بینچ پر جا بیٹھا۔ چائے آئی تو وہ اس کے گھونٹ بھرنے لگا۔

اچانک اس کی سماعتوں سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ ایک عورت اپنے ساتھی مرد سے شکایت کر رہی تھی۔

''کیرتن! تم نے مجھے بہت نراش کیا ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کر میں تمہارے ساتھ چلی آئی۔''

''شوبھا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ اچانک کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟'' یہ مرد کی آواز تھی۔

چیتن شرما نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور..... ان کی طرف ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں جوان مرد عورت تھے۔ اسے مرد میں تو ایسی کوئی کشش نظر نہ آئی البتہ عورت اسے خاصی پُرکشش اور سبک اندام بدن کی مالک لگی۔ تاہم اس نے نظریں پھیر لیں۔

جلد ہی ان دونوں کی بحث طول پکڑنے لگی اور وہ دونوں مرد عورت ایک دوسرے سے غصے اور طیش میں بکتے جھکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چیتن جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگا، وہ دونوں اسی کے قریب سے بکتے جھکتے گزرنے لگے تو نہ جانے مرد کو کیا ہوا اس نے عورت کے تھپڑ رسید کر دیا۔

عورت جس نے اپنے بھرے بھرے بدن پر خوب کس کر ساڑی باندھ رکھی تھی، تھپڑ لگتے ہی ایک نازک اندام سی چیخ کے ساتھ چیتن شرما کے اوپر آ رہی۔ اس طرح کہ اس نے اپنا آپ..... بمع حسن و شباب کے چیتن شرما کی گود پر وار دیا۔ چیتن شرما جوان نہ سہی مگر..... بہرحال اتنا بڈھا بھی نہ تھا۔

لہٰذا..... چیتن شرما پہلے تو بری طرح بوکھلا گیا، پھر جوان خوبصورت اور ساڑی پوش عورت کے نرم و گداز لمس نے اسے لمحہ بھر کو نہیں بلکہ کئی ثانیوں کے لیے بے خود سا کر دیا۔ یوں عورت نے بھی خود کو اس سے الگ کرنے اور ''سنبھلنے'' میں دانستہ کچھ ''تساہل'' سے کام لیا۔ یہی نہیں،

اس کا مرد ساتھی بھی بغیر پیچھے دیکھے غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی عورت اس کا تھپڑ لگنے سے کسی غیر مرد کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح جا گری تھی۔

''کس..... سوری..... مترجی!'' وہ خوبصورت سانولی مگر پرکشش عورت جو بلاشبہ شوبھا ہی تھی، معذرتی انداز میں اس سے یہ کہتی ہوئی اس کی گود سے ''چاروناچار'' اٹھنے کی سعی کرنے لگی، ساتھ ہی وہ روئے بھی جارہی تھی۔

تھپڑ مارنے والا عورت کا ساتھی کیرتن تھا۔ دونوں نے ایک چال چلی تھی۔ ایک ڈرامے کی صورت میں اب چیتن شرما پر شوبھا کی صورت میں جال پھینک دیا گیا تھا۔

''کک..... کوئی بات نہیں۔'' چیتن نے جلدی سے اور قدرے بدک کر کہا۔ ساتھ ہی اس نے کن انکھیوں سے اس کے ساتھی مرد کو غصے اور بے پروائی کے عالم میں ڈائننگ ہال سے نکلتے دیکھا تو اس کی ہمت کچھ سوا ہوئی۔

شوبھا روتی سسکتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ چیتن شرما نے جلد ہی اپنے حواسوں پر قابو پایا اور اس سے بولا۔

''آ..... آپ، پلیز! روئیے مت..... مجھے دکھ ہوا..... عورت پر اس طرح ہاتھ اٹھانے والے پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے، مگر.....''

''میرا تو جیون ہی جنم جلا ہے مترجی!'' شوبھا اپنی ساڑی کے پلو سے مگرمچھ کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ چیتن کو اس کا ''مترجی'' کہنا نہایت بھلا لگا۔ بولا۔

''ایسا مت کہیے، آپ تو بہت خوبصورت ہیں، یہ آپ کا ساتھی ہی برا ہے۔ نہ شکل نہ عقل، پہلو میں حور لیے گھوم رہا ہے اور نرا جاہل ہے۔'' کہتے ہوئے چیتن نے اسے اپنا رومال نکال کر تھما دیا جسے شوبھا نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا اور اسی سے اپنا چہرہ پونچھنے لگی۔

اس نے شوبھا کو پانی کا گلاس بھی بھر کر دیا۔

چیتن نے شوبھا کو چائے بھی پلائی اور اس کے حواس درست ہوئے تو شوبھا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا خیال تھا کہ اس کا شکار چیتن شرما اسے اپنے کیبن میں چلنے کی دعوت دے گا مگر ایسا نہ ہوا تو اسے خود ہی مکاری دکھانا پڑی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ اس کا پتی ہے اور کسی بات پر اچانک دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

''میرا تو اس مورکھ کے پاس جانے کو اب دل ہی نہیں کر رہا۔ مجبوری بھی ہے لیکن نہیں، میں اب لندن تک اسی ڈائننگ ہال میں سفر کروں گی لیکن اس پاگل وحشی کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔''

چیتن شرما سوچ میں پڑ گیا۔ شوبھا ترچھی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی کالی آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔ اس نے دانستہ ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر ہولے ہولے سسکنا شروع کر دیا اور بالکل غیر محسوس طریقے سے اپنی کسی ہوئی ساڑی کا ایک باریک مہین پلو اپنے بھرے بھرے سبک شانوں سے ڈھلکا دیا۔ رونے کی اداکاری کے دوران شوبھا نے خود کو تھوڑا جھکا بھی دیا۔

''نظارہ'' واضح ہوا تو چیتن شرما بھی چکرا سا گیا۔ وہ اپنے تئیں لاکھ ہوشیار سہی، مگر ایک جوان اور بھرپور ناری کے اس روایتی ہتھیار کے سامنے ڈھیر ہونے لگا۔

یوں دبلے پتلے اور لمبے کھمبے جیسے چیتن شرما نے جو یہ ''جوار بھاٹے'' کا سا نظارہ دیکھا تو اس کی دھنسی دھنسی آنکھوں کے ڈیلے یکدم باہر نکل آئے۔ وہ حلق میں اتری رقیق سی شے کو نگلتے ہوئے اٹھل پتھل سی آواز اور لہجے میں اس سے بولا۔

''آ آ..... آپ بھی کمال کرتی ہیں شوبھا دیوی! بھلا ڈائننگ ہال بھی کوئی رہنے کی جگہ ہوتی ہے۔ میرا کیبن حاضر ہے، لیکن آپ اگر برا نہیں.....''

''نہیں مترجی! آپ کو خوامخواہ زحمت ہوگی۔'' شوبھا نے ہولے سے کہا۔ پلو اس نے ذرا دیر گرا رہنے کے بعد پھر سنبھال لیا تھا۔

''لو بھلا، مجھے کیا زحمت ہوگی۔ آپ مجھے دوست مترجی کہہ رہی ہیں اور.....''

''میں تو آپ کی بہت دھنیواد ہوں۔ آپ کے کیبن میں فرش کی جگہ بھی مل جائے تو بہت ہے میرے لیے۔''

''ہرگز نہیں..... فرش کیوں..... میرا دل..... ہم..... میرا مطلب.....'' اس کی عقل خبط ہونے لگی۔ ''میرا گرم بستر کاہے کو ہے۔ وہاں بیڈ ہیں لیکن..... کہیں آپ کے پتی.....''

''وہ سنگ دل اور بے رحم ہو گیا ہے۔'' شوبھا نے جلدی سے کہا۔ ''اس کا مزاج اب پہلے جیسا نہیں رہا، وہ بدل گیا ہے۔ اسے تو اپنے سوا کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔ بہت پینے بھی لگ گیا ہے۔ اندر جا کر بہت ساری دارو معدے میں اتار کر گھنٹوں پڑا رہے گا۔''

''ہوں.....'' چیتن کے منہ سے نکلا۔

''چلیں، مترجی؟'' شوبھا لوہا ''گرمانے'' کے

بعد اٹھتے ہوئے بولی۔

''اوش.....اوش.....'' چیتن جلدی سے بولا۔

وہ شوبھا کو لیے اپنے کیبن میں آگیا۔ آمنے سامنے دو بنک بیڈ تھے۔ ان پر گرم بستر لگے ہوئے تھے۔ شوبھا نے بڑے غور سے کیبن اور وہاں موجود مختصر سے سامان کا کن انکھیوں سے جائزہ لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ چیتن شرما نے آخر وہ خط کہاں رکھا ہوگا؟ اپنے سامان میں یا اپنے پاس۔

ابھی اسے جواب کا انتظار تھا۔ جلد ہی اس کی گردش کرتی نگاہوں نے شراب کی بوتل تاڑ لی۔ وہ پورٹ ہول کے قریب ایک چوبی کارنس پر دھری پڑی تھی۔

''میں پیتی تو نہیں ہوں، مگر جب بھی من دکھی اور نراش سا ہونے لگتا ہے تو چند گھونٹ چڑھا لیتی ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے چیتن شرما کی طرف مخمور سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی انگلی سے کارنس کی جانب اشارہ کر دیا۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو.....؟''

جیسا کہ مذکور ہوا، چیتن شرما ایک پینتالیس سالہ دبلا پتلا مگر ہوشیار آدمی تھا۔ اس کی بیوی کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے پھر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے جو شوبھا جیسی بھرپور عورت کو یوں اپنے دامن میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرتے دیکھا تو اس کی عقل و خرد کی دنیا گویا رخصت ہونے لگی۔

''اوش.....اوش.....'' کہتے ہوئے اس نے کارنس سے بوتل اٹھالی اور پھر دو جام تیار کرنے لگا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر جام کا گھونٹ بھرنے لگے تو شوبھا نے بڑی چالبازی کے ساتھ بے خودی نگاہوں سے سامنے بیٹھے چیتن کی طرف دیکھا اور اسے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔

دونوں نصف سے زیادہ جام معدے میں منتقل کر چکے تھے۔ شوبھا کی تیز بھانپتی ہوئی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ..... چیتن شراب کی زیادہ مار سہنے کا عادی معلوم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنا نصف پیگ کارنس پر رکھ دیا تو شوبھا دل لبھانے والے انداز میں مسکراتی ہوئی اس سے بولی۔

''مترجی! یہ کیا؟ ابھی تو چڑھنا شروع ہوئی ہے اور آپ.....''

''مم.....میں اتنی ہی پیتا ہوں۔''

''اوں.....نہیں۔ برسوں بعد تو تمہارے جیسا مضبوط اور سچا ساتھی ملا ہے۔ پلیز، میری خاطر.....'' شوبھا کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ رہ نہ سکا، لیکن شوبھا نے اپنی بات ختم کرتے ہی خود ہی اٹھ کر اس کا پیگ اس کے سامنے قدرے جھک کر بڑھا دیا۔ چیتن نے جام تھاما اور شوبھا نے حسب سابق ساڑی کا پلو گرا دیا۔ چیتن کے ایک بار پھر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ شوبھا اسے اسی طرح جھکی جام پلانے لگی۔ یہاں تک کے سارا جام خالی کر دیا اور اپنا ادھورا ہی رہنے دیا، جسے کارنس پر رکھ کر اس نے چیتن کے ساتھ ہلکے پھلکے انداز میں ''اٹھکیلیاں'' شروع کر دیں۔

یہی وہ وقت تھا جب کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شوبھا نے لڑکھڑاتے ہوئے چیتن کو سنبھالا دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ منصوبے کے مطابق سامنے کیرتن عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

چیتن شرما ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ دونوں نے اسے بنک بیڈ پر لٹا کر اس کی تلاشی لی اور ملکۂ برطانیہ کو جاری کردہ وہ خط برآمد کر لیا۔

☆☆☆

راج محل کی فضا ایک بار پھر دگرگوں اور عجیب سی ہونے لگی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے.....ایک بار پھر اس کے در و دیوار ایک زبردست بھونچال کا شکار ہونے والے تھے۔ ان کے پس منظر میں اب خوشیوں اور شادمانیوں کے قہقہوں کی جگہ چھپی ہوئی سازشوں کے کوڑیالے ناگ کلبلانے لگے تھے۔ اب تو ہر پل یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

راجا پرتاب کمار سے اس روز ہونے والی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کے بارے میں رینا نے گارشیا کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے پھر؟'' گارشیا بولی۔

''انہیں شبہ، بلکہ اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ میں اور شوکی.....'' رینا کہتے کہتے دانستہ چپ ہو رہی۔ گارشیا اس کی بات کا مطلب سمجھ کر چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

''کیا تم نے واشگاف الفاظ میں راجا پرتاب کمار سے کہا کہ تم اور شوکی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو؟''

''کیسی بچوں والی باتیں کر رہی ہو تم گارشیا؟'' رینا ایک دم اکتا کر بولی۔ ''ابھی تمہیں سب بتا تو دیا ہے، اتنی سی بات سے بچہ بھی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اسی لیے تو انہوں نے آخر میں مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ.....ہمیں ہمارا جواب مل چکا ہے، لہٰذا ہمیں اب تم سے دوبارہ جواب مانگنے کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے، یہ بات ختم ہوئی لیکن تم نے ذرا یہ بھی سوچا ہے کہ شوکی اور راجا پرتاب کمار میں زمین آسمان کا فرق ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' گارشیا کی بات پر رینا نے اس کی طرف گھورا۔

''صاف بات ہے۔ راجا پرتاب آسمان ہے اور شوکی زمین کی خاک بھی نہیں۔ تم شوکی جیسے ایک معمولی نوکر کے ساتھ خوش رہ سکو گی یا راجا جیسے بادشاہ.....''

''شٹ اپ، گارشیا!'' رینا اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ایک دم آگ بگولا ہو گئی۔ ''شوکی فقیر بھی ہوتا تو سو جان سے مجھے قبول ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے مجھ سے سچی محبت کی ہے اور میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں۔ راجا پرتاب کیا کسی شہنشاہ کی دولت کو بھی میں اپنے محبوب شوکی کے پاؤں کی دھول کے برابر اہمیت دیتی ہوں۔ میں تو سمجھی تھی کہ اپنے بھائی سے چوٹ کھا کے تمہیں عقل آ گئی ہے لیکن افسوس! تمہاری اب بھی وہی چھوٹی سوچ ہے۔''

رینا یہ کہہ کر قریب رکھی نشست پر بیٹھ گئی اور سر جھکائے شوکی کو یاد کر کے رو پڑی۔ گارشیا کے دل کو ایک گھونسا سا لگا، اس کی بھی آنکھیں بھیگنے کے قریب ہو گئیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کی کرسی کے قریب آئی اور..... اس کے قدموں کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر ہولے سے بولی۔

''سوری رینا.....! ایکسٹریملی سوری.....!''

راجا پرتاب کمار اپنی سہ روزہ شکاری مہم پر جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد راج محل کی فضا اب رینا کو ہی نہیں بلکہ گارشیا کو بھی گھٹی گھٹی محسوس ہونے لگی تھی۔

اگلے دن رینا نے گارشیا سے اپنے ساتھ چلنے کی ضد کی..... وہ تیار تھی۔ رینا راکاشی قبیلے کی طرف قصد کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت کوہ شالیہ کی دھرتی میں وہی ایک ایسے معصوم لوگ تھے جو ہر طرح کی ریاکاری سے پاک تھے۔

اس سے اگلے دن رینا نے راکاشی جانے کا قصد کیا۔ مگر گارشیا کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے وہ ساتھ نہ جا سکی تھی، اگرچہ اس کی حالت اب کافی بہتر ہو گئی تھی، لیکن رینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسی حالت میں گارشیا کو پریشان کرے۔ یوں بھی رینا نے سوچا تھا کہ اس نے کون سا وہاں ڈیرا ڈالنا تھا۔

اس نے سوچا کہ راکاشی قبیلے، ان کے سردار اور بوڑھے غافر سے ملنے اور انہیں تسلی تشفی دینے اور کچھ وقت ان کے ساتھ بتانے کے بعد وہ شام یا رات تک جلد ہی راج محل واپس لوٹ آئے گی۔

راجا پرتاب کی خاص مہمان ہونے کے ناتے رینا یا گارشیا پر کہیں بھی آنے جانے پر پابندی نہ تھی۔ حتیٰ کہ راجا نے اس سلسلے میں انہیں پوری سہولیات بہم پہنچانے کا خدمت گاروں کو حکم دے رکھا تھا، چنانچہ رینا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر راکاشی کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ اکیلی تھی اور اس کے ساتھ صرف ایک بوڑھا کوچبان تھا۔

گھوڑا گاڑی راج محل سے رینا کو لے کر نکلی اور جنگل کے درمیان بل کھاتے کچے راستے پر گامزن ہو گئی۔ اس وقت خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ پرندوں کی مست الست ڈاریں ایک ترتیب کے ساتھ آب و دانے کی تلاش میں آزاد ہواؤں کے سنگ اڑی چلی جا رہی تھیں۔

ذرا ہی دیر بعد راج محل بہت پیچھے رہ گیا۔ ان کی گھوڑا گاڑی اب گھنے جنگل سے گزر رہی تھی۔ گاڑی میں ایک ہی گھوڑا جتا ہوا تھا اور کوچبان جس کی عمر ستر سال کے قریب تھی، ان راستوں کا ایک تجربہ کار کھلاڑی تھا۔

جنگل گھنا ہونا شروع ہو گیا اور راستہ بھی قدرے ناہموار، جلد ہی اونچے نیچے راستوں پر یہ لوگ راکاشی بستی کے قریب قریب پہنچ گئے کہ اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ گھوڑا گاڑی کا ایک چوبی پہیا ٹوٹ گیا۔ گاڑی کا توازن بگڑا اور وہ الٹ گئی۔ گھوڑا بھی زور سے ہنہنا کر گرا۔ رینا کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ گھوڑا گاڑی سے باہر آ رہی۔ شکر تھا کہ گھنی جھاڑیوں اور گھاس میں گرنے سے اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں مگر اس کے حواس ضرور کافی دیر تک مختل رہے اور وہ خود بھی۔

کچھ ہوش آیا تو معلوم ہوا، گھوڑا ٹوٹی ہوئی بگھی سمیت جنگل میں کہیں بگٹٹ بھاگ چکا تھا۔ وقتاً اس کی نظر پڑی اور اس کے حلق سے خوف کے مارے چیخ خارج ہو گئی۔

ذرا ہی فاصلے پر اسے بوڑھا کوچبان بھی گرا پڑا دکھائی دیا مگر اس کی حالت ایسی تھی جیسے وہ زندہ نہ بچا ہو۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور بھی کئی جگہ پر اسے سخت چوٹیں آئی تھیں۔ رینا رو رو کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتی رہی مگر بے سود، وہ واقعی مر چکا تھا۔

رینا وہیں بیٹھی تھوڑی دیر تک اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی اس کے بعد وہ پیدل ہی راکاشی بستی کی جانب بڑھتی چلی گئی جو اب وہاں سے زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

راج محل میں اچانک کہرام سا مچ گیا۔ یکا یک ایک بھگدڑ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اچانک کوئی بھونچال سا آگیا ہو، جس نے گارشیا کو ایک دم پریشان اور خوف زدہ سا کر دیا۔ پھر اس وقت تو اس کی جیسے جان ہی نکل گئی جب شاہی سپاہیوں کے دستے نے مہمان گاہ پر دھاوا بول دیا اور گارشیا کو گرفتار کر کے اسے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر آناً فاناً راج محل کے سب سے خوفناک اور اندھیرے بندی خانے میں پھنکوا دیا گیا۔

گارشیا یہی سمجھی کہ شاید یہ سب راجا پرتاب کمار کے حکم پر کیا گیا ہے کیونکہ رینا نے راجا پرتاب کے سوال کے جواب میں نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ اشاروں کنایوں میں شوکت حسین عرف شوکی کے حق میں اپنا عندیہ بھی سنا ڈالا تھا۔

لہٰذا گارشیا کو اس بات پر یکا یقین ہونے لگا تھا کہ یہ حرکت ضرور راجا پرتاب کمار کی کوئی انتقامی کارروائی کے نتیجے میں ہی عمل میں لائی گئی ہے، لیکن پھر وہ سوچنے لگی کہ اگر ایسا تھا تو پھر رینا کو کیوں راج محل سے باہر جانے دیا گیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ گارشیا کے ذریعے رینا پر اس طرح کا دباؤ ڈالنا چاہ رہا ہو؟ مگر پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ گارشیا کے دل میں کچھ ایسا دھواں سا اٹھتا تھا جس کے نیچے کوئی چنگاری دبی ہوئی اسے بار بار بے چین کیے دے رہی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سب کچھ نہیں ہے جو یہ سمجھ رہی ہے .... تو پھر کیا ہوا تھا ایسا کہ..... راج محل کے ان داتا اور راجا کے معزز مہمانوں کے ساتھ اچانک ایسا سلوک روا رکھا گیا تھا؟ گارشیا کو اس کا جواب بعد میں ملا جسے سن کر اس کی روح تک لرز گئی۔

☆☆☆

بیجورام المعروف بچھورام نے خود کو نئے منظر نامے کے ابھرنے تک محدود کر لیا تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایک طرح سے بہ ظاہر خاموش مگر بے چینی سے منتظر بیٹھا تھا کہ کب اس کی مراد بر آتی ہے اور کب وہ راج نیتی کے سنگھاسن پر براجمان ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے شیورائے بھولکر کو ان ساری تازہ۔خبروں سے آگاہ کر آیا تھا جو آنے والے دنوں میں اس کے اور نجو بائی کے حق میں جا سکتی تھیں لیکن وہ تقدیر کی طرفہ کاری سے بے خبر تھا کہ بازی دونوں (نجو بائی اور بچھورام) میں سے صرف ایک کے ہاتھ میں آنے والی تھی اور یہی بچھورام کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بات ہوتی۔

فرنگیوں کی کوہ شالیہ پر چڑھائی کی ناکام مہم کے بعد بچھورام اب نجو بائی کی تخلیہ گاہ میں جانے کا روادار نہیں رہا تھا۔ وہ اس کا قرب حاصل کرتا رہا تھا، نجو بائی کا حسن و شباب اب اس پر ایسا نشہ بن کر طاری رہنے لگا تھا کہ وہ بے قرار سا ہو جاتا تھا لیکن اب فرنگیوں کی جنگ کی ناکامی کے بعد نجو بائی اس سے سخت ناراض ہوگئی تھی۔ اس میں اب نجو بائی کا سامنا کرنے کی ہمت کہاں رہی تھی، اسی لیے وہ اب چپکا بیٹھا شطرنج کی نئی چال کا منتظر تھا اور اسے اس بار پوری امید تھی کہ جو چال چلی گئی ہے وہ ضرور کامیاب ہوگی مگر بچھورام نہیں جانتا تھا کہ اس بار قسمت کی بساط پر گھوڑے ٹیڑھے، یا پیادے نے چال نہیں چلی تھی بلکہ..... ملکہ کی چال چل گئی تھی، اگر چہ اس میں بھی ملکہ کی تقدیر کا ہی شاخسانہ تھا۔

بچھورام کو سہ پہر کے وقت شور شرابے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ خود بھی گھبرا سا گیا۔ اپنے اقامتی گوشے سے باہر تو نہیں آنا چاہتا تھا مگر شور اور واویلا تھا کہ راج محل کے در و دیوار تک دہلنے لگے تھے۔ وہ گھبرا گیا، حقیقت جاننے کے لیے ابھی اس نے اپنے اقامتی گوشے سے پیر باہر نکالا ہی تھا کہ شاہی سپاہیوں کے ایک جتھے نے اسے دبوچ لیا۔

''ارے..... رے..... بھیو! یہ کیا کر رہے ہو؟''

بچھورام بری طرح بوکھلا کر بولا۔ ''میں بیجورام ہوں، سٹھیا گئے ہو کیا؟ نہیں پہچانتے مجھے؟'' لیکن سپاہیوں نے سختی سے بچھورام کی ایک نہ سنی اور اٹھا کر اسے بھی بندی خانے میں ڈال دیا۔

آج اپنی پوری زندگی میں پہلی بار اس نے راج محل کے بندی خانے کی ہوا کھائی تھی اور خود اس کی اپنی ہوا نکل گئی تھی۔ وہ ایک دم سکتے کی سی کیفیت میں آگیا، کافی دیر تک یہی حالت رہی اس کی..... دماغ نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا قامت ٹوٹ پڑی تھی۔

جب کچھ دیر اور بیتی تو اس کے حواس اور سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں جاگیں۔ وہ بندی خانے کے سیلن زدہ اور تاریک در و دیوار اور یہاں کے خوفناک ماحول کو دیکھ کر پورے جی جان سے لرز گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ کئی اندازے قائم کرنے لگا تھا کہ کہیں اس کی غداری کا پول تو نہیں کھل گیا۔

دفعتاً اسے اپنے علاوہ کسی اور کی بھی یہاں موجودگی کا احساس ہوا۔ بندی خانے میں کہیں سے نیم اور مدھم سی روشنی

آتی رہتی تھی۔ اسے وہ ہیولا خود سے چار پانچ ہاتھ کی دوری پر دیوار سے نڈھال لگا بیٹھا نظر آیا۔

بچھورام بہ غور اسے دیکھنے لگا، وہ اسے کسی عورت کا ہیولا لگا تھا اور اس خیال سے اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا..... کہیں یہ نجو بائی تو نہیں تھی؟ کیا اس کی بھی سازشیں طشت از بام ہو چکی تھیں اور راجا پرتاب نے اسے بھی اس کی طرح یہاں بندی خانے میں پھنکوا دیا تھا۔

''کک..... کون؟ تت..... تم کون ہو؟'' معاً اس نسوانی ہیولے نے کہا تو بچھورام کو ایک اور جھٹکا لگا۔

''ی..... ی..... یہ نجو بائی کی تو آواز نہیں لگتی؟'' وہ جیسے خود سے بڑبڑایا۔

''مم..... میں گارشیا ہوں..... راجا پرتاب کمار کی مہمان لیکن یہ سب اچانک کیا ہو گیا ہے؟ تم کون ہو؟''

گارشیا نے شاید بچھورام کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔

بچھورام اسے پہچانتے ہوئے تر ت بولا۔

''اوہو..... تو تم ان کے مہمان ٹولے سے تعلق رکھتی ہو لیکن جو سوال تم کر رہی ہو اس کا جواب تو خود میں بھی تلاش کر رہا ہوں۔'' پھر ایک ذرا توقف کے بعد اس سے سوال کیا۔ ''تمہیں کس جرم میں یہاں پھینکا گیا ہے؟''

گارشیا نے پہلے تو سوچا کہ اسے حقیقت بتا دے کہ رینا کے راجا پرتاب کمار سے شادی کی خواہش کو ٹھکرا دینے کی وجہ سے یہ سب کیا گیا ہے مگر وہ ابھی اتنی بڑی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتی تھی کیونکہ ابھی اسے خود بھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً لاعلمی کا اظہار کر دیا اور الٹا بچھورام سے سوال کر ڈالا۔

''تت..... تمہیں بھلا کس جرم کی سزا دی گئی ہے؟ تم تو ان کے پرانے آدمی اور خدمت گزار تھے؟''

اب بچھورام بھی اسے کیا بتاتا۔ غرضیکہ دونوں ہی کچھ بتانے سے قاصر تھے۔ بچھورام کو اپنا ڈر تھا، جو وہ زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کوئی بغاوت ہوئی ہے؟'' بالآخر بچھورام بات بناتے ہوئے بولا جس پر گارشیا کو ایک جھٹکا لگا، اس نے فوراً بچھورام سے کہا۔

''تت..... تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ یہی بات ہوئی ہوگی، کیونکہ راجا پرتاب کمار تو ایک دو روز سے اپنی شکاری مہم پر گئے ہوئے ہیں۔''

گارشیا کی بات پر بچھورام کا ماتھا ٹھنکا۔ نجو بائی کی بے رخی اور دیگر وجوہات کی بنا پر وہ چند دنوں سے صرف اپنے اقامتی گوشے تک ہی محدود رہا تھا۔ اس لیے اسے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ..... راجا پرتاب راج محل میں تھا یا باہر.....

اب اسے بھی یقین ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی سازش اندر ہی اندر پکتی رہی ہوگی اور آج راجا کی غیر موجودگی میں ایک چنگاری کی طرح بھڑک کر بغاوت کی آگ بن گئی۔

لیکن کیسے؟ وہ کون تھے؟ سازش تو یہ تیار کر رہا تھا؟ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو پھر بھلا اسے کیوں بندی خانے کی نذر کیا جاتا؟ وہ عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا۔

وہ رات بیتی اور اگلے دن بندی خانے کے اندھیاروں میں یکا یک روشنی پھیل گئی۔ سب سے زیادہ بچھورام کی آنکھیں چندھیائی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی چندی چندی مکار آنکھیں پھیل بھی گئیں۔ ایسے میں اس کا استخوانی سا چہرہ مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔

جب اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھا۔ وہاں چار مسلح وردی پوش شاہی سپاہیوں کی معیت میں نجو بائی کھڑی تھی..... مگر..... نہیں..... وہ نجو بائی کہاں تھی؟ وہ تو..... مہارانی تھی۔ اسی شان، آن اور دبدبے کے ساتھ اپنی مخصوص مہارانیوں والی پوشاک میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

چاروں سپاہیوں نے مشعلیں تھام رکھی تھیں۔ نجو بائی ایک بار پھر مہارانی کے روپ میں اس کے سامنے ایک تفاخر کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی، مگر اس کی مسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی اور زخمی محسوس ہوتی تھی۔

اس کے ہمراہ اس کا بیٹا ایش کمار بھی کھڑا تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کے چہروں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ گارشیا کو بڑی ہلاکت خیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''بچھورام! دیکھ لو اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر مجھے..... پہچان رہے ہو یا نہیں.....؟'' معاً مہارانی نجو بائی کی رعب دار اور گھن گرج لیے والی آواز بندی خانے میں گونجی۔

ادھر بچھورام کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، جیسی ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی بچھورام کے بک وک سے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ ابھری اور وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''مم..... مہارانی صاحبہ ابدھائی ہو..... مم..... مجھے آپ کو اس روپ میں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''بکواس بند کرواپنی۔'' مہارانی نجو بائی جیسے زخمی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے اسے گھور کر بولی۔ ''اپنے انجام کی چنتا کر بچھورام! بہت تھوڑا سے بچا ہے تیرے پاس۔''

مہارانی نجو بائی کی اس دھمکی پر بچھورام کو جھٹکا لگا۔ ایکا

ایکی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ حلق میں آتی ہوئی کسی رقیق شے کو بہ مشکل نگلتے ہوئے بولا۔

''مم..... مہارانی جی! مگ..... کیا مطلب؟''

اسی وقت تین اور سپاہی بندی خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے لوہے کا ایک عجیب اور بڑا سا زنگ آلود پنجرہ اٹھا رکھا تھا، جو کہیں کہیں سے سیاہ نظر آتا تھا۔ اس میں دائیں بائیں دو لیور نظر آرہے تھے۔ یہ ''شکنجہ'' تھا۔ اسے دیکھ کر سختی سے بچھورام کی روح فنا ہونے لگی۔ گارشیا بھی سراسیمہ انداز میں ایک طرف کو کونے میں جا سمٹی تھی۔ ادھر بچھورام کو ایک بار پھر ذرا دیر کو سکتہ سا ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چلا کر بولا۔

''تت..... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔ میں تیری اصلیت راجا پرتاب کو بتادوں گا، سب کو بتادوں گا۔''

''ہاہاہا.....!'' مہارانی نے قہقہہ لگایا اور استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ''بے چارہ راجا پرتاب..... چچ..... چچ..... وہ تو شیر کا شکار کرنے گیا تھا اور خود خونخوار شیروں کے جتھے کا شکار ہوگیا۔'' اس چونکا دینے والے انکشاف پر بچھورام ہکا بکا رہ گیا۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب مہارانی نجو بائی نے دو سپاہیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ ایک نے چاقو نکال لیا اور بچھورام کی جانب بڑھا۔ ہولناک موت کو سامنے دیکھ کر بچھورام کا سکتہ کسی نشے کی طرح ٹوٹا اور وہ کسی چوہے کی طرح جان بچانے کے لیے ادھر ادھر کونوں کی جانب بھاگنے لگا، مگر کب تک..... سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا۔

وہ تڑپنے لگا، ایک سپاہی نے اس کے استخوانی جبڑے بھینچ کر منہ کھولا اور دوسرے نے ایک ہاتھ سے اس کی زبان کو پکڑ کر باہر کھینچا۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ دوسرے چاقو والے ہاتھ کو سپاہی نے ماہرانہ حرکت دی اور اگلے ہی لمحے بچھورام کے حلق سے ذبح کیے ہوئے جانور کی سی خرخراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کا منہ خونم خون ہوگیا تھا۔ اس کی زبان کا ایک ٹکڑا سپاہی نے چاقو سے کاٹ کر بندی خانے کے سیلن زدہ فرش پر پھینک دیا تھا، جو اب خون آلود لوتھڑے کی طرح تھرک رہا تھا۔

''اب اسے شکنجے میں جکڑ دو۔'' مہارانی نجو بائی کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چہرہ انتقام کی سرخی سے بھبکا ہوا نظر آتا تھا۔ دونوں سپاہیوں نے زخم سے نڈھال بچھورام کو شکنجے میں جکڑ دیا۔

بچھورام زخم سے نڈھال ہونے کے باوجود بھی شکنجے میں جکڑے جانے کی اذیت ناک اور بھیانک موت کے تصور سے ہی بری طرح کانپنے اور تڑپنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بندی خانے کی سیلن زدہ مگر مضبوط دیواروں کو توڑتا ہوا جان بچا کر بھاگ جائے۔

دونوں سپاہی اب آہستہ آہستہ لیور گھمانے لگے۔ دونوں لیور ایک دوسرے کی مخالف سمت میں گھمائے جا رہے تھے۔ اس طرح شکنجے میں جکڑے ہوئے بچھورام کے جسم کا ایک ایک جوڑ کھل رہا تھا۔ ادھر بچھورام زندہ آنکھوں سے اپنی اس اذیت ناک اور بھیانک موت کو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے بے بسی سے محسوس کر رہا تھا۔ زبان کٹنے کی وجہ سے وہ دہائیاں اور داد فریاد بھی کرنے سے قاصر تھا۔

تب ہی ہلکی کڑکڑاہٹ کی آوازیں بندی خانے کے بھیانک ماحول میں گونجیں اور بچھورام کے جسم کے سارے جوڑ کھلتے چلے گئے۔ دوسرے زاویے سے سینے کا پنجر اور پسلیاں ایک دوسرے میں دھنستی چلی گئیں۔ بچھورام کا لہولہان سا چہرہ اذیت کی بڑی بھیانک تصویر بنا کیے اسی طرح اکڑا پڑا رہ گیا تھا۔

بچھورام اپنے ہولناک انجام کو پہنچ گیا تو مہارانی نجو بائی کے اشارے پر شکنجہ کھول دیا گیا۔ اس کے اندر سے بچھورام کا کسی چوہے کی طرح پچکا پچکا وجود ڈھلک کر باہر ٹنگی اینٹوں والے فرش پر بکھر سا گیا۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی پڑی لاش عجیب روح فرسا منظر پیش کر رہی تھی۔

گارشیا کی تو یہ جاں گسل منظر دیکھ کر حالت ہی غیر ہونے لگی تھی۔ وہ خوف و دہشت سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح ایک کونے میں دبکی لرز رہی تھی۔

ایش کمار نے اپنی ماں سے کچھ کہا پھر مہارانی نجو بائی نے اثبات میں دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کی خونی نگاہیں اب ڈری سہمی گارشیا پر جم گئی تھیں۔

''اسے بھی شکنجے میں جکڑ دو۔'' ایش کمار نے تحکمانہ کہا۔

''نن..... نہیں..... مم..... میرا..... قصور کیا ہے؟'' گارشیا جیسے جی جان سے چیخ اٹھی۔ وہی دونوں جلاد سپاہی اسے دبوچنے کو آگے بڑھے تھے۔

''تمہارا قصور یہ ہے لڑکی کہ تم اس .... ذلیل آدمی رابرٹ کی بہن ہو جو میری معصوم بہن کو ورغلا کر بھگا لے گیا ہے۔'' ایش کمار نے غرا کر کہا۔

دونوں سفاک اور جلاد سپاہیوں نے گارشیا کو دبوچ لیا۔ گارشیا کی آنکھوں کے سامنے سے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے کا وہ جاں گسل منظر ہی نہیں ہٹا تھا کہ اب وہ خود بھی اس

ہولناک سزا کا بے بس کردار بننے والی تھی۔

یہ تصور ہی اس کے لیے لرزا دینے والا تھا۔ وہ روتے ہوئے دونوں ماں بیٹے کی منتیں کرنے لگی۔

''تت..... تمہیں..... خ خ..... خدا کا واسطہ..... رابرٹ میرا بھائی کب تھا؟ وہ تو خود میری جان کے درپے ہو گیا تھا جب میں نے ان کا منصوبہ ناکام کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''بہلاوے مت دے لڑکی!'' اس بار نجو بائی اسے تُرشی ہوئی نگاہوں سے گھور کر بولی۔ ''تو بھی اس میں شامل تھی اور دونوں کے بیچ ضرور اس دولت کے بٹوارے کا جھگڑا ہوا ہوگا۔''

گارشیا کو مزید بولنے کا موقع نہ دیا گیا۔ آخر میں جب اس کا بھی نرم و نازک جسم شکنجے میں جکڑ دیا گیا تو ناامیدی اور انتہا درجے کی مایوسی تلے اس نے ان دونوں سفاک ماں بیٹوں سے یہ التجا بھی کی تھی کہ اسے شکنجے میں جکڑ کر اذیت ناک موت نہ دی جائے بلکہ اسے گولی ماردی جائے یا زہر دے دیا جائے۔

مگر ایش کمار کے سینے میں اپنی جوان کنواری بہن اور مہارانی نجو بائی کا اپنی بیٹی کے انتقام سے سینہ چھلنی ہوا جا رہا تھا۔

وہ دونوں بندی خانے سے نکلنے لگے تو ان کے عقب میں گارشیا کی لرزا دینے والی اذیت ناک چیخیں باہر تک سنائی دینے لگیں۔ اس کے بعد اتھاہ خاموشی چھا گئی۔

رینا کی تلاش میں بھی سپاہی اور جاسوس دوڑا دیے گئے تھے۔

☆☆☆

لانچ تیزی سے سی ہاک کی جانب بڑھی چلی جا رہی تھی۔ اریبہ اسی طرف ٹکٹکی جا رہی تھی۔ رائفل ہنوز اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ سی ہاک اور ان کا فاصلہ ایک حد تک قریب آنے کے بعد تھم چکا ہے، بلکہ اب تو بتدریج بڑھتا بھی جا رہا تھا۔

''سی ہاک روانہ ہو چکا ہے۔ اب ہم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔'' اچانک وھیل مین نے اس سے کہا۔ اس کے چہرے پر تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ''وہ دیکھو سی ہاک کی چمنیوں نے دھواں اگلنا شروع کر دیا ہے۔''

''لانچ کی رفتار بڑھا دو۔'' اریبہ پریشان ہو کر بولی۔ اپنے دیس کا خزانہ بچانے کے لیے اس نے اپنی جان کی بازی تک لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''بے شک لانچ کو جہاز سے ٹکرا دو۔''

''لانچ میں ایندھن ختم ہونے کو ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا، سوائے افسوس کے۔ خزانہ تو گیا اب..... ہمارے دیس میں..... ہاہاہا.....'' وھیل مین اپنے گوروں کی کامیابی پر اور اریبہ کی ناکامی پر ہنسنے لگا۔ ساتھ ہی لانچ کی رفتار مزید ہلکی کرتے ہوئے اس کا رخ واپس موڑنے لگا۔

اریبہ غصے اور نفرت سے اس کی طرف گھور کر بولی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ واپس کیوں لوٹ رہے ہو؟ میں نے تمہیں ابھی ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔'' کہتے ہوئے اریبہ نے گولی چلا دی۔ وھیل مین بدکا۔

گولی ہوائی فائر کی صورت میں چلائی گئی تھی۔ مقصد اریبہ کا یہی تھا کہ اس پر اپنی دہشت بٹھا سکے لیکن وہ شاید اب اریبہ کی بے بسی سے حظ اٹھا رہا تھا، اسی تسلی کے ساتھ بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں، لانچ میں اب اتنا ہی ایندھن رہ گیا ہے کہ واپس ہم ساحل تک پہنچ سکیں۔''

اریبہ کو اس کی یہ حرکت بری طرح کھل گئی۔ اس نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ کر رائفل کو لٹھ کی طرح گھما دیا۔ وھیل مین کی کنپٹی پر زور کا پٹاخا چھوٹا۔ وہ وہیں تیورا کر گرا اور بے سدھ ہو گیا۔

اریبہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ حسرت ناک نگاہوں سے سی ہاک کو دور ہوتا دیکھتی جا رہی تھی جبکہ اس کی لانچ کی رفتار مدھم پڑنے لگی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر کچھ گھبرائی بھی تھی کہ لانچ کو ہینڈل کرنے والا کوئی نہ تھا۔

وہ جلد ہی ایندھن کے پوری طرح ختم ہو جانے کے بعد سمندر کی لہروں پر ہلکورے کھاتی پتا نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتی لیکن اریبہ کو اپنی فکر کہاں تھی؟ اسے تو دکھ اپنے مشن کی کامیابی کے قریب پہنچتے پہنچتے ناکامی کی دہلیز تک جا پہنچنے پر ہو رہا تھا۔

رات اور بیکراں تاریک سمندر..... اور وہ تنہا بے مقصد لانچ میں رہ گئی تھی۔

تب ہی اس نے لانچ کے عرشے پر گھوم پھر کر چاروں طرف کا جائزہ لیا تو اچانک ٹھٹکی۔ ایک جانب سے اسے سمندر میں ذرا فاصلے پر کسی چھوٹی سی کشتی کا خاکہ سا ہلکورے کھاتا دکھائی دینے لگا۔ وہ چونک گئی۔

پہلا خیال اس کے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں یہی آیا تھا کہ کہیں یہ شاہ زمان نہ ہو جو ہوش میں آنے کے بعد اس کے پیچھے چلا آیا ہو۔

چونکہ لانچ کا رخ واپسی کے لیے موڑا جا چکا تھا۔ اسی

لیے کشتی اور لانچ کا فاصلہ ازخود ہی کم ہوتا جارہا تھا، لیکن اریبہ کو خدشہ تھا کہیں زمان کی کشتی اس سے ٹکرا نہ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کردیا۔

ذرا دیر بعد جب کشتی قریب آئی تو اس میں سوار ایک شخص کو دیکھ کر اریبہ بری طرح چونکی۔ اس کا اندازہ بالکل غلط نکلا تھا۔ وہ شاہ زمان نہیں تھا۔

☆☆☆

تاریک سمندر میں ہاؤس بوٹ ہلکورے لے رہی تھی۔ کیپٹن جیمس اریبہ کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹا تھا اور زخمی ہونے کے باوجود وہ اس کی مدد کے لیے ایک چھوٹی سی کشتی میں روانہ ہوچکا تھا۔

ہاؤس بوٹ میں اب ازابیلا اور شاہ زمان اکیلے رہ گئے تھے۔ ازابیلا عرشے سے لگی کھڑی تھوڑی دیر تک اپنے شوہر کو دور تک کشتی میں جاتے دیکھتی رہی، ٹھنڈ بڑھنے لگی تھی اسی لیے وہ پلٹی اور اندر کیبن میں آگئی۔

اس نے دیکھا کہ زمان کو ہوش آگیا تھا۔ وہ کہنیوں کے بل پر بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

''پلیز یہ نہ کریں..... آپ ابھی پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہیں۔'' ازابیلا اس کے قریب آکر بولی۔

زمان کو واقعی اب بھی کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ وہ اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''مم..... میری ساتھی اریبہ کہاں ہے؟'' ازابیلا نے اسے اریبہ اور پھر اپنے شوہر کے بارے میں بتایا تو وہ ایک دم سراسیمہ سا ہوگیا۔

''تم فکر مت کرو، جیمس اس کی مدد کو چلا گیا ہے۔'' ازابیلا اسے تشویش میں پاکر تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں بھی ان کے پیچھے جاؤں گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔'' زمان بولا۔ کہنیوں کے سہارے اب وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''جیمس ساتھ ہوگا تو کوئی ان سے لڑنے کی جرأت نہیں کرے گا، وہ اسی لیے اریبہ کی مدد کو گیا ہے۔'' ازابیلا نے اسے پھر تسلی دینی چاہی۔

لیکن شاہ زمان اب تک کے حالات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ کیپٹن جیمس کو اس جزیرے کے فوجی کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کی جھلک وہ آفیسر رینالڈ اور جیمس کے درمیان ہونے والی خون ریز جھڑپ کی صورت میں دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا وہ ازابیلا کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''کیپٹن جیمس کا میں شکر گزار ہوں کہ وہ زخمی ہونے کے باوجود میری ساتھی کی مدد کو گیا، لیکن میڈم! افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں ابھی تک ان لوگوں کا اندازہ نہیں ہوسکا ہے کہ تمہارے اپنے بھی دشمن بن چکے ہیں۔''

اس کی بات پر پہلی بار ازابیلا بھی پریشان سی نظر آنے لگی۔ زمان دوبارہ بولا۔ ''ہمیں ان کے پیچھے جانا ہوگا۔ میں یہ بوٹ چلا سکتا ہوں۔ تم میری ویل کیبن تک مدد کردو۔'' کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھنے لگا تو ازابیلا فوراً اسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی۔

زمان کو یہ اچھا نہیں لگا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔ وہ اب خود اپنی قوتِ ارادی کے بل پر کھڑا ہوچکا تھا۔

ازابیلا نے اس کی ڈرائیونگ ویل تک لے جانے میں مدد کی تو اچانک اس کی نگاہ کھڑکی سے پار تاریک سمندر کی جانب پڑی اور وہ چلائی۔

''اوہو..... کوئی کشتی ہماری بوٹ کی طرف آرہی ہے۔'' اس کی بات پر زمان نے بھی چونک کر اس طرف دیکھا۔ دور ساحل کی طرف سے ایک کشتی ان کی بوٹ کی طرف دھیرے دھیرے بڑھی چلی آرہی تھی۔

''کون ہوسکتے ہیں یہ؟'' زمان نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کہیں جیمس واپس تو نہیں لوٹ رہا؟''

''یہ جیمس کی کشتی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا رخ ساحل کی جانب تھا۔'' ازابیلا نے جواب میں کہا۔ ''یہ کوئی اور کشتی لگتی ہے۔''

دونوں کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ کہیں یہ دشمن نہ ہوں، اس کی تسلی کے لیے دونوں کو عرشے پر آنا پڑا۔

ازابیلا اندر سے سنگل لینس والی دوربین لے آئی تھی۔ وہ زمان نے اپنی آنکھ سے لگا کر دیکھی تو کچھ واضح نہ ہوسکا، ماسوائے اس بات کے کہ کشتی میں صرف ایک ہی سوار موجود تھا۔

☆☆☆

علی کی فطرت تھی کہ اسے جو بھی مشن سونپا جاتا تھا، وہ بلا دیر اس کے لیے کمربستہ ہوجاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل شمیر خان اور کرنل نہال خان کی ہدایت پر اس نے فوراً عمل کیا تھا اور بڑی مارکیٹ پہنچ کر اس نے پہلے عبدالرحمان اور شاکر حسین سے رابطہ قائم کیا اور اس کے بعد سب سے آخر میں..... بمبئی کی بندرگاہ پر پہنچ کر مراد خان سے ملاقات کی۔

ان تینوں مذکورہ افراد نے بالکل اسی طرح اس کی راہنمائی کی تھی جس طرح وہ پہلے اریبہ اور شاہ زمان کی

کر چکے تھے۔

بہر حال..... جب اس نے رات ہونے تک ٹریژر آئی لینڈ میں قدم رکھا تو اسے زبردست حیرت ہوئی۔ اس کے خیال میں یہاں سخت پہرا ہو سکتا تھا مگر مراد خان نے اسے ایک ٹرالر کے ذریعے جب ساحل کے قریب اتارا تو ساحل تک کا راستہ اس نے تیر کر پار کیا۔

یہاں اسے کوئی فوجی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی۔ اگرچہ زمان اور اریبہ کے علاوہ نواب صاحب نے علی کو بھی اس مشن سے متعلق معلومات دے رکھی تھیں اور وہ اسی کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچا تھا، یوں ثمیر اور نہال خان بھی اس کی مدد میں شامل رہے تھے۔

اس نے یہاں خاصی ابتری اور تباہی کے مناظر دیکھے تو وہ فخر و انبساط سے یہ سوچے بنا نہ رہ سکا تھا کہ..... شاہ زمان اور اریبہ کا مشن کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس نے چند تباہ حال پٹکے اور مورچے بھی دیکھے۔ ایک عمارت کو تو اس نے بالکل تباہ و بربادی کی حالت میں دیکھا۔

چند فوجی اسے دکھائی دیے تھے مگر ان کی حرکات و سکنات سے صاف ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ مایوس اور شکست خوردہ ہوں۔ تاہم اس بات پر اسے حیرت ضرور ہوئی تھی کہ اگر اس کے دونوں ساتھی اس اہم مشن میں کامیاب رہے تھے تو پھر کہاں تھے؟

اس کا اس نے یہی آسان طریقہ سوچا اور ایک فرنگی کو اکیلے پا کر اس پر حملہ کر دیا پھر اسے بے بس کرنے کے بعد اس نے اس کے منہ سے سب اگلوا لیا۔ علی کے چہرے سے اب جوش کے آثار ہویدا ہونے لگے اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ..... بالکل درست وقت پر یہاں پہنچا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹی سی کشتی پر شاہ زمان کو نہ پا کر اریبہ چونکی ضرور تھی مگر مایوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ کیپٹن جیمس تھا۔ جب وہ اپنی کشتی سے اس کی لانچ پر آیا تو اریبہ نے اسے ساری بات بتا دی۔ تاہم وہ اس نوجوان انگریز کے اس نیک فعل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی جس نے زخمی ہونے کے باوجود اس کی مدد کی ٹھانی تھی۔

''ڈونٹ وری مس اریبہ!'' کیپٹن جیمس نے بڑے احترام سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سی ہاک زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ ہم اسے جلد ہی جا لیں گے، تم اس کی فکر نہ کرو لیکن اس کے لیے ہمیں اپنی ہاؤس بوٹ میں لوٹنا ہوگا۔''

اریبہ نے اس کے مشورے پر صاد کیا اور وہ دونوں اسی لانچ میں ہاؤس بوٹ کی طرف لوٹ پڑے۔

☆☆☆

جب کشتی قریب آئی تو شاہ زمان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اس کا ساتھی اور دیرینہ یار علی ریحان تھا۔

''یہ..... یہ میرا ساتھی علی ہے۔'' زمان جوشِ مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا اور دوربین دوبارہ ازابیلا کو تھما دی اور ایک ہاتھ کو زور زور سے ہلانے اور خوشی سے چلانے لگا۔

''علی..... علی..... میرے بھائی!''

ادھر کشتی میں علی نے بھی اسے پہچان لیا اور وہ بھی خوشی سے اپنے ہاتھ ہلانے لگا۔

جب علی نے عرشے پر قدم رکھا تو دونوں وفورِ جذبات تلے گلے مل گئے مگر شاہ زمان کو زخمی دیکھ کر علی پریشان ہو گیا۔

''اندر چلو، آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' شاہ زمان نے اس سے کہا مگر وہ پاس کھڑی ازابیلا کو دیکھ رہا تھا۔ جواب دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاہ زمان ابھی علی کو ازابیلا وغیرہ کے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ وہ چیخ پڑی۔

''اوہو..... اس طرف سے بھی ایک لانچ ادھر آ رہی ہے۔''

اس کی بات پر دونوں چونک کر اس طرف دیکھنے لگے۔

لانچ قریب آئی تو انہوں نے کیپٹن جیمس اور اریبہ کے ہیولوں کو پہچان لیا۔ ازابیلا اور شاہ زمان نے ان دونوں کو صحیح سلامت دیکھ کر بے اختیار اطمینان کی سانس خارج کی تھی لیکن اب بھی کئی سوال ان کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہے تھے۔

☆☆☆

''آواز زنان خانے کی سمت سے آ رہی تھی۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے شوق میں ولی نے سارے آداب اور لحاظ کو بالائے طاق رکھا اور راہداری سے گزر کر میرے کمرے کی جانب بڑھا، بین کی آواز وہیں سے آ رہی تھی۔

''دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں ہلکی قرمزی رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا ایک خوبصورت تخت پر شاہی لباس میں ایک بوڑھا بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ ولی نے اس کے سامنے جس لڑکی کو ہاتھ جوڑے کھڑے دیکھا، وہ میں تھی۔ یعنی سدھا.....!

''کچھ اور لوگ بھی ادھر ادھر تمکنت کے ساتھ بیٹھے

Digitized by Google

تھے۔ منظر کچھ ایسا تھا گویا دربار ہو یا کوئی عدالت ہو۔ پھر بوڑھے نے اشارہ کیا اور لوگ اٹھ اٹھ کر وہاں سے جانے لگے مگر ولی یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ دروازے سے کوئی آدمی برآمد نہ ہوتا تھا بلکہ سرسراتے سانپ نکلتے اور اندھیرے لان میں غائب ہو جاتے۔

''یہ عجب منظر دیکھ کر ولی ڈر گیا اور الٹے پاؤں واپس کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کمرے میں بوڑھے کی کپکپاتی ہوئی آواز گونجی۔ ولی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بوڑھا مجھ سے ہمکلام تھا۔

''پتری! تجھے آگیا نہیں مل سکتی۔ تیرے جنم کے سمے تیرے ماتا پتا نے منتا مانی تھی کہ تجھے (سدھا کو) شیش ناگ کی داسی بنائیں گے۔ دیوتاؤں نے بھینٹ سویکار کر لی اور اسی سے کشتری ناگ تیری رکھوالی کر رہا ہے۔ تیرے ماتا پتا جانتے ہیں، تو لاکھ اپائے کر کوئی منش تجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا اور کسی نے ایسی کوشش کی بھی تو شیش ناگ سے بچ نہیں سکتا جو تیری آتما میں رچ گیا ہے۔''

''پرمہاراج! دان تو میرے ماتا پتا نے کیا ہے، میرا کیا دوش ہے؟'' ولی کو جواب میں میری آواز سنائی دی تھی۔

''تو کیا منش کو کوئی ادھیکار نہیں کہ اپنے بھاگیہ بدل لے؟''

''ہے اور اوش ہے۔ کرم میں بڑی شکتی ہے، پرنتو اس راستے میں اتنی کٹھنائیں آتی ہیں کہ کم لوگ ہی انہیں سہار پاتے ہیں۔ زیادہ وہی ہوتے ہیں جو تھک ہار کر کال بھاؤنا سے ہار مان لیتے ہیں اور یوں بھاگیہ کا لکھا پورا ہوتا ہے۔''

''مہاراج! مجھے آگیا دیں کہ میں اپنے کرم کی شکتی کو آزما سکوں۔''

''پتری! تجھے سدا سے آگیا ہے۔ پرنتو ہوگا کچھ نہیں، پھر بھی میں تجھے یہ وچن دیتا ہوں کہ تیرا پریمی شیش ناگ کے کرودھ سے سدا بچا رہے گا کہ تو اس کام میں بے بس ہے۔''

''دھنیواد مہاراج! داسی کو آپ سے ایسی ہی آشا تھی۔''

''اس کے بعد کمرے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی چلنے کے لیے اٹھا ہو۔ اب ولی کا وہاں ٹھہرنا نامناسب تھا اس لیے دبے پاؤں وہ اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

''ان محیر العقول واقعات کے بعد ولی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور رہی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا اور ان پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال آتا کہ ..... آخر سدھا کا پریمی کون ہے؟''

''لیکن جب ولی محمد نے اگلے روز مجھے یہ بتایا تو میں ہنسی میں اس کی بات ٹالنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس نے ضرور کوئی سپنا دیکھا ہے۔

''وہ سپنا نہیں تھا سدھا!'' وہ مجھ سے سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تھا اور تجھے بھی سانپوں کے اس دربار میں کسی بوڑھے مہاراج کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے دیکھا اور باتیں کرتے سنا تھا۔''

''اچھا!'' میں ہنسی۔ ''تو پھر تم مجھے آواز دے دیتے یا پھر جب تم واپس اپنے کمرے میں آگئے تھے تو ایک نظر میرے کمرے میں بھی ڈال لیتے۔ میں تمہیں ضرور گہری نیند میں ہی کھٹیا پر سوئی پڑی ملتی۔'' میرے بہلاووں سے ولی محمد لاجواب سا ہونے لگا۔

''دراصل میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی، کہیں ولی مجھ سے خوف زدہ نہ ہو جائے، جبکہ میں نے اس کٹھنائی سے خود ہی مقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی اور ولی کو اس سارے معاملے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔

''خیر، ناگ پنچمی کے واقعے نے جہاں میرے حسن کی تشہیر کی وہیں میرے ناگن ہونے کا چرچا بھی زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔ ان حالات میں وہاں ہمارا قیام مناسب نہ رہا تھا۔ میرے باپو سیٹھ مرلی لال نے وہاں سے کوچ کرنے کی ٹھانی، خود میں بھی یہی چاہتی تھی کہ ولی محمد سے دور ہو جاؤں اور کسی طرح ان پراسرار حالات سے نمٹنے اور ان کا کھوج لگانے کی کوشش کروں۔

''یہ ساری جادو نگری ایک خواب ناکی کی سی کیفیات کے زیرِ اثر تھی یا واقعی اس کی حقیقت بھی تھی۔ جبکہ شواہد کی رو سے یہ سب غلط بھی نہیں ثابت ہو رہا تھا۔ یہ خوفناک خوابوں کی کوئی جادو نگری تھی، یا حقیقت..... یوں میں ولی کو بھی کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

''لہٰذا مجبوراً ہم نے سب کچھ اونے پونے بیچ دیا اور بمبئی کی راہ لی کہ بڑا شہر ہے جہاں کوئی کسی کے ماضی کو نہیں جانتا، نہ ہی کسی کو یہ جاننے کی فرصت ہے۔ حد تو یہ تھی کہ وہاں میرے باپو نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا اور سیٹھ مرلی لال کے بجائے سیٹھ کشن پرشاد کے نام سے کاروبار شروع کیا۔

''ادھر ولی نے پہلے تو میرے بچھڑنے کی پروا تک نہ کی۔ شاید اسے اس عمر میں اس کے نتائج کا ادراک نہ تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ ہم لوگ واقعی ترکِ وطن کر گئے اور دن گزرنے لگے تو اسے اپنی زندگی میں ایک عجیب سا خلا اور بے کیفی محسوس کرنے لگی۔

''دل بہلانے کے لیے وہ اپنے جوتش کے شوق کو پورا کرنے لگا۔ جھانسی کے ایک جوگی سے جس سے چند موزوں نکات پہلے بھی سیکھ چکا تھا اور زندگی کی ریکھا کا خاصا

Digitized by Google

مطالعہ کر چکا تھا، اس سے ریکھاؤں کا علم سیکھنا چاہا مگر اس کام میں اس کا دل نہ لگا۔ وہ سانپ جھاڑنے کے علم سے زیادہ شغف رکھتا تھا۔

''اگرچہ ایک طرح سے اس کے اس شوق کی وجہ بھی میں ہی تھی، اس کے باپ محمد اختر کو بھی یہ علم کافی حد تک تھا مگر بیٹے کے اصرار کے باوجود وہ اسے نہیں سکھاتے تھے، یہ علم خطرناک بھی تھا اور خود اس کے والد بھی بہت کم ہی یہ کرتے تھے لیکن ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کو اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔

''اسی زمانے میں گوالیار کے ایک پنڈت کا شہرہ ہوا جسے اسٹیٹ نے صرف اس لیے ملازم رکھا تھا کہ وہ سانپ جھاڑنے کا عجیب وغریب منتر جانتا تھا۔

''اس کے لیے سواری کا بھی خاطر خواہ اور وقت پر بندوبست رکھا جاتا تھا تاکہ جہاں کہیں مارگزیدگی کی واردات ہو تو وہ بہ آسانی پہنچ سکے۔ یوں گوالیار کے لوگ بھی خوب واقف ہوں گے کہ اپنے فن میں اسے کمال کی حد تک ملکہ حاصل تھا۔ ریاست میں کہیں بھی سانپ ڈسنے کی واردات ہو صرف اس کا نام لے کر مارگزیدہ کے کپڑوں یا چٹیا میں گرہ لگا دی جاتی، پھر تین دن تک اس پر سانپ کا زہر اثر نہ کرتا۔ اسی دوران میں وہ پنڈت اطلاع پا کر پہنچ جاتا جھاڑتا تو مریض شفایاب ہو جاتا۔

''آئے دن اس کے علم کی کرامات سن کر ولی کو بھی اس کے حصول کا شوق ہوا۔ اس نے خواب میں جو کچھ دیکھا تھا، اسے لگا تھا کہ اس منتر اور علم کو سیکھے بنا میرا حصول ممکن نہیں۔

''سانپ جھاڑنے والا گرو دیو..... بالکل نوجوان سا آدمی تھا مگر سرکاری ٹھاٹھ باٹ، ہر وقت چار اردلیوں اور دیگر نوکروں کی خدمت گزاری، بہت معقول مشاہرہ اور شان دار مکان نے اسے بڑا مغرور سا بنا دیا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد تو ولی کو بار یابی ہوئی، پھر اس نے اپنا علم سکھانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا رویہ بھی ولی کے ساتھ خاصا اہانت آمیز تھا۔ ولی کو سخت غصہ آیا اور اس نے بھی عزم کر لیا کہ اس فن میں وہ اس سے بھی زیادہ مہارت حاصل کرے گا، اس نے یہ عہد کر لیا تھا مگر وہ کس طرح سیکھے.....؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر بھی اس نے کتابوں اور عالموں سے مل کر کئی عمل سیکھے۔

''یوں اس کے شوق کو دیکھ کر اس کے ایک دور پار کے بوڑھے عزیز نے بزرگوں کا بخشا ہوا وہ عمل بھی اسے سکھا دیا جسے ہاتھ پر دم کر کے مارگزیدہ کو نہیں بلکہ صرف

اگر

اپنی غلطی ضرور مانو..... اگر تم غلطی پر ہو۔
کمزوروں کی مدد ضرور کرو..... اگر تم طاقتور ہو۔
سچ کا دامن کبھی نہ چھوڑو..... اگر تم حق پر ہو۔
دوسروں کی اصلاح ضرور کرو..... اگر تم پرہیز گار ہو۔
لغو باتوں سے کنارہ کشی کرو..... اگر تم مومن ہو۔
بوڑھے لوگوں کی عزت ضرور کرو..... اگر تم جوان ہو۔
غریب کی امداد ضرور کرو..... اگر تم مالدار ہو۔
لوگوں سے امیدیں لگانا چھوڑ دو..... اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاکپتن شریف

اطلاع دینے والے کو ایک تھپڑ رسید کر دیا جاتا ہے اور ادھر مارگزیدہ اچھا ہو جاتا ہے۔

''ولی محمد کو دو تین بار اس عمل کا تجربہ کرنے کا موقع بھی ملا اور اس کی کامیابی پر دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔

''پھر بھی اس کے اندر اس مغرور پنڈت کی سی بات نہ تھی۔

''ولی محمد نے بارہا بمبئی جانے کا ارادہ کیا مگر کچھ تو مصروفیات مانع رہیں اور کچھ اس بات سے ڈرتا رہا کہ والدین کو علم ہوا تو خفا نہ ہوں۔ اسی زمانے میں اس کے والد کے پاس میری شادی کا دعوت نامہ پہنچا۔

''ہاں! میرے باپو نے میرا ایک بار پھر رشتہ کسی سے طے کر دیا تھا۔ ولی کے والد محمد اختر ان دنوں ساگر میں تعینات تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی شرکت کی تیاری پکڑی۔ ظاہر ہے ان کے عزیز ترین اور دیرینہ دوست کی بیٹی کی جو شادی تھی۔ یوں انہوں نے ولی کو بھی لکھا کہ وہ گوالیار سے فوراً یہاں پہنچنے کی کوشش کرے۔

بیاہ سے دو روز پہلے یہ سب لوگ بمبئی پہنچ گئے۔ میرے باپو مرلی لال نے ان کی خاطر مدارات کی، گھر کے فرد کی حیثیت سے ہر معاملے میں ولی کے دلدار اختر کو پیش پیش رکھا اور سمدھیانے والوں کے استفسار پر بڑے فخر سے یہی بتایا کہ وہ سمدھا کے ''کاکا'' ہیں اور گھر کے سب سے

Digitized by Google

بڑے وہی ہیں۔ میں البتہ کچھ مغموم اور فکرمندی دکھائی دیتی تھی، لیکن جب ولی سے میری نگاہ ملتی تو میں جی جان سے مسکرا دیتی اور میرا چہرہ کھل اٹھتا۔ اس کی والدہ نے میری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ میں اپنی تعلیم ختم کر چکی ہوں اور کسی ادارے میں رقص کی تعلیم لے رہی ہوں۔ خاص طور سے ''سپیرا ناچ'' میں بڑا کمال حاصل کیا ہے۔ نیز مجھے ناچ سے اتنا شغف ہے کہ اکثر راتوں کو بھی کمرا بند کر کے رقص کرتی رہتی ہوں۔ اس انکشاف پر ولی نے دیکھا کہ اس کے والد صاحب خواجہ محمد اختر کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھرے اور انہوں پوچھا۔

''کمرے میں سدھا تنہا ہوتی ہے یا کوئی اور بھی ہوتا ہے؟''

یہ سوال مجھے ہی نہیں ولی کو بھی کچھ برا سا لگا اور یقیناً میرے باپو مرلی لال کو بھی برا لگا ہوگا مگر انہوں نے نرمی سے بس اتنا ہی جواب میں کہا۔

''کسی اور کو تو ہم نے نہیں دیکھا۔ پھر کمرا بند بھی تو ہوتا ہے۔''

''اس گفتگو کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی ولی کی والدہ نے فوراً بات کا رخ موڑ دیا اور سدھیا نے والوں کے بارے میں سوالات کرنے لگیں۔

''معلوم ہوا کہ بمبئی (ممبئی) ہی کا ایک ساہوکار خاندان ہے جسے لڑکی سے زیادہ مرلی لال کی دولت سے دلچسپی ہے جس کی تنہا وارث سدھا (یعنی میں) تھی۔

''پھر سدھا بٹیا کو کیوں جھونک رہے ہو؟ ایسی ہی بھاری لگتی ہے تو مجھے دے دو، پال لوں گی میں۔'' ولی کی والدہ نے ناگواری سے کہا۔

''تم سے یہی آشا ہے دیدی۔ پر تم نہیں جانتیں کہ کتنی مشکل سے یہ رشتہ ملا ہے۔ ویسے لڑکا اچھا ہے۔ وہ لالچی نہیں لگتا۔'' میرے باپو مرلی لال بولے۔ ولی کی والدہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ میں وہاں آگئی تو وہ خاموش ہوگئیں۔

''بہرحال..... ولی کی ہمارے گھر آمد نے مجھے جہاں خوشی سے نہال کر رکھا تھا وہیں میں اندر سے مغموم بھی تھی۔ ولی بھی میرے قریب رہ کر خوش تھا اور اس کی بھی دلی کیفیات مجھ سے مختلف نہ تھیں۔ کیسی عجیب بات تھی، ہم دونوں کے بیچ کیسا عجیب پریم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے..... سے خاموشی سے محبت کرتے تھے، مگر جانے کیا بات تھی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ایک فاصلہ رکھنے پر بھی مجبور تھے۔ جیسے ہم دونوں کو ہی اس بات کا ادراک ہو کہ..... ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔ ہم دونوں نے باتیں بھی کیں اور ہنستے مسکراتے بھی..... مگر اس رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

آدھی رات کے لگ بھگ جب سب لوگ گہری نیند میں تھے، اچانک ولی کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کمرا بند ہے اور اس نے مجھے اپنے پلنگ کے بالکل قریب کھڑے پایا۔ یوں کہ میں اپنے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ کو جکڑے ہوئے ہوں۔ استعجاب، مسرت اور خوف کے ملے جلے احساسات سے ولی بے چارہ پسینے پسینے ہوگیا۔ بہ مشکل ہی اس کی زبان سے نکلا تھا۔

''سس..... سدھا ...! تم۔''

''ہاں! یہ میں ہی ہوں۔'' میری آواز اسے اس قدر شیریں اور مترنم لگی جیسے کسی دھن پر گھنگرو چھنک رہے ہوں۔ ''تم نہیں جانتے ولی کہ تمہارے لیے میں کتنے کشٹ اٹھا رہی ہوں۔'' پھر میں اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ''میرا سپیرا ناچ پورا ہو چکا ہے، تم مجھ سے پریم کرتے ہو تو تمہیں بھی تھوڑا سا بلیدان دینا ہوگا پھر شیش ناگ مجھے تیاگ دیں گے اور میں سدا کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔'' میں ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ اس اچانک اور عجیب صورت حال سے ولی کا دماغ چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بہرحال..... اسے خاموش دیکھ کر میں پھر اس سے بولی۔

''سچ سچ بتاؤ آج ولی! کیا تم مجھ سے پریم نہیں کرتے؟'' ولی نے گویا ڈرتے ڈرتے ہامی بھری، جیسے کسی بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میری محبت جتنی شدید تھی، اتنی ہی پاکیزہ اور بے لوث بھی تھی۔

''تاہم اس کی ہامی پر خوشی سے میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ آگے بولی۔

''تو سنو! کوہ شالیہ کے جنوب مغرب میں واقع نیل نگری کی پہاڑیوں میں چلے جاؤ۔''

''کیوں؟'' اس کی زبان سے نکلا۔

''یہ تمہیں نیرنگ آباد پہنچتے ہی معلوم ہو جائے گا۔''

''مم..... مگر پرسوں تو تمہارا بیاہ ہے؟''

''بیاہ!'' میں حقارت سے بولی۔ ''میرا بیاہ تمہارے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔'' میری بات پر ولی کا حوصلہ بڑھا۔ فرطِ مسرت تلے اس معصوم اور خاموش دیوانے فرزانے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور جذبات سے مغلوب کپکپاتی ہوئی آواز میں بے اختیار اس کی زبان سے بھی نکل گیا۔

''سدھا.....! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟ کک..... کہیں

Digitized by Google

یہ خواب تو نہیں..... بعد میں تو کہتی ہے کہ تجھے تو علم ہی نہیں؟''

''یہ سچا سپنا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' میں نے اب اس کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا۔ آگے بولی۔

''لو..... میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر دیکھ لو، پھر بھی وشواس نہ آئے تو میرے شریر سے لپٹ کر مجھے بھینچ لو، پھر تم جان جاؤ گے یہ کوئی جھوٹا سپنا نہیں۔'' میری آواز، معنی اور لہجے میں اسے جانے کیا شیرینی اور پریم حلاوت محسوس ہوئی کہ اس نے پہلے میرے نرم و نازک ہاتھ کو بوسہ دیا پھر وارفتانہ انداز میں مجھے خود سے بھینچ لیا۔ اسے میرے شریر میں عجیب طرح کا لوچ اور خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ سرمستی اور نشے کے عالم میں اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ خود میری اپنی حالت و کیفیات اس سے بھلا کب مختلف تھیں۔ اس کے توانا جوان بازوؤں کی وارفتانہ گرفت اور شریر سے نکلتی گرمی میرے اندر سرایت کرنے لگی اور میں بھی آپے میں نہ رہی۔ میں نے اپنے جسم کو اس پر جھکنے کے لیے خم کیا مگر..... پھر اچانک میں نے اسے خود سے پرے دھکیل دیا اور دور جا کھڑی ہوئی۔

''آہ..... ! ابھی غضب ہو جاتا..... غضب ہو جاتا۔'' میں گھبرا سی گئی۔ جیسے ہوش میں آ گئی۔ جیسے کوئی سپنا ٹوٹا ہو۔ جیسے میں گہری نیند سے جاگی ہوں۔

☆☆☆

وائٹ فالکن کے عرشے پر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ عرشے پر ہی کرسیاں اور چھوٹی میزیں لگائے بیٹھے تھے۔ رابرٹ اور سونجنا بھی دو کرسیوں پر اس خوشگوار دھوپ تلے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ رابرٹ محسوس کرنے لگا تھا کہ سونجنا..... کچھ چپ چپ سی رہنے لگی تھی، حالانکہ وہ اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ کبھی پیار کی گرمی سے تو کبھی میٹھی میٹھی باتوں سے..... اور کبھی اسے انگلستان کے سرسبز اور شادمانیوں بھرے خواب دکھاتا۔ وہ بھی خوش جاتی لیکن یہ عارضی ہوتا، وہ پھر کہیں دور کھو جاتی تھی۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ! تم ایک دم چپ چپ سی ہو جاتی ہو؟'' رابرٹ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''دیکھو! کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور سفر میں کتنا مزہ آ رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے بعض لوگ شوق میں بحری سفر کرتے ہیں۔''

''اوں..... ہاں!'' وہ دور کہیں خیالات کے بھنور سے ابھر کر بولی۔ ''میں تو خوش ہوں، چپ کہاں ہوں؟'' کہتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''گڈ!'' رابرٹ خوش ہو کر بولا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے دکھانے کے لیے ایسا کہہ رہی تھی مگر اس نے کوئی اثر نہ لیا۔ گویا ایسا ہے تو ایسا ہی سہی..... اسے اب یوں بھی اس بات کی پروا کب رہی تھی کہ سونجنا کیا سوچتی ہے۔ وہ تو اپنے گھناؤنے مقصد میں اگرچہ پوری طرح تو نہیں لیکن کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ سونجنا کے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ رابرٹ اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر لندن میں اس کے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اگر وہ جان جاتی تو لندن جانے کے بجائے اسی جہاز سے سمندر میں کود کر اپنی جان دینا زیادہ بہتر سمجھتی۔

وہ اس سے پھر چکنی چپڑی باتیں کرنے لگا۔

''ڈارلنگ! تمہیں اداس دیکھتا ہوں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ دیکھو، مجھ سے اپنے دل کی باتیں اور خدشات مت چھپایا کرو۔ اس طرح خوامخواہ بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔'' رابرٹ نے مکاری سے اسے کھدیڑ کر اکسایا جس کا خاطر خواہ اثر نکلا اور سونجنا دور سمندری لہروں کی طرف ایک نگاہ ڈالنے کے بعد رابرٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''رابرٹ! ایسا کیوں ہو رہا ہے میرے دل کے ساتھ؟ جبکہ تمہاری محبت بھی مجھے مل گئی ہے اور ہم لندن پہنچ کر ہمیشہ ساتھ رہنے کے خوش آئند مقصد کو بھی پانے والے ہیں؟''

''یہ صرف تمہارا وہم ہے سونجنا ڈارلنگ! اور کچھ نہیں.....''

''مگر رابرٹ! وہم دل و دماغ میں اس قدر بے چینیاں تو نہیں پیدا کرتا؟''

''وہم ہی تو بے چین کرتا ہے۔'' رابرٹ نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا۔ ''ورنہ ہم نے تو ایک دوسرے کو پا لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہارا اب مجھ سے اور میرے پیار سے دل بھرنے لگا ہے۔'' عیار رابرٹ نے اس بار اس کی کمزور رگ کو چھیڑا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے کچھ برا سا منہ بنا لیا تھا۔ سونجنا پریشان ہو گئی اور گھبرا کر رابرٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو رابرٹ تم؟''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں سونجنا!'' لوہا گرم دیکھ کر رابرٹ نے یہی وتیرہ اپنائے رکھا۔ ''میں تو تمہیں اور تمہاری محبت کو پا کر بے حد خوش اور مطمئن ہوں اور زندگی کے ساتھ بھرپور انجوائے کر رہا ہوں، لیکن پتا نہیں تمہارے دل میں کیا پل رہا ہے؟ تم اب خوش نہیں ہو میرے ساتھ..... کیا تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں؟''

''کیا کہہ رہے ہو تم رابرٹ؟'' سونجنا ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ ''میں نے تمہاری خاطر اپنا سب کچھ

Digitized by Google

چھوڑ دیا اور تم اب مجھے بیچ منجھدار میں لا کر اس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟ میں بھلا کسی اور سے محبت کرتی ہوتی تو تمہارے ساتھ.....''

''مجھ پر احسان جتانے کی کوشش مت کرو۔'' رابرٹ بھی بدلحاظی... دکھانے پر اتر آیا۔ ''تم نے میری خاطر کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ خود ہی تم لوگوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا، بلکہ اب تک نکل چکا ہوگا۔ میں تو خود تمہیں بربادی کے گڑھے سے نکال کر ایک نئی اور سہانے سپنوں کی خوشیوں بھری دنیا میں لے جا رہا ہوں، لیکن تم.....''

رابرٹ نے دانستہ یہ کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ناراضی کے اظہار میں کرسی چھوڑ کر اپنے عرشے کی ریلنگ کے پاس جا کھڑا ہوا اور یونہی دور ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا نظارہ کرنے میں محو ہو گیا۔ سونجنا کی کجراری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ذرا ہی فاصلے سے کوئی بدستور اسے نظروں میں لیے ہوئے تھا۔

یہ شفیق تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس وقت..... ان سے چند قدموں کے فاصلے پر بیٹھا بہ غور ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ارے برخوردار! کہاں کھوئے ہوئے ہو تم؟''

اچانک اس کے سامنے چائے کا پیالہ تھامے بیٹھے مقبول مٹھون نے جیسے کہیں کھویا ہوا اور متوجہ پا کر کہا۔

''تمہاری چائے پڑی ہے اور تم ہو کہ ادھر دیکھ ہی نہیں رہے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے، اٹھاؤ پیالہ۔''

''جج..... جی، ابا جان!'' شفیق چونکا اور فوراً پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتارے اور ایک بار پھر وزدیدہ نظروں سے سونجنا کی طرف دیکھا۔

رابرٹ کے بعد اب سونجنا نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی اور ریلنگ سے ٹکے کھڑے رابرٹ کی طرف بڑھی۔

اس نے رابرٹ سے کچھ کہا تھا کہ اچانک رابرٹ برا سا منہ بناتے ہوئے اسے وہیں چھوڑ کر ایک طرف کو بڑھ گیا۔ سونجنا وہیں کھڑی اسے جاتا تکتی رہ گئی۔ ایسے میں شفیق کی بے چینی عروج پر تھی مگر باپ سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا دل سونجنا کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ وہ یوں اپنے باپ کی موجودگی میں اچانک اپنی کرسی چھوڑ کر سونجنا کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔

''ہاں میاں! میں کہہ رہا تھا کہ لندن میں مشتاق قیصرانی صاحب ہیں نا..... بھئی واہ! کیا سچا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ ہمیں ایک بڑا آرڈر دلوانے والا ہے، اپنا کمیشن تو اس نے رکھا ہی ہے لیکن ہمارا فائدہ بھی کیا ہے۔''

''جی ابا جان! آپ نے بتایا تھا۔'' شفیق نے مختصراً کہا۔

''ایک اور بات سن لو۔'' مقبول مٹھون بیٹے کی جانب تھوڑا جھکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

''اس کی ایک اکلوتی بیٹی بھی ہے عمیرہ..... بہت پیاری اور خوب صورت ہے۔ تم اس سے مل کر یقیناً خوش ہوگے۔''

''جی ابا جان! یقیناً۔''

''اے! تم کہیں کھوئے ہوئے ہو؟'' اچانک مقبول بولا۔

''نن..... نہیں تو۔'' شفیق ذرا گڑبڑا گیا پھر بولا۔

''اصل میں، میں ذرا دن کی روشنی میں دور پرے تک کھلے سمندر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا ابا جان.....!''

''اچھا برخوردار! تم نظارہ کرو۔'' وہ چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی پیالہ میز کی سطح پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''میں تو چلا اپنا پان کھانے، سسری چائے کے بعد تمباکو کی طلب بے چین کر دیتی ہے۔'' وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ شفیق کی جیسے مراد بر آئی۔

ادھر باپ نے جیسے ہی کرسی چھوڑی، وہ جلدی سے اٹھا اور تیر کی طرح ذرا فاصلے پر کھڑی سونجنا کی طرف بڑھ گیا۔

ادھر عرشے کے مغربی کونے کی ایک مختصر گلی سے..... جس کے آخری کونے میں چیتن شرما کا کیبن تھا، وہ وہاں سے برآمد ہوا۔

اسے ابھی تک چڑھی ہوئی تھی، تاہم اس کا دماغ ابھی ماؤف سا تھا۔ کیبن میں اس کا دل ایک دم گھبرا سا گیا تھا۔ وہ کھلی فضا میں آنا چاہتا تھا تاکہ دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہو کہ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا؟

اگرچہ اسے رفتہ رفتہ یاد آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔ وہ جب اپنے کیبن سے کچھ یاد کرتا ذہن پر زور دیتا ہوا باہر عرشے پر آیا تو اچانک اس کی نظر..... سونجنا پر پڑ گئی جو ریلنگ سے لگی کھڑی تھی۔ اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ وہ اپنا ''مسئلہ'' بھی ذرا دیر کو بھلا بیٹھا تھا۔ پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا لیکن پھر تسلی کی خاطر جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اسے پوری طرح پہچان کر بری طرح چونکا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''ارے..... ارر..... راجکماری سونجنا.....''

سونجنا ہراساں انداز میں پلٹی، یہی وہ وقت تھا جب شفیق بھی اپنی کرسی چھوڑے اس کے قریب آن پہنچا تھا اور اس کے کانوں سے بھی چیتن شرما کے یہ الفاظ ٹکرائے تھے۔

ان تینوں کے لیے جیسے بلکورے لیتی آزاد فضا یکایک تھم گئی تھی۔

(جاری ہے)

Digitized by Google

محبت کا صلہ

شاہ زین رضوان

صلہ چاہے محبت کا ہو یا نفرت کا اپنا اثر تو ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ وہ جو خوبصورت رشتوں کی ڈوری میں بندھی زندگی کے دن گزار رہی تھی کہ آہستہ آہستہ سازشوں کی چادر میں لپٹتی چلی گئی حتیٰ کہ تمام مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ ایسے میں اندھیرے نے اس کے جنون کو مہمیز کیا اور پھر وہ تنہائی کے دریا میں بہتی کنارے تک بالآخر پہنچ ہی گئی۔

محبت کے صلے میں..... دشمنی پانے والی ایک صنف نازک کا ماجرا

ڈیریل کی میموریل والے دن پہلی بار مجھے اپنے ہاتھوں کے سن ہونے کا احساس ہوا۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے میرے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس کیفیت نے میرے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مجھے یوں لگا کہ میں چکرا کر گر پڑوں گی۔ وہ ایک روشن دن تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن سردیوں کی دھوپ میں اتنی حرارت نہیں ہوتی کہ جسم کو گرم رکھ سکے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے کپکپاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور

بارش کی دعا مانگی اور کسانوں نے میری تائید میں سر ہلایا۔

میں نہیں جانتی کہ اس یادگاری تقریب کے لیے ڈائریکٹر نے اپنے دو معاونین کے ہمراہ دو سے زائد مرتبہ وہاں کا دورہ کیا تھا۔ میں آئی ڈیل میں رہتی ہوں اور وہاں اب بہت کم جوان رہ گئے ہیں۔ ہم ہال کے باہر کھڑے ہوئے تھے کہ بگل بجانے والوں نے ڈیریل کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے دھن بجائی۔ میں اپنے شوہر کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی کہ ان میں سے ایک شخص نے خالی کارتوس ایک جھنڈے میں لپیٹ کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیے۔

اسی روز کوڈی اور لارا میرے پاس آئے۔ میری سیکنڈ کزن اپنے شوہر کی پک اپ میں مجھے گھر چھوڑنے آئی تھی۔ راستے میں اس نے میرے لیے ابلے ہوئے انڈے اور سینڈوچ لیے جن کی پلیٹیں میری رانوں پر ہی رکھی رہیں۔ میری کزن نے رکنے کی پیشکش کی لیکن میں جانتی تھی کہ یہ محض دکھاوا ہے اور جب میں اسے اپنے گھر جانے کے لیے کہوں گی تو وہ یقیناً سکھ کا سانس لے گی۔

گھر کے اندر سردی تھی اور باہر سے آنے والے ہوا کے جھونکوں سے اس میں مزید شدت آگئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ ڈیریل ہر روز صبح سورج نکلنے پر اپنا نہانے کا گاؤن پہنے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتا اور گاڑیوں کو گزرتے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے بچا ہوا کھانا میز پر رکھا اور فریزر سے مٹر نکالنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس کے علاوہ بھی میں نے بہت سی چیزیں محفوظ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ جب ڈیریل نے کھانا چھوڑ دیا اور اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا تو موسم گرما شروع ہو چکا تھا۔ میرے باغ میں اس بار بھی بیر، ٹماٹر، تربوز اور مرچوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور باقی محفوظ کر دیں۔ اس وقت میں اپنی سرد بند غذاؤں کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔

وہ ہائی وے کے کسی موٹیل سے آئے تھے۔ اس کا نام انہوں نے ویسٹرن ونڈز بتایا اور اس کے عقبی کمروں میں سے ایک میں رہتے تھے جبکہ وہ موٹیل ان کی کسی خالہ یا شاید کزن کی ملکیت تھی۔ بہرحال اب وہ جگہ متروک ہو چکی تھی اور ان کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔

میں مقفل دروازے کے پیچھے سے بات کر رہی تھی کیونکہ ڈیریل کی یہی ہدایت تھی۔ میں نے کہا۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''ہم تم سے تعزیت کے لیے آئے ہیں۔'' لارا نے کہا۔

''اگر تمہیں باتیں کرنا ہوں تو لارا دن میں تمہارے پاس رہ سکتی ہے۔'' کوڈی نے کہا۔ اس نے اپنا بازو کمر پر رکھا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی عمر تیس کے قریب ہوگی لیکن وہ اچانک ہی مجھے بہت چھوٹا لگنے لگا۔ مجھے ان کی سنجیدگی اچھی لگی۔ ان کے کپڑے تھوڑے سے میلے ہوئے تھے اور ناپ میں بھی بڑے تھے۔ تاہم میں دل ہی دل میں ان کے اچھے برتاؤ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''تم اندر کیوں نہیں آجاتے؟'' میں نے کہا اور دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ''اگر تم لوگ پہلے مل جاتے تو اچھا ہوتا۔''

''ہاں، واقعی ہمیں آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔''

میں نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ کھانا کھاؤ گے یا کافی بناؤں؟''

''شکریہ میم!'' کوڈی نے کہا اور میٹ پر اپنے بوٹ صاف کرنے لگا۔ اس کا چہرہ گول تھا اور اس نے کلین شیو کیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ڈینم کی جیکٹ اتاری تو میں نے دیکھا کہ اس کے بازوؤں پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن میں چشمے کے بغیر نہیں پڑھ سکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس طرح گھل مل گئے جیسے میں انہیں عرصے سے جانتی ہوں۔ کوڈی مجھے اپنے دوستوں اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ گو کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن پھر بھی میں اس کی باتیں توجہ سے سنتی رہی اور اس کا ہر لفظ اپنے دماغ میں بٹھا لیا۔

میں نے لارا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گرمجوشی تھی اور اس نے مصنوعی پلکیں بھی نہیں لگائی ہوئی تھیں جبکہ اس عمر کی لڑکیاں اپنی آنکھوں کو پُرکشش بنانے کے لیے خاصا جتن کرتی ہیں۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت نرم مزاج ہے۔ گو کہ مجھے اس کے چہرے پر پریشانی نظر آئی۔ اس نے اپنے بالوں پر بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی بلکہ انہیں پیچھے کی جانب کس کر باندھا ہوا تھا۔

لارا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور بولا۔

''مینی! تم ایک مہربان عورت لگتی ہو۔ ڈیریل بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوگا۔''

یہ سن کر میرا جذباتی ہونا ایک فطری امر تھا لیکن اس نے جس اعتماد اور یقین سے یہ بات کہی تھی، اس سے میرے اندر گرمجوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے انہیں اگلے روز رات کے کھانے پر بلایا پھر اگلے روز وہ خود ہی آگئے۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا اور وہ ہفتے میں دو دن میرے یہاں کھانا

Digitized by Google

کھانے لگے۔ میں انہیں اپنے اور ڈیریل کے قصے سناتی۔ مجھے اس وقت کی باتیں بھی یاد تھیں جب ہم دونوں بہت چھوٹے تھے۔ ہم برف پر ڈانس کرتے اور خوب لڑتے جھگڑتے۔ اس کی وجہ سے میں اکثر گرتی اور برف پر پھسلتی ہوئی دور چلی جاتی۔

مجھے وہ سال بھی یاد تھا جب آئی ڈیل کی ٹیم نے فٹ بال چیمپئن شپ جیتی تھی اور وہ دن بھی کبھی نہیں بھول سکتی جب ڈیریل پڑوسن کے بالاخانے میں بلب لگا رہا تھا کہ چھت سے گر پڑا اور اس کی دونوں ٹانگیں ان کے پارلر پر جھولتی رہیں۔ بڑی مشکل سے اسے اتارا گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ڈیریل کی کرسی کے پاس بیٹھ جاتی اور اس سے ان بچوں کی باتیں کیا کرتی۔ ڈیریل نے کبھی زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کی اور ہم تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دیتی کہ وہ کوڈی اور لارا کی باتیں سن کر خوش ہوتا ہوگا جبکہ میں جانتی تھی کہ یہ سچ نہیں ہے۔

ایک دن میں نے سوچا کہ بیڈروم سے ڈیریل کی چیزیں ہٹادوں لیکن ان میں سے کچھ میں نے وہیں رہنے دیں۔ مثلاً اس کی ایک بہت پیاری ٹیبل اور رے چارلس کا ریکارڈ جسے وہ بہت پسند کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا رجسٹر بھی میں نے وہیں رہنے دیا۔ سوچا تھا کہ اس کی کچھ نظمیں پڑھوں گی۔ زندگی میں تو اس نے کبھی مجھے اس رجسٹر کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ میں نے پہلا صفحہ کھولا۔ وہ نظم ایک دیہاتی کے بارے میں تھی جس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ دوسری نظم ایک سپاہی کے بارے میں کہی گئی تھی جو جنگ میں گولہ لگنے سے زخمی ہوگیا تھا۔ میں نے اکتا کر رجسٹر بند کردیا اور بیڈروم کے فرش پر بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھوں میں سنسناہٹ ہورہی تھی اور دماغ سن ہوگیا تھا۔

میں کافی دیر تک اسی حالت میں فرش پر بیٹھی رہی پھر جب طبیعت بحال ہوئی تو میں نے وہ چیزیں گتے کے ڈبوں میں پیک کرنا شروع کیں۔ میں نے انہیں اپنی کار میں رکھا اور گڈول اسٹور کی طرف جانے لگی تاکہ یہ چیزیں کسی کے کام آجائیں لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا۔ میرے گھر کے عقب میں ایک بڑا شیڈ تھا جہاں میں اپنا فالتو سامان رکھتی تھی۔ اسی کے ایک حصے میں ڈیریل نے ایک چھوٹی سی ورکشاپ بنا رکھی تھی۔ میں نے یہ باکس بھی وہیں رکھ دیے۔

اس روز میں ایک بڑا باکس لے کر جارہی تھی جس میں ڈیریل کی دوائیں تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں۔ تبھی میں نے کوڈی کو موٹیل کے پارکنگ لاٹ میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ کسی شخص کے ساتھ گفتگو کررہا تھا۔ میں نے باکس نیچے رکھا اور اسے ہیلو کہنے کے لیے آواز دی۔ اب وہ موٹیل دوبارہ آباد ہوگیا تھا اور وہاں سے دن بھر کاریں اور پک اپ گزرتی تھیں اور اب وقت آگیا تھا کہ اس کی حالت بہتر بنائی جائے تاکہ وہاں فیملیز قیام کرسکیں۔ اسی لیے میں نے وہاں کچھ کاریگر اور مزدور نما لوگ دیکھے تھے لیکن یہ شخص ان سے مختلف لگ رہا تھا۔ وہ اور کوڈی گٹروں پر بحث کررہے تھے۔ میں نے کوڈی کو کبھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا لیکن اس وقت وہ چلا رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر سکون کا سانس لیا کہ انہوں نے میری آواز نہیں سنی تھی لیکن کوڈی نے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سڑک پار کرنے کے لیے آگے بڑھا جبکہ دوسرا شخص اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔

''میں تمہارا باکس اٹھالیتا ہوں۔'' اس نے یہ کہہ کر باکس اٹھالیا اور بولا۔ ''یہ جوتی ہے۔''

''تم وہی آنٹی ہو جس کے بارے میں سنا ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس جیسا بدصورت شخص نہیں دیکھا تھا۔ اس کا وزن کم از کم تین سو پونڈ تو ہوگا۔ انہوں نے چند منٹوں میں ہی میرا سامان شیڈ تک پہنچا دیا۔ انہوں نے آخری باکس زمین پر رکھا اور جوتی نے شیلف میں سے اچار کی ایک بوتل نکال لی۔

''اوہ..... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ یہ کتنا پرانا ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا اور اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔ حالانکہ وہ پچھلی گرمیوں میں ڈالا گیا تھا۔ میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ اب اس کی نظریں شیشے کے مرتبان میں رکھے پھلوں پر تھیں۔

''مجھے کچھ چکھنے دو۔'' اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور شیلف سے ایک دوسری بوتل نکال لی۔ ''میرے دادا بہت اچھا اچار بناتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ کچن میں ہوتا اور ہم دونوں اکٹھے ریڈیو سنا کرتے۔''

کوڈی نے دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اسے ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس کی وجہ سے دروازہ پورا بند نہیں ہورہا اور اس خلا میں سے چوہے بہ آسانی اندر آسکتے ہیں۔''

جوتی نے ڈیریل کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کتنے اچھے اوزار ہیں۔ انہیں استعمال ہونا چاہیے۔''

مجھے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ کوئی ڈیریل کی چیزوں کو ہاتھ لگائے لہٰذا میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''ہمیں کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ڈیریل خود ہی سب ٹھیک کرلیتا تھا۔''

Digitized by Google

کوڈی نے دوبارہ ہینڈل کو کھینچا اور بولا۔ ''اسی لیے اب میں ان چیزوں کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' میں نے کہا، گو یہ بدتہذیبی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو یہاں لاکر میں نے ڈیریل سے دھوکا کیا ہے۔

''میں بھی تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔'' جونی اپنی قمیص نیچے کھینچتے ہوئے بولا۔

کوڈی نے اپنا سر ہلایا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں پیشے کے لحاظ سے ایک کاریگر ہوں لیکن خیر جو تم مناسب سمجھو۔''

''تم بہتر سمجھ سکتے ہو، جب مجھے ضرورت ہوئی تو تمہیں بلالوں گی۔''

اسی لمحے مجھے فضا میں گھٹن کا احساس ہوا۔ جونی کے سگریٹوں اور پسینے کی بُو ناگوار گزر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں ایک بار پھر سنسناہٹ ہونے لگی۔ ''کیوں نہ ہم پورچ میں چل کر بیٹھیں۔ میں تمہارے لیے لیمن جوس بناتی ہوں۔''

کچن میں آکر میں نے سوچا کہ میرا رویہ کچھ عجیب سا ہے جبکہ یہ دونوں میری مدد کرنا چاہتے ہیں چنانچہ میں نے انہیں لیمن جوس دیتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں آج رات میرے مہمان ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک پچاس ڈالر کا نوٹ کوڈی کو پکڑا دیا۔

''نہیں میم! اس کی ضرورت نہیں۔'' کوڈی نے کہا لیکن میں نے زبردستی وہ نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''آج تم ہیلیلین میں جاکر تفریح کرو۔''

جونی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے دادا کے علاوہ شاید زندگی میں کسی نے بھی اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہیں کیا اور یہ سوچ کر میں افسردہ ہوگئی۔

ہماری کوئی اولاد نہیں تھی اور میں نے اپنے ان جاننے والوں سے حسد کرنا چھوڑ دیا تھا جو اولاد کی نعمت سے مالا مال تھے تاہم جب لارا نے مجھے بتایا کہ وہ حاملہ ہے تو میرے سینے میں جیسے کوئی پھانس سی چبھ گئی لیکن میں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا مگر خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے جو زیادہ مناسب بات تھی، میں سنجیدہ ہوگئی۔ اس وقت ہم پورچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

''تم اس کا نام کیا رکھو گی؟'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن یوں لگا جیسے کسی بھاری بوجھ تلے دبی جارہی ہوں۔

لارا بولی۔ ''اگر لڑکی ہوئی تو میرے ذہن میں دو نام ہیں..... لیلی اور صوفیہ اور لڑکے کا نام ہم نے کولٹ سوچا ہے لیکن یہ فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تو پہلے دوسری باتوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ بچہ کہاں سوئے گا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے تائید میں سر ہلایا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بچے کا تصور آیا جو موٹیل کے پارکنگ لاٹ میں گھٹنوں کے بل پھر رہا تھا۔

''کیا کوڈی نے کلاس لینا شروع کردی؟'' میں نے پوچھا۔ ایک ہفتہ پہلے انہوں نے بتایا تھا کہ وہ کوئی ملازمت کرنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہاں سے اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی جاسکتا ہے اور شاید لارا بھی۔ میں نے سوچا کہ یہ اچھا خیال ہے چنانچہ میں نے اسے ساری تیاری کروادی تھی۔

''ہاں۔ اس نے گزشتہ ہفتے سے جانا شروع کردیا ہے۔'' لارا نے کہا۔ ''لیکن اس وقت میں تمہارے پاس ایک اور کام سے آئی تھی۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا تم میرے ساتھ چرچ جاسکتی ہو کیونکہ کوڈی اس معاملے میں بہت ضدی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ خدا سے رجوع کرنے کا بہترین وقت ہے۔''

''ڈیریل اور میں کبھی باقاعدگی سے چرچ نہیں گئے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.....'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''عام طور پر ہم صرف ایسٹر پر ہی چرچ جایا کرتے تھے۔'' میں نے قہقہہ لگایا۔ ''مجھے ہمیشہ یہ جستجو رہی کہ کیتھولک اجتماع کیسا ہوتا ہے۔''

''میں کیتھولک نہیں ہوں۔''

میں شرم سے سرخ ہوگئی۔ اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ ''ہم اولڈ میتھوڈسٹ چیپل جائیں گے جو ایلسن میں ہے۔''

''وہ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے لیکن کوئی بات نہیں۔''

چرچ سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ ملنے ملانے کی غرض سے پارموٹی ہال کی طرف چلے گئے۔ جس خاتون نے پیانو بجایا تھا، اب وہ ایک پلاسٹک کی میز پر کھڑی چاکلیٹ کیک کے ٹکڑے بنا کر کاغذ کی پلیٹوں میں رکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔ وہ میری پرانی دوست انیتا تھی۔ ہم گلے ملے اور باتیں شروع ہوگئیں۔ تھوڑی دیر بعد لارا میرے پاس آئی اور بولی۔ ''میں تھک

Digitized by Google

چکی ہوں، چلنے کی تیاری کرو۔"

انیتا نے پہلے لارا پھر مجھے دیکھا اور بولی۔ "مینی! میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گی۔"

لارا کندھے اچکا کر رہ گئی۔ لگتا تھا جیسے اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انیتا بولی۔ "مجھے اپنی میوزک شیٹ لینی ہے، میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اسکول میں میری کلاس فیلو تھی۔ بعد میں وہ میوزک ٹیچر بن گئی۔ اس کا شوہر ٹومی بھی میری کلاس میں تھا لیکن اب وہ بے چارہ بیماری کی وجہ سے گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا ایک بازو میرے کندھے پر رکھا اور میرے ساتھ عبادت گاہ میں جاتے ہوئے بولی۔ "مجھے ڈیریل کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ معذرت خواہ ہوں کہ اس کی میموریل سروس میں نہ آسکی۔ کیا تمہیں میرا کارڈ مل گیا تھا؟ میں نے جب اس کی موت کی خبر پڑھی تو فون کرنا چاہ رہی تھی لیکن میرے پاس تمہارا نمبر نہیں تھا۔"

"تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ "یہ میری اور ڈیریل کی غلطی تھی کہ ہم نے دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود ان میں سے کچھ اس کے جنازے پر آگئے۔"

انیتا نے اپنی میوزک بک موڑ کر پرس میں رکھی اور بولی۔ "میں تمہیں بہت یاد کیا کرتی تھی۔ تم چرچ بھی نہیں آتی تھیں جبکہ میری نظریں اسی امید پر تمہیں ڈھونڈتی تھیں کہ شاید تم بھی بھولے سے یہاں آجاؤ۔ آج تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے اس جگہ سے پیار ہے۔ پادری ڈی کا وعظ کرنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ اگلے اتوار کو ون ڈش پارٹی ہے، اس میں تم اپنے کچھ محفوظ کیے ہوئے کھانے لے کر آنا اور بدھ کو بائبل کا درس ہے....."

میں نے سر ہلا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اب بھی میری دوست بننا چاہ رہی تھی۔ اس نے بیالو کی میز کے عقب میں ایک الماری کا دروازہ کھول کر مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سرخ مشروب کی بوتلیں اور ویفرز کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے برابر میں پلاسٹک کی پیالیاں اور سنہری ٹرے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک آدھی بھری ہوئی بوتل کھولی اور اس میں سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ میں بھی اپنے آپ کو پینے سے نہ روک سکی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ میرے لیے نئے تجربات کا دن تھا۔

"میں کبھی کبھی کسی اتوار کو یہ شغل کرتی ہوں، جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ کھلی ہوئی بوتلوں کو پھینک دیتے ہیں۔ میری نظر میں اس طرح ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔"

"میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔"

"یہ لڑکی کیا تمہاری رشتے دار ہے؟ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔" میں نے جواب دیا۔ انیتا نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں اور منہ بنا لیا جس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اچھا ہے کہ کچھ نوجوان لوگ ہمارے ساتھ رہیں۔ یہ اور اس کا بوائے فرینڈ دونوں بہت اچھے ہیں اور میں انہیں پسند کرتی ہوں، یہ دونوں ویسٹرن ونڈز میں رہتے ہیں۔"

"لگتا ہے کہ آج کل تم ان لوگوں کے ساتھ وقت گزار رہی ہو؟"

میرے ذہن پر اس وقت بھی ڈیریل چھایا ہوا تھا۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ "تم نے ساری زندگی ایک شخص کے ساتھ گزار دی اور تم اس کی عادی ہو گئی ہو۔"

"ہاں، میں اور ٹومی ایک طویل عرصے سے ساتھ ہیں۔ جیسے ایک جان دو قالب ہوں۔"

"اور میں تنہا زندگی بسر کر رہی ہوں۔"

"اوہ مینی!" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ ہم جانے والوں کو مسلسل یاد کرتے ہیں لیکن ان کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ "مجھے گھر سے دوبارہ باہر نکلنے کے بعد یہ احساس ہو رہا تھا۔ میں کافی سکون محسوس کر رہی ہوں۔"

"خاص طور پر اگر وہ شخص ڈیریل جیسا ہو۔" انیتا بڑبڑائی۔

مجھے یاد آگیا کہ انیتا اور میری دوسری سہیلیوں نے پہلے پہل ڈیریل کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ وہ نہ صرف قدرے سنجیدہ ہے بلکہ عمر میں بھی مجھ سے زیادہ ہے۔ اس وقت میں سترہ کی اور وہ چھبیس سال کا تھا لیکن اس سے ملنے کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل لی۔ تاہم مستقبل کے بارے میں تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ہم نے بوتل ختم کی اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر آگئے۔ پارکنگ لاٹ خالی ہو چکا تھا اور وہاں صرف انیتا کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ انیتا نے ایک جھٹکے سے گاڑی ریورس کی اور پیچھے لگے ہوئے بائیک اسٹینڈ سے ٹکرا دی۔ ہم گاڑی سے باہر آئے۔ اس کا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔

"اوہ..... یہ کیا ہوا؟" وہ بڑبڑائی۔ "میں ٹومی کے

Digitized by Google

معاون کو بلاتی ہوں۔''

ہم گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ انیتا بولی۔ ''میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ یہ لڑکی اور اس کا دوست تمہاری دولت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ تمہارے ڈیڈی کی زمین فروخت کرنے سے تمہیں اور ڈیریل کو اچھی خاصی رقم ملی تھی۔''

''میں بوڑھی اور احمق ضرور ہوں لیکن سٹھیا نہیں گئی۔''

''میں جانتی ہوں، میں تو صرف.....''

''کیا صرف؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دانتوں پر لپ اسٹک لگی ہوئی ہے؟''

''اوہ معاف کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا۔

''اس کے علاوہ.....'' میں نے کہا۔ ''میرے والدین کو رخصت ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ کوئی نئی خبر ہے؟''

اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی اور تمہارے ڈیڈی اتنے سمجھدار تھے کہ گھر میں بیٹھ کر ہی موسم کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کی چھٹی حس بہت تیز تھی۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ کر اندازہ لگا لیتے کہ طوفان آنے والا ہے اور ان کے اندازے اکثر درست ہوتے تھے۔''

''میں بھی اسی طوفان کی طرف اشارہ کر رہی ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

تمہارے کا یہ فائدہ ہے کہ مجھے کسی کو بتانا نہیں پڑتا کہاں جا رہی ہوں۔ بس چل دیتی ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے دور کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں کیونکہ میں راستوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میں تیز گاڑی چلاتی ہوں۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ میں اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے پولیس کار کے آنے کا پتا بھی نہ چلا۔ اس کے مسلسل سائرن بجانے پر مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ اس میں سے ایک شخص باہر آیا اور میری کھڑکی کا شیشہ بجا کر کہا کہ میں قصبے میں ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔

''اچھا تو تم وہی ہو جو ہائی وے ایک سو بیس پر رہتی ہے۔'' اس نے طنزاً کہا۔ وہ نیا شیرف ایڈ بیکر تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس بار تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ چالان نہیں کرتا۔ دراصل میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہارے گھر کے جنوب میں متروکہ گھروں پر موشن سینسر لائٹس لگوا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو تمہارے گھر بھی لگ سکتی ہے کیونکہ پچھلے دنوں نقب زنی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔''

''نہیں شکریہ۔ میرے گھر کوئی چوری نہیں ہوئی۔''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میں تمہیں مسئلے سے آگاہ کر رہا ہوں؟ تم تو یہاں کافی عرصے سے ہو۔''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ جانتی تھی کہ ہمارا قصبہ تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ ایک ماہ قبل میں سیکنڈ ایونیو سے اپنی کار میں گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے تمام مکانوں کے دروازوں پر لکڑی کے تختے لگا دیے گئے تھے یا ان کی کھڑکیوں کو ٹین کی چادروں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ وہاں مجھے کوئی آتا جاتا نہیں دکھائی دیا۔ صحن میں فالتو سامان اور پورچ میں ٹوٹا ہوا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ اسی لیے بیکر میرے بارے میں فکرمند ہو رہا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ لوگ میری عزت اور احترام کرتے ہیں۔

اس نے مجھے جانے دیا اور میں ایک بار پھر تیزی سے گاڑی دوڑاتی ہوئی گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ ہائی وے کے ساتھ ساتھ مکانات جو کبھی زرد اور کریم رنگ کے تھے، اب گرد میں ڈوب چکے تھے۔ ایڈ بیکر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ گو کہ ان میں سے بیشتر مکانات خالی تھے اور ان کے مالکان ریسٹ ہوم میں جا چکے تھے۔ ان کے بچوں کے پاس بھی کوئی کام نہیں تھا کیونکہ کپاس کی پیداوار گھٹ گئی تھی اور گوشت محفوظ کرنے کا پلانٹ بند ہو چکا تھا۔ سو وہ بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے اور قصبے میں واپس نہیں آئے لیکن میں جانتی تھی کہ یہ جگہ ہمیشہ میرا گھر رہے گی۔

اس قصبے کے لوگ ہمیشہ سے غریب تھے جس میں ہم بھی شامل ہیں۔ اگر بارش نہ ہو تو اس کے گھر والوں کو کھانے کے لالے پڑ جاتے لیکن میں حیران تھی کہ اس کے باوجود وہ ہمیشہ اجنبیوں اور غیر یقینی حالات کے بارے میں مجھ سے زیادہ چوکنا رہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ جنگ میں حصہ لے چکا تھا۔ وہ گھنٹوں اندھیرے میں اکیلا بیٹھا مشروب پیتا رہتا اور پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو جاتا۔ ذرا سی آہٹ یا کھٹکے پر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ ہمیشہ بھرا ہوا پستول ڈریسر کی دراز میں رکھا کرتا تھا۔

میں نہیں سمجھتی کہ بہادری سے جنگ لڑنے پر ملنے والے تمغوں کے علاوہ اس کی قربانیوں کے اعتراف میں کچھ

Digitized by Google

کیا گیا ہو۔ اس کی پوری زندگی انہی سایوں کے تعاقب میں گزر گئی۔ اس لحاظ سے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ میں نے کوڈی کو اپنے گھر آنے دیا۔ پھر ایک روز کوڈی نے عجیب حرکت کی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ ڈیریل اجنبیوں سے کیوں دور رہتا تھا۔ لارا اور کوڈی میرے گھر آئے ہوئے تھے کہ اچانک ہی کوڈی نے مینٹل پیس سے ڈیریل کے تمغے اٹھا لیے اور فریم سے نکال کر ان سے کھیلنے لگا۔

''اے..... میری طرف دیکھو۔'' اس نے ان میں سے ایک تمغا سینے پر لگا کر سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ''یہ سلور اسٹار ہے۔''

میں تمغا لینے کے لیے آگے بڑھی لیکن وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''ذرا صبر کرو۔''

''کوڈی.....'' لارا نے اسے تنبیہ کی۔

''تم کبھی بھی ایک سپاہی نہیں بن سکتے جب تک تم یہ نہ سیکھ لو کہ دوسروں کی عزت کیسے کی جاتی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہماری کاؤنٹی میں میرے شوہر کو سب سے زیادہ تمغے ملے۔ شاید وہ پورے ٹیکساس میں پہلے نمبر پر رہا ہو۔ اگر وہ چاہتا تو اس کی تدفین آرلنگٹن میں بھی ہو سکتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم اس کی قربانی کو نہیں سمجھ سکتے.....''

''مینی!'' کوڈی کے چہرے کی مسکراہٹ رخصت ہوگئی اور وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے بارے میں زیادہ نہیں جانتیں۔ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہو جنہوں نے ہمیشہ میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔''

''تم جانتے ہو کہ یہ سچ نہیں ہے میرے بچے۔'' میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگی۔ ''میں معذرت خواہ ہوں۔''

کوڈی نے وہ تمغے واپس اپنی جگہ پر رکھ دیے اور لارا کے پاس جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں رات کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کوڈی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ فوج میں جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن وہ ڈیریل کی طرح ہوشیار اور سمجھدار نہیں تھا اور نہ ہی اس کی طرح بہادر لیکن اس پر ایک حاملہ گرل فرینڈ کی ذمے داری تھی۔ ان میں سے ایک یا دونوں کو کالج میں بھی داخلہ لینا تھا لیکن اس موٹیل میں رہ کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب میں باقاعدگی سے چرچ جانے لگی گو کہ پہلی بار میں لارا کی وجہ سے وہاں گئی تھی لیکن اب وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ تھکن کی وجہ سے اس کے لیے صبح اٹھنا مشکل تھا اور وہ اکثر اتوار کے دن باہر نہیں نکل پاتی تھی۔ اس وقت میں نے اس بارے میں نہیں سوچا لیکن اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ کیا میں نے کسی ایسی بات کو نظر انداز کر دیا تھا جس سے پتا چلتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ڈیریل اکثر کہا کرتا تھا کہ مینی تم نہیں جانتیں کہ کتاب کے اگلے صفحے پر کیا لکھا ہوا ہے اور میں یہ سن کر چڑ جاتی تھی۔ ہر کوئی اس کی طرح چوکس اور محتاط نہیں ہوتا۔

اس اتوار کو میں چرچ سے فارغ ہو کر سیدھی گھر آئی اور جب میں نے گاڑی ڈرائیوے میں روکی تو لارا کو پورچ کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پاجامہ اور ایک بڑی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ سیدھی بستر سے اٹھ کر آ گئی ہے۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک کتے کی شکایت کی جو اسے کافی خطرناک لگا پھر وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اس طرح بھونکنے والے کتے خطرناک نہیں ہوتے۔ میں اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔ میں نے کیک بنایا ہے جو تمہیں یقیناً پسند آئے گا۔''

وہ اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''اچھا۔ میں بیئر لے کر آتی ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے کندھے اچکا دیے۔ میرے ہاتھوں میں سنسناہٹ شروع ہوگئی اور سینہ جکڑنے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی پریشانی ہو چنانچہ اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے میں وہ گولیاں لینے روم میں گئی جو ڈاکٹر نے مجھے دی تھیں۔ میں نے دواؤں کی الماری کھولی تو وہاں ایک خالی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ گولیاں کہاں گئیں۔ لارا کے لیے بنایا ہوا بیئر کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا اور میرے دماغ میں ایک شک ابھر رہا تھا۔ میں احمق نہیں تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ نوجوان نسل سکون حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی دواؤں پر ہاتھ صاف کر لیتی ہے۔ میں واپس لیونگ روم میں آئی اور لارا کو گلاس پکڑا دیا۔

''میرا دماغ بری طرح گھوم رہا ہے۔ کسی نے میری گولیوں کی شیشی خالی کر دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پورے ہفتے کے لیے کافی ہوں گی۔''

Digitized by Google

''یہ بڑی عجیب بات ہے۔'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں نے وہ گولیاں نکال لیں جو ڈاکٹر نے تمہارے لیے تجویز کی تھیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یقیناً تم یہ حرکت نہیں کرسکتیں۔''

اس نے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور بولی۔ ''کیا تم کسی بات کے لیے مجھے الزام دے رہی ہو؟''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں ایسا کیوں چاہوں گی؟''

وہ مجھے گھورنے لگی اور میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے کیوں اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔ لارا مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گی۔ میں دوا لانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی پھر خیال آیا کہ آج اتوار ہے۔ فارمیسی تو بند ہوگی۔

اسٹرابیری کا موسم آیا تو میں نے انہیں ڈبوں میں محفوظ کرنا شروع کردیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ میں اس کا چھلکا اتار کر اور اس میں چینی ملا کر چولہے پر جوش دیتی۔ اس طرح اس کا سوپ بن جاتا۔ ڈیریل کو میٹھا بہت پسند تھا اور جب وہ بیمار ہوا تو میں گھنٹوں کچن میں کھڑی رہتی اور سوچتی کہ شاید اس کے منہ میں ایک چمچہ ڈالنے سے اس کی طبیعت بہتر ہوجائے۔

اس وقت بھی میں ڈیریل کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ میرا کام تقریباً ختم ہوچکا تھا کہ جونی نے میرے کچن کی کھڑکی پر دستک دی۔ میں اس کی آمد سے بے خبر تھی، اس لیے بے اختیار میری چیخ نکل گئی۔ وہ الٹے قدموں بھاگا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو سنبھالتی، وہ گھر کے اندر آچکا تھا۔

''معاف کرنا۔ میں نے تمہیں ڈرا دیا۔'' اس نے کہا۔ ''میں کوڈی کو دیکھنے آیا تھا لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔''

مسلسل کام کرنے کی وجہ سے میں تھک چکی تھی اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ کچن میں گرمی بھی بہت تھی جس کی وجہ سے میں پسینے میں شرابور ہوگئی تھی۔

''مجھے بھی گرمی محسوس ہورہی ہے۔ کیا پانی مل سکے گا؟''

میں نے اسے ایک گلاس پانی دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہاں بیٹھنا چاہتا ہے۔ شاید اسے کچھ کھانے کی خواہش ہو۔ اس کی نظریں ان بوتلوں پر جم گئیں جو میں نے تیار کی تھیں۔

''ڈیریل کو اسٹرابیری بہت پسند تھی۔''

''او.....'' اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا شوہر..... اسے کینسر ہوگیا تھا؟''

''ہاں۔'' میں نے اپنا چہرہ صاف کرنے کے لیے ایک ٹشو نکالا۔

''کیا وہ بہت تکلیف میں تھا؟''

''ہاں۔ میرا بھی خیال ہے۔'' میں نے کہا اور چولہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس سوپ میں چمچہ چلانا ہے ورنہ یہ جل جائے گا۔''

جونی جانے کے لیے مڑا اور دروازے کے پاس رک کر بولا۔ ''مجھے تمہارے شوہر کی موت کا سن کر افسوس ہوا۔''

☆☆☆

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو کہ جونی کل یہاں آیا تھا؟''

''ہاں لیکن اس نے مجھے بالکل پریشان نہیں کیا۔ وہ تمہاری تلاش میں آیا تھا۔''

کوڈی میرے لیے مچھلی لے کر آیا تھا کیونکہ لارا مچھلی نہیں کھا سکتی تھی۔ اس لیے وہ مجھے دینے چلا آیا۔ ہم کچن کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس کی لائی ہوئی مچھلی درمیان میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم دونوں دوست ہو۔'' میں نے کہا۔

''جونی میرا دوست نہیں ہے۔'' اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

''وہ میرا کاروباری ساتھی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ میں نے تو پچھلے ہفتے تم دونوں کو.....''

''اس نے مجھ سے دھوکا کیا۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ تم سے دوبارہ ملنے آئے تو مجھے ضرور بتانا۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے پر رک کر اس نے پوچھا۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''نہیں۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو۔'' میں نے کہا پھر میں نے وہ حرکت کی جو اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر آئی اور اس کے چہرے کا بوسہ لے لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔

رات تین بجے کے قریب میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے خواب میں کوڈی کو دیکھا تھا، وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا اور میں اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں تھی۔

Digitized by Google

میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں ڈیریل کی کرسی پر جھک گئی۔ یہ بڑے شرم کی بات تھی اور اس طرح کے خیالات کو دل میں جگہ دینا بھی شرمناک تھا۔

میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ اس لیے میں اسٹرابیری کا دوسرا پیچ بنانے کچن میں چلی گئی کیونکہ انہیں محفوظ کرنا بھی ضروری تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں بوتلوں میں گھری ہوئی ہوں اور میرے لیے کام کرنے کی جگہ بالکل نہیں تھی۔ میں نے ایک باکس میں پہلے پیچ کی بوتلیں رکھنا شروع کر دیں تاکہ انہیں شیڈ میں منتقل کر دوں۔ میں نے اپنا ہاؤس کوٹ اور جوتے پہنے پھر خیال آیا کہ رات میں گھر سے باہر نکلنا حماقت ہے۔ ڈیریل مجھے بھی اس کی اجازت نہ دیتا لہٰذا میں نے ڈریسر سے اس کا پستول نکالا اور جیب میں رکھ لیا۔

میں نے پورچ سے باہر قدم رکھا۔ سیاہ رات کا سناٹا ہر سو چھایا ہوا تھا۔ خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی اور میں یہ سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ کہیں پڑوسیوں کا کتا مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ شیڈ کی طرف جاتے ہوئے میری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی اور رک گئی۔ میں گن استعمال کرنا نہیں چاہ رہی تھی کیونکہ میں نے دس سال پہلے دریا کے کنارے رائفل شوٹنگ کی تھی اور مجھے اس کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے باکس میں سے ایک بوتل نکالی اور آواز کی سمت اچھال دی۔ شیشے کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے لیکن کسی کتے کے بھونکنے یا غرانے کی آواز نہیں آئی۔ پھر میں نے ایک اور بوتل پھینکی لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

اس کے بعد میں نے دروازہ چرچرانے کی آواز سنی جیسے اندر سے کسی نے کوئی چیز مجھ پر پھینکی ہو۔ میں جانتی تھی کہ اندر جانا میرے لیے نقصان دہ ہوگا۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی۔ میں تیزی سے شیڈ کی جانب بڑھی۔ اندر بالکل اندھیرا تھا لیکن مجھے عقبی کونے سے ایک آواز سنائی دی، جیسے کوئی نیچی آواز میں غرا رہا ہو۔ یہ کوئی مرد تھا۔ میرے ہاتھ سے باکس گر گیا اور میری چیخ نکل گئی۔ مجھے اندھیرے میں بچنے کا سوچ نظر نہیں آیا پھر میں نے کسی کو دبے پاؤں چلتے دیکھا۔ میں نے بے اختیار کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اور میری انگلیاں ٹریگر پر جم گئیں۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور پستول میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ایک چیخ سنائی دی۔ ضرور کسی المار[illegible] تھی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور میری محفوظ کردہ چیزیں فرش پر بکھر گئی تھیں۔ میں نے اپنے سر میں اچانک ہی شدید قسم کا درد محسوس کیا اور چکرا کر گر پڑی۔

جب مجھے ہوش آیا تو سر میں شدید دھماکے ہو رہے تھے اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑی ہوئی اور بہ مشکل تمام سوئچ تلاش کر کے لائٹ جلا دی اور جو کچھ میں نے دیکھا، اسے شاید کبھی ذہن سے نہ مٹا سکوں۔ جونی زمین پر مُردہ پڑا ہوا تھا۔ اسے گولی لگی تھی۔ میں دوبارہ چکرا کر زمین پر گر پڑی۔

پہلی اس کے کندھے اور دوسری گولی اس کی گردن میں لگی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ یہ بات مجھے اسپتال میں ایڈ بیکر نے بتائی۔ اس نے کہا کہ میرا سر میز کا کونا لگنے سے زخمی ہوا جس پر میں گری تھی۔ ایک پڑوسی نے گولیاں چلنے کی آواز سن کر شیرف کو اطلاع دی۔ بیکر کو جونی کی لاش کے پاس سے ایک بڑا بیگ ملا جس میں ڈیریل کے قیمتی اوزار بھرے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ ریکارڈ کے مطابق جونی عادی چور تھا اور مجھے پورا حق تھا کہ خود کو بچاؤں۔ اس لحاظ سے یہ اپنے دفاع کے زمرے میں آتا تھا۔

لیکن وہ غلط کہہ رہا تھا۔ کسی نے مجھے بے ہوش کرنے کے لیے میرے سر پر ضرب لگائی تھی اور میں نے بھی صرف اس خیال سے ایک ہی فائر کیا تھا کہ شاید وہ مجھے قتل کر دے لیکن میں نے بیکر کو یہ نہیں بتایا کہ درد بھگانے والی دوائیں غائب ہو گئی تھیں اور یہ بات بھی اس سے چھپائی کہ میرے گھر سے نقد رقم اور ڈیریل کے تمغے چوری ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد سے کوڈی اور لارا غائب ہیں۔ وہ موٹیل ویران ہو چکا ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ یہ سب کیسے کر سکتے تھے لیکن.....

ایک آدمی مر گیا اور ایک طرح سے اس میں میری غلطی تھی۔ میں نے بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ صرف اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایسا کرنا پڑا اور اب بھی میں وہی حماقت کر رہی ہوں اور پہلے کی طرح یہاں بیٹھ کر موٹیل کو دیکھتی اور ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔ ان کے لیے میرے دل سے ایک ہی سانس میں دعا اور بددعا نکلتی ہے۔ ان کے لیے دعا کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید تنہائی ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ انہوں نے میری ویران زندگی میں جو پھول کھلائے، ان کی مہک میں بھی نہیں بھول سکتی۔

Digitized by Google

ہمتِ مرداں

ملک صفدر حیات

اکثر کسی غلطی اور گناہ کی وجہ یا تو عورت بنتی ہے یا دولت... البتہ جائیداد کا شمار بھی اس میں ہوتا ہے لیکن وہ لوگ بھی کتنے عجیب تھے جنہوں نے دولت کی خاطر قتل بھی کیے اور ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہوتے ہوئے در در چھپتے پھرے... حتیٰ کہ دولت بھی انتہائی محفوظ مقام پر چھپا دی مگر... اتنی تگ و دو کے باوجود، وہ اس دولت کا سکہ نہ اٹھا سکے۔ بس یہی وہ مقام ہے جو دوسرے لوگوں کے لیے عبرت کا سامان لیے ہوئے ہے مگر یہ نادان انسان شاید قدرت کے اس کھیل کو سمجھنے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال گناہ بے لذت کے اس تماشے میں ان کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا البتہ خون کی لالی انہیں ان کے کریہناک انجام تک ضرور پہنچا گئی۔

نفس کی غلامی اختیار کرنے والے لالچی انسانوں کے ہاتھوں

ایک خونی واردات کا احوال

بعض اوقات دید اور شنید میں بڑا فرق آجاتا ہے پھر یہ تفاوت ریل کی دو پٹریوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ایک دوسرے کے متوازی تو چلتی ہیں مگر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنے کے باوجود بھی یہ باہم شیر و شکر نہیں ہو پاتیں اور کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی نکل آتا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ انگریز بہادر کے سنہری دور حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیا کرتے تھے۔ مجھے ایک روز پتا چلا کہ جھنڈا پیرنی کے گھر کے صحن میں مرغی، بلی اور کتا اس طرح بلاخوف و خطر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے کہ نہ تو مرغی کو بلی سے کسی قسم کا ڈر محسوس ہوتا تھا اور نہ ہی بلی کو کتے سے کوئی اندیشہ ہائے دور دراز تھا۔ اس شنید نے میرے اندر دید کے جذبے کو ابھارا اور میں نے جھنڈا پیرنی المعروف بہ باجی اللہ والی سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

کسی کام کا ارادہ کرنا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کوشش کرنا انسان کے اختیار میں ہے لیکن اس کام کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کہیں اور ہی ہوتا ہے۔ اس معاملے میں انسان قطعی بے اختیار ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ میں جھنڈا پیرنی کے پاس پہنچتا، اس کے حوالے سے ایک سنسنی خیز خبر مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو کانسٹیبل مراد نے میرے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب! باجی اللہ والی کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، جھنڈا پیرنی کو.....؟'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن

Digitized by Google

ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چک بتالی سے تھوڑی دیر پہلے ایک بندہ آیا ہے۔ اسی نے اس واقعے کی اطلاع دی ہے جناب۔''

چک بیالیس غربی میرے تھانے سے لگ بھگ ایک میل کی مسافت پر تھا۔ سادہ لوح دیہاتی بیالیس کو ''بتالی'' کہتے ہیں اور چک کا مطلب ہے، گاؤں۔ میں نے مراد سے پوچھا۔

''اطلاع کنندہ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

جس وقت میں برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کو چوبی بینچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو ہدایت کی کہ وہ مذکورہ شخص کو میرے پاس بھیج دے۔

''جی ملک صاحب۔'' مراد فرماں برداری سے گردن ہلا کر جانے کے لیے مڑا۔

میں نے پوچھ لیا۔ ''کیا بصیر اس وقت تھانے میں موجود ہے؟''

بصیر میرے تھانے کا سب سے زیادہ ہوشیار اور چاق و چوبند کانسٹیبل تھا۔ مراد نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جی، بالکل موجود ہے۔''

''بصیر سے کہہ دو کہ چک بیالیس چلنے کی تیاری کرے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس، ہم تھوڑی دیر میں روانہ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' مراد پُراعتماد انداز میں بولا۔

چک بیالیس نام کے اصل میں دو گاؤں تھے۔ ایک بیالیس شرقی اور دوسرا بیالیس غربی کہلاتا تھا اور ان دونوں کے بیچ میں ایک نہر ثالا جنوباً رواں دواں تھی جو دیوار برلن کی طرح مشرقی اور مغربی چک کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھی۔ یہ دونوں گاؤں اور مذکورہ نہر میرے تھانے کی مغربی سمت میں واقع تھے۔ یعنی بیالیس غربی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے بیالیس شرقی سے گزر کر آگے بڑھنا تھا۔ اس علاقے میں آمدورفت کے لیے ایک کچی سڑک موجود تھی۔

جھنڈا پیر نی کی موت کی خبر تھانے پہنچانے والے شخص کا نام فضل کریم تھا۔ فضل کریم کی عمر پینتالیس کے آس پاس تھی اور وہ بیالیس غربی ہی کا رہنے والا تھا۔ جب تک کانسٹیبل بصیر ہماری روانگی کی تیاری کرتا، میں نے فضل کریم کا انٹرویو کر لیا۔ وہ جھنڈا پیر نی کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ گاؤں والوں نے اسے محض قانونی کارروائی کے لیے تھانے بھیج دیا تھا۔

میں نے فضل کریم سے پوچھا۔ ''تم کس چیز پر بیٹھ کر تھانے آئے ہو؟''

''میں تو سرکار پاؤں پاؤں پیدل ہی پہنچا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''چودھری صاحب نے مجھ سے کہا، تھانے جا کر وہاں کے انچارج صاحب کو اس واقعے کی اطلاع دے دو اور میں چل پڑا.....''

''تم نے بہت اچھا کیا جو چلے آئے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اب تم پاؤں پاؤں نہیں بلکہ ہمارے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر چک بیالیس کی طرف جاؤ گے۔''

''جو حکم مائی باپ۔'' وہ اطاعت گزاری سے بولا۔

آج کل زندگی اتنی زیادہ مصروف ہو گئی ہے کہ لوگوں کی خصوصاً شہروں میں، پیدل چلنے کی عادت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ بہت زیادہ جسمانی بیماریوں کا سبب بھی یہی ہے۔

ہمارا تانگا سبک خرامی سے کچے راستے پر تھانے سے چک بیالیس غربی کی سمت رواں دواں تھا۔ وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ نو سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا لیکن اس موسم نے پورے ماحول کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا۔ میں تانگے کی فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا جبکہ کانسٹیبل بصیر، فضل کریم کے ساتھ عقبی نشست پر موجود تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں چک بیالیس شرقی کے آثار نظر آنے لگے۔

کسی زمانے میں چک بیالیس ایک ہی ہوا کرتا تھا جب چودھری نظام یہاں کا حکمراں تھا۔ نظام کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹوں میں شدید نوعیت کے اختلافات نے جنم لیا اور نوبت مارنے مرنے تک جا پہنچی۔ چودھری خاندان کے بعض عمر رسیدہ اور تجربہ کار افراد نے اس گاؤں کو دونوں بھائیوں میں بانٹ کر اس تنازع کو ہمیشہ کے لیے ختم کرا دیا تھا۔ اس تقسیم کے مطابق چک بیالیس شرقی بڑے بھائی چودھری اقبال کے حصے میں آیا تھا جبکہ چک بیالیس غربی چھوٹے بھائی چودھری طفیل کو سونپ دیا گیا تھا۔ ان دونوں گاؤں کے بیچ نہر ایک حد بندی کے طور پر رواں دواں تھی۔ کہتے ہیں، ڈنڈا مارنے سے پانی نہیں بچھڑتا مگر اسی بہتے ہوئے پانی نے دو بھائیوں کو جدا کر دیا تھا۔

☆☆☆

جھنڈا پیر نی عرف باجی اللہ والی کا ڈیرا چک غربی کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ یہ قبرستان سے ملحقہ تھا اور

اس کے عقب میں نہر بہتی تھی۔ نہر میں آج کل پانی نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔ بس، پانی کے نام پر نہر کے قلب میں ایک پتلی سی لکیر مجوحرکت دکھائی دیتی تھی اور وہ بھی نہایت سست روی اور خاموشی کے ساتھ.....!

ہم نے تانگے کو ڈیرے کے نزدیک ایک جگہ چھوڑا اور ڈیرے کی جانب بڑھ گئے۔ یہ ایک وسیع و عریض ڈیرا تھا۔ ڈیرے کے اندر قدم رکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ باہر سے یہ اتنا بڑا نظر نہیں آتا تھا جیسا کہ اندر پہنچنے کے بعد محسوس ہوا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس ڈیرے کا کل رقبہ کسی بھی طور چالیس مرلے سے کم نہیں تھا۔ کراچی کے باسی اسے لگ بھگ ایک ہزار گز سمجھ لیں۔ ڈیرے کا تعمیر شدہ حصہ کم و بیش آٹھ مرلے (دو سو گز) تھا جبکہ باقی کے بتیس مرلے (آٹھ سو گز) زمین ایک کشادہ صحن کی صورت میں تھی جس کی دیواروں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے قد آور درخت موجود تھے۔ یہ وہی صحن تھا جس کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا، وہاں مرغی، بلی اور کتا بڑے اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہتے ہیں۔ ایسا مجھے نظر بھی آیا لیکن یہ ایسے نظاروں کا موقع نہیں تھا لہٰذا میں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

ڈیرے کے تعمیر شدہ حصے کے ایک کونے میں چھت پر ایک گنبد بنا ہوا تھا جیسا کہ اکثر مزاروں میں صاحب مزار بزرگ کی تربت پر بنا ہوتا ہے۔ مذکورہ گنبد کی چوٹی پر گہرے سبز رنگ کا ایک جھنڈا بھی مجھے لہراتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ جھنڈا، جھنڈا پیرنی کا علامتی نشان تھا جو..... اب بے نشان ہونے جا رہی تھی۔

جلد ہی میں ڈیرے کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں باجی اللہ والی کی لاش پڑی تھی۔ جائے وقوعہ کا ذکر کرنے سے پہلے میں اس ڈیرے کے تعمیر شدہ حصے کا حال بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ ڈیرے کے محض پانچویں حصے پر عمارت بنی ہوئی تھی اور یہ عمارت چار کمروں اور ایک کشادہ برآمدے پر مشتمل تھی۔ صحن عبور کرنے کے بعد ایک ہال نما کمرا آتا تھا جس کی پیمائش پندرہ بائی اٹھارہ فٹ رہی ہوگی۔ یہاں پر فرشی نشست کا بندوبست تھا۔ مجھے پتا چلا کہ جھنڈا پیرنی اس ہال میں، اپنے پاس آنے والے حاجت مندوں سے ملاقات کیا کرتی تھی۔ ہال ہی کی سیدھ میں بارہ بائی پندرہ فٹ کا ایک کمرا تھا جو باجی اللہ والی کے حجرے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں سے نوے درجے کے زاویے پر مزید دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں ایک بارہ بائی بارہ فٹ کی خواب گاہ تھی اور دوسرا کمرا اس خواب گاہ سے ملحق تھا اور بادی النظر میں اس کا سائز بھی بارہ ضرب بارہ فٹ ہی نظر آتا تھا۔ اسی کمرے کی چھت پر گنبد اور گنبد کے اوپر جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اس ڈیرے کی تعمیرات ایل شیپ میں کی گئی تھی۔

جھنڈا پیرنی کی لاش خواب گاہ کے اندر بیڈ کے اوپر پڑی تھی۔ دوسروں کے نصیب چمکانے والی پیرنی کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی بدنصیبی پر مہر ثبت کی گئی تھی۔ لاش کو ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ بے خبری میں اس کی کھوپڑی پر کسی بھاری آہنی شے سے وار کر کے اسے زندگی کی حرارت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی سامنے کی طرف سے بری طرح پچکی ہوئی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اسے سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ اس کی پاش پاش کھوپڑی سے نکلنے والے خون نے بستر کو بری طرح بھگو دیا تھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے اور خواب گاہ کے دوسرے حصوں میں متلاشی نگاہ دوڑائی مگر آلۂ قتل مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔

جب میں اس ڈیرے پر پہنچا تو میں نے وہاں درجن بھر مرد و زن کو جمع پایا تھا جنہیں میں نے ڈیرے کے باہر ہی روک دیا تھا تاہم ان میں سے ایک شخص میرے ساتھ ہی ڈیرے کے اندر گھسا چلا آیا تھا۔ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم نے سنا نہیں، میں نے سب کو باہر رکنے کے لیے کہا ہے.....؟''

''سنا ہے سرکار، پر میں تو چودھری صاحب کے حکم سے مجبور ہوں۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''کون چودھری؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''چودھری طفیل صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بتالی غربی کے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کا کہا ٹال نہیں سکتے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں اور اس واردات کی تحقیق کے سلسلے میں آپ کو جو بھی مدد چاہیے ہو، وہ میں فراہم کروں۔''

''بہت خوب!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چک بیالیس غربی کے چودھری طفیل نے فضل کریم کو تھانے بھیجا تھا اور اس آدمی کو میری معاونت کے لیے جھنڈا پیرنی کے ڈیرے پر متعین کر دیا تھا۔ گویا، چودھری طفیل کو اپنے علاقے کے تھانے دار کا بڑا خیال تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' میں نے اس پلے پلائے سانڈ

Digitized by Google

کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نام تو میرا مجید ہے سرکار۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن سب مجھے مجا کہہ کر پکارتے ہیں۔''

اس کا نام سن کر بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا۔ ''مجا یعنی مج (بھینس) کا مُکھ والا..... اس کا خاوند!''

پتا نہیں، وہ میری چٹکی کو سمجھا یا نہیں، سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی حالانکہ باجی اللہ والی سے بھی کئی بار دعا کرائی ہے۔''

''مجے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''شادی کے لیے تین چیزیں نہایت ہی اہم ہیں۔ نمبر ایک، ارادہ۔ نمبر دو، کوشش۔ نمبر تین، دعا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شے بھی کم ہو تو پھر معاملہ لٹک کر رہ جاتا ہے۔ لگتا ہے، تم نے باقی دو کو نظر انداز کر کے صرف دعا پر ہی تکیہ کیا ہوا ہے۔''

وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا۔

وہ ایک لحاظ سے اسم بامسمیٰ تھا یعنی ایک دم ڈگا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے مجے سے پوچھا۔ ''چودھری صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ ایک گھنٹا پہلے ادھر ہی تھے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر وہ اپنی حویلی چلے گئے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ آپ جیسے ہی موقع کی کارروائی سے فارغ ہوں، میں آپ کو اپنے ساتھ حویلی لے جاؤں۔''

اس گفتگو کے بعد میں مجید عرف مجا کو ہال نما کمرے میں چھوڑ کر جھنڈا پیرنی کی لاش کے معائنے میں مصروف ہو گیا تھا اور پھر میں نے آدھے گھنٹے کے اندر یہ کام نمٹا دیا۔ اس دوران میں میری ہدایت پر کانسٹیبل بصیر نے ڈیرے کے اندر اور باہر کا تمام علاقہ چھان مارا تھا لیکن آلۂ قتل کہیں نہیں ملا تھا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے بصیر کی زیرِ نگرانی جھنڈا پیرنی کی لاش کو ضلعی اسپتال روانہ کر دیا اور خود مجے کو لے کر ہال نما کمرے کی فرشی نشست پر بیٹھ گیا۔

''تم تو اکثر اس ڈیرے پر آتے رہتے تھے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''باجی اللہ والی کے قتل کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا مطلب ہے، باجی اللہ والی کے قتل کے حوالے سے۔ باقی آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے، میں بتاؤں گا۔ چودھری صاحب نے اسی مقصد کے لیے مجھے یہاں رکنے کو کہا تھا۔''

''ہوں.....'' میں گہری نظر سے مجے کو تکنے لگا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مجا مجھے چکر دینے کے لیے کسی غلط بیانی سے کام لے رہا ہوگا۔ میں نے... بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا جھنڈا پیرنی اس ڈیرے پر اکیلی ہی رہتی تھی؟''

''نہیں جناب.....!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''پھر..... اور یہاں کون رہتا تھا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ان کے قبضے میں بہت سارے جنات اور موکلات تھے۔'' وہ ڈرے سہمے لہجے میں بولا۔ ''باجی اللہ والی کو اسی لیے قبرستان کے ساتھ بنے ہوئے اس ڈیرے پر کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔''

اس کے جواب پر میرا سر پیٹنے کو جی چاہا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''میں کسی انسان کی ڈیرے پر رہائش کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، جھنڈا پیرنی کے علاوہ یہاں اور کون کون رہتا تھا؟''

''ان کا ملازم خاص.....'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر.....''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''مگر کیا؟''

''اس بندے کا نام تو قاضی ہے جی۔'' مجا تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''لیکن باجی اللہ والی کہتی تھیں کہ اصل میں یہ ایک جن ہے جسے میں نے انسانی شکل میں اپنی خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس وقت تو ڈیرے پر ہمارے سوا اور کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ قاضی کہاں ہے؟ کیا وہ کوہِ قاف میں کسی جن کا نکاح پڑھانے چلا گیا ہے؟''

''پتا نہیں سرکار!'' مجا بے بسی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آج صبح سے وہ بھی غائب ہے.....''

''غائب ہے!'' میں نے چونک کر مجے کی طرف دیکھا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

قاضی کے غیاب کی اطلاع نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن مختلف زاویوں میں برق رفتاری سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ مجے نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جناب! قاضی پچھلے دس سال سے اس ڈیرے پر

باجی اللہ والی کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے ادھر ڈیرے پر ہی موجود رہتا تھا لیکن آج صبح سے وہ نظر نہیں آرہا۔''

مجے کے انکشافات سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں جھنڈا پیرنی کی موت میں قاضی ہی کا تو ہاتھ نہیں۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

''قاضی کہاں جاسکتا ہے؟''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اس کا تو کوئی گھر بار یا رشتے دار بھی نہیں تھا جو یہ سوچا جائے کہ ان لوگوں سے ملنے چلا گیا ہوگا۔ میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آرہی ہے.....''

''کون سی بات؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''جناب! سیدھا حساب ہے۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''باجی اللہ والی کے فرمان کے مطابق قاضی کوئی انسان نہیں بلکہ انسانی صورت میں ایک جن تھا جسے باجی اللہ والی نے اپنی خدمت کے لیے ڈیرے پر رکھا ہوا تھا۔ جب باجی اللہ والی ہی باقی نہ رہیں تو پھر قاضی کا ڈیرے پر کیا کام۔ میں سمجھتا ہوں، وہ واپس اپنے دیس چلا گیا ہوگا۔''

مجے کی اس وضاحت کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ قاضی نامی وہ شخص واقعتاً کوئی جن ہی تھا جسے باجی اللہ والی نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا اور جھنڈا پیرنی کی موت کے ساتھ ہی وہ جن آزاد ہوگیا تھا۔ مجے کی اس احمقانہ سوچ پر مجھے ہنسی تو بہت آئی لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ انسان کے پاس جتنا دماغ ہوتا ہے وہ اسی حدود میں خیال آرائی کرسکتا ہے۔ مجا ایک سیدھا سادہ دیہاتی تھا۔ اس کے تجزیے کا مذاق اڑانے کے بجائے میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جھنڈا پیرنی کی لاش کو سب سے پہلے کس نے دیکھا تھا؟''

''زلیخا نے۔'' اس نے جواب دیا۔

''زلیخا کون؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اس نے بتایا۔ ''زلیخا کا تعلق بتالی شرقی سے ہے جناب۔ وہ آج صبح اپنے خاوند کے ساتھ باجی اللہ والی سے ملنے آئی تھی۔ اس ڈیرے پر جو بھی حاجت مند آتا ہے، قاضی، باجی اللہ والی سے اس کی ملاقات کراتا ہے۔ زلیخا اور اس کے گھر والے لیاقت نے ڈیرے پر پہنچنے کے بعد قاضی کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا تو وہ دونوں میاں بیوی اسی ہال میں بیٹھ کر قاضی کا انتظار کرنے لگے جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تھوڑی دیر کے بعد لیاقت نے اپنی بیوی سے کہا کہ ڈیرے پر چھائی ہوئی خاموشی سے تو لگتا ہے کہ یہاں کوئی بندہ بشر موجود نہیں۔ میرا خیال ہے، واپس گھر چلتے ہیں۔ زلیخا کسی بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں باجی اللہ والی سے ملنے آئی تھی۔ وہ شرفِ ملاقات حاصل کیے بغیر خالی ہاتھ واپس دامن واپس نہیں جانا چاہتی تھی لہٰذا اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ ادھر ہی بیٹھے۔ وہ اندر جا کر باجی اللہ والی کو دیکھتی ہے۔ پھر جب زلیخا اس ہال سے نکل کر حجرے میں اور حجرے سے ہوتے ہوئے خواب گاہ میں پہنچی تو اسے بستر پر باجی اللہ والی کی لاش نظر آئی۔''

''تمہیں یہ کہانی کس نے سنائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خود زلیخا نے۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

وہ شخص پولیس کے لیے نہایت ہی اہم ہوتا ہے جس نے مرنے والے کو آخری مرتبہ زندہ دیکھا ہو اور وہ شخص بھی جس نے کسی مردہ انسان کی لاش کو سب سے پہلے دیکھا ہو۔ اس امر میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ جھنڈا پیرنی کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس تناظر میں زلیخا کی ذات میرے لیے فی الحال سب سے زیادہ دلچسپی کی حامل تھی۔

''زلیخا اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے اس سے استفسار کیا۔ ''میں خود اس سے کچھ پرتیت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا زلیخا باہر والے ہجوم میں موجود ہے؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اس واقعے نے زلیخا کو خاصا بدحواس کر دیا تھا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ بتالی شرقی چلی گئی ہے۔''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری زلیخا سے کیسے ملاقات ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی جھنڈا پیرنی کے درشن کرنے آج صبح ہی اس ڈیرے کی طرف آئے ہوئے تھے.....''

''نہیں سرکار۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں تو ڈیرے کے سامنے والے کھیتوں میں تھا۔ جب زلیخا نے باجی اللہ والی کی لاش دیکھی تو اس نے ڈیرے سے باہر نکل کر شور مچا دیا۔ آس پاس موجود افراد اس کی چیخ پکار پر ڈیرے کے سامنے جمع ہوگئے۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ زلیخا کی نشاندہی پر ہم سب نے اندر آکر دیکھا تو ہمیں باجی اللہ والی کی سر پھٹی لاش بستر پر نظر آگئی۔''

''پھر.....؟'' میں نے ٹٹولنے والی نگاہ سے مجے کو گھورا۔

''جناب! اس صورتِ حال نے تو میری مت ماردی

تھی۔'' وہ اپنی گردن کو پراسرار انداز میں حرکت دے کر جھرجھری لے کر بولا۔ ''میں سیدھا حویلی کی جانب دوڑا تاکہ چودھری صاحب کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دے سکوں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چودھری صاحب میرے ساتھ اس ڈیرے پر پہنچ گئے، پھر سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس کے بعد چودھری صاحب نے فضلو (فضل کریم) کو آپ کی طرف دوڑایا اور میری ڈیوٹی ڈیرے پر لگا کر خود حویلی چلے گئے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ جیسے ہی موقع کی کارروائی مکمل کرلیں، میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر حویلی چلا آؤں۔''

اتنا کہہ کر مجا خاموش ہوگیا۔ مجھے حویلی لے کر جانے کی بات وہ پہلے بھی کرچکا تھا لیکن ان لمحات میں میرا ذہن حویلی یا اسے زیادہ جھنڈا پیرنی کی حسرت ناک موت میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے اس واردات کے حوالے سے شک کا جو دائرہ کھینچا تھا، اس میں سب سے پہلے قاضی داخل ہوا تھا اور اب زلیخا اس میں شامل تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''جب تم چودھری طفیل کے ساتھ دوبارہ یہاں آئے تو کیا زلیخا ڈیرے کے اندر یا باہر کہیں موجود تھی؟''

''نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ بتالی شرقی روانہ ہوچکی تھی۔''

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مجے نے فوراً میری تقلید کی پھر اضطراری لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر یہاں کا کام ختم ہوگیا ہو تو ہم حویلی چلیں!''

''یہاں کا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔'' میں نے ہال نما کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''تم فوری طور پر میرے لیے ایک تانگے کا انتظام کرو۔''

''تانگا..... وہ کس لیے جی؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''حویلی تو یہاں سے چند قدموں پر ہے سرکار۔''

''میں تم سے جو کہہ رہا ہوں، اس پر توجہ دو۔'' میں نے ڈانٹ بھرے انداز میں کہا۔

''جی، ٹھیک ہے.....!'' وہ جلدی سے بولا۔

مجا اور میں ایک ساتھ ہی ڈیرے کے صحن سے گزرے۔ اس وسیع و عریض صحن میں واقعتاً کتے، بلیاں اور مرغیاں ادھر ادھر گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ صحن کی دیواروں کے ساتھ استادہ قدآور درختوں کے بیچوں بیچ ان جانوروں کے لیے مختلف سائز کے ڈبے بھی بنے ہوئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں موجود کوئی بھی بلی کسی بھی مرغی کی گردن دبوچنے میں کوئی دلچسپی رکھتی تھی اور نہ ہی کوئی کتا کسی بلی کے شکار کا خواہاں نظر آتا تھا۔ یہ جو بھی چشکار تھا اس کے پیچھے یقیناً جھنڈا پیرنی ہی کا ہاتھ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جھنڈا پیرنی نے شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلانے والے انگریز بہادر کو مات دے دی تھی تو ہرگز غلط نہیں ہوگا۔

مجے کے جانے کے بعد میں ڈیرے کے باہر موجود افراد سے فرداً فرداً پوچھ گچھ کرنے لگا۔ جب میں یہاں پہنچا تھا تو میں نے کم و بیش ایک درجن افراد کو ڈیرے کے سامنے جمع دیکھا تھا۔ اب ان کی تعداد دوگنا ہوچکی تھی۔ جھنڈا پیرنی چک بیالیس غربی کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اس کی موت اور پھر پولیس کی آمد نے پورے گاؤں میں ہلچل مچادی تھی۔ ہر کوئی یہ جاننے کا مشتاق تھا کہ جھنڈا پیرنی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ میں بھی یہی جاننے کی کوشش میں تھا لیکن سردست باجی اللہ والی کی موت ایک پراسرار معما ہی بنی ہوئی تھی۔

جب آدھے گھنٹے کی پوچھ تاچھ کے بعد بھی اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آیا تو میں مجے کے لائے ہوئے تانگے میں جا بیٹھا اور مجے کو بھی اپنے ساتھ ہی تانگے پر سوار کرالیا۔ اس کے بعد ہم چک بیالیس شرقی کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

بیالیس شرقی اور بیالیس غربی کے درمیان جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں، ایک نہر بہتی تھی۔ جب ہمارا تانگا نہر کا پل عبور کرکے بیالیس شرقی کی سمت بڑھا تو مجے نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر آپ پہلے چودھری صاحب کی حویلی کا چکر لگا لیتے تو اچھا ہوتا۔''

''مثلاً..... کیا اچھا ہوتا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''وہ جی.....'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ ''چودھری صاحب نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو حویلی پہنچادوں۔''

میں نے بہ دستور کڑے لہجے میں کہا۔ ''یہ راگ تم پہلے بھی دو تین بار مجھے سنا چکے ہو؟''

''جی.....'' وہ گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''اس علاقے کا تھانے دار میں ہوں یا چودھری طفیل؟''

''ظاہر ہے جی..... تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''کیا میں نے کبھی چودھری طفیل کی حویلی یا چک بیالیس غربی کے اندرونی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی؟''

وہ میرے پے در پے استفسارات سے کافی الجھ گیا تھا۔ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔''

''پھر تم اور تمہارا چودھری بھی میرے معاملات کو مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اپنے تھانے کی حدود میں مجھے کسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں کس طرح، کب اور کس سمت میں نقل و حرکت کرنا ہے اس کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔ مجھے کچھ بتانے یا سمجھانے یا سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب، جو آپ کی مرضی۔'' وہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا کہ آپ.....''

''کیا اچھا نہیں لگ رہا تمہیں؟'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ میں مانتا ہوں کہ چودھری اقبال، ہمارے چودھری صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''لیکن آپ ہمارے گاؤں میں آئے ہیں لہٰذا آپ کو پہلے چودھری طفیل صاحب سے ملاقات کرنا چاہیے.....''

میں مجے کی الجھن بھری پریشانی کی تہ میں پہنچ گیا۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تو تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں بیالیس شرقی چودھری اقبال سے ملنے جارہا ہوں؟''

''جی..... میں تو یہی سمجھ رہا ہوں۔'' وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

''یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے مجے۔'' میں نے کہا۔ ''تم جیسا سوچ رہے ہو ویسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر.....؟'' اس نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں بیالیس شرقی اس عورت سے ملاقات کرنے جارہا ہوں جس نے سب سے پہلے جھنڈا پیرنی کی لاش کو دیکھا تھا۔'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے بتایا۔

''اوہ اچھا.....'' وہ ایک بوجھل سانس لے کر رہ گیا۔

چودھری خاندان کے بزرگوں نے چک بیالیس کی بڑی عجیب و غریب تقسیم کی تھی۔ چودھری نظام کی چودھراہٹ کے زمانے میں یہ گاؤں لگ بھگ ایک ہزار نفوس کی آبادی پر مشتمل ہوا کرتا تھا یعنی کم و بیش ڈھائی سو گھر جن میں سے تقریباً ایک سو بیچاس گھر نہر کی مغربی سمت میں قبرستان کے ساتھ تھے جبکہ تقریباً ایک سو گھر نہر کی مشرقی جانب تھے۔ یعنی گاؤں کا بڑا حصہ قبرستان کی طرف تھا لیکن جب چک بیالیس کی تقسیم کی گئی تو اس کا بڑا حصہ (غربی) چھوٹے بھائی چودھری طفیل کو سونپا گیا تھا اور نسبتاً چھوٹا حصہ (شرقی) بڑے بھائی چودھری اقبال کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس امر سے قطع نظر کہ اس تقسیم کے پیچھے بزرگوں کی کیا مصلحت تھی بہرحال دونوں بھائی مطمئن تھے تاہم ان کے بیچ بھائی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

زلیخا کا گھر چک بیالیس شرقی کے درمیانی حصے میں تھا۔ ہم نے کچھ فاصلے پر تانگا چھوڑ دیا۔ میں نے مجے کو تانگے میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود اس کی نشاندہی پر زلیخا کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

میری دستک کے جواب میں ایک عام سی صورت والے دیہاتی نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے میں ایک باوردی پولیس والے کو کھڑے دیکھا تو اس کے چہرے پر خوف کا سایہ سا لہرایا پھر بے ساختہ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جی سرکار.....؟''

''تم لیاقت ہو نا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

مجے کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ زلیخا کے گھر والے کا نام لیاقت تھا۔ آج صبح زلیخا، لیاقت کے ساتھ ہی جھنڈا پیرنی کے ڈیرے پر پہنچی تھی۔

''جی سرکار! میں لیاقت ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟''

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں تمہاری بیوی زلیخا سے دو باتیں کرنے آیا ہوں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟''

وہ جلدی سے دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے فدویانہ انداز میں بولا۔ ''اندر آجائیں سرکار..... یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔''

اسی لمحے گھر کے اندرونی حصے سے ایک نسوانی استفسار ابھرا۔ ''لیاقو! تو کس کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ باہر کون آیا ہے؟''

''ہمارے علاقے کے تھانے دار صاحب ہیں۔'' لیاقت عرف لیاقو مجھے گھر کی بیٹھک کی جانب لے جاتے ہوئے بولا۔

وہ یقیناً زلیخا ہی تھی۔ لیاقت کے جواب میں اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''پولیس کا ہمارے دروازے پر کیا کام۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

اس دوران میں لیاقت مجھے بیٹھک میں پہنچا چکا تھا۔ میں نے ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم اپنی بیوی کو بھی ادھر ہی بلا لو۔ میں تم دونوں کے سامنے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ''جی اچھا'' کہتے ہوئے بیٹھک سے نکل گیا۔

لیاقت کا گھر ایک عام سا چھوٹا مکان تھا جو دو کمروں، ایک بیٹھک اور ایک مناسب سائز کے صحن پر مشتمل تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ان میاں بیوی کے روبرو بیٹھا ہوا تھا اور ہمارے درمیان ایک چوبی میز پر پانی سے بھرا ہوا ایک جگ اور گلاس رکھا تھا۔ لیاقت اور زلیخا نے چائے سے میری تواضع کے لیے بہت اصرار کیا تھا لیکن میں نے صاف معذرت کرتے ہوئے صرف پانی منگوالیا تھا۔

''ڈرنے یا پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے جھنڈا پیرنی کی موت کے بارے میں چند سوالات کروں گا اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اگر تم لوگوں نے غلط بیانی سے کام لیا تو پھر مجھ سے بھی کسی رورعایت کی توقع نہیں رکھنا۔''

دونوں نے گھبرائی ہوئی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر لیاقت نے مجھ سے پوچھا۔ ''باجی اللہ والی کی موت سے ہمارا کیا تعلق واسطہ جناب؟''

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''خصوصاً تمہاری بیوی زلیخا کا.....!''

''ہائے میں مرجاؤں.....'' زلیخا سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔ ''میں..... کی کیتا جی..... آپ مجھے کیوں ڈرا رہے ہو.....؟''

اس کے استفسارات کے جواب میں، میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''زلیخا! تم وہ انسان ہو جس نے سب سے پہلے جھنڈا پیرنی کی لاش کو دیکھا تھا اس لیے پولیس کی نظر میں تمہاری بہت اہمیت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا.....؟''

''جج..... جی.....'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''جب ڈیرے پر ہمیں قاضی کہیں نظر نہیں آیا اور ہمیں ملاقات والے ہال میں بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو میں تجسس سے مجبور ہوکر ڈیرے کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی تھی تاکہ دیکھ سکوں کہ باجی اللہ والی کہاں ہے۔ پھر.....'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک جھرجھری لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''پھر ایک کمرے میں مجھے بستر پر باجی اللہ والی کی لاش نظر آئی۔ ان کا سر کسی نے بری طرح کچل ڈالا تھا۔ پھٹی ہوئی کھوپڑی میں سے نکلنے والے خون نے بستر کو لال کردیا تھا.....''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا تھا جی.....'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں باجی اللہ والی کا ایسا بھیانک حشر نشر دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا گئی تھی۔ میں نے پہلے لیاقو کو صورت حال سے آگاہ کیا پھر ڈیرے سے باہر نکل کر میں نے کھپ ڈال دی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتانے لگی کہ کسی ظالم نے باجی اللہ والی کا گھنگھرو کھول کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔''

''گھنا کھولنے'' سے زلیخا کی مراد ''کھوپڑی پچکانے'' سے تھی۔ اس کے بیان سے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہوگی۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور جب آس پاس والے کھیت مزدور تمہاری پکار پر ڈیرے کے سامنے جمع ہوگئے تو تم لوگ چپکے سے وہاں سے کھسک آئے۔''

''تو اور کیا کرتے سرکار۔'' لیاقت نے بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''زلیخا کے بعد میں نے بھی اندر جاکر باجی اللہ والی کی خون آلود لاش دیکھی تھی اور سچ مانیں تو اس دہشت ناک منظر نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے تھے۔ ایک منٹ کے لیے بھی ڈیرے پر رکنے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔''

''اور میرا حال لیاقو سے بھی زیادہ خراب تھا تھانے دار صاحب۔'' زلیخا نے خوف سے لبریز دیدے گھماتے ہوئے بتایا۔ ''میرا دل ایک دم بیٹھنے لگا تھا اور دماغ تو گھن گھیریاں کھانے لگا تھا۔ میں نے لیاقو کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ چل، یہاں سے نس جاتے ہیں۔''

میں دس پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر ان میاں بیوی سے جھنڈا پیرنی کے قتل کے بارے میں سوال کرتا رہا لیکن ان کے جوابات سے کوئی بھی ایسی بات سامنے نہ آئی جو جھنڈا پیرنی کی پراسرار موت کے معمے کو حل کرنے میں میری کوئی مدد کرتی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ ان دونوں کا جھنڈا پیرنی کو پیش آنے والے واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ آخر میں، میں نے ان سے پوچھا۔

''تم لوگ آج صبح کتنے بجے جھنڈا پیرنی کے ڈیرے پر پہنچے تھے؟''

''بہت صبح جی۔'' زلیخا نے بتایا۔ ''ٹائم کا تو مجھے اندازہ نہیں۔ باجی اللہ والی نے کہا تھا کہ سورج اگنے سے پہلے ان کے پاس پہنچنا ہے۔''

''ہم کل بھی باجی اللہ والی کے پاس آئے تھے تھانے دار صاحب۔'' لیاقت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''باجی نے زلیخا کو تاکید کی تھی کہ کل یعنی آج صبح تڑکے ہمیں دوبارہ آنا ہوگا۔''

''ایسا کون سا معاملہ تھا کہ جھنڈا پیرنی نے علی الصباح تم لوگوں کو اپنے ڈیرے پر بلالیا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان میاں بیوی کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اور وہ بھی ٹھنڈے ٹھار موسم میں.....؟''

''وہ جی زلیخا کا..... علاج چل..... رہا ہے نا.....'' لیاقت نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسی سلسلے میں باجی اللہ والی نے بلایا تھا۔''

''کس قسم کا علاج؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''ہماری شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں تھانے دار صاحب۔'' لیاقت نے بتایا۔ ''لیکن ابھی تک زلیخا نے کسی بچے کو جنم نہیں دیا۔ زلیخا اسی سلسلے میں باجی اللہ والی سے علاج کروا رہی ہے..... کروا رہی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے، روحانی علاج؟'' میں نے سوالیہ نظر سے لیاقت کی طرف دیکھا۔

''نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جسمانی علاج۔''

''اوہ..... تو جھنڈا پیرنی عملیات کے علاوہ دوا دارو بھی کرتی تھی۔'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ لوگوں کو صاحب اولاد کرنے کے لیے کس طرح کا حکیمی علاج کر رہی تھی؟''

میرے سوال نے انہیں الجھن میں ڈال دیا۔ دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر لیاقت جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''وہ میرا نہیں، صرف زلیخا کا علاج کر رہی تھیں۔''

''میں بھی تو وہی پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے آسان الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا جھنڈا پیرنی زلیخا کو کھانے پانے کے لیے جڑی بوٹیاں دے رہی تھی؟''

''نہیں جناب.....!'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

میں نے زور دے کر پوچھا۔ ''تو پھر.....؟''

میرے اصراری استفسار پر زلیخا کا چہرہ یکایک سرخ ہوگیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اپنے خاوند سے بولی۔

''لیاقو! تو تھانے دار صاحب کو بتا..... میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔''

پھر لیاقت کا جواب سننے سے پہلے ہی زلیخا بیٹھک سے نکل گئی۔ اس صورتِ حال نے مجھے تھوڑی دیر کے لیے الجھا کر رکھ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جھنڈا پیرنی کے طریقۂ علاج کے سلسلے میں وہ میاں بیوی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے لیاقت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''یہ کیا چکر ہے۔ تم لوگ مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟''

''چھپا تو کچھ نہیں رہے سرکار۔'' وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ''وہ دراصل بات ہی ایسی ہے کہ اپنی زبان سے بتاتے ہوئے زلیخا کو شرم آ رہی تھی۔''

زلیخا کا اچانک سرخ ہوتا چہرہ میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں بھی جھنڈا پیرنی کے علاج کا ذکر کرتے ہوئے کسی قسم کی شرم محسوس ہو رہی ہے؟''

''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اصل میں باجی اللہ والی نے بتایا تھا کہ زلیخا کے پیڑو پر بہت زیادہ ورم ہے جسے ختم کرنے کے لیے انہوں نے آج ایک خاص دوائی دینا تھی۔'' پھر اس نے مجھے زنانہ بیماری کے بارے میں بتایا تو میں سمجھ گیا کہ زلیخا اندر کیوں چلی گئی تھی۔ ''آج پہلا دن تھا۔ کل اس کے کہ باجی اللہ والی وہ دوائی دیتی، کسی شقی القلب شخص نے سرکچل کر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا.....'' لیاقت ایک سیدھا سادہ دیہاتی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ راج مستری کا کام کرتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں چک بیالیس شرقی سے نکل کر مجید عرف مجا کی معیت میں چک

بیالیس غربی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

چودھری طفیل ایک دبنگ قسم کا انسان تھا۔ اس نے اپنی حویلی پر میرا بڑا پُرتپاک استقبال کیا پھر ہم ایک کشادہ آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ حویلی کے گیٹ پر جب اس نے مجھے اپنے نمک خوار مجید عرف مجا کے ساتھ دیکھا تو چودھری کی آنکھوں میں مجھے مجا کے لیے ستائش کی جھلک نظر آئی تھی جو مجا کی فرماں برداری اور اطاعت گزاری کا صلہ تھی۔ یہ بندہ پچھلے تین چار گھنٹے سے کسی سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا اور بالآخر اس نے چودھری طفیل کی ہدایات کے مطابق مجھے حویلی پہنچا دیا تھا۔

چودھری نے میری آمد سے قبل ہی دوپہر کے کھانے کا اہتمام کرا دیا تھا۔ وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار دوپہر تھی۔ اگرچہ سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن اس کی دھوپ میں وہ تمازت نہیں تھی جو موسم کی یخ بستگی کا سینہ چیر کر اس میں حرارت بھر دیتی۔ میں پچھلے پانچ گھنٹے سے مسلسل مصروفِ عمل تھا لہٰذا بھوک کا احساس شدت سے ستا رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں، میں نے چودھری کی میری خاطر تواضع کی خواہش کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہمارے معاشرے کی ایک ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ معاشی حالات کی بنا پر ہم ایک ہی چیز کے دو نام رکھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی غریب کے گھر کا جو کمرا بیٹھک کہلاتا ہے، اسی مقصد کے لیے استعمال ہونے والے کسی صاحبِ ثروت شخص کے گھر کے کمرے کو ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے۔ اس بیان کا مقصد کسی دولت مند انسان کی دل آزاری یا کسی غریب کی دل داری ہرگز نہیں ہے۔ یہ ایک کھلی اور تلخ حقیقت ہے۔ سچائی ہر حال میں سچائی ہی رہتی ہے۔

کھانے کے دوران میں میرے اور چودھری طفیل کے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا اور ہم دونوں کا فوکس جھنڈا پیرنی کی پراسرار موت پر تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! اس واردات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تو یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس لگتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''جب مجھے آج صبح اس واقعے کی اطلاع ملی تو میں ڈیرے پر گیا تھا اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے باجی اللہ والی کی لاش کو دیکھا تھا۔ کسی سنگ دل شخص نے بری طرح سر کچل کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے چودھری صاحب۔'' میں نے چودھری طفیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ سنگ دل شخص کون ہو سکتا ہے؟''

اس نے جواب دینے میں تھوڑی دیر لگائی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب.....''

''چودھری صاحب!'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق اس ڈیرے پر صرف دو افراد ہی رہتے تھے یعنی جھنڈا پیرنی اور اس کا خدمت گار قاضی صغیر۔ پیرنی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے اور قاضی جائے وقوعہ سے غائب ہے پھر بھی.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی آپ کوئی واضح جواب دیتے ہوئے اتنا ہچکچا کیوں رہے ہیں؟''

''میں ہچکچا نہیں رہا بلکہ الجھن کا شکار ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''بہرحال، کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کس الجھن میں ہیں؟''

''ملک صاحب!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''اگر حالات و واقعات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ قاضی نے باجی اللہ والی کو قتل کیا اور پھر موقع سے فرار ہو گیا لیکن.....''

''لیکن کیا چودھری صاحب؟'' وہ بولتے بولتے رکا تو میں بولا۔ ''مثلاً آپ کیا سوچ رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''حالات و واقعات کی روشنی میں، تجزیہ کرنے میں کیا قباحت ہے؟''

''میرے خیال میں یہ کوئی دوسرا ہی چکر ہے۔'' وہ پراسرار انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کون سا دوسرا چکر چودھری صاحب؟'' میں نے اصراری لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ نے موقع کی کارروائی کرتے ہوئے اس ڈیرے کا اچھی طرح جائزہ تو لیا ہوگا۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے متفسر ہوا۔ ''کیا آپ کو وہاں کوئی غیر معمولی بات دکھائی دی؟''

''میں نے ڈیرے کے اندرونی اور بیرونی حصے کا بغور معائنہ کیا ہے سوائے ایک جگہ کے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

''کون سی جگہ؟'' اس نے چونک کر میری طرف

دیکھا۔ ''آپ کس جگہ کا ذکر کررہے ہیں ملک صاحب؟''

''ڈیرے کے اندر بنا ہوا آخری کمرا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جس کے اوپر گنبد بنا ہوا ہے اور مذکورہ گنبد کے اوپر گہرے سبز رنگ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔''

''اوہ..... اس کمرے میں شاہ صاحب دفن ہیں۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرا اشارہ اس طرف نہیں تھا۔''

''مذکورہ کمرے پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا اس لیے سردست میں اس کی تلاشی نہیں لے سکا۔'' میں نے کہا۔ ''اب آپ بتا رہے ہیں کہ اس کمرے میں کوئی شاہ صاحب دفن ہیں تو جناب! شاہ صاحب اور ان کے مزار پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے آپ اپنے اشارے کی وضاحت فرمائیں۔''

''میں نے وہ اشارہ ڈیرے کے وسیع و عریض صحن کی جانب کیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ نے وہاں جانی دشمنوں کو پیار و محبت کے ساتھ زندگی گزارتے نہیں دیکھا؟''

''ایک نظر دیکھا ہے.....'' میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''بلی کو دیکھ کر عام حالات میں مرغی کی روح فنا ہوجاتی ہے اور کتے پر نگاہ پڑتے ہی بلی کے دیوتا کوچ کر جاتے ہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن مجال ہے، باجی اللہ والی کے ڈیرے کے صحن میں ان جانوروں کو ایک دوسرے سے کسی قسم کے تحفظات ہوں۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے ملک صاحب.....''

''واقعی، یہ سب ان جانوروں کی فطرت اور جبلت کے برعکس ہے۔'' میں نے سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ جو بتانا چاہ رہے ہیں، وہ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔''

''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ باجی اللہ والی کے قبضے میں کئی موکلات اور جنات تھے۔'' وہ انکشاف انگیز انداز میں بتانے لگا۔ ''جن کی مدد سے وہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتی تھیں۔ ڈیرے کے صحن میں نظر آنے والا جانوروں کا آپس میں محبت اور رواداری کا سلوک بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے لیکن شاید آپ ہوائی چیزوں اور ان کے نادیدہ اثرات پر یقین نہیں رکھتے.....''

''چودھری صاحب! آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مگر تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں کہ جھنڈا پیر نی اپنی کسی روحانی یا ذہنی یا جناتی یا موکلاتی طاقت کی مدد سے ان جانوروں کی نفسیات کو کنٹرول کرتی تھی لیکن یہ کتے، بلیاں اور مرغیاں ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہیں۔ ہم اس وقت جھنڈا پیر نی مرڈر کیس پر بات کررہے ہیں اور میں نے اسی سلسلے میں آپ کی رائے جاننا چاہی تھی.....؟''

''جی، جی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ جلدی سے گردن کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ باجی اللہ والی کی موت میں کسی جن وغیرہ کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ان کا تو یہ بھی دعویٰ تھا کہ قاضی انسانی شکل میں ایک جن ہی ہے جسے انہوں نے اپنی خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔ قاضی ڈیرے سے غائب ہے۔ عین ممکن ہے، یہ کام اسی کا ہو.....''

قاضی کے جن ہونے کی بات ڈیرے پر مجے نے بھی کی تھی اور اب چودھری طفیل بھی اسی نوعیت کی اسٹوری سنا رہا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جھنڈا پیر نی نے پورے چک بیالیس اور آلے دوالے کے گاؤں دیہات میں اس قسم کی کئی ایک کہانیاں پھیلا رکھی تھیں جن پر لوگ اندھا دھند یقین بھی رکھتے تھے۔ گاؤں دیہات کے لوگ بے چارے تو سادہ دل اور معصوم ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ اس طرح کی ضعیف الاعتقادی کی وبا نے شہروں میں بسنے والے تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد کی بھاری تعداد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اللہ ایسے بے ضمیر معاشرتی ناسوروں کو غارت کرے اور ہم سب کو ان جونکوں کے شر سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے..... آمین!

''چودھری صاحب!'' میں نے اپنے میزبان اور چک بیالیس غربی کے حاکم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جھنڈا پیر نی کا قاتل کوئی جن ہے یا انسان، میں بہت جلد اس کی گردن دبوچ لوں گا۔ آپ ذرا مجھے ان شاہ صاحب کے بارے میں بتائیں جو جھنڈا پیر نی کے ڈیرے کے ایک کمرے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کیا وہ جھنڈا پیر نی کے کوئی مرشد و رشد تھے؟''

''ایک حد تک آپ ایسا کہہ سکتے ہیں.....''

''اور.....'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے ٹوک دیا۔ ''دوسری حد تک کیسا کہہ سکتے ہیں؟''

''شاہ صاحب کا نام حیدر علی تھا اور وہ نرگس کے شوہر تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نرگس کو تمام تر فیض، شاہ صاحب ہی سے حاصل ہوا تھا لہٰذا آپ شاہ

صاحب کو ان کا مرشد کہہ سکتے ہیں۔''

''ایک منٹ چودھری صاحب!'' میں نے انگلی کے اشارے سے چودھری طفیل کو مزید بولنے سے روک دیا اور پوچھا۔ ''یہ نرگس صاحبہ کون ہیں؟''

چودھری کے انداز سے میں سمجھ تو گیا تھا کہ وہ جھنڈا پیرنی کا ہی ذکر خیر کر رہا تھا لیکن تصدیق کی خاطر میں نے استفسار ضروری جانا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''باجی اللہ والی کا اصل نام نرگس ہے ملک صاحب۔'' چودھری کے الفاظ میں جھنڈا پیرنی کے لیے عقیدت و احترام کی جھلک نظر آتی تھی۔ ''یہ تینوں افراد لگ بھگ بارہ سال پہلے اس علاقے میں آئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا مطلب ہے حیدر علی شاہ، ان کی بیوی نرگس اور ان کا وفادار ملازم قاضی صغیر۔ اس زمانے میں چک بیالیس کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے تھے اور پورے گاؤں کے چودھری صرف ابا جی ہی ہوا کرتے تھے.....''

بات کے اختتام پر اس کے چہرے کے تاثرات میں کبیدگی اتر آئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ چک بیالیس کی ''شرقی/غربی'' تقسیم سے چودھری طفیل کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ اس دوران میں کھانے کا سیشن ختم ہو چکا تھا اور ہمارے درمیان پستے بادام والی کشمیری چائے کا دور چل رہا تھا۔

''یہ تینوں چک بیالیس میں آباد ہونے سے پہلے کہاں تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے شاہ صاحب، ان کی وجہ محترمہ اور قاضی اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟''

''ان لوگوں کا تعلق ضلع جھنگ کے علاقے ''شاہ جیونا'' سے ہے جناب۔'' چودھری طفیل نے مجھے بتایا۔ ''حیدر علی شاہ خاندانی زمیندار اور صاحب گدی تھے۔ شاہ جیونا میں والد کی وفات کے بعد بھائیوں میں گدی کے حصول کے لیے بڑے خطرناک تنازعات نے جنم لیا۔ شاہ صاحب ایک امن پسند اور صلح جو انسان تھے۔ انہوں نے لڑائی جھگڑے سے کنارہ کشی کی اور فسادی ماحول کو چھوڑ کر چک بیالیس میں سکونت اختیار کر لی۔''

''حیدر شاہ کی کہانی کافی حد تک آپ سے مماثلت رکھتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس حد تک کہ ابا جی کی وفات کے بعد میرے اور اقبال کے بیچ بھی خاصی رنجشوں نے جنم لے لیا تھا۔''

اس نے اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی چنانچہ اس سلسلے میں، میں نے بھی کرید مناسب نہ جانی اور اصل موضوع پر آتے ہوئے سوال کیا۔

''نرگس کو پیرنی بننے کا اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا تھا؟''

میرا اصل مقصد جھنڈا پیرنی کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا تھا اسی لیے میں چودھری سے ادھر ادھر کی باتیں نہیں پوچھ رہا تھا۔ اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔

''انہیں چک بیالیس میں منتقل ہوئے دو سال ہی ہوئے تھے کہ شاہ جی کا انتقال ہو گیا۔ نرگس نے قبرستان کے بجائے اپنے شوہر کو ڈیرے کے ایک دور افتادہ کونے والے کمرے میں دفن کر کے ان کی قبر کو پکا کرا دیا۔ پھر مذکورہ کمرے کے اوپر گنبد تعمیر کرانے کے بعد ایک جھنڈا بھی لگا دیا۔ آپ اس کمرے کو حیدر علی شاہ کا مزار بھی کہہ سکتے ہیں مگر یہ مزار دوسرے مزاروں سے بہت مختلف قسم کا ہے۔ کسی بھی عقیدت مند کو شاہ صاحب کی قبر تک رسائی حاصل کرنے کی اجازت نہیں۔''

''اوہ..... میں نے بھی اس کمرے کو مقفل ہی دیکھا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''ایسی قدغن کس نے لگائی ہے؟''

''باجی اللہ والی نے لگائی تھی۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اب وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہیں۔ سوہنا رب جانے، آہ کیا ہوگا۔''

''چودھری صاحب! آپ ماشاءاللہ اس گاؤں کے کرتا دھرتا ہیں۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سوہنا رب تو جو جانتا ہے سو جانتا ہے بلکہ وہ تو سب کچھ جانتا ہے لیکن اس گاؤں کا حاکم ہونے کے ناتے آپ کو بھی بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ آپ اس واقعے کو اتنا آسان نہ لیں۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں چودھری صاحب!'' میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر کہا۔ ''اگر میں غلط نہیں تو آپ کا شمار بھی جھنڈا پیرنی کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے اور اس واقعے نے آپ کی سوچ کو منتشر کر دیا ہے.....''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''آپ مجھے صرف جھنڈا پیرنی کے ماضی اور حال کے بارے میں بتائیں۔ اس کی موت اور مستقبل کی جان کاری میں خود حاصل کرلوں گا۔''

آئندہ پندرہ منٹ میں چودھری طفیل نے مجھے جو معلومات فراہم کیں، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

جھنڈا پیرنی جوانی میں خاصی آزاد خیال اور فیشن ایبل ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ نہ صرف اسکول بلکہ اس نے کالج تک بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں اس کا گاؤں شاہ جیونا سے جھنگ شہر تک آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے لیے اس نے لاہور کے ایک معروف کالج میں داخلہ لیا تھا لیکن یہ سب اس زمانے کی باتیں ہیں جب اس کی حیدر علی سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حیدر علی صاحب سلسلہ تھا لہٰذا شاہ صاحب سے نکاح کے بعد نرگس بالکل بدل گئی۔ آزاد خیالی اور بے باکی کو ترک کرکے وہ پردے اور صوم وصلوٰۃ کی پابند ہوگئی تھی۔ بعد ازاں حیدر علی بوجوہ شاہ جیونا سے چک بیالیس شفٹ ہوگیا تھا۔

حیدر علی کی وفات کے موقع پر نرگس نے گاؤں والوں کو بتایا کہ شاہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ انہیں ڈیرے کے فلاں کمرے میں دفن کیا جائے لیکن کسی بھی عقیدت مند کو اس کمرے تک رسائی نہ دی جائے۔ صرف ان کی بیوہ یعنی نرگس صاحبہ مذکورہ کمرے میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھ سکتی ہیں لہٰذا سب کچھ ایسے ہی کردیا گیا۔ نرگس نے شاہ جی کی خواہش کے مطابق ڈیرے کے ایک کمرے کو شاہ جی کا ایک ایسا مزار بنادیا جس پر ایک تالا پڑا رہتا تھا اور کسی سائل کو وہاں تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اس قدغن پر وہاں آنے والے کسی عقیدت مند نے کبھی کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ چند روز بعد نرگس نے قاضی کو اپنا ایک خواب سنایا۔ پھر قاضی کی زبانی وہ خواب نہ صرف چک بیالیس کی فضاؤں میں رچ بس گیا بلکہ بیرون گاؤں سے ڈیرے پر آنے والے لوگوں نے اس خواب کو قرب وجوار کے علاقوں تک بھی پھیلا دیا تھا۔ اس خواب کے مطابق شاہ صاحب نے ان کے خواب میں آکر اپنی تمام تر روحانی قوتیں اپنی بیوی یعنی نرگس کے اندر منتقل کردی تھیں اور نرگس کو حکم دیا تھا کہ اب وہ پیرنی بن کر اس ڈیرے پر اس سلسلے کو آگے بڑھائے۔ قصہ مختصر..... اگلے روز سے نرگس جھنڈا پیرنی بن گئی تھی۔ اکثر لوگ اسے ''باجی اللہ والی'' کہا کرتے تھے۔ یہی باجی اللہ والی لگ بھگ دس سال تک قاضی صغیر کی معاونت کے طفیل اس ڈیرے پر راج کرتی رہی تھی پھر ایک دن اس پیرنی کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا اور اس کا وفادار خدمت گار ڈیرے سے غائب تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جھنڈا پیرنی کی موت میں جنات کا ہاتھ تھا مگر میں اس انداز میں ہرگز نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں مجھے دھاگے کے کسی ایسے سرے کی ضرورت تھی جسے پکڑ کر میں دوسرے سرے تک پہنچ جاتا اور وہاں پر جھنڈا پیرنی کے قاتل سے میری ملاقات ہوجاتی۔

''حیدر علی شاہ کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں چودھری طفیل سے پوچھا۔

''قبرستان کے ساتھ والے کھیتوں میں ایک زہری (زہریلے) سانپ نے انہیں ڈس لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ادھر موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے۔''

''اوہ.....'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''کیا اس موذی سانپ کو لوگوں نے مارا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ اس وقت باجی اللہ والی اور قاضی بھی شاہ صاحب کے ساتھ تھے لیکن وہ کمینہ سانپ اتنا پھرتیلا نکلا کہ اپنا کام کرکے پلک جھپکتے میں رفو چکر ہوگیا تھا، وہ کسی کو نظر تک نہیں آیا.....''

''تو یہ کیسے پتا چلا کہ شاہ صاحب کی موت سانپ کے ڈسنے ہی سے ہوئی تھی کیونکہ آپ بتا رہے ہیں کہ قاضی یا جھنڈا پیرنی نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شاہ صاحب حرکت قلب کے بند ہوجانے سے اس دنیا سے پردہ فرما گئے ہوں؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ پورے یقین سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شاہ صاحب کی موت کا سبب سانپ کا ڈسنا ہی تھا۔''

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جب صاحب کھیتوں میں گرے تو ان کا ایک ہاتھ ٹخنے پر تھا۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کے گرنے پر باجی اللہ والی اور قاضی نے شور مچادیا تھا۔ لوگ فوراً وہاں جمع ہوگئے۔ قاضی اور باجی اللہ والی کے علاوہ درجن بھر افراد نے دیکھا کہ شاہ صاحب نے اپنا جو ٹخنہ تھام رکھا تھا، اس پر ایک چھوٹا سا سرخ گول نشان بنا ہوا تھا جیسے ٹخنے کے اندر سے خون نکل کر اس جگہ جم گیا ہو۔ اس قسم کا

لال نشان عموماً سانپ کے ڈسنے ہی سے بنتا ہے۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں ملک صاحب!''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں چودھری صاحب۔''

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ پچھلے بارہ سال میں یہ لوگ کتنی بار شاہ جیونا گئے تھے اور کیا شاہ جیونا کے لوگ بھی ان سے ملنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے؟''

''یہ لوگ شاہ جیونا سے ایسے آئے کہ پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔'' چودھری نے بتایا۔ ''اور نہ ہی ادھر سے اس دوران میں کوئی ان کی خبر لینے یہاں پہنچا۔ میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ دونوں فریقین نے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔''

میں نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چودھری طفیل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا حیدر علی شاہ کی ناگہانی موت پر بھی شاہ جیونا سے کوئی بندہ بشر ادھر نہیں پھٹکا؟''

''نہ جی..... بالکل نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں تھوڑی دیر تک مزید چودھری طفیل کی حویلی میں موجود رہا پھر وہاں سے واپس آ گیا۔ واپسی کے سفر کے لیے چودھری نے ایک تانگے کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے اس مہمان نوازی پر تہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا اور وقتِ رخصت اس سے کہا۔

''چودھری صاحب! اگر آپ کو جھنڈا پیرنی کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کے حوالے سے کوئی بھی بات پتا چلے تو آپ پہلی فرصت میں مجھے بتائیں گے۔''

''جی، جو آپ کا حکم۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرماں برداری سے بولا۔

''اور اس بات کا بھی انتظام کروا دیں کہ ڈیرے کے اردگرد سے گاؤں کے لوگ نہ گزریں۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل صبح کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ جائے وقوعہ کا دورہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے، میرا کھوجی اس واردات کا کوئی نہ کوئی سراغ تلاش کر لے گا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں اپنے بندوں سے کہہ کر آپ کے احکامات کی تعمیل کروا دوں گا۔'' اس نے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے ڈیرے کو لاک تو کروا دیا ہے نا؟''

''بالکل کروا دیا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے ڈیرے سے نکلتے وقت اس کے داخلی گیٹ پر سرکاری تالا ڈال دیا تھا۔''

وہ مطمئن انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

کسی چھوٹی یا بڑی واردات کی اطلاع پر جب میں تھانے سے جائے وقوعہ کا رخ کرتا ہوں تو میرے پاس ایک بیگ بھی لازماً ہوتا ہے جسے میرے ساتھ چلنے والا جونیئر پولیس اہلکار اٹھاتا ہے۔ مذکورہ بیگ میں ہتھکڑی، چابی تالا، ڈائری، قلم، سادہ کاغذ اور اسی نوعیت کی دوسری کئی اشیا بھی موجود ہوتی ہیں جو کسی وقت بھی کام آ سکتی ہیں۔

مغرب سے تھوڑی دیر پہلے میں تھانے پہنچ گیا۔ مجھے پتا چلا کہ ایک گھنٹا قبل کانسٹیبل بصیر بھی سرکاری اسپتال سے لوٹ آیا تھا۔ بصیر کو میں نے جھنڈا پیرنی کی لاش کے ساتھ ڈسٹرکٹ اسپتال بھیجا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔

''ہاں بھئی بصیر!'' اس کے پہنچتے ہی میں نے سوال کیا۔ ''اسپتال والوں نے کیا کہا ہے؟''

''کل شام تک وہ لوگ باجی اللہ والی کی لاش ہمارے حوالے کر دیں گے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اور پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی لاش کے ساتھ ہی ہو گی۔''

''کیا اے ایس آئی آفتاب اس وقت تھانے میں موجود ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی ملک صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''تم آفتاب کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔''

''او کے ملک صاحب۔'' اس نے مستعد لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

آفتاب میرے تھانے کا ایک سمجھ دار اور موقع شناس پولیس اہلکار تھا۔ میں نے اگلی صبح اسے شاہ جیونا روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ جھنڈا پیرنی کے قتل پر روشنی ڈالنے کے لیے معلومات کی چند نارنج لائٹس کو تلاش کیا جا سکے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ حیدر علی شاہ اور جھنڈا پیرنی کے علاوہ ان کے خادمِ خاص قاضی کا تعلق بھی شاہ جیونا ہی سے تھا۔ میں خاص طور پر قاضی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں قاضی ایک ایسا کردار تھا جس پر میں سب سے زیادہ شک کر سکتا تھا۔ اگر قاضی میرے ہتھے چڑھ جاتا اور مجھے یقین تھا کہ میں اسے کہیں نہ کہیں سے کھوج نکالوں گا..... تو اس کے بعد جھنڈا پیرنی المعروف بہ باجی اللہ والی کی پراسرار موت کا معما حل کرنے میں نہ ہینگ لگتی اور نہ پھٹکری۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے اے ایس آئی آفتاب کو ضروری ہدایات کے ساتھ جھنگ صدر کے علاقے ''شاہ جیونا'' کی طرف روانہ کردیا تاکہ مقتول اور اس کے خادمِ خاص کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اس کے بعد میں نے کانسٹیبل نیاز کے ہمراہ چک بیالیس غربی کا رخ کیا۔ اس مشن میں کھوجی بھی شامل تھا۔ کھوجی کا نام خوشی محمد تھا لیکن وہ چاچا خوشیا کے نام سے مشہور تھا۔ میں حسبِ ضرورت خوشیا سے کام لیتا رہتا تھا۔ خوشیا کی عمر پینسٹھ کے آس پاس تھی۔

وہ موسمِ سرما کے دن تھے۔ ماہِ دسمبر کا وسط چل رہا تھا۔ آج دسمبر کی چودہ تاریخ تھی۔ گزشتہ روز تو پھر بھی سورج چاچو نے اپنی شکل دکھادی تھی لیکن آج اس کا درشن دینے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ موسم کی سختی تو اپنی جگہ تھی ہی۔ اس کے ساتھ ہی دھند نے بھی دہرا ستم ڈھا رکھا تھا۔ چند فٹ سے آگے کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارے تانگے کا کوچوان اپنے پیشے کا ماہر تھا تاہم میں نے اسے ہدایت کردی تھی کہ وہ تانگے کی رفتار کو بہت کم رکھے۔ اس نے بعین میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ہمارا تانگا سست روی سے چک بیالیس غربی کی سمت رواں دواں تھا۔

''ملک صاحب! آپ تو جوان جہان ہیں۔'' کھوجی بابا نے دھند کے اس پار دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''یہ سردی آپ پر زیادہ اثر انداز نہیں ہورہی ہوگی لیکن میری بوڑھی ہڈیوں کا تو کباڑا ہوگیا ہے۔''

''چاچا! عشق نہ پچھے ذات تے سردی نہ پچھے عمر.....'' میں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رگڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیر و جواں کے فرق پر توجہ نہیں دیتی، جب یہ اپنی آئی پر آتی ہے تو سب کے دانت بجا کر اور ہڈیاں چٹخا کر رکھ دیتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن عمر سے بہت فرق پڑتا ہے۔ جب بندہ ڈھال پر ہوتا ہے تو ہر گزرتے سال کے ساتھ اس کی ہمت اور برداشت میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ آپ کی ابھی چڑھتی جوانی ہے۔ چالیس کے بعد جب ڈھال کا دور شروع ہوگا تو لگ پتا جائے گا آپ کو۔ میں تو پینسٹھ کا ہندسہ بھی عبور کرچکا ہوں۔''

''اس کے باوجود بھی آپ آج کل کے جوانوں سے زیادہ مستعد ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، آپ نے جوانی میں مکھن، ملائی اور دیسی گھی خوب جی بھر کر کھایا ہوگا۔''

''ہاں بھئی، دیسی گھی اور مکھن ملائی کی طاقت سے انکار ممکن نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن ایسی خوراک کو ہضم کرکے جزوِ بدن بنانے کے لیے کڑی محنت بھی کرنا پڑتی ہے۔ جو شخص مشقت سے گھبراتا ہو اسے ایسی ثقیل خوراک سے دور ہی رہنا چاہیے ورنہ دل کا خانہ خراب ہوجائے گا۔''

بابا خوشیا کی باتوں میں وزن تھا اور الفاظ میں سالہا سال کا تجربہ بولتا تھا۔ آج کل تو کچھ ایسی وبا چلی ہے کہ نوجوان نسل کو چکنائی سے یکسر دور کردیا گیا ہے۔ کولیسٹرول اور امراضِ قلب کے نام پر مکھن، گھی اور اسی نسل کی دوسری مقوی اشیا کو شجرِ ممنوعہ کا درجہ دے دیا گیا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کو کار کے بارے میں صرف یہ بتائیں کہ اسے روڈ پر چلانے سے ایکسیڈنٹ بھی ہوسکتا ہے جس میں آپ کی جان بھی جاسکتی ہے تو ہمارے بچے کار کو اپنی جان کا دشمن سمجھنے لگیں گے اور کبھی اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کریں گے لیکن اگر اس کے ساتھ ہی ہم اپنے بچوں کو ڈرائیونگ کے اصول سکھائیں اور انہیں روڈ پر دوسروں کو بچانے کے گر تعلیم کریں تو یقیناً وہ ایک تجربہ کار ڈرائیور بن جائیں گے۔

ہم صحت اور موسم کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے چک بیالیس شرقی کی بغل سے گزر کر چک بیالیس غربی پہنچ گئے۔ میں نے تانگا ڈیرے کی دیوار کے ساتھ رکوایا اور نیچے اتر کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ نزدیکی کھیتوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لوگ کام کررہے تھے۔ میں نے کانسٹیبل نیاز کو بھیج کر ان میں سے دو افراد کو بلالیا۔ ان میں سے ایک کا نام صابر اور دوسرے کا منظور تھا۔ ان دونوں کا تعلق چک بیالیس غربی ہی سے تھا اور وہ جھنڈا پیرنی اور اس کے دیرینہ ملازم کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ میں نے ڈیرے کے گیٹ پر لگے سرکاری تالے کو کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔

ڈیرے کے صحن میں نظر آنے والے منظر نے ہم سب کو ششدر کردیا۔ میں، خوشیا، نیاز، صابر اور منظور پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ڈیرے کے صحن اور برآمدے میں مردہ مرغیوں، بلیوں اور کتوں کو ادھر ادھر پڑے دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی بھی مرغی کو کسی بلی نے شکار کیا تھا اور نہ ہی کوئی بلی کسی کتے کے دستِ ستم کا نشانہ بنی تھی۔ تمام جانوروں کی لاشیں اس طرح صحن اور برآمدے میں بکھری

پڑی تھیں جیسے انہیں زہریلا کھانا کھلا کر موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا ہو۔

''باجی اللہ والی کے پردہ فرماتے ہی ڈیرے کا نظام بھی درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔'' صابر نامی دیہاتی نے ایک خوفزدہ جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک وہ حیات تھیں تو کسی بلی کی مجال نہیں تھی کہ وہ کسی مرغی پر جھپٹا مارے اور نہ ہی کبھی کسی کتے کی اتنی ہمت ہوئی تھی کہ وہ کسی بلی کو اپنے پنجوں میں دبوچنے کی کوشش کرے۔''

''یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔'' منظور نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''اب وہ دن دور نہیں جب ہم انسان بھی کتے بلیوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ صابر اور منظور گاؤں کے دوسرے افراد کی طرح جھنڈا پیرنی کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے تھے اور اس کی روحانی قوتوں کے معترف بھی تھے لیکن میں ان کی سوچ کے مطابق ڈیرے کے صحن اور برآمدے میں دکھائی دینے والے منظر کو فٹ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں دیکھا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قیامت ابھی بہت دور ہے اور یہ جو ادھر ادھر جانوروں کی لاشیں پڑی ہیں نا، ان میں سے کسی نے کسی کی جان نہیں لی۔''

''پھر.....؟'' منظور نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب خود بخود کیسے مر گئے؟''

''یہ خود نہیں مرے بلکہ انہیں کسی انسان نے موت کی نیند سلا دیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں بہت جلد اس درندہ صفت شخص تک پہنچ کر اس سے پوچھوں گا کہ ان بے زبان جانوروں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

''مجھے تو یہ کسی شریر جن کی کارستانی لگتی ہے۔'' صابر نے گھبرائی ہوئی نظر سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے متوحش انداز میں کہا۔ ''باجی اللہ والی کے قبضے میں بہت سارے جنات تھے۔ وہ زندہ نہیں رہیں تو خبیث جنات ان اوچھی حرکتوں پر اتر آئے ہیں۔''

''اور تم لوگوں کے خیال میں جھنڈا پیرنی کی موت میں بھی کسی جن ہی کا ہاتھ ہے۔'' میں نے انہیں یکے بعد دیگرے گھورا۔ ''ہیں نا.....؟''

''اس میں کیا شک ہے تھانے دار صاحب!'' صابر ترت بولا۔

منظور نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ورنہ باجی اللہ والی کی جان لینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔''

مجھے ان دونوں کی جاہلانہ سوچ پر غصہ تو بہت آیا مگر میں نے غصے کے اظہار کو مناسب نہیں سمجھا اور باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

''تو تمہارے خیال میں جھنڈا پیرنی کی موت کا ذمے دار کوئی کمینہ جن ہے ورنہ کوئی انسان تو ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی جان لینا کسی کے اختیار میں تھا ہی نہیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''ہم تو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔''

''اچھا تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جس ذاتِ پاک نے جھنڈا پیرنی کو زندگی دی تھی، وہ بھی اس زندگی کو واپس لینے پر قادر نہیں ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ ہڑبڑا کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ ان کے ہڑبڑاہٹ بھرے چہروں پر لاجوابی جھلک رہی تھی۔ چند لمحات کے لیے وہ گنگ ہو کر رہ گئے تھے جیسے میرے سوال کے پھنیر سانپ نے انہیں سونگھ لیا ہو۔ یہ میری ضرورت یا خواہش نہیں تھی کہ ان کی طرف سے کوئی جواب آئے لہٰذا میں نے وقت ضائع کرنے کے بجائے معتدل انداز میں کہا۔

''زندگی دینے والا بھی وہی ہے اور زندگی لینے والا بھی وہی۔ کوئی جن وانس اس قادرِ مطلق سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ میں نے تم دونوں کو ایک خاص مقصد سے ڈیرے کے اندر بلایا تھا۔ اگر تم جناتی قوت کو خدائی قوت پر فوقیت دیتے ہو اور ان جانوروں کی بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے ہو تو میری طرف سے تمہیں جانے کی مکمل چھوٹ ہے۔ میں یہ کام کسی اور سے لے لوں گا.....''

میری اس لتاڑ پھٹکار کے نتیجے میں ان کے چہروں سے شرمندگی جھلکنے لگی۔ صابر نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ خدا والا معاملہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔''

''جب انسان یادِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں طرح طرح کے واہمے اور دماغ میں نوع بہ نوع واہیات خیالات بسیرا کر لیتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے خالی دماغ کو شیطان کا گھر کہا جاتا ہے۔''

منظور نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''سرکار! ہم آپ کے

Digitized by Google

حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔ بتائیں، کرنا کیا ہے؟''

صابر اور منظور کو میں نے آمادۂ کار دیکھا تو میں نے کہا۔ ''تو آؤ، پھر کام پر لگتے ہیں.....''

کھوجی خوشیا کو میں نے راستے میں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اسے کس مقصد سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ میں ان سب کو لے کر ڈیرے کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ گزشتہ روز میں نے برآمدے کے ایک حصے میں جست کا ایک ٹرنک رکھا دیکھا تھا جس کے اندر مردانہ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ برآمدے کا یہ حصہ اس ہال نما کمرے سے متصل تھا۔ جہاں جھنڈا پیرنی سائلوں/سائلات سے ملاقات کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ قاضی اسی ہال نما کمرے میں شب بسری کیا کرتا تھا۔ میں نے ابھی جس جست ٹرنک کا ذکر کیا، اس کے نزدیک ہی چند جوڑی جوتے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں چپلیں اور ملیشن جوتے شامل تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ کپڑے اور جوتے قاضی سے تعلق رکھتے ہوں گے کیونکہ اس ڈیرے پر صرف ایک وہی مرد رہائش پذیر تھا۔ تاہم میں نے اپنی تسلی کی خاطر صابر اور منظور سے پوچھ لیا۔

ایک لمحہ سوچ بغیر انہوں نے بیک زبان جواب دیا۔ ''یہ قاضی کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے جناب.....''

انہوں نے میرے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''ایک تو یہ کہ ہم نے قاضی کو یہ کپڑے اور جوتے پہنے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' صابر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوسرے اس سائز کے کپڑے اور جوتے قاضی کے سوا اور کسی کے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ قاضی کا قد بہت چھوٹا اور جسم بہت موٹا ہے۔''

صابر کی دلیل نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے جن چپلوں اور بند جوتوں کا ذکر کیا ہے، ان کا نمبر آپ چھ سمجھ لیں۔ اس نمبر کے جوتے عموماً دس سے بارہ سال کے بچوں کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جست ٹرنک میں موجود کپڑے (شلوار + قمیص) لمبائی اور چوڑائی میں لگ بھگ مربع شکل کے تھے۔ ایسا لباس کسی پستہ قامت موٹے تازے شخص ہی کا ہو سکتا تھا۔ قاضی میرے لیے حد سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اور اس کی تلاش اس سے بھی زیادہ اہم، چنانچہ میں نے کھوجی چاچا کو فی الفور قاضی کا کھرا نکالنے کے کام پر لگا دیا۔

گزشتہ روز زلیخا اور لیاقت کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جب وہ جھنڈا پیرنی سے ملاقات کرنے ڈیرے پر پہنچے تو داخلی گیٹ انہیں کھلا ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی اسی گیٹ کے راستے وہاں سے غائب ہوا تھا۔ جلدباز خوشیا نے قاضی کا کھرا پکڑ لیا۔ مذکورہ کھرا ڈیرے سے نکل کر نہر کے پل کی سمت جا رہا تھا۔

''چاچا! میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟'' میں نے کھوجی سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو جائیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''کھرا بڑا واضح ہے۔ موتیا اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ انشاء اللہ! میں آپ کو بہترین نتائج دوں گا۔''

''چاچا! اگر مجھے تمہاری صلاحیت پر بھروسا نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں اس کام کی زحمت نہ دیتا۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ ہماری گفتگو کے بیچ موتیا کہاں سے آ گیا؟''

''تین سال پہلے ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر کا تو یہی مشورہ تھا کہ مجھے آپریشن کروا لینا چاہیے مگر میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ ملک صاحب! جب تک چلتا ہے، چلنے دیں۔ ڈاکٹر کی بنائی ہوئی آنکھیں سوہنے رب کی بنائی ہوئی آنکھوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی نا!''

''ڈاکٹر کی بنائی ہوئی آنکھوں'' سے خوشیا کی مراد ''آپریشن کے ذریعے ٹھیک کی گئی آنکھیں تھیں۔'' میں نے کہا۔

''چاچا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ اس خالق و مالک سے زیادہ اچھی چیز اور کوئی نہیں بنا سکتا لیکن بے پروائی نقصان دہ بھی تو ثابت ہو سکتی ہے۔''

''مثلاً کس قسم کا نقصان؟'' اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔

''کہیں اس غفلت میں تمہاری بینائی ہی نہ چلی جائے۔'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''کچھ نہیں ہوگا ملک صاحب!'' وہ بڑے یقین سے بولا۔ ''تین سال پہلے معاملہ جہاں تھا، آج تک وہیں رکا ہوا ہے۔ آگے کیا ہوگا، یہ تو صرف میرا رب ہی جانتا ہے۔''

خدا پر خوشیا کے یقین کامل نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔

''چاچا! اللہ تجھے اور تیری آنکھوں کو سلامت رکھے۔''

''آمین!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولا۔

اس کے بعد میں، صابر اور منظور کی جانب متوجہ ہو گیا اور باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز

Digitized by Google

میں کہا۔ ''تم لوگ جلدی سے ایک دو ریڑھیوں یا بیل گاڑیوں کا بندوبست کرو اور اپنے ساتھ چند لوگوں کو بھی لگا لو۔ ان تمام مردہ مرغیوں، بلیوں اور کتوں کو اٹھا کر کہیں دور پھینکنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہے ہیں۔'' منظور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو ہم انہیں نہر میں پھینک دیتے ہیں۔''

''نہر میں پھینکنے سے بہتر ہے کہ کہیں دور زمین کھود کر انہیں دبا دو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ لاشیں کھلی فضا میں پڑی رہیں تو ان سے تعفن پھیلے گا اور وبائی امراض پھوٹنے کا بھی خطرہ ہے۔''

''آپ جیسا کہہ رہے ہیں ہم بالکل ویسا ہی کریں گے تھانے دار صاحب۔'' صابر نے فرماں برداری سے کہا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی اس کمرے کا خیال آ گیا جس کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا تھا۔ مذکورہ کمرے کے دروازے پر میں نے ایک تالا جھولتا دیکھا تھا۔ چودھری طفیل نے مجھے بتایا تھا کہ جھنڈا پیرنی نے اس کمرے میں اپنے شوہر حیدر علی کو دفنا کر وہاں اس کا مزار بنا دیا تھا لیکن جھنڈا پیرنی کے سوا اور کسی شخص کو اس مزار پر حاضری دینے کی اجازت نہیں تھی۔ جب میں نے کل ڈیرے کے باہر مختلف لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تھی تو ایک یہ نظریہ بھی سامنے آیا تھا کہ مذکورہ کمرے میں جھنڈا پیرنی کے جنات رہتے تھے اسی لیے وہ کسی کو اس کمرے میں جانے نہیں دیتی تھی۔ یہ تمام باتیں مجھے متاثر نہیں کر سکی تھیں لہٰذا اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اس کمرے کا سروے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تھانے سے میرے ساتھ کانسٹیبل نیاز بھی ڈیرے پر پہنچا تھا۔ میں نے اسے ڈیرے کے قرب و جوار کا جائزہ لینے کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ یہی کام گزشتہ روز کانسٹیبل بصیر نے بھی کیا تھا اور کوئی بھی قابلِ ذکر چیز تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ممکن ہے، آج نیاز کے ہتھے کچھ لگ جاتا.....!

میں ہال نما کمرے سے ہوتے ہوئے جھنڈا پیرنی کے حجرے میں پہنچا پھر اس کے اندر سے گزر کر اس خواب گاہ تک رسائی حاصل کر لی جہاں جھنڈا پیرنی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں نے چند لمحات تک وہاں رک کر کمرے کے طول و عرض کا جائزہ لیا پھر بغلی دروازہ کھول کر اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جس پر ایک تالا جھول رہا تھا۔

مذکورہ کمرے کا سائز بھی خواب گاہ کے برابر یعنی بارہ ضرب بارہ فٹ ہی تھا۔ میں نے اپنے بیگ میں سے ہتھوڑی نکالی اور دو تین کاری ضربات کے بعد میں اس تالے کی کنڈی کو اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تالا توڑنے کی.. بہ نسبت یہ کام قدرے آسان تھا۔ کنڈی جب اکھڑ گئی تو تالا پھر کسی مصرف یا مقصد کا نہیں رہا تھا۔ اب وہ تالا نہ تو کمرے کی حفاظت کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی شخص کو اندر آنے سے روک سکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس دروازے کے پٹ وا کر کے شاہ صاحب کے مزار میں داخل ہو گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مذکورہ کمرا باہر کی بہ نسبت اندر سے کافی چھوٹے سائز کا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق کمرے کی اندرونی پیمائش نو بائی نو فٹ رہی ہو گی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کمرے کی چاروں دیواریں تین فٹ یعنی ایک گز موٹی تھیں۔ اتنی مضبوط دیواریں تو کسی عظیم خزانے کی حفاظت کی خاطر ہی تعمیر کی جاتی ہیں اور واقعتاً ایسا ہی تھا مگر وہ انمول خزانہ موٹی دیواروں والے اس مقفل کمرے سے غائب ہو چکا تھا.....

جی ہاں! کمرے کے وسط میں اگرچہ ایک پختہ قبر بنی ہوئی تھی جس میں یقیناً دس سال پہلے قبلہ شاہ صاحب کی لاش دفن کی گئی ہو گی لیکن میرے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث اس مزار شریف کی اندرونی دیواریں تھیں جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دیوار گیر کیبنٹ بنے ہوئے تھے جیسا کہ کچن میں سامان رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ درجن بھر سے زیادہ وہ کیبنٹ کھلے پڑے تھے۔ کمرے کے فرش پر مجھے طلائی زیورات کے کئی ڈبے پڑے دکھائی دیے جو تمام کے تمام خالی تھے۔ چند ایک کیبنٹ سے مجھے کچھ ایسے آثار بھی ملے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ جھنڈا پیرنی وہاں کرنسی نوٹ رکھا کرتی تھی۔ گویا شاہ صاحب کے مزار والا یہ کمرا جھنڈا پیرنی کا سیفٹی لاکر تھا جہاں وہ نیازوں اور چڑھاووں سے حاصل ہونے والی دولت اور زیورات کو چھپا کر رکھتی تھی لیکن کسی ماہر فن نے جھنڈا پیرنی کے خزانے پر ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

اگر جھنڈا پیرنی کے بہیمانہ قتل اور ڈکیتی کی اس واردات کو آپس میں ملا کر دیکھا جاتا تو پھر ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ کوئی شخص جھنڈا پیرنی کے اس خزانے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے پہلے جھنڈا پیرنی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس کے بعد مقتولہ کے بیڈروم میں سے شاہ صاحب کے مزار کی چابی حاصل کی پھر وہاں موجود تمام طلائی زیورات اور مال و دولت کو کسی تھیلے میں بھرا، مزار شریف کو

دوبارہ متقل کیا اور چپکے سے کہیں غائب ہوگیا اور..... ایسا شخص قاضی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت فنگر پرنٹس کو کوئی اہمیت دیتی تھی مگر میری تھانے دارانہ سوچ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے پہلی فرصت میں قاضی کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر قاضی میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر اس کیس کا اونٹ بھی بڑی تسلی بخش کروٹ بیٹھ جانا تھا۔

میں نے لٹے ہوئے خزانے والے کمرے کا دروازہ بند کیا اور خواب گاہ و حجرے سے ہوتے ہوئے ہال نما کمرے میں آگیا۔ ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کررہا تھا۔ اس دوران میں صابر اور منظور نے دو بیل گاڑیوں کا بندوبست کرلیا تھا اور اپنے ساتھ مزید دو تین افراد کو شامل کرکے وہ جھنڈا پیرنی کے پالتو طلسماتی جانوروں کے لاشے اٹھانے میں مصروف تھے۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کسی بلی نے کسی مرغی کی گردن دبوچی ہوگی یا کسی کتے نے کسی بلی کو بھنبھوڑ ڈالا ہوگا۔ ان تمام جانوروں کی موت کا کوئی اور ہی سبب تھا۔ میرا ذہن تو یہی کہتا تھا کہ انہیں زہر دے کر مارا گیا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایسا کس نے کیا؟

میں اس سوال کے جواب کی تلاش میں اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑا ہی رہا تھا کہ چودھری طفیل مجھ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''ملک صاحب! مجھے پتا چلا تھا کہ آپ ادھر آئے ہوئے ہیں اس لیے میں بھی ڈیرے پر چلا آیا اور یہ جو کچھ صحن میں ہوا ہے، اس کی بھی مجھے خبر مل گئی تھی۔ لگتا ہے، باجی اللہ والی کے پردہ فرماتے ہی ان جانوروں نے اپنی اپنی فطرت کے عین مطابق عمل کرکے ایک دوسرے کی جان لے لی ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں ابھی تک اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام رہا ہوں کہ اس ڈیرے پر موجود بلیاں، مرغیوں پر اور کتے، بلیوں پر جھپٹنے کیوں نہیں تھے۔'' میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کو ان کی اموات کے بارے میں جیسا لگتا ہے، میں اس سے اتفاق نہیں کرسکتا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ملک صاحب!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ڈیرے کے صحن میں مرغیوں، بلیوں اور کتوں کی جو لاشیں دیکھی ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی موت کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہیں ہوئی۔''

''پھر.....؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''مجھے یقین ہے کہ ان تمام پالتو جانوروں کو کوئی سریع الاثر زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ایک مردہ مرغی، ایک بلی اور ایک کتے کی لاش کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اسپتال بھجواؤں گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

''اوہ.....'' وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟''

یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں تھی جو مجھے اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور مدلل الفاظ میں چودھری طفیل کو ان پالتو جانوروں کی موت کے بارے میں بتادیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے کسی پر حملہ کیا ہوتا تو جانوروں کے جسموں پر اور صحن کی زمین پر کہیں تو خون کے آثار دکھائی دیتے۔ میں حیران ہوں کہ اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں آپ کا دھیان جس طرف لے کر جانے والا ہوں وہاں پہنچ کر تو آپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔''

''کک..... کیا مطلب.....؟'' اس نے بھویں سکیڑ کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''اب آپ کون سا سنسنی خیز انکشاف کرنے والے ہیں؟''

''آپ آئیں میرے ساتھ۔'' میں نے ڈیرے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

چودھری نے میری تقلید میں قدم اٹھائے تو مجا بھی ہمارے پیچھے چل پڑا۔ میں نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مجے! تم ادھر ہی رکو اور کسی بندے کو بھیج کر ایک تانگا منگوالو۔ میں تمہیں اور کانسٹیبل... کو تین مردہ جانوروں کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیجنے والا ہوں۔''

''اچھا جی.....'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلا کر رہ گیا۔

Digitized by Google

میں چودھری کو کمرا در کمرا گزار کر شاہ صاحب کے مزار پر حاضری دینے لے گیا پھر جب میں نے مزار شریف کا دروازہ وا کیا تو اندرونی منظر کو دیکھ کر چودھری ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

''یہ..... سب کیا..... ہے ملک صاحب.....؟''

وہ سب جو بھی تھا، میں نے اپنے نقطۂ نظر سے چودھری کو آگاہ کردیا۔ وہ دیدے پھیلا کر میری وضاحت سنتا رہا۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر کبھی یقین اور کبھی بے یقینی کے رنگ ابھرتے رہے۔ میری بات کے اختتام پر اس نے کہا۔

''اگر آپ کی بات کو درست مانا جائے تو پھر یہ حرکت قاضی کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ راز جان گیا تھا کہ باجی اللہ والی مزار والے کمرے میں قیمتی طلائی زیورات اور رقم کو چھپا کر رکھتی تھیں۔ اس کی نیت میں فتور آگیا۔ اس نے پہلے باجی اللہ والی کو حالتِ نیند میں موت کے گھاٹ اتارا پھر مزار والے کمرے کا تالا کھول کر سب کچھ اڑا لے گیا۔ اس کارروائی کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے تالا بھی لگا دیا تاکہ فوری طور پر کسی کا اس طرف دھیان نہ جائے اور اس دوران میں وہ کہیں کا کہیں نکل جائے.....''

''میں اسے کہیں کا کہیں نہیں نکلنے دوں گا چودھری صاحب۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''جب حالات و واقعات قاضی کو مجرم ظاہر کر رہے ہیں تو وہ زیادہ دیر تک میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔''

''اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے جس بھی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو، میں حاضر ہوں ملک صاحب!'' وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔

''میری بھی شدید خواہش ہے کہ قاضی جلد از جلد عبرت ناک انجام کو پہنچے۔''

''چودھری صاحب! میں آپ کی اس خواہش کو بعین پورا کروں گا اور میں نے قاضی کو قابو کرنے کے لیے اپنی تفتیش کا جال بھی پھیلا دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن قاضی کی گرفتاری سے پہلے ایک اور کمبھیر مسئلے کو بھی حل کرنا ہے.....!''

''کون سا کمبھیر مسئلہ ملک صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''بے زبان پالتو جانوروں کی پراسرار موت کا مسئلہ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''میں بڑی شدت سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات کون اس ڈیرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان جانوروں کو موت کی نیند سلا دیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ شخص میرے ہتھے چڑھ گیا تو پھر قاضی تک رسائی حاصل کرنا بھی آسان ہوجائے گا۔''

''لیکن ڈیرے کے داخلی گیٹ پر تو آپ سرکاری تالا ڈال کر گئے تھے۔'' چودھری نے الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا وہ تالا توڑ کر کوئی شخص ڈیرے کے اندر داخل ہوا تھا؟''

''نہیں چودھری صاحب!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سرکاری تالا اپنی جگہ سلامت تھا۔'' پھر میں نے ڈیرے کی دیواروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اس ڈیرے کے اندر داخل ہونے کے لیے تالا توڑنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی شخص دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر کود سکتا ہے۔''

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب.....!''

ہمارے بیچ یہ کمبھیر گفتگو جاری ہی تھی کہ کانسٹیبل نیاز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آیا پھر ایک چیز میری جانب بڑھاتے ہوئے جوش بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ دیکھیں ملک صاحب.....!''

میں نے اس چیز کو ہاتھ میں لے کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ کالی ڈوری میں تین پتھروں والا ایک لاکٹ تھا۔ وہ تینوں مختلف رنگ کے عقیق تھے۔ کالی ڈوری گرہ کے مقام سے ٹوٹی ہوئی تھی یعنی اس ڈوری کے ٹوٹنے کے سبب ہی مذکورہ لاکٹ کسی کے گلے سے گر گیا تھا۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کانسٹیبل سے سوال کیا۔

''نیاز! یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟''

''ڈیرے کی قبرستان والی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''ڈیرے کے اندر یا باہر؟''

''باہر ملک صاحب۔'' نیاز نے جواب دیا۔

گزشتہ روز کانسٹیبل بصیر نے ڈیرے کے اندر اور باہر دیواروں کے ساتھ والا سارا حصہ بغور دیکھا تھا لیکن یہ ٹوٹی ہوئی ڈوری والا لاکٹ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ..... یہ لاکٹ پچھلی رات وہاں گرا تھا۔

''چودھری صاحب!'' میں نے مذکورہ لاکٹ کو چودھری طفیل کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ابھی چند لمحے پہلے ہم جس بندے کا ذکر کر

Digitized by Google

رہے تھے وہ ڈیرے کی قبرستان کی طرف والی دیوار پھلانگ کر اندر کودا تھا۔ اندر آتے ہوئے یا باہر جاتے وقت یہ لاکٹ ٹوٹ کر اس کی گردن سے نکل گیا۔ اگر اس لاکٹ کے مالک کا پتا چل جائے تو بھی یہ معلوم کرنا کافی آسان ہوجائے گا کہ اس نے زہر کھلا کر اتنے جانوروں کا صفایا کیوں کیا.....!''

''یہ کیس پیچ در پیچ الجھتا ہی جارہا ہے۔'' چودھری نے ہونٹ بھینچتے ہوئے فکر انگیز لہجے میں کہا۔ ''ابھی ہم قاضی کو کھوجنے کے لیے پریشان تھے کہ بیچ میں یہ لاکٹ والے کا چکر شروع ہوگیا۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آرہا.....''

ہمارے درمیان ٹوٹے ہوئے لاکٹ پر بات ہو ہی رہی تھی کہ مجاور وہاں پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی مجھے اطلاع دی۔

''تھانے دار صاحب! میں تانگے لے آیا ہوں۔''

''شاباش!'' میں نے تحسینی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔'' تم تو بہت کام کے آدمی ہو بھئی۔''

اچانک اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں موجود لاکٹ پر پڑی تو وہ اپنی تعریف سے محظوظ ہونا بھول گیا اور لاکٹ کو دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یہ آپ کو کہاں سے ملا.....؟''

''کیا تم اس لاکٹ کو پہچانتے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی بالکل پہچانتا ہوں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ایسا لاکٹ تو میں نے اس چک کے صرف ایک ہی بندے کے گلے میں دیکھا ہے۔''

''کس بندے کے گلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بڑے تیقن سے جواب دیا۔ ''پیجا کے گلے میں!''

☆☆☆

پرویز عرف پیجا کو میں نے اس کے گھر سے گرفتار کرکے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دیا تھا۔ پرویز چک بیالیس غربی ہی کا رہنے والا تھا۔ گرفتاری کے وقت اس کا پورا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کی بیوی رانی عرف رانو نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلی رات سے پیجا کو تیز بخار تھا۔ رانو بھولی صورت والی ایک معصوم اور خوش شکل عورت تھی۔ ان دونوں کی ایک چار سالہ بیٹی بھی تھی جسے وہ گڈی کہتے تھے۔ میں نے رانو کے سامنے پیجا کی چھترول کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے پوچھ گچھ کے بہانے اسے اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا اور ابتدائی ''مٹھی چاپی'' کے لیے اسے حوالدار جابر کی تحویل میں دے دیا تھا۔

''دیکھو پیجا! میں بنے ادھر چک بیالیس میں تمہاری بیوی، تمہاری بچی اور تمہارے تیز بخار کی وجہ سے تمہاری درگت نہیں بنائی لیکن یہاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ تمہارے پیچھے جو حوالدار کھڑا ہے نا اس کا صرف نام ہی جابر نہیں بلکہ یہ ستم و جبر ڈھانے میں پی ایچ ڈی ہے لہٰذا اگر تم اپنے جسم کی سلامتی کے خواہاں ہو تو میں جو پوچھوں اس کا سچا اور کھرا جواب دینا۔ اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میرا ایک اشارہ جابر کے ہاتھ پاؤں کھول دے گا۔ پھر تمہاری خیریت نہیں۔ کوئی تمہیں بچانے نہیں آئے گا، تھانے سے تمہاری لاش ہی جائے گی۔''

اگرچہ میں نے نہایت ہی نرم لہجے میں اسے تنبیہ کی تھی لیکن میرے الفاظ میں چھپی ہوئی سختی کو اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کرلیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے یہی اخذ کیا کہ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ بے حد سراسیمہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! میرا قصور کیا ہے؟''

''تمہارے قصور براستہ کاہنہ پر بعد میں بات ہوگی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سخت لہجے میں کہا پھر اپنی میز کی دراز میں سے وہ ٹوٹا ہوا لاکٹ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تمہارا ہی ہے نا.....؟''

''ن.....نہیں..... جی ہاں.....'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مطلب تم یہ چاہتے ہو کہ میں جابر کو اشارہ کردوں۔'' میں نے کرخت نظر سے اسے گھورا۔ ''تاکہ یہ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر بسوں میں فروخت کرنا شروع کردے؟''

''نہیں، نہیں.....'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو پھر ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دو۔'' میں نے گرجدار آواز میں کہا پھر اپنے سوال کو دہرایا۔

اس مرتبہ وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''جی، یہ لاکٹ میرا ہی ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملا.....؟''

''جہاں پچھلی رات تم نے گرایا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جھنڈا پیر کی کے ڈیرے کی اس دیوار کے باہر جو قبرستان کی طرف ہے۔ بتاؤ، تم کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر داخل ہوئے تھے اور اس امر کی بھی وضاحت کرو کہ تم نے ڈیرے پر موجود بے زبان جانوروں

Digitized by Google

کو کیوں مارا؟ اگر تم نے کسی قسم کی غلط بیانی کی تو میں تمہاری کھال کھنچوانے میں ایک لمحے کی سوچ بچار نہیں کروں گا۔''

میرا اٹل انداز دیکھ کر اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ تھوک نگل کر مریل سی آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر میں..... آپ کو سب کچھ..... سچ سچ بتا دوں تو..... پھر آپ مجھے..... جانے دیں گے نا.....؟''

''اگر تم کسی سنگین جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تو بے شک جانے دوں گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''جناب.....'' وہ گھگیایا۔ ''میں..... لالچ میں..... آ گیا تھا.....!''

''کس چیز کا لالچ؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

وہ بتانے لگا۔ ''مال و دولت کا لالچ، زیورات کا لالچ.....''

اس کی بات اچھی طرح میری سمجھ میں بیٹھ رہی تھی لیکن پھر بھی تصدیق کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔ ''پتا نہیں، تم مجھے کیا کہانی سنا رہے ہو۔ مال و دولت اور زیورات کا جھنڈا پیرنی کے ڈیرے سے کیا تعلق؟''

''میں آپ کو کھل کر بتاتا ہوں جی.....'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''جلدی سے کھل جاؤ۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تمہیں کھولنے کے لیے مجبوراً مجھے جابر کو زحمت دینا پڑے گی۔''

''نن..... نہیں جناب..... اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ نے گرفتاری کے بعد جتنی دیر کے لیے مجھے حوالات میں بند رکھا، میں نے آپ کے حوالدار صاحب کی صلاحیتوں کو اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''تو پھر رکے بغیر شروع ہو جاؤ۔'' میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''جتنی جلدی تم اپنی کہانی مکمل کر لو گے، اتنی ہی جلدی میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔''

آئندہ دس منٹ میں پرویز عرف پیچا نے مجھے جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے تھا۔ پیچا نے جھنڈا پیرنی کے خادم خاص قاضی کو فیض نامی ایک آدمی سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ قاضی اور فیض کی گفتگو سے اسے پتا چلا تھا کہ جھنڈا پیرنی نے گنبد والے کمرے کے اندر بہت سارے زیورات اور مال و دولت چھپا رکھا ہے۔ جب جھنڈا پیرنی کا قتل ہو گیا اور قاضی کی بھی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی تھی تو پیچا کے دل میں لالچ آ گیا اور اس نے ڈیرے میں گھس کر جھنڈا پیرنی کے مال و دولت پر ہاتھ صاف کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کام کے لیے اس نے پچھلی رات کا انتخاب کیا۔

''جناب! آپ تو کل ڈیرے پر تالا ڈال کر چلے گئے تھے لیکن مجھے اندر داخل ہونے کے لیے کچھ انتظام کرنا پڑا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''مرغیاں اور بلیاں تو بے ضرر جانور ہیں لیکن میں کتوں کی طرف سے فکرمند تھا کہ اگر انہوں نے مجھے ڈیرے میں کودتے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تو میرا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔ میں نے پہلے کتوں کو گہری نیند سلانے کا پروگرام بنایا تھا پھر میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آ گیا.....''

''کون سا اچھوتا خیال؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''گاؤں کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ ڈیرے پر موجود تمام جانوروں کو باجی اللہ والی اپنی کسی روحانی قوت سے کنٹرول کرتی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''باجی اللہ والی تو اللہ کے پاس جا چکی تھیں۔ میں نے سوچا، تمام جانوروں کو گہری نیند سلا دیتا ہوں تاکہ گاؤں والے یہی سمجھیں کہ باجی اللہ والی کے غم میں تمام مرغیاں، بلیاں اور کتے غم سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ میں نے کہیں سے بے ہوشی کی دوا حاصل کی اور شام سے تھوڑی دیر پہلے یہ دوا گوشت پر لگا کر بلیوں اور کتوں کے آگے ڈال دی۔ یہی دوا آٹے کی گولیوں میں ڈال کر میں نے مرغیوں کو بھی کھلا دی۔ پھر جب رات کا اندھیرا پھیل گیا تو میں ڈیرے میں کودا۔ میرا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ تمام مرغیاں، بلیاں اور کتے گہری نیند سو رہے تھے لہٰذا مجھے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر میرا لاکٹ اسی وقت ٹوٹ کر کہیں گر گیا جس کا مجھے مطلق احساس نہ ہوا اور اسی کی وجہ سے میں پکڑا گیا۔''

''گدھے کے بچے! تم نے وہ دوا کچھ زیادہ ہی مقدار میں ان بے زبان جانوروں کے شکم میں اتار دی تھی اس لیے وہ گہری بے ہوشی سے آگے کی منزل پر پہنچ گئے۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان کی لاشیں اٹھانے میں دو تین گھنٹے لگ گئے تھے اور جہاں تک تمہاری گرفتاری کا معاملہ ہے نا.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لاکٹ ملنا تو ایک اتفاق ہے۔ اگر تم پاتال میں بھی چھپ جاتے تو میں جلد یا بدیر تمہیں ڈھونڈ ہی لیتا۔

تمہیں اندازہ نہیں کہ قانون کے ہاتھ کتنے مضبوط اور لمبے ہوتے ہیں۔''

وہ جابر کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے اندازہ ہوگیا ہے تھانے دار صاحب۔ اسی لیے تو میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

لگتا تھا، جابر نے اس مختصر سے قیام کے دوران میں پیجا کی اچھی خاصی ''مہمان داری'' کر ڈالی تھی جبھی وہ وقفے وقفے سے سہمی ہوئی نظر سے جابر کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ نہیں سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری سنائی ہوئی کہانی پر یقین کرلوں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں صبح فیض نامی اس بندے کو تھانے بلا کر تمہاری باتوں کی تصدیق کروں گا۔ بتاؤ، یہ فیض کیا بیچتا ہے؟''

''وہ تو کچھ بھی نہیں بیچتا تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''اس کی چار پانچ کلے (ایکڑ) زمین ہے۔ وہ کھیتی باڑی کرتا ہے۔''

اگرچہ پیجا میرے سوال کو سمجھ نہیں پایا تھا تاہم اس کا جواب میرے حسبِ منشا تھا۔ میں نے اس سے استفسار کیا۔

''کیا فیض بھی چک بیالیس غربی ہی کا وسنیک ہے؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ ادھر شرقی میں رہتا ہے۔''

''تمہارے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ فیض اور قاضی میں بڑی گہری دوستی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تو وہ اتنی اہم باتیں کررہے تھے..... ہیں نا؟''

''جی، مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیض کو اگر تفتیش کے نازک مراحل سے گزارا جائے تو اس کی زبان قاضی کے غیاب کی کہانی سنا سکتی ہے اور تمہارے بیان کی تصدیق یا تردید بھی ہوسکتی ہے۔''

''جناب! میں نے آپ کو ایک بھی بات غلط نہیں بتائی۔'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''کاکا بلی! پولیس کے معاملات قسمیں کھانے سے حل نہیں ہوا کرتے۔'' میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم حقائق وشواہد کی روشنی میں اپنی تفتیش کو آگے بڑھاتے ہیں اور بالآخر کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں لہٰذا.....'' میں نے ذرا دیر کو رک کر کھوجتی ہوئی نظر سے پیجا کو دیکھا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہارے قسمیں کھانے سے میری تفتیش کا پیٹ نہیں بھرے گا اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنی کہانی مکمل کرو۔ پچھلی رات ڈیرے میں داخل ہونے کے بعد تم نے کیا کیا؟ کیا جھنڈا پیرنی کا خفیہ خزانہ تمہارے ہاتھ لگا؟ تم نے وہ مال و دولت اور زیورات کہاں چھپائے ہیں.....؟''

میرے خطرناک سوالات کی بوچھاڑ نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب..... آپ میری..... بات کا یقین کریں..... میں رات کو ڈیرے میں داخل ضرور ہوا تھا پر..... پر میں وہاں سے کچھ بھی حاصل نہیں کرسکا..... میں الٹے پاؤں وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔ میں آپ کو بالکل سولہ آنے سچ بتا رہا ہوں۔''

''تمہارا سچ سولہ آنے ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم صرف اس بات کی وضاحت کرو کہ وہاں سے خالی ہاتھ کیوں لوٹ آئے تھے اور وہ بھی الٹے پاؤں.....؟''

''وہ جی..... میں ڈر گیا تھا۔'' وہ خوف زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''کس چیز سے ڈر گئے تھے.....؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔ ''کیا تم نے جھنڈا پیرنی کے ڈیرے پر کا شود یو کو دیکھ لیا تھا؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں جناب.....'' اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہوگیا۔ ''پتا نہیں، وہ کا شود یو تھا یا شاہِ جنات..... مگر میں بری طرح ڈر گیا تھا۔ پھر اسی خوف میں دوڑتے ہوئے میں ڈیرے سے نکل آیا تھا اور گھر پہنچتے ہی مجھے تیز بخار چڑھ گیا.....''

''ڈرو نہیں.....!'' میں نے اس کی تیزی سے بگڑتی حالت کے پیشِ نظر تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ ملک صفدر حیات کا تھانہ ہے۔ کوئی کا شود یو، شاہ جنات، بھوت چڑیل یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ تم اپنے دماغ کو حاضر رکھ کر مجھے بتاؤ کہ پچھلی رات ڈیرے پر تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے پانی منگوا کر پیجا کو پلایا اور اس دوران میں اس کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ دس منٹ کی کوشش کے بعد اس کے اوسان بحال ہوگئے پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''تھانے دار صاحب! پچھلی رات میں بہ آسانی ڈیرے کے اندر داخل ہوگیا تھا اور میری منزل بھی گنبد والا وہ کمرا جس کے اوپر جھنڈا لگا ہوا ہے۔ میں نے قاضی اور

فیض کو اسی کمرے میں چھپائے ہوئے خزانے کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا۔ میں دو تین کمروں سے گزر کر اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچ گیا۔ میں اندھیرے میں دیکھنے کے لیے اپنے ساتھ ایک ٹارچ لے گیا تھا۔ میں جیسے ہی گنبد والے کمرے کے سامنے پہنچا، ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ اچانک بجھ گئی۔ اگلے ہی لمحے ایک ہیبت ناک آواز میری سماعت سے ٹکرائی.....''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''کیسی آواز؟''

''وہ کسی انسان کی آواز نہیں تھی۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''وہ کسی اور ہی مخلوق کی آواز تھی جناب.....اس آواز کو سن کر میری روح فنا ہو گئی تھی اور میں تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ پھر میں نے وہی کیا جو اس آواز نے کہا تھا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا پھر خوف کی شدت سے مجھے تیز بخار چڑھ گیا۔''

چیچا کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا تاہم اس کا بیان مبنی برحقیقت نہیں تھا۔ وہ اپنے تاثرات اور محسوسات کی کہانی سنا رہا تھا جس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ میں نے اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے اور اس کی سوچ کا تجزیہ کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''اس غیر انسانی آواز نے تم سے کیا کہا تھا؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے ڈری سہمی نظر سے مجھے دیکھا پھر گویا ہوا۔ ''وہ دلوں کو دہلا دینے والی آواز مجھ سے کہہ رہی تھی.....دفع ہو جا یہاں سے.....تو جس مقصد سے یہاں آیا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ تمہاری پیرنی نہیں رہی تو کیا ہوا۔ ہم ہیں نا، اس کے خزانے کی حفاظت کرنے والے۔ جو بھی چوری کی نیت سے اس کمرے کی طرف بڑھے گا، ہم اس کی گردن توڑ ڈالیں گے۔ اگر زندگی پیاری ہے تو فوراً واپس چلے جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہیں کرنا.....''

''ٹھیک ہے چیچا۔'' میں نے اپنے رویے سے ایسا ظاہر کیا جیسے میں نے اس کی سنائی ہوئی کہانی کو سچ مان لیا ہو۔ ''تم آج کی رات ہمارے تھانے کے مہمان ہو۔ کل صبح میں فیض کو یہاں بلاؤں گا۔ اگر تمہاری بات کی تصدیق ہو گئی تو میں تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

''کون سی بات کی تصدیق تھانے دار صاحب۔'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''آپ اس ہیبت ناک آواز کا ذکر تو نہیں کر رہے.....؟''

''کیا پچھلی رات فیض بھی تمہارے ساتھ جھنڈا پیرنی کے ڈیرے میں گھسا تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''ن.....نہیں تو.....'' اس نے نفی میں جواب دیا۔

''وہاں تو میں اکیلا ہی گیا تھا۔''

''تو پھر تم اس دھمکی آمیز غیر انسانی آواز کو اپنے حواس پر سوار نہ کرو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں فیض سے صرف اس بات کی تصدیق کروں گا کہ اس نے قاضی سے خزانے کے حوالے سے کیا گفتگو کی تھی۔''

چیچا اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ سیلز کیئر

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

Digitized by Google

''پھر تو ٹھیک ہے جناب۔''

''جابر!'' میں نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کی رات پیچا تمہارا مہمان ہے لیکن اس کی خصوصی ''خاطر داری'' نہیں کرنا۔ بس، دال روٹی ہی سے گزارہ چلانا ہے۔''

''جی، میں سمجھ گیا ملک صاحب!'' جابر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پیچا کو اپنے ساتھ لے گیا۔

ان کے جانے کے بعد میں پیچا کی ذہنی کیفیت پر غور کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے پچھلی رات گنبد والے کمرے کے سامنے کوئی انسانی یا حیوانی یا جناتی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ محض اس کے اندر کا خوف تھا جو تاریخ کے کسی بھی وجہ سے بجھ جانے کے باعث باہر نکل آیا تھا اور کسی مہیب آواز کی صورت اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ جھنڈا پیرنی کی ذات کئی طرح کے اسرار میں لپٹی ہوئی تھی جن میں ایک خاص الخاص بات یہ تھی کہ جھنڈا پیرنی کے قبضے میں جنات ہیں۔ چک بیالیس اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ اس بات پر اندھا یقین بھی رکھتے تھے کہ جھنڈا پیرنی جنات سے کام لیتی ہے۔ جھنڈا پیرنی کے انتقال پُرملال پر پیچا نے خزانے کے لالچ میں ڈیرے کے اندر داخل ہونے کی ہمت تو کر لی تھی لیکن اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جنات کا خوف موجود تھا۔ چنانچہ جب اس کی ٹارچ بجھی تو وہاں کی تاریکی نے اس کے اندر کے خوف کو باہر نکال دیا جس کے نتیجے میں اسے وہ غیر انسانی آواز سنائی دی تھی جو دراصل اس کے لاشعور کی کرشمہ کاری تھی۔ انسان جس چیز سے خوف زدہ ہوتا ہے، اچانک اندھیرا چھا جانے سے وہ اسی خوف کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ پیچا بھی یقیناً اسی نفسیاتی تجربے سے گزرا تھا اور اس کی سماعت نے کوئی جناتی آواز سن لی تھی۔

میں پیچا کے انٹرویو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسپتال سے جھنڈا پیرنی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آگئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی جس کے مطابق جھنڈا پیرنی کی موت بارہ دسمبر کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ کسی بھاری آہنی چیز کی مدد سے اس کی کھوپڑی کو کچل کر اسے فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ بوقتِ انتقال جھنڈا پیرنی بے ہوشی کی حالت میں تھی یعنی اسے بے خبری کے عالم میں قتل کیا گیا تھا۔ کیمیکل ایگزامر کی رپورٹ میں اس امر کی تصدیق کی گئی تھی کہ موت سے پہلے جھنڈا پیرنی کو کوئی خواب آور دوا کھلائی گئی تھی۔

اس ڈیرے پر صرف دو افراد ہی رہتے تھے۔ ایک جھنڈا پیرنی اور دوسرا اس کا خادمِ خاص قاضی۔ پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامر کی رپورٹس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ قاضی نے پہلے رات کے کھانے میں کوئی خواب آور دوا ملا کر جھنڈا پیرنی کو اٹانحفیل کیا تاکہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کر سکے اور اس کا کام آسان ہو جائے پھر کسی آہنی وزنی ہتھوڑے سے اس کا سر کچل کر اسے زندگی سے خالی کر دیا۔ اس کے بعد وہ جھنڈا پیرنی کے خفیہ خزانے پر ہاتھ صاف کر کے وہاں سے غائب ہو گیا۔

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ جھنڈا پیرنی کا قاتل ہر صورت میں اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا ورنہ پیرنی کی گہری بے ہوشی خفیہ خزانہ لوٹنے کے لیے کافی تھی۔ قاتل کو یہ ڈر تھا کہ اگر جھنڈا پیرنی زندہ رہی تو بعد ازاں اس کے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتی تھی لہٰذا اس نے اس محاورے پر عمل کر ڈالا تھا..... نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری!

میں نے جھنڈا پیرنی کی لاش کو تانگے پر رکھوا کر چودھری طفیل کی حویلی بھجوا دیا تاکہ وہ اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر سکے۔ چک بیالیس غربی میں جھنڈا پیرنی کا کوئی حقیقی والی وارث موجود نہیں تھا جو میں پیرنی کی لاش اس کے سپرد کرتا۔ میری نظر میں اس مقصد کے لیے چودھری طفیل سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص ہو نہیں سکتا تھا۔ وہی جھنڈا پیرنی کی تدفین کا عالی شان انتظام کر سکتا تھا کیونکہ وہ بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا لہٰذا رات کا کھانا کھانے کے فوراً بعد مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں نے جیسے تیسے عشا کی نماز ادا کی پھر گرم بستر کی آغوش میں پناہ گزیں ہو گیا۔

☆☆☆

پندرہ دسمبر کی صبح قدرے خوشگوار تھی یعنی اس روز سورج آسمان پر چمک رہا تھا جس کی وجہ سے سردی کی شدت میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ رات بھر کی پُرسکون اور گہری نیند نے میری ساری تھکن اتار دی تھی۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا اور کانسٹیبل بصیر کو اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات کے ساتھ چک بیالیس شرقی روانہ کر دیا تاکہ وہ فیض نامی اس شخص کو پکڑ کر تھانے لے آئے جس کا ذکر پیچا نے کیا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہی فیض مجھے قاضی تک

Digitized by Google

پہنچائے گا.....

تھوڑی دیر کے بعد اے ایس آئی شاہ جیونا سے لوٹ آیا۔ میں نے آفتاب کو فوراً اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ جب وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، شاہ جیونا کی کیا خبریں ہیں۔ کیا قاضی کا کوئی اتا پتا لگا.....؟''

''کوئی خبریں نہیں ہیں ملک صاحب۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے بارہ سال سے شاہ جیونا والوں نے قاضی کی شکل نہیں دیکھی۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے وہاں کے لوگوں کو جھنڈا پیرنی کی موت کے بارے میں تو بتایا ہوگا؟''

''جی بتایا تھا۔'' وہ بے دلی سے بولا۔ ''میں حیدر علی شاہ اور نرگس کے خاندان کے بعض افراد سے بھی ملا ہوں۔''

''پھر ان کے کیا تاثرات تھے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

''ان میں سے کسی کو نرگس یا حیدر شاہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''وہ مجھے بہت ہی انا پرست اور ضدی لگے ہیں۔ ان کے خیالات کے مطابق حیدر شاہ اور نرگس ان کے لیے بارہ سال پہلے ہی مر گئے تھے جب انہوں نے شاہ جیونا چھوڑا تھا.....'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب وہ حیدر شاہ اور نرگس کے لیے ایسی لاتعلقی اور بے مروتی رکھتے ہیں تو پھر قاضی ان کے لیے کس کھیت کی مولی ہے۔ قصہ مختصر، ملک صاحب! میں بے حد افسوس کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آپ نے مجھے جس کام کے لیے شاہ جیونا روانہ کیا تھا میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔''

''دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں آفتاب!'' میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''انسان کی ایک ناکامی اس کی کامیابی کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔ اگر تم شاہ جیونا میں کوئی تیر نہیں مار سکے تو یہاں کا میدان تمہارا منتظر ہے۔ میں تمہیں بہترین کارکردگی دکھانے کا پورا موقع فراہم کروں گا۔''

''لگتا ہے.....'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں اس کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے؟''

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اسے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل سنا دی جس کے بعد وہ خاصا ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ اسی وقت ایک کانسٹیبل نے مجھے اطلاع دی کہ چاچا خوشیا مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے کھوجی بابا کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

''چاچا! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' خوشیا بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ ''کل سے تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک اہم کام تمہارے ذمے لگایا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

''ملک صاحب! میں کوئی باجی اللہ والی کا جن تھوڑی ہوں جو کہیں غائب ہو جاؤں گا۔'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولا۔ ''سرکار، میں آپ ہی کے کام سے لگا ہوا تھا۔ رات کو جب میں واپس تھانے آیا تو آپ اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے۔ میں نے آپ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے گھر چلا گیا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔''

میں نے اس کی وضاحت کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے۔ قاضی کا کھرا کہاں تک لے گیا؟''

''رپورٹ تو خاصی حوصلہ افزا ہے ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ میں نے قاضی کے پاؤں کے نشانات کا بڑی توجہ سے تعاقب کیا ہے۔ وہ بندہ ڈیرے سے نکل کر نہر کے پل کی طرف گیا تھا.....''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔ ''یہ بات تو تم نے کل ہی مجھے بتا دی تھی۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ساری باتیں کل ہی کی ہیں۔ آج تو میں نے ابھی کام شروع بھی نہیں کیا۔ آپ حوصلے سے سنیں تو میں کچھ عرض کروں.....''

اس نے بڑے مہذب انداز میں گویا مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔ میں نے اس کی بات کا ہرگز برا نہیں منایا۔ چاچا خوشیا عمر میں مجھ سے دگنا تھا۔ اس لحاظ سے وہ میرے لیے ایک بزرگ کا درجہ رکھتا تھا لہٰذا میں نے اس کی ڈانٹ کا برا اثر نہیں لیا اور معتدل انداز میں کہا۔

''جی، آپ فرمائیے، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

وہ فرمانے لگا۔ ''نہر کا پل عبور کرنے کے بعد قاضی نے نہر کا کنارہ پکڑ لیا اور شمال کی سمت بڑھنے لگا۔ اب وہ نہر کی دوسری سمت تھا یعنی چک بیالیس شرقی کے علاقے میں.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس کے کھرے کو پکڑے رکھا۔ نہر کے

Digitized by Google

کنارے تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ دائیں جانب والے کھیتوں میں اتر گیا۔ یہ کھیت چک شرقی تک چلے جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کچی سڑک کی بہ نسبت کھیتوں کے اندر سے کھڑا کا فاصلہ قدرے مشکل کام ہے۔ میرا بہت سارا وقت انہی کھیتوں میں گزر گیا۔ بالآخر جب میں قاضی کے کھرے کے تعاقب میں کھیتوں سے نکل کر چک بیالیس شرقی کے گھروں کی جانب بڑھا تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ روشنی اتنی کم ہوگئی تھی کہ میں قاضی کے قدموں کے نشانات کی تلاش جاری نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا میں نے ایک مقام پر پتھر کی نشانی رکھی اور واپس آ گیا۔ اب جا کر اسی پتھر سے دوبارہ کام شروع کروں گا۔''

خوشیا کی رپورٹ نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ پیجا نے بتایا تھا کہ قاضی کا ساتھی فیض چک بیالیس شرقی کا رہنے والا تھا۔ عین ممکن تھا، قاضی نے جھنڈا پیرنی کو ٹھکانے لگانے کے بعد فیض کی طرف رخ کیا ہو۔ اس امر کا اغلب امکان نظر آنے لگا تھا کہ قتل اور ڈکیتی کی اس مذموم کارروائی میں فیض اور قاضی آپس میں ملے ہوئے تھے۔

''تو تمہارا یہ خیال ہے کہ قاضی چک بیالیس شرقی کے کسی گھر کی طرف گیا ہوگا؟'' میں نے اضطرازی لہجے میں دریافت کیا۔

وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! حالات و واقعات تو اسی طرف اشارہ کررہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے چاچا! آپ فی الفور اپنے کام کو آگے بڑھاؤ۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور اس مشن میں اے ایس آئی آفتاب بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔'' پھر میں نے اے ایس آئی کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آفتاب! قاضی کا کھرا چک بیالیس شرقی کے جس گھر تک بھی پہنچے، تم نے اس گھر کے تمام مکینوں کو اٹھا کر تھانے لے آنا ہے اور اگر قاضی وہاں موجود ہو تو اسے الٹی ہتھکڑی لگا کر یہاں پہنچانا ہے۔ باقی کی تفتیش میں خود کرلوں گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''جیتی طراں سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''انشاء اللہ! دوپہر سے پہلے میں آپ کو کوئی خوشخبری سناؤں گا۔''

میں نے نیک خواہشات کے سائے میں انہیں رخصت کردیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد کانسٹیبل بصیر میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے آج صبح اسے فیض کی تلاش میں چک بیالیس شرقی روانہ کیا تھا۔ اس نے میرے پاس آکر بتایا۔

''ملک صاحب! میں نے ابھی آفتاب کو کھوجی بابا کے ہمراہ بیالیس شرقی کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ کیا وہاں پر کوئی خاص کارروائی ہونے والی ہے؟''

''وہاں کی کارروائی پر تو ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں جس مقصد کے لیے ادھر بھیجا تھا اس سلسلے میں تم نے کیا تیر مارا ہے؟''

''میں نے فیض کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلی ہیں ملک صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''لیکن اس بندے سے میری ملاقات نہیں ہوسکی۔''

''ملاقات کیوں نہیں ہوسکی؟'' میں نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

''وہ اپنے گھر میں موجود نہیں ملک صاحب۔'' بصیر نے بتایا۔ ''اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔''

''اوہ! قاضی غائب اور اس کا ساتھی فیض بھی ندارد۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''تم نے فیض احمد کے بارے میں کس قسم کی معلومات اکٹھا کی ہیں؟''

''فیض اپنے گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے جناب!'' بصیر مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''پانچ سال پہلے اس کی بیوی رضیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ رضیہ کپڑوں میں آگ لگنے سے جل کر مری تھی۔ رضیہ کی موت کے بعد فیض بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ ان میاں بیوی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ فیض کے پاس پانچ ایکڑ زمین ہے۔ وہ اسی زمین پر کاشت کاری کر کے اپنا گزارہ چلاتا ہے اور یہ کہ پچھلے تین دن سے کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ وہ کہاں چلا گیا، کسی کو کچھ خبر نہیں۔''

''آج دسمبر کی پندرہ تاریخ ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''تین دن پہلے کا مطلب یہ ہوا کہ بارہ دسمبر۔ یہ تو وہی تاریخ ہے جب جھنڈا پیرنی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قاضی اور فیض ایک ساتھ ہی منظر سے غائب ہوئے ہیں۔''

''جی بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فی الحال تو یہی نظر آرہا ہے۔ میں نے چک شرقی میں ادھر ادھر گھوم کر لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی ہے لیکن کسی نے بھی قاضی اور فیض کو ایک ساتھ نہیں دیکھا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اے ایس آئی جیسے ہی واپس آئے تو مجھے اطلاع دینا۔''

''جی ملک صاحب!'' وہ مجھے سیلوٹ کر کے کمرے

Digitized by Google

سے نکل گیا۔

☆☆☆

آفتاب اور خوشیا کی واپسی ظہر کے وقت ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ تین افراد کو بھی پکڑ لائے تھے جن میں دو عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میں نے تھانے سے رخصت کرتے وقت آفتاب کو ہدایت کی تھی کہ قاضی کا گھر اجس بھی گھر میں داخل ہو، تم نے اس کے مکینوں کو پکڑ کر میرے پاس لانا ہے۔ یہ تین افراد اسی سلسلے میں تھانے پہنچائے گئے تھے جو اس وقت تھانے کی حوالات میں بند تھے اور آفتاب میرے سامنے بیٹھا رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

''ملک صاحب! قاضی کا گھرا ہمیں فیض احمد نامی ایک شخص کے گھر تک لے گیا تھا لیکن.....''

''لیکن یہ کہ فیض کے دروازے پر تالا جھول رہا ہے۔'' میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''وہ پچھلے تین دن سے چک بیالیس شرقی کے کسی دستیک کو نظر نہیں آیا اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کب لوٹ کر واپس آئے گا۔ چک شرقی کے کسی باسی نے قاضی اور فیض کو ایک ساتھ نہیں دیکھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری تحقیق بھی یہی کہتی ہے۔''

''یہ جو تم تین بندوں کو پکڑ کر لائے ہو، ان کی کیا کہانی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ فیض کے دو طرفہ پڑوسی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فیض کے گھر کی ایک جانب رحم دین اور اس کی بیوی خالدہ رہتے ہیں۔ رحم دین کی کریانے کی دکان ہے۔ فیض کے دوسرے پڑوس میں شاداں اور اعجاز رہتے ہیں۔ اعجاز مویشیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے اور اکثر اسے گاؤں سے باہر جانا پڑتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ چک شرقی میں نہیں ہے۔ میں شاداں کو پکڑ لایا ہوں۔ شاداں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ فیض کی رشتے دار بھی ہے لیکن ان کا ملنا جلنا نہیں ہے۔ باقی کا انٹرویو آپ خود کر لیں جناب۔''

''ٹھیک ہے، تم پہلے رحم دین اور اس کی بیوی کو میرے پاس بھیجو، اس کے بعد شاداں کی باری آئے گی۔'' میں نے کہا۔ ''اور ہاں، تم اب چھٹی کر لو۔ کل سے تم نے بڑی دھوڑ دھوپ کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

آفتاب میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

چاچا خوشیا بھی میرے کمرے میں موجود تھا۔ اے ایس آئی کے جانے کے بعد اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ قاضی کو آسمان کھا گیا یا اسے زمین نے نگل لیا ہے۔ میں نے اس کے گھر کے فیض کے دروازے تک پکڑے رکھا۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چل رہا۔ اگر مجھے فیض کے گھر کے اندر داخل ہونے کا موقع مل جائے تو میں کوئی سراغ لگانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہیں ضرور یہ موقع فراہم کروں گا اور وہ بھی آج ہی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تھوڑی دیر باہر بیٹھو۔ میں ذرا ان لوگوں سے بات چیت کر لوں۔ پھر ہم آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔''

''جی اچھا ملک صاحب۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

میں نے رحم دین اور اس کی بیوی خالدہ کو اندر بلا لیا۔ ان کے دو بچے تھے جنہیں وہ گھر میں چھوڑ کر آئے تھے۔ میں نے رحم دین اور خالدہ سے گھما پھرا کر کئی سوال کیے لیکن ان کے جوابات سے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ قاضی یا فیض کی روپوشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی اور شاداں کو اپنے پاس بلا لیا۔

شاداں کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کی مالک ایک تندرست توانا عورت تھی۔ اس کے لیے خالصتاً پنجاب کی جٹی کے الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے۔ شاداں نے میرے سوالات کے جواب بھی کم و بیش رحم دین اور خالدہ جیسے ہی دیے۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، فیض احمد سے تم لوگوں کی کوئی رشتے داری بھی ہے؟''

''رشتے داری تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''رضیہ کی المناک موت کے ساتھ ہی سارے رشتے ناتے ختم ہو گئے۔ پچھلے پانچ سال سے ہمارا میل ملاپ اور بات چیت بند ہے۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے، رضیہ سے تمہارا کوئی جذباتی تعلق تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''رضیہ میری چھوٹی بہن تھی تھانے دار صاحب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لیکن فیض نے اسے ایک دن کا سکھ بھی نہیں دیا تھا۔ پھر ایک روز اس نے خود کو آگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔''

''اوہ.....!'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے لیکن تمہیں پتا ہے نا، پولیس

Digitized by Google

والوں کو کسی کیس کے سلسلے میں اس نوعیت کی پوچھ گچھ کرنا پڑتی ہے۔''

''یہی سوچ کر تو میں آپ کے بندوں کے ساتھ تھانے آگئی ہوں۔'' وہ گھائل لہجے میں بولی۔ ''ورنہ فیض سے تو مجھے اس قدر نفرت ہے کہ میں اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔ آپ کو مجھ سے جو بھی پوچھنا ہے، جلدی پوچھ لیں۔ میں زیادہ دیر تک اس خبیث انسان کے ذکر کو برداشت نہیں کرسکتی۔''

میں نے شاداں کی جذباتی کیفیت کے پیش نظر مزید دو چار سوالات کے بعد فارغ کردیا۔ فیض احمد اور قاضی کے بارے میں شاداں سے کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوسکی تھیں تاہم میں نے اس سے فیض کے رشتے داروں کے نام اور پتے پوچھ لیے تھے۔

اسی سہ پہر میں نے خوشیا کے ساتھ چک بیالیس شرقی کا دورہ کیا اور وہاں کے لوگوں کی موجودگی میں دروازے کا تالا توڑ کر خوشیا کو گھر کے اندر کا وزٹ کرایا۔ وہ دو کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل عام سا چھوٹا گھر تھا جس کے صحن کے بڑے حصے میں فیض نے مختلف سبزیاں لگا رکھی تھیں۔

خوشیا نے گھوم پھر کر فیض کے گھر کا چپا چپا چھان مارا لیکن اس گھر کے اندر اسے کہیں بھی قاضی کا گھر انہیں ملا۔ بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ قاضی فیض کے دروازے تک تو آیا تھا لیکن اس کے گھر کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں یہی فرض کرلیا گیا کہ عین ممکن ہے فیض گھر سے باہر نکل کر قاضی سے ملا ہو۔ اس کے بعد وہ کہیں چلے گئے ہوں لیکن باوجود ہزار کوشش کے بھی ان کی وہاں سے روانگی کا کھرا دستیاب نہ ہوسکا۔ گویا ان دونوں کا غیاب ایک معما بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے دو دو ہوشیار قسم کے اہل کاروں پر مشتمل تین پولیس ٹیمیں تشکیل دیں اور انہیں شاداں کے فراہم کردہ پتوں پر فیض کی تلاش میں روانہ کردیا۔ چک جمیرا، احمد پور شرقیہ، ڈجکوٹ، ناروال، مریدکے، ہیلی اور چک سندھو کی طرف جانے والی تمام ٹیمیں ناکام و نامراد واپس لوٹ آئیں۔ انہیں کہیں سے بھی فیض احمد کی خیر خبر نہیں ملی تھی۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ میں اس کیس کی طرف سے مایوس ہوتا جارہا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں جھنڈا پیر کی عرف باجی اللہ والی کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ آخرکار، میں نے اسے خدا کی مصلحت جانتے ہوئے صبر کرلیا۔

☆☆☆

اس امر میں کسی شبے کی گنجائش نہیں کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اور ہر حال میں صبر کا پھل میٹھا ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مایوسی کفر کے برابر گناہ ہے۔ دو سال کے بعد مجھے بیک وقت ان تینوں حقائق سے سابقہ پڑ گیا۔ جھنڈا پیر فی مرڈر کیس ایک طرح سے داخل دفتر ہوچکا تھا۔ اس واردات کے ذمے دار قاضی کو نامزد کرکے مفرور قرار دے دیا گیا تھا۔ ایک روز میں تھانے میں بیٹھا معمول کی مصروفیات نمٹا رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص مجھ سے ملنے آیا اور اس نے اپنا نام اعجاز بتانے کے بعد کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں شاداں کا گھر والا ہوں۔''

''کون شاداں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہی شاداں جس سے دو سال پہلے اسی تھانے میں آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''ان دنوں میں جانوروں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں چک سے باہر گیا ہوا تھا اور آپ باجی اللہ والی کے قتل کی تفتیش کر رہے تھے۔''

''باجی اللہ والی'' کے ذکر پر میں چونک اٹھا کیونکہ یہ کیس تو میرے دل میں کسی خار کے مانند پیوست تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور محتاط نظر سے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ میں ان دنوں قاضی اور فیض نامی دو افراد کی تلاش میں تھا۔ اسی سلسلے میں تمہاری بیوی کو بھی تھانے بلایا گیا تھا کیونکہ فیض تم لوگوں کا پڑوسی تھا اور مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ وہ تمہارا رشتے دار بھی ہے۔''

اس نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''شاداں آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''اگر تمہاری بیوی مجھ سے ملاقات کی خواہش رکھتی ہے تو اسے بھی اپنے ساتھ لے آتے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''شاداں بہت زیادہ بیمار ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ وہ بستر سے لگ گئی ہے۔ اس نے درخواست کی ہے کہ آپ ایک مرتبہ گھر جا کر اس سے مل لیں۔''

اعجاز کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا اور ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''وہ کس سلسلے میں مجھ سے

Digitized by Google

ملاقات کرنا چاہتی ہے؟''

''میں نے بہت کریدا ہے سرکار لیکن اس نے سلسلہ بتایا نہیں۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کی سوئی بس ایک ہی جگہ پر اٹک کر رہ گئی ہے کہ وہ صرف اور صرف آپ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتی ہے۔''

اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر میں اعجاز کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ شاداں کسمپرسی کی حالت میں اپنے بستر پر چت پڑی تھی۔ فالج کے اٹیک نے اسے بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ پہلے جیسی صحت مند اور تروتازہ دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم اس کی زبان مناسب طور پر کام کر رہی تھی۔

اعجاز نے شاداں کے بستر کے نزدیک ہی میرے لیے ایک کرسی رکھ دی اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں نے مناسب الفاظ میں شاداں کی عیادت کی پھر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ایسی کیا خاص خبر ہے جو تم نے اپنے گھر والے کو بھی اندھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ تم مجھے کیا بتانا چاہ رہی ہو؟''

''میں آپ کے ذہن کی ایک خلش مٹانا چاہتی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''لیکن میرے کچھ بولنے سے پہلے آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ ہمارے درمیان ہونے والی یہ گفتگو یہیں پر ختم ہو جائے گی۔ اس کی بنا پر آپ کسی قسم کی قانونی کارروائی نہیں کریں گے۔''

''میں تمہاری بات سنے بغیر اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔'' میں نے محتاط نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات سننے کے بعد وعدہ کریں گے تو پھر اس میں آپ کا کیا کمال ہوگا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''میں جانتی ہوں، میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہوں گی۔ آپ میری درخواست کو لبِ مرگ کسی انسان کی آخری خواہش سمجھ کر وعدہ کر لیں۔''

بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں پھر وہاں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پر پھسل گئے۔ مجھے شاداں کی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر میرا دل پسیج گیا تھا۔ پھانسی کی سزا پانے والے مجرم سے بھی اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ میں پولیس والا ہونے کے علاوہ ایک انسان بھی تھا۔ میں نے اپنے جیسے ایک قریب المرگ انسان کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''شاداں! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان ہونے والی بات چیت اسی کمرے کی فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ تم جو کہنا چاہتی ہو، پورے اعتماد کے ساتھ کہہ ڈالو۔''

''آپ کو فیض اور قاضی کی تلاش تھی نا.....؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! کیا تم ان کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''کچھ نہیں..... بہت کچھ!'' میری طرف سے کیے جانے والے وعدے نے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔

''کہاں ہیں وہ دونوں؟'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

''برابر والے گھر کے صحن میں سبزیوں کی جو کیاریاں بنی ہوئی ہیں نا۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''وہ انہی کیاریوں میں منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔''

''انہیں وہاں کس نے پہنچایا؟'' میں نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے!''

''کیوں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میرے ''کیوں'' کا جواب دینے سے پہلے اس نے ایک بوجھل طویل سانس خارج کی پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ان لمحات میں اس فالج زدہ عورت کے سینے میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اس کے بستر کے قریب چپ چاپ بیٹھا اس کے آنکھیں کھولنے کا انتظار کرنے لگا۔ شاداں نے آنکھیں نہیں کھولیں، بند آنکھوں کے پیچھے اس کی زبان کھل گئی۔

''فیض ایک انتہائی کمینہ اور بدذات شخص تھا۔ میں جانتی ہوں، رضیہ کی موت کا ذمے دار یہی شیطان تھا۔ میں فیض سے شدید نفرت کرتی تھی۔ پھر قدرت نے مجھے اپنی نفرت کے اظہار کا ایک موقع فراہم کر دیا.....''

اس کی بند آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا اور وہ بھیگی ہوئی آواز میں مجھے بتا رہی تھی۔

''جب رضیہ زندہ تھی تو ہم نے اندرونی کمروں کی درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی بنائی ہوئی تھی تاکہ ایک دوسرے کے گھر میں قدم رکھے بغیر ہم آپس میں باتیں کر لیں۔ وقوعہ کی رات وہ کھڑکی کسی حد تک کھلی رہ گئی تھی اور اسی کھڑکی کے توسط سے میں نے قاضی اور فیض کی گفتگو سن لی تھی جس سے مجھے پتا چلا کہ قاضی باجی اللہ والی کو قتل کر کے اس کی ساری دولت اور زیورات چرا لایا تھا۔ اب یہاں سے ان دونوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر کہیں اور جانا تھا۔

جب فیض گھوڑوں کا بندوبست کرنے گھر سے نکلا تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا دماغ میرے قابو میں نہیں ہے۔ کوئی غیر مرئی قوت مجھے کنٹرول کررہی تھی۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میں میکانکی انداز میں اپنے گھر کی سیڑھی سے چھت پر پہنچی پھر فیض کی سیڑھی سے اس کے صحن میں اتر گئی۔ ہمارے گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں اس لیے اس عمل میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں صحن سے گزر کر سیدھی اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں قاضی موجود تھا۔''

''تم کون ہو۔'' وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر چونک گیا۔ ''اور یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''میں فیض کی سالی ہوں۔'' میں نے نشیلی آواز میں کہا۔ ''جب بھی میرا گھر والا گاؤں سے باہر گیا ہوتا ہے تو میں فیض کا دل بہلانے رات کی تاریکی میں اسی طرح ادھر آجایا کرتی ہوں۔'' پھر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ''فیض کہاں ہے؟''

''وہ باہر نکلا ہے۔'' قاضی مجھ پر رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔ ''جب تک وہ واپس نہیں آجاتا تم میرا دل بہلا دو۔''

''قاضی صاحب! یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی۔'' میں نے قربان جانے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن کیا آپ کپڑے پہنے پہنے ہی مجھ سے دل بہلائیں گے؟''

''نہیں نہیں.....'' وہ جوشِ جذبات میں بولا۔ ''میں ابھی لباس اتار رہا ہوں۔''

''اس کے ساتھ ہی وہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنا لباس اتارنے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک کام کی چیز کو اپنی نگاہ میں محفوظ کرلیا تھا۔ وہ مسالا کوٹنے والا ایک آہنی ڈنڈا تھا۔ (ہاون دستہ ٹائپ سمجھ لیں)

''قاضی کپڑے اتارنے لگا۔ جب وہ قمیص کے گریبان کے اندر سے گردن نکال رہا تھا تو میں نے بجلی کی سرعت سے حرکت کی اور اس کے قمیص کے اندر پھنسے ہوئے سر پر آہنی ڈنڈوں کی بارش کردی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیورا کر گرا پھر زمیں بوس ہوگیا۔ اس کے بعد میں بیرونی دروازے کے ساتھ لگ کر فیض کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ فیض دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر گیا تھا۔ وہ جیسے ہی لوٹا اور اس نے دروازہ کھول کر گھر کے اندر قدم رکھا تو میں نے آہنی ڈنڈے سے اس کے سر پر پے در پے وار کیے اور اسے بھی زمین پر لٹا دیا۔ اس کے بعد کی کہانی بہت سیدھی اور سادی ہے۔ میں نے صحن والی کیاریوں کے چند پودے ہٹائے اور نرم زمین کو کھود کر کوئی گز بھر گہرا گڑھا تیار کرلیا پھر ان دونوں کی لاشوں کو گڑھے میں پھینک کر اوپر سے مٹی برابر کرکے وہ چند پودے بھی دوبارہ لگا دیے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے وہاں سے ہٹائے تھے۔ آخری کام کے طور پر میں نے فیض کے گھر کے دروازے پر باہر سے تالا ڈال دیا تاکہ یہی لگے کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔''

''اور وہ مال و دولت..... طلائی زیورات؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ان کا تم نے کیا کیا؟''

''قتنے کی جڑ یہی مال و دولت ہی تو تھا۔'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''میں نے وہ سب بھی ان کے ساتھ ہی زمین میں دفن کردیا تھا.....'' پھر وہ تشنہی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن آپ وعدہ کرچکے ہیں کہ گڑے مردے نہیں اکھاڑیں گے۔''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں شاداں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں نے جو کیا، وہ تمہارے ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچ گئے۔ بس، تم سے میرا آخری سوال ہے۔ یہ بتاؤ، جب میں کھوجی کے ساتھ فیض کے گھر آیا تھا تو مجھے یہاں پر ان دونوں کا کھرا کیوں نہیں ملا تھا؟''

''میں نے اسی رات فیض کے پورے گھر میں خوب دبا کر جھاڑو ماردی تھی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''اس رات قدرت خود ہی مجھ سے کچھ نہ کچھ کروا رہی تھی۔ میں نے صرف ہمت کی۔ باقی سب آپوں آپ ہوتا چلا گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں..... ہمتِ مرداں، مددِ خدا!''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ اور میں نے اس سے کوئی بحث نہیں کی بلکہ وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ مردِ نہ سہی مگر اس نے خاصا مردوں کا کام کر دکھایا تھا۔

میں شاداں سے کیے ہوئے وعدے پر آج بھی قائم ہوں۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ طلائی زیورات اور دولت کے لالچ میں کہیں چک بیالیس غربی کا رخ نہیں کرلیجیے گا کیونکہ وہ مدفون خزانہ آپ کو راس نہیں آئے گا اور پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس کہانی میں کرداروں اور مقامات کے نام فرضی ہیں، صرف کہانی سچی ہے!

(تحریر: حسام بٹ)

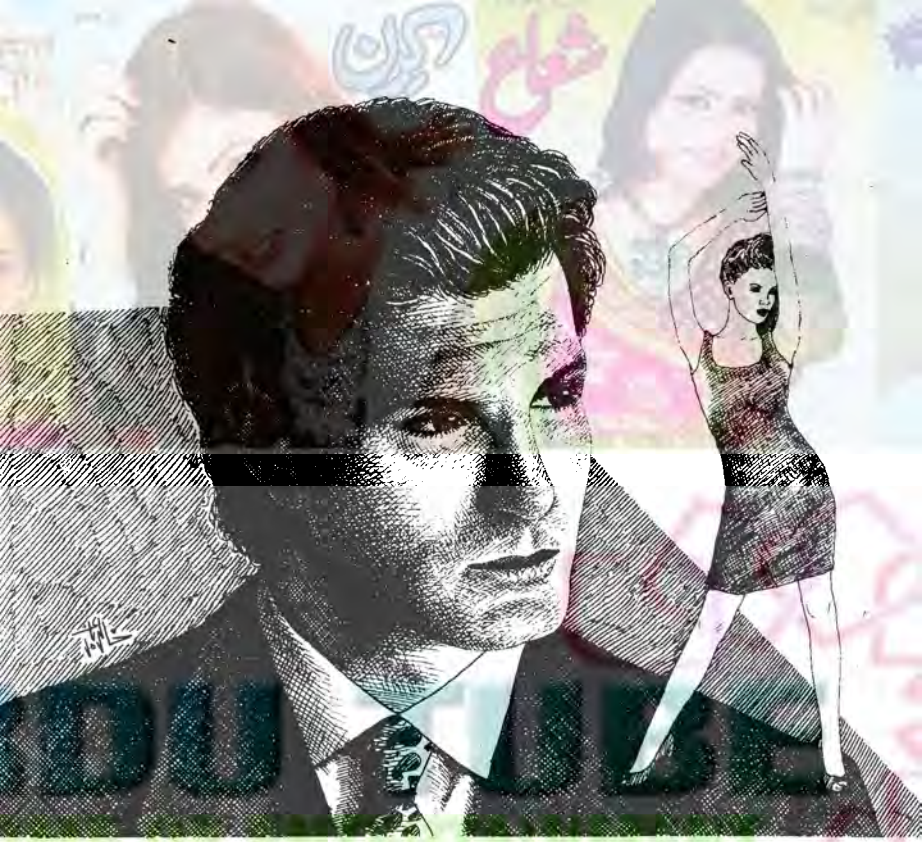

ہوشیاری

سلیم انور

وقت نے ثابت کیا ہے کہ جو جتنا ہوشیار بنتا ہے اتنا ہی بڑا نقصان بھی اٹھاتا ہے۔ اس کی چالاکی نے آخری وقت میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا کیونکہ لنگڑی چالیں اچھے بھلے انسان کی چال کو بھی لڑکھڑا دیتی ہیں... پھر وہ کیسے اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکتا تھا... بالآخر اسے گرنا تھا سو گر گیا۔

اعتماد کا خون کرنے والے ایک جوڑے کی بے اعتباری کا انجام

"جیمس تم نے تو مجھے ڈرا دیا ڈیرک۔" میری بیوی ربیکا نے کہا۔ "تم ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم دفتر کیوں نہیں گئے؟ اور تم نے یہ ہاتھ میں....."

اسے اپنا آخری سوال مکمل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ میں نے زنبور والی ہتھوڑی سے نہایت تیزی کے ساتھ اس کی کھوپڑی پر ایک بھرپور وار کردیا تھا۔

میری بیوی کرسی پر سے لڑھکتی ہوئی فرش پر اس طرح ڈھیر ہوگئی جیسے ہڈی سے گوشت جدا کیا جاتا ہے۔ میں نے

ہتھوڑی دوبارہ بلند کی اور اس کی کنپٹی پر ایک اور ضرب لگا دی۔ اس کی داہنی آنکھ پر فوراً ہی سوجن آ گئی۔

شاید ریکا کے نامکمل سوال کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس نے میرے ہاتھ میں ہتھوڑی دیکھ لی ہو جو اس کے سر پر وار کرنے کے لیے بلند ہو چکی تھی یا اس کی وجہ یہ حقیقت رہی ہو کہ میں مکمل طور پر بے لباس تھا اور میں نے ہاتھوں میں دستانوں کے سوا اور بدن پر کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔

شاید میں ریکا کے نامکمل سوال کی وجہ کبھی نہ سمجھ پاؤں لیکن اس بات کو دفع کریں۔

صبح کے گیارہ بجے کے کچھ دیر بعد میرے مکمل طور پر بے لباس ہونے کی وجہ بالکل سادہ اور آسان تھی۔ میں ایک مرتبہ ٹیلی وژن پر خود ایک ایسا اپیل سوڈ کر چکا تھا جس میں ایک شخص زرد رنگ کی برساتی پہن کر ایک قتل کا ارتکاب کرتا ہے پھر اس برساتی کو دھو ڈالتا ہے۔ البتہ اس وقت پکڑ میں آ جاتا ہے جب اس کی کلائی کی گھڑی کے پٹے پر خون کے قطروں کے دھبے دریافت ہو جاتے ہیں۔

اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ خون کے چھینٹوں کے تمام امکانات کو ختم کر دیا جائے۔ تب ہی میں نے نہ صرف اپنی کلائی کی گھڑی اتار دی تھی بلکہ بدن پر کوئی لباس اور سر سے پیر تک کوئی چیز موجود نہیں رہنے دی تھی۔ اگر خون کا کوئی چھینٹا میرے بدن پر پڑ گیا تو ایک بھرپور شاور لینے سے وہ بھی باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

میں موت کے اس منظر کا سامنا کرنے کے لیے تمام جزویات پر پوری طرح غور و فکر کر چکا تھا۔ اس کام میں خود اعتمادی درکار تھی اور بطور ایک اداکار میں نے اب تک اپنا کردار نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا تھا۔ اگر میں نے اس کی تیاری پہلے سے نہ کی ہوتی تو شاید مجھ سے بھی کہیں نہ کہیں چوک ہو جاتی۔

لیکن اصل بات حقیقی پرفارمنس کی تھی۔ میں نے خود کو ایک بادقار شوہر ثابت کرنے میں کہیں بھی اور کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اپنی حسین و جمیل بیوی کے کرتوتوں سے واقف ہوں۔ اس کے باوجود کہ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے، میں بالکل ہی انجان بنا ہوا تھا۔

اور اب اس پرفارمنس کا پردہ نیچے گر چکا تھا۔

میں نے ریکا کی نبض چیک کی۔ میں یہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ وہ واقعی مر چکی ہے، صرف بے ہوش نہیں ہوئی لیکن میری خواہش کے مطابق اس نے اپنا کردار بے حد خوش اسلوبی کے ساتھ نبھا دیا تھا۔ اس کی یہ پرفارمنس قابلِ تحسین تھی۔

دوسرے کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی وژن کی چنگھاڑ مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ٹیلی وژن کی آواز پہلے ہی جان بوجھ کر بلند کر دی تھی تاکہ اگر میرے ریکا کو قتل کرنے کے دوران وہ چیخے چلائے تو اس کی آواز ٹیلی وژن کی اونچی آواز میں دب کر رہ جائے اور کسی کو اس جانب متوجہ نہ کر سکے۔ ٹی وی پر کوئی مقامی نیوز کاسٹر رات گئے کسی جگہ لگنے والی آگ کے بارے میں مسلسل بولے چلے جا رہا تھا جیسے کہ وہ لاس اینجلز کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہو۔ بے مکانی، ٹریفک یا دیگر مسائل کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔

میں نے ٹیلی وژن آن رہنے دیا البتہ اس کی آواز بند کر دی۔ مجھے خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مجھے دلچسپی لینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں کیوں لیتا؟ باضابطہ طور پر تو میں گھر میں موجود ہی نہیں تھا۔

بلکہ باضابطہ طور پر تو میں اس وقت گھر سے باہر تھا اور ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ اسکرین ایکٹرز گلڈ ایوارڈز قریب آ رہے تھے اور میں ہر مودی دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اپنا ووٹ پوری ذمے داری کے ساتھ ڈال سکوں۔ حتیٰ کہ میرے پاس اس بات کا ثبوت بھی موجود تھا کہ میں اس وقت فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے میں ایک انتہائی سرگرم آزاد تھیٹر کے مالک کا شکر گزار تھا جو عدم موجودگی کے ثبوت کے طور پر بعد کی تاریخ کے ٹکٹ کا ایک حصہ مناسب قیمت پر فراہم کر دیتا تھا اور اس بارے میں کوئی سوال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس شخص اور اس کی خدمات کے متعلق مجھے یہ بات کچھ عرصہ قبل ایک اور اداکار نے بتائی تھی۔ عام طور پر اس کی یہ پیشکش ان جوڑوں کی سہولت کے لیے تھی جو اپنی کسی جگہ خفیہ ملاقات کو پوشیدہ رکھنے کے لیے فلم بینی کا جواز پیش کرنا چاہتے تھے اور سب سے عمدہ بات یہ تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی سوال جواب نہیں کرتا تھا اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔

لہٰذا دو روز قبل جب میں اس تھیٹر میں دو روز بعد کا ٹکٹ لینے گیا تو اس نے مجھ سے بھی اس ایڈوانس ٹکٹ کے حصے کی خریداری کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ وہ یہ ٹکٹ مجھے کسی قتل کی جائے واردات سے عدم موجودگی کے ثبوت کے طور پر فروخت کر رہا ہے۔

ریکا کے سر سے بہنے والا خون اب فرش پر پھیل رہا تھا۔ کچھ خون اس کے لباس کو تر کر رہا تھا۔ ریکا اگر زندہ ہوتی تو اسے اپنے لباس کو دیکھ کر بے حد کراہیت محسوس ہوتی

کیونکہ وہ اپنے وارڈ روب کے بارے میں نہایت سلیقہ مند اور باذوق تھی۔ یہ بات البتہ بُری ہوئی تھی کہ میری طرح وہ بے لباس نہیں تھی۔

لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اس وقت بھی تو بے لباس تھی جب اس کی وہ رنگین لمحات پر مشتمل ویڈیو میرے ہاتھ لگ گئی تھی جو نہیں لگنی چاہیے تھی۔ اس ویڈیو میں اس کا ساتھی کردار میرا پڑوسی اسٹیو بیکسٹر تھا۔ اگر وہ ویڈیو میرے ہاتھ نہ لگتی تو ربیکا شاید اب بھی زندہ ہوتی۔

میں خون آلود ہتھوڑی کچن میں لے گیا اور اسے بلیچ اور گرم پانی سے دھو کر اچھی طرح صاف کر دیا لیکن اس پر .... خون، سر کے بال اور ٹشوز کے کچھ آثار ہو سکتا ہے کہ باقی رہ گئے ہوں لیکن اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ جیسے کسی نے اپنے طور پر ان تمام آثار کو مکمل طور پر صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔

اور وہ فرد میرا پڑوسی اسٹیو بیکسٹر ہی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ہتھوڑی اسی کی تھی۔

پھر میں باتھ روم میں چلا گیا۔ میں نے قد آدم آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے عکس کا بھرپور جائزہ لیا۔ میرے بدن پر کہیں بھی خون کے چھینٹوں کے نشان نہیں تھے لیکن اس کے باوجود میں نے شاور لے لیا۔ اس کے بعد میں نے ربر کے وہ دونوں دستانے اتار کر ٹوائلٹ کے فلش میں بہا دیے۔ پھر اپنے یقین کی خاطر دوبارہ مزید فلش کر دیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنا لباس پہن لیا پھر پیپر ٹاول کی مدد سے وہ ہتھوڑی اٹھالی اور اپنے پڑوسی اسٹیو بیکسٹر کے گھر کی جانب چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ گھر پر موجود نہیں ہوگا کیونکہ یہ جمعے کی صبح تھی۔ وہ جمعے کی ہر صبح گھر کا سودا سلف لینے کے لیے جایا کرتا تھا اور اس کے اس معمول کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اختلاف رائے نہیں تھی۔

اور جہاں تک میری معلومات تھیں وہ رات کی کلاسز کو پڑھایا کرتا تھا اور دن میں فارغ ہوتا تھا۔ میری طرح مصروف نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اگر میں سیٹ پر ہوتا تو یہ الگ بات تھی لیکن اسٹیو بیکسٹر کا ہر روز کا ایک مخصوص معمول تھا۔ آپ اسٹیو بیکسٹر کی نقل و حرکت سے اپنی گھڑی کا وقت سیٹ کر سکتے تھے۔ وہ وقت کا اس حد تک پابند تھا۔

اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ اسٹیو اور ربیکا نے ہفتے کا کون سا دن اپنی رنگ رلیوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہوگا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سنیچر کا دن ہوگا، اس لیے کہ ہر سنیچر کی سہ پہر میں ہالی وڈ کے ایک ایکٹنگ ورکشاپ میں حصہ لیا کرتا تھا اور جب بھی میں اس ورکشاپ سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا تھا تو ربیکا کو اکثر انتہائی خوشگوار موڈ میں پاتا تھا۔

میں اس چابی کی مدد سے اسٹیو بیکسٹر کے گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا جو چند ماہ قبل اس نے شہر سے باہر کسی تدفین میں جاتے ہوئے مجھے دی تھی۔ اس وقت اس نے اپنا معمول توڑ دیا تھا۔ اس نے گھر کی چابی مجھے اس لیے دی تھی کہ میں نہ صرف اس کے پودوں کو وقت پر پانی دے سکوں بلکہ اس کے پالتو کتے کو بھی بہلا سکوں۔

میں اس کے پالتو کتے کو پسند کرتا تھا۔ کبھی میں اسٹیو بیکسٹر کو بھی پسند کرتا تھا۔

اس وقت اس کتے کو دم ہلاتا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ مجھے دوبارہ وہاں دیکھ کر وہ خوش ہو رہا تھا۔ میں نے چند لمحے اس کا سر سہلایا اور اسٹیو کے گیراج کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وہ ہتھوڑی طاق پر واپس اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔

اس وقت گیارہ بجکر چھتیس منٹ ہو رہے تھے۔ ہاں اپنا لباس پہننے کے بعد میں نے اپنی خون سے پاک دستی گھڑی بھی کلائی پر باندھ لی تھی۔ اسٹیو بیکسٹر کے اسٹور سے سودا سلف لے کر گھر واپس آنے میں ابھی دیر تھی۔

اس کے گھر سے نکلنے سے عین پیشتر میں نے بچت اسٹور سے خریدا ہوا بکٹ ہیٹ جو میں نے خاص طور پر اس صبح پہننے کے لیے خریدا تھا، سر پر اچھی طرح سے جما لیا اور دھوپ کی عینک بھی پہن لی۔ پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے اور سر جھکائے لمبی قلانچیں بھرتا ہوا تین بلاک فاصلے پر موجود اپنی کار کی جانب چل دیا جو میں نے آج صبح سویرے وہاں پارک کی تھی۔

بہت سے لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوگا کہ ایک بھرپور پرفارمنس کو تخلیق کرنے کے لیے ایک مخصوص انداز کی چال کتنی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اگر کسی سے بھی پوچھا جاتا کہ انہوں نے کیا ڈیرک کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ یہی جواب دے گا۔ ''نہیں آفیسر۔ میں نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ ڈیرک ہرگز نہیں تھا۔'' میں تصور میں اپنے ایک پڑوسی کو پولیس کو یہ بیان دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ''میں ڈیرک کے چلنے کے انداز سے بخوبی واقف ہوں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ شخص ڈیرک تھا۔''

جب میں اپنی کار کے پاس پہنچ گیا تو پھر اس میں سوار ہو کر لاس اینجلز کے ان علاقوں میں ڈرائیو کرتا رہا جن سے میں پہلے واقف نہیں تھا۔ پھر میں لنچ کرنے کے لیے

Digitized by Google

یارک ملیو ارڈ کے ایک اطالوی ریسٹورنٹ پر رک گیا جہاں اس سے پہلے میں کبھی نہیں گیا تھا۔ لنچ سے فارغ ہو کر میں اس علاقے میں ایک ایسے کوڑے دان کی تلاش میں ٹہلنے نکل گیا جہاں میں اپنا بکٹ ہیٹ اور دھوپ کی عینک ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

پھر عین اس وقت پر جب وہ فلم جو میں قیاس کے مطابق دیکھ رہا تھا، ختم ہو گئی تو میں اپنے گھر کی جانب چل دیا تا کہ اپنی بیوی کے قتل کی واردات کو دریافت کر سکوں۔

جب میں اپنے گھر پہنچا تو اس وقت تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ میں پہلے اپنے گھر کی سیڑھیوں پر کئی مرتبہ دوڑتا ہوا اترا اور چڑھا تا کہ میرا سانس چڑھ جائے اور جب میں نائن ون ون پر اس قتل کی خبر کروں تو ہانپ رہا ہوں اور مجھ پر صدمے کے باعث سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو۔

جب پولیس کی پیکی نفری یہاں پہنچی تو میری آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں اور یہ رونا حقیقی تھا۔ میں گھٹیا اداکاروں کے مانند مصنوعی چال بازیوں سے کام نہیں لینا چاہتا تھا جیسے کہ پیاز کترنا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ پولیس والوں کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ آٹومیٹک طور پر کسی بھی قتل کی واردات میں سب سے پہلے میاں یا بیوی پر شک کریں اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا قتل ہوا ہو۔

لہٰذا اس موقع پر میری پرفارمنس ہر لحاظ سے بے عیب ہونی لازمی تھی۔

جب ہومی سائڈ کے سراغ رساں میرے گھر پہنچے تو اس وقت میں کچن میں بیٹھا اپنے پیروں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

ربیکا کی لاش کا جائزہ لینے کے بعد وہ میرے پاس آ گئے اور مجھے اپنی داستان بیان کرنے کو کہا۔ میں نے منظر کو بیان کرتے وقت اسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور اس حقیقت کو بیان کرنے میں طول کلامی سے کام لیا کہ میں سمجھ نہیں پایا، ربیکا کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

ان سراغ رسانوں میں مائیکلسن نامی سرخ تمتماتے چہرے والا ایک لمبا تڑنگا آدمی بھی تھا۔ وہ بولا۔ ''ویل، ہمیں بھی من وعن اس وقت تک پتا نہیں چل سکتا جب تک میڈیکل ایگزامنر لاش کا مکمل معائنہ نہیں کر لیتا لیکن سر پر موجود کاری زخم کسی بھرپور ضرب کے باعث لگتا ہے جو موت کا سبب ہو سکتا ہے۔ زخموں کے سائز اور شیپ کی بنیاد پر میں یہی کہوں گا کہ یہ ضرب ہتھوڑی نما کسی شے سے لگائی گئی ہے۔''

''مائی گاڈ.....!'' میں کراہ اٹھا۔

''آئی ایم سوری مسٹر ڈیرک۔ تمہارے پاس اوزار تو نہیں ہوں گے، یا ہیں؟''

''کیا؟ نہیں، نہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر اپنی ضرورت کے وقت تم کیا کرتے ہو؟''

''اگر مجھے کسی اوزار کی ضرورت پڑتی ہے تو میں وہ اپنے پڑوسی سے مستعار لے لیتا ہوں۔ اس کے پاس ہر قسم کے اوزار موجود ہیں۔'' میں نے سادگی سے بتایا۔

سراغ رساں مائیکلسن کا نائب ایک ہسپانوی نوجوان تھا جس کا نام اکوسٹا تھا۔ اس نے وہ سوال داغ دیا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ ''کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ آج صبح تم کہاں تھے؟''

میں نے اسے بتایا کہ میں فیکو روڈ راتھیٹر میں ایکس مین اینڈ آف ڈیز کا صبح سویرے کا شو دیکھنے گیا ہوا تھا۔ ''ان کمبخت فلموں کو دیکھنے کے لیے مجھے مارننگ شوز میں جانا پڑتا ہے۔''

''کیا یہ اچھی تھی؟''

''کیا؟''

''وہ فلم۔ کیا اچھی فلم تھی؟''

میں اس فلم پر خاصے تبصرے پڑھ چکا تھا اس لیے میں اسے اپنی فرضی رائے دے سکتا تھا۔ البتہ اس بارے میں قدرے بدمزگی کا اظہار کیا کہ اس میں حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا گیا تھا۔

''تم یہ بات اب کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے نائب سے جاننا چاہا۔ ''ہاں یہ مارول سلسلے کی پچھلی فلم کے مقابلے میں زیادہ بہتر فلم تھی گو اس کا انجام بے حد طویل تھا۔ میری اس فلم کو دیکھنے کے لیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں اسکرین ایکٹرز گلڈ ایوارڈز کے لیے اپنا ووٹ بھرپور معلومات کی بنیاد پر کاسٹ کر سکوں۔''

''اوہ! تم ایک اداکار ہو؟''

''ہاں۔''

''اور تمہارے خیال میں ایک سپر ہیرو موووی اسکرین ایکٹرز گلڈ ایوارڈز کی دوڑ میں شامل ہو سکتی ہے؟'' اکوسٹا نے پوچھا۔

مجھے تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ سوال میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

''اسسٹنٹ کٹیگری کے لیے۔'' میں نے بے ساختہ

Digitized by Google

کہا۔ ''لیکن اس بات کا کیا تعلق بنتا ہے؟ میری بیوی قتل ہوگئی ہے اور تم یہ بے تعلق سوالات کررہے ہو۔''

''درست۔ سوری، سر۔'' اکوسٹا بڑبڑایا۔

''کیا تمہارے خیال میں ایسا کوئی ہوگا جو تمہاری بیوی کو مردہ دیکھنا چاہتا ہو؟'' سراغ رساں مائیکلسن نے پوچھا۔

میں نے اپنا سر جھکالیا اور آنکھ سے آخری آنسو بہاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، حقیقت میں تو ایسا کوئی فرد نہیں ہوسکتا..... اوہ گاڈ..... نہیں، نہیں..... اسٹیو یہ نہیں کرسکتا..... نہیں۔''

وہ میرے جال میں آگئے۔

''اسٹیو کون ہے؟'' مائیکلسن نے پوچھا۔

''ہمارا پڑوسی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا اس سے کوئی تنازعہ تھا؟''

''گزشتہ دنوں ہمارے تعلقات میں قدرے تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔''

''اس کی وجہ؟''

''وہ رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے اور اس کے گھر سے جانے کے بعد اس کا پالتو کتا رات بھر بھونکتا رہتا ہے اور اس کے راتوں کے بھونکنے سے ربیکا اس پر ناراضی کا اظہار کرتی تھی لیکن..... نہیں، نہیں بھول جاؤ کہ میں نے اس بارے میں کچھ کہا ہے۔''

''اگر تمہیں کچھ علم ہے سر تو تمہیں وہ سب کچھ ہمیں بتانا ہوگا۔'' سراغ رساں مائیکلسن نے کہا۔

''ویل، ربیکا نے کہا تھا کہ وہ شہری انتظامیہ سے رابطہ قائم کرے گی کہ وہ اس کے پالتو کتے کو یہاں سے ہٹوادیں تاکہ اسے راتوں کا سکون میسر آجائے لیکن اس کے لیے ایسا کرنا خاصا دشوار تھا۔ اس نے گزشتہ ہفتے اس معاملے پر پڑوسی اسٹیو سے تکرار بھی کی تھی لیکن اسٹیو نے اس کی بات کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے مایوس کردیا تھا۔''

یقیناً میرا یہ بیان لغو اور من گھڑت تھا لیکن ربیکا تو اب اس دنیا میں نہیں تھی جو میرے بیان کی تردید کرسکتی۔

''سو تمہارے خیال میں تمہارے پڑوسی نے اپنے پالتو کتے کی خاطر تمہاری بیوی کا قتل کردیا ہوگا؟'' اکوسٹا نے پوچھا۔

''میں..... نہیں۔ میں اس پر یقین نہیں کرسکتا۔ نیور مائنڈ یہ فضول اور مضحکہ خیز بات ہے۔''

''کیا یہ پالتو کتے والا پڑوسی وہی شخص ہے جس کے پاس تمام اوزار بھی ہوتے ہیں؟'' مائیکلسن نے سوال کیا۔

میں نے جان بوجھ کر قدرے توقف کیا جیسے مجھے کوئی شاک پہنچا ہو، پھر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اوہ مائی گاڈ!''

''ہمیں اپنے اس پڑوسی کے بارے میں بتاؤ، مسٹر ڈیرک۔''

میں نے اپنی متاثر کن کپکپاتی آواز میں ان کے تمام سوالوں کے جوابات دے دیے۔ جب وہ اپنا کام نمٹا چکے تو سراغ رساں مائیکلسن نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا میں اپنا رسمی بیان درج کرانے کے لیے پولیس اسٹیشن چل سکتا ہوں۔ میں نے رضامندی ظاہر کردی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں ربیکا کی لاش کے ساتھ گھر میں رکنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میڈیکل ایگزامنر کی تحقیقات مکمل ہونے سے پیشتر ربیکا کی لاش وہاں سے ہٹائی نہیں جاسکتی تھی۔

مجھے یہ بھی علم تھا کہ پولیس اس بارے میں میرے پڑوسی اسٹیو بیکسٹر سے بات چیت ضرور کرے گی۔ وہ یقیناً ہر چیز سے انکار کردے گا لیکن ایک بار جب انہیں اس کے مکان سے ہتھوڑی مل جائے گی تو پھر اس کے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں نے اپنا بیان ایک خاتون پولیس افسر کو ریکارڈ کرادیا۔ اس نے مجھے وہ بیان پڑھ کر سنایا۔ پھر میں نے اس پر دستخط کردیے۔ اس کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں کچھ دیر تک وہاں رک سکتا ہوں تاکہ میری ذہنی کیفیت نارمل ہوجائے۔ وہ خاتون پولیس افسر میرے لیے ایک کپ کافی لے آئی اور مجھے اس خالی کمرے میں تنہا چھوڑ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میری نگرانی ہورہی ہے۔

اب تک سب کچھ عمدگی سے ہورہا تھا۔ میں اپنی پرفارمنس جاری رکھ سکتا تھا۔

میں مزید آدھ گھنٹے تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں یہی تاثر دیتا رہا جیسے میں اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رو رہا ہوں، کپکپا رہا ہوں اور آنسو بہا رہا ہوں۔ البتہ میں قدرے فکرمند بھی تھا۔

پھر میں اس کمرے سے باہر نکل آیا تاکہ ان لوگوں سے رخصت ہونے کی اجازت لے لوں۔ میری مڈبھیڑ سراغ رساں مائیکلسن سے ہوگئی۔

''اوہ مسٹر ڈیرک۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم ابھی تک یہیں موجود ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں، چلو واپس اسی کمرے میں چلتے ہیں تاکہ ہم اکیلے میں بات کرسکیں۔''

وہ مجھے اپنے ہمراہ واپس جرح کرنے والے کمرے میں لے گیا اور مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردیا۔

''اب بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم نے تمہارے پڑوسی مسٹر اسٹیو بیکسٹر سے بات کی ہے اور ہمیں اس کے گیراج سے وہ مل گیا ہے جو ہمارے خیال میں آلۂ قتل ہوسکتا تھا۔ میرا قیاس سو فیصد درست تھا۔ وہ ایک ہتھوڑی تھی۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' میں کراہ اٹھا۔ ''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ اسٹیو اس قسم کی کوئی حرکت کرسکتا ہے۔''

''کیا تم اس بات سے باخبر تھے کہ تمہاری بیوی اور اس کے درمیان آشنائی کا معاملہ چل رہا تھا؟''

میں نے اپنے چہرے پر شاک پہنچنے کے بھرپور تاثرات کا اظہار کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

''اف خدایا.....!'' میں الفاظ ادا کرنے میں اٹکنے لگا۔ ''میں..... نہیں..... میں باخبر نہیں تھا..... لیکن اگر ان کے درمیان آشنائی تھی تو..... تو اس نے ربیکا کو کس لیے قتل کیا ہوگا؟''

''ویل سر، اس بارے میں ہم نے تحقیقات کرلی ہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ اس نے تمہاری بیوی کو قتل نہیں کیا۔ وہ قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔'' سراغ رساں مائیکلسن نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اس بات سے کیا مطلب ہے؟''

''اس بات کا مطلب ہے کہ ہم نے اسے اس قتل کے شبہے سے بری کردیا ہے۔''

''وہ کیسے؟..... میرا مطلب ہے کہ کیوں؟''

''اس لیے کہ تم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ تم آج صبح ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ اپنے گھر سے چلے گئے تھے۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟''

''ہاں، لگ بھگ یہی درست وقت ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''فلم گیارہ بجکر کچھ منٹ پر شروع ہوئی تھی۔ ٹھہرو، میں تمہیں فلم شروع ہونے کا درست وقت بتا سکتا ہوں۔'' میں نے تھیٹر کے ٹکٹ کا پھٹا ہوا حصہ جیب سے نکال لیا اور اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''گیارہ بج کر دس منٹ!''

''اور تم گھر واپس پہنچے تو اس وقت.....''

''ڈھائی بج رہے تھے۔ لگ بھگ یہی وقت ہوا تھا۔''

''سو وہ فلم تقریباً ڈھائی گھنٹے کی طوالت پر مشتمل تھی؟''

جواب دینے سے قبل میں اپنے ذہن میں اس سوال کی نوعیت کا تجزیہ کرنے پر زور دینے لگا۔ کیا یہ سراغ رساں فلم کی طوالت کے بارے میں مجھے پھانسنے کی کوشش کررہا ہے؟ مجھے معلوم تھا کہ یہ فلم دو گھنٹے سے زیادہ طویل ہے..... لیکن کتنی زیادہ یہ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

''ہاں، یہ طویل فلم تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور فلم کے شروع ہونے سے قبل آنے والی فلموں کے ٹریلر بھی دکھائے گئے تھے لیکن تم اس فلم کی طوالت کے بارے میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہو، سراغ رساں؟''

''میں صرف یہ یقین کرلینا چاہتا ہوں کہ ٹائم لائن کے بارے میں مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو اور میں ہر بات کے درست وقت سے واقف ہوں۔'' سراغ رساں نے جواب دیا۔ ''جب تم گھر سے صبح ساڑھے دس بجے روانہ ہوئے تھے تو تمہاری بیوی زندہ تھی اور جب تم ڈھائی بجے دوپہر واپس لوٹے تھے تو وہ مرچکی تھی۔ دوست؟''

''ہاں! اور تب میں نے نائن ون ون پر فون کیا تھا۔''

''ان اوقات کی درستی سے تمہارے پڑوسی مسٹر اسٹیو بیکسٹر کی جائے واردات سے عدم موجودگی کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ شاید تمہارے علم میں نہیں ہے کہ تمہارا پڑوسی آج جیوری ڈیوٹی پر تھا..... صبح آٹھ بجے سے لے کر سہ پہر تین بجے تک جب جیوری برخاست ہوئی تھی، اس تمام وقت میں وہ عدالت کی عمارت سے بالکل بھی باہر نہیں نکلا تھا حتیٰ کہ اس نے لنچ بھی عدالت کے کیفے میں کیا تھا اور اس کے ہمراہ جیوری کے دیگر ممبران بھی تھے۔ وہاں پر اس کی موجودگی کی تصدیق جیوری کلرک نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ کردی ہے۔'' سراغ رساں مائیکلسن نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ، ویل..... یہ بات تو باعثِ اطمینان ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ ''میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ حرکت

اسٹیو نے کی ہوگی لیکن اس ہتھوڑی کے بارے میں کیا کہیں گے جو تمہیں اس کے گیراج میں سے ملی ہے؟''

''میرے خیال میں وہ ہتھوڑی اسے پھنسانے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی جس کی رسائی اس کے گھر تک تھی۔ جب ہم نے مسٹر اسٹیو بیکسٹر سے بات کی تو اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے گھر کی ایک چابی تمہارے پاس بھی ہے۔''

''ایک مرتبہ جب وہ کہیں گیا ہوا تھا تو میں نے اس کے پالتو کتے کی دیکھ بھال کی تھی لیکن میں اس وقت یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ چابی اب کہاں ہے۔''

میری اس بات پر سراغ رساں کے ہونٹوں پر بے یقینی کی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''تم حقیقت میں کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی میرے جسم پر پسینا آنا شروع ہوگیا۔

سراغ رساں کے ہونٹوں پر بدستور وہی ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟ یہ نہایت بے ہودہ خیال ہے۔ تمہارے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قتل اسٹیو نے نہیں کیا ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے لیکن میرے پاس بھی ثبوت ہے کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے تھیٹر کے ٹکٹ کا نصف ٹکڑا میز پر سراغ رساں کے سامنے پٹخ دیا۔ ''اسے غور سے دیکھو۔ اس کی تاریخ دیکھو۔ اس پر درج وقت دیکھو۔ تمہیں مزید اور کیا ثبوت چاہیے؟''

''یہ کاغذ کے ایک ٹکڑے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مسٹر ڈیرک!''

''اس بات کا کیا مطلب ہے، سراغ رساں!'' میں نے غصے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس بات کا مطلب یہ ہے کہ کاغذ کے اس ٹکڑے میں تحریف بھی ہوسکتی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نہیں جانتا حقیقت میں یہ تحریف کس طرح کی گئی ہے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔'' سراغ رساں مائیکلسن نے کہا۔

''اوہ، واقعی؟'' میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کس وجہ سے اتنا یقین ہے کہ اس ٹکٹ کے اس حصے میں تحریف کی گئی ہے؟''

سراغ رساں نے اپنی دونوں مٹھیاں میز کی سطح پر جمادیں اور مجھ پر جھک گیا۔ میں سٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ بولا۔ ''اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ فیکٹ رورا تھیٹر گزشتہ شب آگ لگنے کی بنا پر جل کر خاکستر ہوچکا ہے۔''

''وہ..... کیا؟''

''آگ بھڑک نصف شب کے وقت وہاں آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ آگ مشکوک بھی تھی لیکن یہ معلوم کرنا فائر ڈیپارٹمنٹ کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔ مجھے جس معاملے سے تعلق ہے وہ یہ کہ جب فائر یونٹ آگ پر قابو پانے کے لیے وہاں پہنچا تو عمارت میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا سوائے سلگتی ہوئی لکڑیوں اور اینٹوں کے۔ یہ اس سے کچھ گھنٹوں پہلے کی بات ہے جب تمہارا کہنا ہے کہ تم اس تھیٹر میں فلم دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا اس کاغذ کے فضول ٹکڑے پر جو کچھ لکھا ہے اس کی حقیقت میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ کاغذ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔''

''تھیٹر..... جل کر..... خاکستر ہوچکا تھا۔'' میں کراہ اٹھا۔

''مجھے ایک طریقے سے حیرانی ہو رہی ہے کہ تمہیں اس خبر کا پتا کیوں نہیں چلا۔'' سراغ رساں مائیکلسن نے کہا۔ ''یہ خبر تو آج صبح تمام نیوز چینلز پر بھی دکھائی گئی تھی۔''

کسی عمارت میں آگ لگنے کی وہ خبر جو ٹی وی نشر کر رہا تھا، وہ میں نے نظر انداز کردی تھی کیونکہ اس وقت میں ربیکا کو قتل کر رہا تھا اور میرا تمام تر دھیان اسی طرف تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور آہیں بھرنے لگا۔

''میرے خیال سے جائے واردات سے تمہاری عدم موجودگی آگ کے دھوئیں کے ساتھ ہوا میں تحلیل ہوچکی ہے، مسٹر ڈیرک!'' سراغ رساں نے کہا۔ ''لہٰذا اب تم دوبارہ سے کچھ بیان کرنا شروع کردو۔ کیا خیال ہے؟''

میں خاموش بیٹھا رہا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے خوف آرہا تھا۔ سب سے بدترین حقیقت یہ تھی کہ اپنی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اس صورتِ حال میں اپنا کردار کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

بطور ایک اداکار میں بری طرح ناکام ہوچکا تھا اور اپنی ناکامی کے اعتراف میں، میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے۔

Digitized by Google

محفلِ شعر و سخن

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

اپنی گلیاں اپنے رستے، اپنے جنگل، اپنی ہوا
چلتے چلتے وجد میں آئیں راہوں میں بے راہ چلیں

❁ ورداجنید.....کراچی

اے مسیحا ترے دکھ سے ہے سوا دکھ کس کا
کس سے پوچھوں، ترے بیمار کہاں ہیں جانے
ترا کیا اپنا طرفدار نہیں میں خود بھی
وہ جو ہے اس کے طرفدار کہاں ہیں جانے

❁ ایم الیاس.....ملتان

سو رہا ہے شام ہی سے شہرِ دل
شہر کے شبِ زنداں واراں کیا ہوئے

❁

❁ محمد کاشان.....بی

اے زندگی بتا کہ سرِ جادۂ شباب
یہ کون کھو گیا ہے کسے ڈھونڈتا ہوں میں
اے وحشتو! مجھے اسی وادی میں لے چلو
یہ کون لوگ ہیں یہ کہاں آگیا ہوں میں

❁ وزیر محمد خان.....بلہ ہزارہ

مدت ہوئی جو یار کی آئی نہیں خبر
لگتا ہے نامہ بر بھی رقیبوں سے جا ملا

❁ عدنان حسن شازل.....فورٹ عباس

سانجھ پھر کوئی بستی میں ہوا ہے شاید
شام روتی ہوئی جنگل کی طرف آئی ہے

❁ جاوید اختر رانا.....پاکپتن شریف

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم
ہو پیکرِ وفا تو کافی ہے اک شخص

❁ حمید خان.....ٹنڈو الہ یار

چاند کی پگھلی ہوئی چاندی میں
آؤ کچھ رنگِ سخن گھولیں گے
تم نہیں بولتی ہو؟ مت بولو
ہم بھی اب تم سے نہیں بولیں گے

❁ زرین آفریدی.....حیدرآباد

ملیں گی ہم کو ہمارے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے، کب یہ کمال ہوتا ہے

❁ انیلہ رشید سیال.....خیرپور، میرس

میں سنگ صفت ایک ہی رستے میں کھڑا ہوں
شاید مجھے دیکھیں گی پلٹ کر تیری آنکھیں

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
آئینہ گردشِ دوراں کو دکھانے والے

❁ فراز رشید.....سرگودھا

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
"آپ، وہ، جی، مگر" یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

❁ جلیلی ہیر.....جھنگ سٹی

آنسو دل کا درد بتائے
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

❁ محمد شفیق حسین.....سندھی ہوٹل، کراچی

یہ بوند بوند سی بارش کسی کی یادوں کی
میرے یقیں کا کچا مکان گرائے گی

❁ نبیل علی.....اوکاڑہ

دفترِ حکمت کے شک پرور مباحث چھیڑ کر
شہرِ دانش کے نئے ذہنوں کو بہکایا کریں
اپنی فکر تازہ پرور سے بہ انداز نویں
حکمت یونان و مصر و روم کا احیا کریں

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

ابھی تو زور پہ سودا ہے بت پرستی کا
خدا دکھائے برہمن کا بت شکن ہونا
کروں میں کیا رہ ہستی کے پیچ و خم کا گلہ
عزیز ہے تری زلفوں کا مُشکن ہونا

❁ عبدالجبار رومی انصاری.....بورے والا

چلو ہم بھی تو دیکھیں اس نشے میں ایسی مستی میں
کدھر کو جا رہے ہیں روز و شب آہستہ آہستہ

❁ امتیاز احمد.....منڈی بہاء الدین

جواب کچھ نہ ملے گا مگر سوال تو کر
کہ سوزِ غنچہ و صوتِ ہزار میں کیا ہے
ستم شعار نے خود کتنے زخم کھائے ہیں
کبھی شمار تو کرنا شمار میں کیا ہے

❁ میمونہ عزیز.....لاہور

یوں مجھے بھیج کے تنہا سرِ بازار فریب
کیا مرے دوست مری سادہ دلی بھول گئے
میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں
چارہ گر کیوں روشِ چارہ گری بھول گئے

❁ عنبرین حسین.....فیصل آباد

مدتوں کے بعد تم نے رخ کیا اس کی طرف
کیا یہی تھا آئینے کے ٹوٹ جانے کا سبب

❁ ارم کاشف.....ٹوبہ ٹیک سنگھ

اب تو کچھ غیر سا لگنے لگا تیرا غم بھی
دیکھ مایوس ہوئے جاتے ہیں کتنے ہم بھی

❁ عادل صدیقی.....لاہور

ہم ایسے خوگرِ پرواز بھی کہاں ہوں گے
بنا کے بھول گئے ہوں جو آشیاں اپنا

❁ فیاض ملک.....کوئٹہ

دستِ جنوں کو کارِ نمایاں بھی ہیں عزیز
یاروں کو شہر بھر کے گریباں بھی ہیں عزیز
اب عقل و آگہی سے ہے اپنا معاملہ
لیکن معاملاتِ دل و جاں بھی ہیں عزیز

❁ اسماء ممتاز.....کراچی

دھرم کی بانسری سے راگ نکلے
وہ سوراخوں سے کالے ناگ نکلے
خدا سے لے لیا جنت کا وعدہ
یہ زاہد تو بڑے ہی گھاگ نکلے

❁ زبیر خان.....لیہ

نشاطِ قصرِ شیشی کا تذکرہ نہ کرو
ابھی تو لوگ ٹھکانے تلاش کرتے ہیں
تمہاری زلف کی خاطر یہ اہلِ پریشان
وہ صرف ہم ہیں جو شانے تلاش کرتے ہیں

❁ ثاقب کمال.....کراچی

اس شخص کے چہرے کی اداسی کو تو دیکھ
لگتا ہے کہ مدت سے وہ رویا ہی نہیں ہے

❁ ذیشان تبسم.....پنڈی گھیب

وہ آنکھیں دیواریں تکتی رہتی ہیں
ان آنکھوں میں شاید کوئی قصہ ہے

❁ ریحانہ پرویز.....ملتان

یاد آتے ہیں وہ بچپن کے زمانے کتنے
ان دنوں تھے یہی دن رات سہانے کتنے

❁ صبا سحر.....کراچی

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہوگئے ہیں
عجب مہک تھی مرے گل ترے شبستاں کی
سو بلبلوں کے وہاں آشیانے ہوگئے ہیں

❁ محمد آریز ملک.....گلستان جوہر، کراچی

ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

Digitized by Google

❁ حنا خان.....لاہور

بدل کے شہر کو تم نے رکھ دیا ہے میاں
ہم ایسوں کا بھی کہیں کچھ اتا پتا ہے میاں

❁ شہباز رضوان.....کراچی

وہ لوگ خواب دیکھنے والے تھے سو انہیں
شکوہ شبوں سے تھا نہ گلہ تیرگی سے تھا

❁ مہر علی خان.....روہڑی

بہت عجیب سے تھے ابتدائے عشق کے دن
جب اپنے گھر میں بھی رکھتے تھے پاؤں ڈرڈر کے

❁ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

ہوئی جو شہر کے لوگوں سے کچھ شناسائی
تو ہم کو یاد بہت آئی اپنی تنہائی

❁ رخسانہ شکیل.....آزاد کشمیر

اس شہر میں کیا خاک شناسا کوئی ڈھونڈے
لوگوں کے بدن پر کوئی چہرہ ہی نہیں ہے

❁ جواد خان.....میانوالی

وقت نے کیسی فصیلیں کھینچ دی ہیں درمیاں
لوگ تنہا ہیں مگر احساسِ تنہائی نہیں

❁ محمود احمد.....ٹنڈوالہ یار

ہے کارِعبث جائے سکوں ڈھونڈتے پھرنا
لے جائے جدھر کو دلِ بے تاب ادھر چل

❁ عدیل انصاری.....راولپنڈی

ستم نگاہ کا اپنی ہمیں نہ بھولے گا
یہ کم نہیں کہ ترے دل میں آگ بھڑکائی

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

اب جنوں کب کسی کے بس میں ہے
اس کی خوشبو نفس نفس میں ہے

❁ کاشف علی.....کراچی

یہاں وہ کون ہے جو انتخابِ غم پہ قادر ہو
جو مل جائے وہی غم دوستوں کا مدعا ہوگا

❁ عاصم خان.....کراچی

ہم کو مٹا نہ دیں یہ زمانے کی مشکلیں
لیکن یہ مشکلیں تو ہزاروں کے ساتھ ہیں

❁ پروین احمد.....نواب شاہ

وحشت میں کچھ خبر ہی نہیں کیا لکھا گیا
اوراق چند صبح سے کالے ہوئے تو ہیں

❁ لنٹی وکیل.....بورے والا

یہ جو کراہتے ہوئے لوٹ رہے ہیں شہر سے
خوب دکھا کے آئے ہیں اپنا کمال شہر میں

❁ عاطف علی.....سکھر

ناؤ بھنور سے لڑسکتی ہے طوفانوں سے ڈر کیسا
ماجھی سچا مل جائے گر نازک سی پتواروں کو

❁ یوسف قادری.....فیصل آباد

نازاں ہے کس عیاری پر اے جابر انسان
پورب پچھم فتح کیے نہ فتح کیے اذہان

❁ ممنون حسین.....میرپور خاص

شہرِ دل کو صحرا کہہ کر گزرے تھے وہ بے پروا
پلٹ کے دیکھا ویرانے میں، تنہا تو پچھتائے بہت

❁ اویس خان.....پشاور

جس کی رفاقت شام کے ڈھلتے سائے تک ہی ملتی ہو
مانا وہ خورشید ہے لیکن اس کی پوجا کیا کرتے

❁ نازیہ علی.....چنیوٹ

آنکھیں ان کی قہر بھری تھیں ہاتھ میں تھی تلوار
جلتی تھی بہنوں کی چادر بھائی تھے لاچار

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی

خوش فہمی ہماری تھی کہ اپنا انہیں سمجھا
ہم سے جو یہ کہتے تھے سمجھدار بہت ہو

❁ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

رنگ اڑ جاتا ہے تحریر تو رہ جاتی ہے
خواب کے بعد کی تعبیر تو رہ جاتی ہے

کوپن
برائے شمارہ
جنوری 2019

مخفل سخن و سخن

نام : ----------

پتا : ----------

جینے کے لیے مغربی دنیا کا انداز واقعی بہت منفرد ہے... چاہے اچھائی ہو یا جرائم کی دلدل... اس عمارت میں بسنے والے بھی بہت اچھے لوگ تھے مگر... اس ماحول کو منشیات کی دیمک دھیرے دھیرے چاٹنے لگی تھی۔ اگر وہ بروقت فیصلہ نہ کرتے تو کبھی اس بیماری سے جان نہ چھوٹ پاتی جو کئی گھروں کی تباہی کا سبب بن رہی تھی۔

تھوڑی سی چالبازی کے ساتھ خطرناک مجرموں سے دلچسپ مقابلہ

میٹھا زہر

ثمر عباس

سپرنٹنڈنٹ تہ خانے میں زہریلا پاؤڈر چھڑک رہا تھا۔ ایلس ولسن نے کپڑوں کی ٹوکری واشنگ مشین کے نزدیک میز پر رکھی اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''صبح بخیر، مسٹر جون۔'' اس نے کہا۔

''صبح بخیر مسز ولسن۔'' اس نے کونے سے آواز لگائی۔ اس نے وہاں ایک چھوٹی ڈش رکھی اور احتیاط سے ایک زرد رنگ کے ڈبے سے سفید پاؤڈر اس میں ڈالنے لگا۔ اس ڈبے پر سرخ حروف میں بیٹ آدے اور اس کے نیچے کھوپڑی اور دو ہڈیوں کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایلس سمجھ گئی کہ اس ڈبے میں زہریا اس جیسی کوئی چیز ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہم چوہوں سے مکمل طور پر نجات حاصل کر چکے ہیں۔'' ایلس نے کہا۔ ''کیا گزشتہ ہفتے چوہے مارنے والا یہاں نہیں آیا تھا؟''

''ہاں لیکن آج صبح میں نے یہاں ایک چوہا دیکھا ہے۔'' اس نے مقفل دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں اپنے اطمینان کے لیے یہ دوا استعمال کر رہا ہوں۔''

ایلس اپنی ٹوکری میں سے کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔ ”یہ ایک فرسودہ طریقہ معلوم ہوتا ہے..... اگر یہ رینگتے ہوئے دیواروں میں چلے گئے تو ان کی ناگوار بو ہر طرف پھیل جائے گی۔“

وہ جھکتے ہوئے بولا۔ ”اس دوا کو کھانے کے بعد وہ زیادہ دور نہیں جاسکیں گے۔ یہ بہت زود اثر ہے.....“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ مشین میں کپڑے ڈالتے ہوئے بولی۔ ”مجھے چوہے پسند نہیں ہیں۔“

جون نے کہا۔ ”کوئی بھی انہیں پسند نہیں کرتا۔ یہ مکھیوں اور کاکروچ سے بھی بدتر ہیں۔ تم فکر نہ کرو مسز ولسن۔ میں ان کا خاتمہ کردوں گا۔“

”شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ مشین میں کپڑے دھونے کا پاؤڈر ڈالنے لگی۔ جب اس نے لانڈری کارڈ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی نظر اس پلیٹ پر گئی جس میں زہریلی دوا رکھی ہوئی تھی اور اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس پر آسانی سے عمل ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں اسے اپنے پڑوسی مارکو فینسلی سے مشورہ کرنا چاہیے۔

لگتا تھا کہ جون نے اس کا ذہن پڑھ لیا۔ ”مسٹر فینسلی کیسے ہیں؟“ اس نے زہریلی دوا کا ڈبا اس شیلف کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا جہاں دیگر صفائی کرنے والے کیمیکلز رکھے جاتے تھے۔ اس نے اسے ربر کے دستانے اتارتے اور ہاتھ دھوتے ہوئے دیکھا۔

”مسٹر فینسلی اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اس کی آنکھ اب ٹھیک ہوگئی ہے اور پسلیوں کی تکلیف بھی کم ہے۔“

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ جون نے اپنے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ بہت خوفناک تھا اور وہ بھی ہماری عمارت کے بالکل سامنے۔ حالانکہ یہ ایک اچھا علاقہ ہے۔“

”ہاں۔“ وہ متفق ہوتے ہوئے بولی لیکن دل میں سوچا کہ اب نہیں رہا۔ جب سے.....

”ٹھیک ہے۔ اسے میری طرف سے پوچھ لینا۔“ جون نے کہا۔ ”تم سے پھر ملاقات ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ تہ خانے میں واقع اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

ایلس نے ایک بار پھر زرد باکس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی توجہ واشنگ مشین کے کی پیڈ پر مرکوز کرلی۔ ابھی تک وہ اس نئی مشین کی پوری طرح عادی نہیں ہوئی تھی اور اسے پرانی مشین بہت یاد آتی اور وہ سوچنے لگتی کہ اکثر پرانے طریقے ہی بہترین ہوتے ہیں۔

اس نے یہ اصطلاح کچھ دیر پہلے جون کے سامنے بھی استعمال کی تھی جب وہ اس سے زہر کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس علاقے میں چوہوں کی موجودگی ایک نئی بات تھی اور اس کی وجہ تعمیراتی سرگرمیوں میں اچانک اضافہ اور قرب وجوار کی عمارتوں کی تزئین وآرائش تھی۔ اس تاریخی علاقے میں اب ایسے لوگ نظر آنے لگے تھے جو دیکھنے میں خاصے بے ڈھنگے لگتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مغرور نوجوان جوڑے جو قیمتی لباس اور جوتے پہنے اتراتے پھرتے تھے۔ ان میں کوئی فیشن ڈیزائنر تھا کوئی فنڈ منیجر اور کوئی اپنے آپ کو کنسلٹنٹ کہتا تھا۔ ان میں سے کئی لڑکیاں تنگ فٹ پاتھ کے ساتھ پرام دھکیلتی اور کانوں سے اسمارٹ فون لگائے زور زور سے باتیں کرتے ہوئے گزرتیں تو راہ چلتے لوگ انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتے۔ وہاں کے پرانے رہنے والوں نے مذاق میں کہنا شروع کردیا تھا کہ یہ بھڑیں، چوہوں سے بدتر ہیں۔ ایسے میں ایلس ولسن کو اپنے مرحوم شوہر کی کمی بہت محسوس ہوتی جس کے ہوتے ہوئے اسے کسی بات کی فکر نہیں تھی۔

اب اس کے سامنے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ حقیقی اور فوری حل طلب وقت آگیا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ کیا جائے۔ اس نے آخری بار شیلف میں رکھے ہوئے زرد رنگ کے ڈبے کو دیکھا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ایلس نے نوٹ کیا کہ مارکو فینسلی آج پہلے سے بہتر لگ رہا تھا اور اس کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔ ورنہ گزشتہ ماہ ہونے والے حادثے کے بعد وہ بہت اداس، خاموش اور الگ تھلگ ہوگیا تھا۔ ایلس اور وہ گزشتہ چودہ سال سے اس عمارت لنڈی ہاؤس میں رہ رہے تھے جب فینسلی اپنی بیوی کے ساتھ اس کے بالکل اوپر والے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوا تھا۔ وہ اس کے مرحوم شوہر کا دوست تھا اور ایلس کی بیٹیاں اسے انکل کہتی تھیں۔ اب وہ شادی کے بعد دوسری ریاستوں میں رہ رہی ہیں لیکن ٹیلی فون پر ایلس سے اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی ہیں۔

ایلس اس کے لیے سینڈوچ لے کر آئی تھی۔ اس نے فینسلی کے کچن میں جا کر کافی بنائی اور وہ دونوں کافی کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ایلس کو یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ فینسلی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک لوٹ آئی جو کئی ہفتوں سے غائب تھی۔

”تو یہ تمہارا آئیڈیا ہے؟“ فینسلی نے پوچھا۔

”میں اس پر کام کر رہی ہوں۔“ ایلس نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ تم ہی اس شو کے اسٹار ہوگے اگر تمہیں

کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"اعتراض؟ کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

ایلس کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "دراصل اس میں تھوڑی سی جسمانی سرگرمی شامل ہے۔"

"اوہ۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔" مارکو نے اسے یقین دلایا۔

ایلس مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ مارکو فینسلی کئی سال پہلے اپنے آبائی وطن اٹلی میں سرکس کا اداکار تھا پھر ان کا خاندان امریکا آ گیا۔ جہاں وہ سرکس کمپنی رنگ برادرز میں کام کرنے لگے۔ وہیں اس کی ملاقات زارا سے ہوئی جس سے بعد میں اس نے شادی کر لی۔ اب اس کے خاندان کے تمام افراد ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس کے والدین، تینوں بڑے بھائی اور بیوی زارا جس کا پانچ سال پہلے کینسر کی وجہ سے انتقال ہو گیا تھا۔

فینسلی کو سرکس کے جھولوں پر چڑھنے میں مہارت حاصل تھی۔ جس کے نتیجے میں اسے ایک ہیلتھ کلب میں فٹنس انسٹرکٹر کی ملازمت مل گئی لیکن اب وہ ریٹائر ہو چکا تھا اور کافی عرصے سے جسمانی طور پر فعال نہیں تھا۔ ایلس کے اندازے کے مطابق اس کی عمر ستر سے کچھ زیادہ ہوگی اور اسے امید تھی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر لے گا۔

"میں تمہیں دکھاؤں کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟" ایلس نے کہا۔ "کھڑکی پر آؤ۔"

وہ کھڑی ہو گئی اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مارکو اب پیسا کھیوں کا محتاج نہیں جو اس کی کرسی کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ البتہ وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہا تھا۔

مارکو کا اپارٹمنٹ پانچ ڈی سب سے اوپر والی منزل پر تھا اور اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا صحن نظر آتا تھا جس کے گرد پڑوسیوں کے مکانات تھے۔ آگ سے بچاؤ کی سیڑھی اس کی کھڑکی کے نیچے لگی ہوئی تھی جو لمبائی میں نیچے تک جا رہی تھی اور اس سے برابر والے فلیٹ پانچ سی کے مکین بھی مستفید ہو سکتے تھے جس میں گورگی اینڈروف رہتا تھا۔ ایلس نے کھڑکی کھولی اور اس پر جھکتے ہوئے مارکو کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کے پاس آ جائے۔

"ادھر دیکھو۔" اس نے اینڈروف کے اپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ باہر جاتے ہوئے بھی اپنی کھڑکی تھوڑی سی کھلی رکھتا ہے۔ میں گزشتہ تین دن سے یہ بات نوٹ کر رہی ہوں جب سے یہ آئیڈیا میرے دماغ میں آیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے اپارٹمنٹ میں الارم سسٹم نہیں ہے۔ میرے منصوبے کے مطابق وہاں دو مرتبہ جانا ہوگا۔ میں خود یہ کام کر لیتی لیکن تم جانتے ہو کہ میرا قد چھوٹا ہے اور یہ کھڑکی کافی اونچی ہے۔ اس لیے تمہیں ہی یہ کام کرنا ہوگا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔" مارکو نے کہا۔ "میں نے اسے بیس منٹ پہلے کہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہال میں کھڑا کسی اولیف نامی شخص کو فون پر بتا رہا تھا کہ وہ اس سمیت دیگر لوگوں سے اسی بار میں ملاقات کرے گا جہاں وہ سب جمع ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس کم از کم ایک گھنٹا یا اس سے بھی کچھ زیادہ کا وقت ہے۔"

ایلس حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "تمہارا مطلب ہے ابھی؟"

"بالکل۔ اس سے اچھا اور کوئی وقت نہیں ہوتا۔ میں جب سے اسپتال سے آیا ہوں اس اپارٹمنٹ سے باہر نہیں نکلا۔ میں خود کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہوں۔"

ایلس نے اسے کام کی نوعیت بتائی اور اسے حیرت سے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ مارکو کھڑکی کے راستے سیڑھی پر اتر گیا پھر وہ پلٹا اور ایلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں پلک جھپکتے میں واپس آتا ہوں۔"

ایلس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی اور کاؤچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ مارکو ٹھیک چودہ منٹ بعد کھڑکی کے راستے واپس آیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

☆☆☆

مایوسی کے لمحات میں ایلس فیصلہ کر چکی تھی کہ اب اسے عملی طور پر کوئی قدم اٹھانا ہوگا اور اس کے نتیجے میں اس کے ذہن میں یہ منصوبہ تشکیل پایا۔ گزشتہ برس تک لنڈی برادرز کے بڑے حصے دار دو شریف اور خوش وضع افراد تھے۔ جنہیں اپنے والدین سے یہ عمارت ورثے میں ملی۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے کاروبار سنبھالا اور لنڈی ہاؤس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ عمارت کے سپرنٹنڈنٹ جون کی کارکردگی قابلِ تعریف تھی۔ وہ مرحوم جون سینئر کا بیٹا تھا جو اس سے پہلے یہ ذمے داری سنبھالے ہوئے تھا۔ جون کی پرورش اسی تہ خانے کے اپارٹمنٹ میں ہوئی جہاں وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا۔

عمارت کے مالکان اور کرایہ دار آپس میں گھل مل کر رہ رہے تھے۔ لفٹ میں آتے جاتے یا میل باکس میں اپنی ڈاک دیکھتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور ہیلو ہائے کرتے۔ گزشتہ سولہ سالوں سے ایلس یہی دیکھ رہی تھی۔

لیکن دونوں بھائیوں کا حال ہی میں انتقال ہوگیا اور چار ماہ قبل ان کے وارثوں نے اپنا حصہ ایک روسی تاجر دیمتری اینڈروف کے ہاتھ فروخت کردیا جس نے ان کی سب سے زیادہ قیمت لگائی تھی۔ وہ اس روسی آبادی کا ممتاز فرد تھا جو شہر کے دور افتادہ حصے میں غیر قانونی طور پر رہائش پذیر تھی۔ اس نے اپنی ناجائز آمدنی کو صاف کرنے کے لیے اس عمارت کے علاوہ کئی دوسری جگہوں پر بھی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ یہ پیسا اس نے منشیات فروشی، جوئے، قحبہ خانوں اور اسی طرح کے دیگر غیر قانونی کاموں سے حاصل کیا تھا۔ دیمتری نے لنڈی ہاؤس کے جو بارہ یونٹ خریدے، ان میں سے گیارہ میں ایسے کرائے دار رہ رہے تھے جو برسوں سے وہاں آباد تھے۔

تاہم تشویش کی بات یہ تھی کہ دیمتری نے اپنے بھتیجے جورجی کو ان میں سے ایک خالی اپارٹمنٹ پانچ سی میں رہنے کی جگہ فراہم کردی تھی۔ وہ انتہائی غیر مہذب اور روکھا شخص تھا۔ خاندان کے لوگ بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے دیمتری نے اپنے قابل نفرت بھتیجے کو ان سے ممکنہ حد تک دور اور خود اس پر نظر رکھنے کے لیے اس اپارٹمنٹ میں جگہ دی تھی۔

اب ایلس اور عمارت کے دیگر لوگوں کے لیے آنا جانا یا لفٹ استعمال کرنا مشکل ہوگیا تھا کیونکہ جورجی ہمیشہ اپنی موٹر سائیکل داخلی دروازے کے سامنے کھڑی کرتا۔ اس کے آوارہ دوست اور بہت سی گرل فرینڈز ہر وقت آتی جاتی رہتی تھیں۔ لنڈی ہاؤس میں آنے کے دو ہفتے بعد ہی جورجی نے تھری بی میں رہنے والی عمر رسیدہ خاتون مسز روز برگ سے لفٹ میں بدتمیزی کی، جب اس نے جورجی سے سگریٹ بجھانے کے لیے کہا تو اس نے جواب میں اس بوڑھی عورت کے منہ پر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ مسز روز برگ تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ میں گئی اور اندر سے دروازہ مقفل کرلیا۔

اس کے ایک ہفتے بعد فورا ے میں رہنے والی خوبصورت اور جوان میگزین ایڈیٹر میری لین کو جورجی کے آوارہ دوستوں نے دالان میں گھیر لیا اور اس سے چھیڑ خانی کرنے لگے۔ اتفاق سے اسی وقت پوسٹ مین آگیا۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں بدمعاش چلے گئے اور میری مزید بے عزتی سے بچ گئی۔

ایک رات پانچ سی میں پارٹی ہوئی اور خوب ہنگامہ رہا۔ جب نصف شب کے بعد بھی موسیقی کا شور اور لوگوں کی اُدھم بازی جاری رہی تو ایلس اور دیگر پڑوسیوں نے پولیس کو فون کردیا لیکن انہوں نے ایک گھنٹے تک کوئی کارروائی نہیں کی پھر جب اپارٹمنٹ سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں تو انہوں نے دوبارہ پولیس کو فون کیا تب چار پولیس والے آئے اور انہوں نے جورجی سے درخواست کی کہ وہ براہِ کرم اپنے مہمانوں کو گھر بھیج دے۔ جورجی نے بڑی شرافت سے ان کی بات مان لی اور پولیس والے مطمئن ہوکر واپس چلے گئے۔

اس کے چند روز بعد دالان کی دیوار پر سرخ رنگ سے نازی پارٹی کا نشان بنا ہوا نظر آیا جس کے نیچے دو دھمکی آمیز نعرے لکھے ہوئے تھے جسے جون نے جلدی سے مٹا دیا گو کہ اس کا الزام کسی پر نہیں آیا لیکن سب لوگوں کو اندازہ تھا کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے۔

ان واقعات کی روک تھام کے لیے ٹوسی میں رہنے والے مسٹر سار خوف کے اپارٹمنٹ میں ایک ہنگامی میٹنگ بلائی گئی جس میں ایلس اور مارکو نے بھی شرکت کی۔ وہاں رہنے والے سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ خوفزدہ پولیس اس پر کوئی کارروائی نہیں کرے گی جب تک کوئی جرم سرزد نہ ہوجائے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جورجی کے چچا دیمتری سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایک تجویز یہ بھی آئی کہ کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کی جائیں لیکن اس کے اخراجات برداشت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ لہٰذا یہ میٹنگ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے علاوہ کیا، کیا جاسکتا ہے پھر بڑی تیزی سے آگے پیچھے دو واقعات پیش آئے جس کے بعد ایلس کی ہچکچاہٹ ختم ہوگئی اور اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار کرلیا۔

اس ہنگامی میٹنگ کے چند روز بعد مارکو فینسلی اپنے اپارٹمنٹ سے باہر آرہا تھا جب اس نے دو آدمیوں کو اپارٹمنٹ پانچ سی کے سامنے راہداری میں دیکھا۔ جورجی اپنے دروازے میں کھڑا اس آدمی کو سفید پاؤڈر کے کئی چھوٹے اور شفاف پلاسٹک کے پیکٹ دے رہا تھا جس نے اسے رقم کی ادائیگی کی تھی۔ مارکو ان کے پاس سے گزرتا ہوا لفٹ تک گیا اور اس کی گھنٹی بجادی۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے آئے اور خاموشی سے لفٹ میں سوار ہوگئے لیکن جب وہ نیچے دالان میں پہنچے تو ان میں سے ایک نے مارکو کا بازو پکڑا اور بولا۔

"تم نے کچھ نہیں دیکھا بڈھے۔ سمجھ گئے؟"

مارکو نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور گروسری اسٹور کی طرف تیزی سے جانے لگا جب وہ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو اسے عمارت کے سامنے ایک فٹ پاتھ پر دو آدمیوں نے گھیر لیا اور زمین پر گرا کر اس کے چہرے اور پسلیوں پر مسلسل لاتیں مارتے رہے۔ اس کا پرس بھی چھین لیا گیا لیکن وہ ان حملہ

آوروں کو نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی اس واقعے کا کوئی عینی شاہد سامنے آیا۔ البتہ بعد میں اس نے ایلس کو اسپتال میں بتایا کہ اس نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک مردانہ آواز سنی تھی۔ وہ روسی زبان بول رہا تھا۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا جس نے ایلس کو فیصلہ کن قدم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ اسے اگلے سال ریٹائر ہونا تھا لیکن وہ اب بھی اپنے علاقے میں واقع جونیئر ہائی اسکول میں ہفتے میں دو دن پڑھا رہی تھی۔ ایک دن دوپہر میں وہ اسکول سے فارغ ہوکر..... اپنے گھر جارہی تھی کہ اس نے کچھ بچوں کو دیکھا جو اسکول سے متصل کھیل کے میدان میں چلا رہے تھے اور ٹم ڈیوس نام کا ایک لڑکا جو دوسروں کے لیے پریشانیاں پیدا کرنے کی وجہ سے مشہور تھا، وہ باڑ کے قریب کھڑا دوسری طرف موجود دو آدمیوں سے بات کررہا تھا۔ ایلس نے فوراً ان دونوں کو پہچان لیا۔ وہ جورجی کے دوست تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے سیل فون کے ذریعے ان کی تصاویر لے لیں۔

ایلس نے دور سے ہی ٹم ڈیوس کو آواز دی اور ان دونوں آدمیوں کو گھورنے لگی۔ انہوں نے بھی جانے سے پہلے اسے گھورا۔ ایلس نے ٹم کو اجنبیوں سے بات کرنے پر لیکچر پلایا لیکن اس کے باوجود وہ فکرمند تھی۔ جورجی کے ساتھی منشیات فروش تھے اور انہوں نے جورجی سے منشیات خریدی تھی۔ یہ سوچنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اسکول کے گرد کیوں منڈلا رہے تھے۔ غالباً ڈیکٹری نے اپنے قابل نفرت بھتیجے کو اسی لیے لنڈی ہاؤس میں جگہ دی تھی کہ وہ یہاں رہ کر اس علاقے میں اس ناجائز کاروبار کی نگرانی کرے۔

ایلس واپس اسکول گئی اور سیدھی پرنسپل کے کمرے میں گھس گئی۔ اس نے انتظامیہ کے لوگوں اور سیکیورٹی گارڈز کو وہاں بلا کر وہ تصویریں دکھائیں جنہوں نے مزید چوکس رہنے کا یقین دلایا۔

اس رات ایلس دیر تک جاگتی اور مارکو، میری لین اور مسٹر روز برگ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی لیکن اس نے جو کچھ اسکول کے کھیل کے میدان میں دیکھا، وہ بہت ہی پریشان کن تھا۔ اس نے ٹم ڈیوس اور ان تمام بچوں کے بارے میں سوچا جنہیں اس نے برسوں پڑھایا تھا۔ اسے اپنی دو بیٹیاں یاد آئیں۔ اب ان کے بھی تین بچے تھے۔ وہ ان سب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

دوسری صبح وہ کپڑے دھونے تہ خانے میں گئی جہاں جون چوہے مارووا ڈال رہا تھا۔ اگلے روز اس نے کیک بنایا جو اسے شام کو اسکول میں ہونے والی والدین واساتذہ کی میٹنگ میں لے کر جانا تھا۔ ابھی وہ کیک بنانے میں مصروف تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے مارکو نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ میں ہوں۔"

"ہاں بولو۔ کیا خبر ہے..... کیا وہ گھر میں ہے؟"

"ہاں لیکن وہ ہر روز سہ پہر میں باہر جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے جانے میں زیادہ دیر نہیں ہے اور آج کا دن اس کام کے لیے بہت مناسب ہے۔ میں نے اسے اپنے ایک کارندے کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ آج رات کو آکر ایک بڑی لاٹ لے جائے۔ میں نے کل وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں مال رکھا ہوا ہے۔ اس لیے اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ آج رات کیا بیچ رہا ہے۔ کیا تم نے تھیلیاں لے لیں؟"

"ہاں" اس نے کہا۔ "میں ابھی اسٹور سے آئی ہوں۔"

اس نے چھوٹی پلاسٹک کی تھیلیوں کو دیکھا جو کچن کاؤنٹر پر رکھی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ میری تیاری مکمل ہے۔" مارکو نے کہا۔

"وہ جیسے ہی گھر سے باہر گیا میں کھڑکی کے راستے سے اندر چلا جاؤں گا۔"

"بہت بہتر جب وہ جانے لگے تو مجھے فون کر دینا۔" ایلس نے کہا۔ "لیکن مجھے بھی تیار ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

ایک گھنٹے بعد وہ سفید پاؤڈر کا آخری لفافہ بھر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

"میں آرہی ہوں۔" ایلس نے فون رکھتے ہوئے لفافوں کے ڈھیر پر نظر ڈالی اور اسے چند روز پہلے جون سے ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "فوری اثر کرنے والی۔"

اس نے وہ تھیلیاں اپنے ایپرن کی جیبوں میں رکھیں اور اوپر چلی گئی اور جب اس نے مارکو کو دیکھا تو وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پائی۔ اس نے واقعی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں پر دستانے اور پیروں میں بے آواز ربر کے جوتے تھے۔ البتہ اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ تاہم وہ اس حلیے میں کافی مستعد نظر آرہا تھا۔

اس نے ایلس سے وہ جھوٹے لفافے لیے اور انہیں ایک براؤن رنگ کے کاغذ کے بیگ میں ڈال لیا۔ یہ بالکل ایسا ہی بیگ تھا جس میں اس کے کچھ طالب علم اپنا کھانا لے کر آئے تھے۔ مارکو نے دروازے کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کیا اور کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "دیکھتی رہنا۔

کوئی خطرہ ہو تو دروازے پر تین دفعہ دستک دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس نے اسے کھڑکی سے گزرتے اور غائب ہوتے دیکھا پھر وہ بیرونی دروازے پر آئی۔ اس نے انٹرکام کا سبز بٹن دبایا اور اس کی چھوٹی اسکرین کو دیکھنے لگی۔ دالان خالی تھا۔

انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ عمارت کے تمام لوگوں بالخصوص جون کو اس معاملے سے الگ رکھیں گے۔ ایلس کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جون بہ خوشی نچلی منزل پر پہرا دینے کے لیے تیار ہو جاتا بلکہ شاید خود ہی جورجی کے اپارٹمنٹ میں جاکر پیکٹ بدل دیتا لیکن جون کے بچے چھوٹے تھے۔ اس لیے ایلس اور مارکو نے اسے شامل کرنا مناسب نہ سمجھا لہٰذا یہ بات صرف ان دونوں کے درمیان تھی اور صرف وہی جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

جورجی نے اپنا مال، الماری کے عقب میں رکھے جوتوں میں چھپا رکھا تھا۔ گزشتہ روز مارکو کو اسے تلاش کرنے میں صرف چودہ منٹ لگے تھے لیکن آج تلاش کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ اسے صرف اس جگہ تک پہنچ کر اپنا کام کرنا تھا۔ ایلس اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی خلاف قانون کام نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی ایسی باتوں پر غور کیا۔ اس لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ مال جوتوں میں رکھا ہوگا۔ وہ حیران تھی کہ مارکو کو یہ خیال کیسے آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سرکس میں گزارا تھا جہاں بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے۔ ان میں جرائم پیشہ افراد بھی ہوں گے پھر اس کے دونوں بڑے بھائی اپنی جوانی کے دنوں میں مختلف جرائم میں ملوث رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ منشیات فروشوں کے طور طریقوں کے بارے میں جانتا تھا۔

ایلس نے خود بھی بڑی محفوظ زندگی گزاری تھی۔ یہاں تک کہ اسکول اور کالج کے زمانے میں بھی اس نے کبھی منشیات کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی سگریٹ یا کسی مشروب کو ہاتھ لگایا۔ اسی وجہ سے اس کا بے حد محبت کرنے والا شوہر بھی مذاق میں اسے بورنگ پرسن کہا کرتا لیکن اسے اپنے بور ہونے پر فخر تھا اور وہ مطمئن تھی کہ اس سے پہلے اس کی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔

اس نے دیوار سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن اسے دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ شاید مارکو بڑی خاموشی سے کام کر رہا تھا اور وہ یہی توقع کر رہی تھی۔ اسے گئے ہوئے چار منٹ ہو گئے تھے۔ ایلس نے انٹرکام کا سبز بٹن دوبارہ دبایا، اس نے دیکھا کہ جورجی دالان کے دروازے پر کھڑا اپنی چابیاں ٹٹول رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی پھر اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور دیوار پر تین مرتبہ زور سے ہاتھ مارا۔

جورجی نے اندرونی دروازہ کھولا اور دس سیکنڈ کی ویڈیو ختم ہوتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایلس نے اپنی سانس روک لی اور چشم تصور سے اسے لفٹ کی طرف بڑھتے اور کال بٹن دباتے دیکھتی رہی۔ اس کے اندازے کے مطابق لفٹ پہلے سے گراؤنڈ فلور پر موجود ہوگی اور اسے انتظار نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ اب وہ لفٹ میں داخل ہو کر اوپر جا رہا ہوگا۔

اس نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن دور سے آنے والی لفٹ کی آواز کے علاوہ کچھ نہیں سنائی دیا جو آہستہ آہستہ اوپر آ رہی تھی۔ ماضی میں ہمیشہ اس نے اس سست خرامی پر لفٹ کی برائی کی لیکن اس وقت وہ خلوص دل سے دعا کر رہی تھی کہ اس کی رفتار مزید آہستہ ہو جائے یا اس میں کوئی ایسی خرابی ہو جائے کہ وہ اوپر نہ آسکے اور راستے میں ہی کہیں رک جائے۔

اس نے دوبارہ پہلے سے زیادہ زوردار آواز میں دستک دی۔ "ایک دو تین پلیز مارکو۔" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ "پلیز....."

اس نے سوچا کہ اب مارکو، جورجی کے بیڈروم میں گھٹنوں نے بل جھکا ہوا کوکین کے پیکٹ نکال کر ان کی جگہ اس سے ملتے جلتے سفوف کے پیکٹ رکھ رہا ہوگا۔ کیا اسے وہاں لفٹ کی آواز آ رہی ہوگی؟ شاید کیونکہ ایلس کو اپنے اپارٹمنٹ میں ہر جگہ لفٹ کی آواز سنائی دیتی تھی اور اسے یقین تھا کہ جورجی کے اپارٹمنٹ میں بھی یہ آواز آتی ہوگی کیونکہ مسٹر سار خوف ٹوسی میں رہتے تھے اور وہ کئی مرتبہ ان کے اپارٹمنٹ میں یہ آواز سن چکی تھی۔

ایلس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جورجی اتنی جلدی واپس کیسے آ گیا حالانکہ اسے گئے ہوئے مشکل سے آدھ گھنٹا ہوا ہوگا۔ اتنی جلدی وہ کبھی واپس نہیں آتا تھا۔ آخر وہ کہاں گیا تھا؟

اب راہداری کے دوسرے سرے سے لفٹ کے رکنے اور دروازہ کھلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایلس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتی۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی طرح جورجی کو اس کے اپارٹمنٹ میں جانے سے روکنا چاہیے پھر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ وہ راہداری میں جاکر جورجی کا راستہ روکے اور اسے کسی بہانے سے اپنے اپارٹمنٹ میں لے جائے مثلاً وہ اس سے کہہ سکتی ہے کہ اس کی الماری کی چابیاں کاؤچ کے پیچھے گر گئی ہیں اور وہ بڑھاپے کی

وجہ سے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ اگر وہ اس کے ساتھ نیچے جا کر کاؤچ کو تھوڑا سا ہٹا دے تو وہ اس کام کا پورا معاوضہ دے گی۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح مارکو کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلنے کا وقت مل جائے گا لیکن وہ سوچتی ہی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا جب اس نے دروازے کے باہر بھاری قدموں اور چابیوں کے بجنے کی آواز سنی۔

اس نے ایک بار پھر دیوار پر تین بار دستک دی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے خوف کے مارے آنکھیں بند کرلیں جب اس نے جورجی کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس کا چودہ سال پرانا بہترین دوست جورجی کے اپارٹمنٹ میں اس کے سامنے موجود تھا۔ یقیناً جورجی نے اب تک اپنا پستول نکال لیا ہوگا اور اس کے سینے کا نشانہ لے رہا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ کو فائر کی آواز سننے کے لیے تیار کرلیا۔

اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مارکو ایک ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا پکڑے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''چھ منٹ تیئس سیکنڈ۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

ایلس نے پلکیں جھپکائیں اور مڑ کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی پھر اس کے کندھے کے پیچھے کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا اور دوبارہ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم کیسے نکل آئے؟''

''اسے تم مینسلی کا فائنل کہہ سکتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے ہی میں نے دروازے میں چابی لگنے کی آواز سنی۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنے جسم کو اوپر اٹھایا اور تیر کی طرح اڑتا ہوا اس... کھڑکی سے باہر آ گیا۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے گو کہ گزشتہ چالیس برس کے دوران میں نے ایسا کرتب نہیں دکھایا۔ بہرحال ایک بوڑھے شخص سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔''

''میں نے تمہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' وہ بولی۔

''میں تمہیں دکھا سکتا ہوں۔''

''نہیں رہنے دو۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔''

دونوں ملحقہ دیوار کی طرف مڑے جس کی دوسری طرف سے غصے میں بھری ہوئی آواز میں ایک مرد اور عورت کسی غیر ملکی زبان میں گرما گرم بحث کر رہے تھے اور پس منظر میں وائلن بجنے کی آواز آ رہی تھی پھر انہوں نے عورت کے رونے کی آواز سنی۔

''یہ اس کا روز کا معمول ہے۔'' مارکو بولا۔ ''روسی ڈراموں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

ایلس مسکرا دی پھر اسے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے وہ کیا کر چکے ہیں تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں تمہیں ڈنر پر لے جاؤں گی۔'' اس نے مارکو سے کہا۔ ''تم آخری بار اس بلڈنگ سے باہر کب گئے تھے؟''

اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ ''تین ہفتے پہلے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم آج رات باہر جاؤ گے۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں قریب ہی ایک نیا اطالوی ریستوران کھلا ہے اور میری لین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ تم خود بھی اطالوی ہو۔ اس لیے بہتر فیصلہ کرسکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک گھنٹے میں تیار ہو جاؤں گا۔''

ایلس نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے کو دیکھ کر کہا۔ ''پہلے اس سے جان چھڑاؤ۔ اسے فلش میں بہانا ٹھیک رہے گا۔''

مارکو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں کیک کھلانا پڑے گا۔''

ایلس نے اس کی طرف دیکھا اور اسے کچھ یاد آ گیا۔

''اوہ ڈیئر۔'' وہ چلائی۔ ''میرا کیک!''

اس نے دروازہ کھولا اور راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔ پانچ سی سے آنے والی روسیوں کی آوازیں اور مارکو کے قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہے اور وہ سیڑھیاں اتر کر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

☆☆☆

آج جون تہ خانے میں چوہے مارنے کی دوا نہیں چھڑک رہا تھا بلکہ اس نے رنگ کیا تھا اور وہ اپنے اوورآل اور بالوں پر لگے ہوئے آف وائٹ پینٹ کے چھینٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب ایلس لانڈری میں کپڑے دھونے آئی تو اس وقت وہ ایک بڑے سے سنک پر کھڑا رولر اور برش دھو رہا تھا۔ ایلس صرف اپنے ہی نہیں بلکہ مارکو کے کپڑے بھی لے کر آئی تھی۔ اس واقعے کے بعد تین مہینوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔

''صبح بخیر جون۔'' ایلس نے کہا۔

''صبح بخیر مسز ولسن، بہت خوبصورت دن ہے اور اس عمارت میں بھی بہت سکون اور خاموشی ہے۔''

''ہاں۔ واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لگتا ہے کہ تم کافی مصروف تھے؟''

Digitized by Google

جان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے ابھی ابھی فائیوی، میں رنگ کا کام مکمل کیا ہے۔“ میں نے اپنے کزن کو مدد کے لیے بلایا تھا۔ نئے کرایہ داروں سے ملے ہو؟“ ایلس نے پوچھا۔

”اوہ ہاں۔ میں گزشتہ ہفتے ان سے ملا تھا جب ہم پینٹ خریدنے گئے تھے۔ ان کے نام شین اور میلوری ورتھنگٹن ہیں۔ شین فنڈ منیجر اور میلوری کنسلٹنٹ ہے۔ دونوں بہت اچھے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ ایسے ہی ہوں گے۔“ ایلس نے کہا۔ اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ دیمتری اینڈ روف نے یہ جگہ ایڈیفیک انٹر پرائز کو فروخت کردی تھی جو ایک باوقار رئیل اسٹیٹ انویسٹمنٹ گروپ تھا۔ انہوں نے اچھی قیمت پر لنڈری ہاؤس میں دیمتری کا حصہ خرید لیا تھا کیونکہ دیمتری کو وکیلوں کی فیس اور مقدمہ کے اخراجات کے لیے بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ اپنے اثاثے فروخت کررہا تھا۔ اسے اپنے بھتیجے جورجی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا اور اس کی لاش دیمتری کے ایک خالی مکان سے ملی تھی۔ اس کے سر اور سینے میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ یہ افواہ سننے میں آرہی تھی کہ دیمتری اپنے بھتیجے سے اس لیے ناراض تھا کہ اس نے وہ مال چوری کرلیا جو اسے فروخت کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور اس کی جگہ پسی ہوئی چینی رکھ دی۔

اخبارات میں کئی دن تک اس خبر کا چرچا رہا۔ نشے کے عادی افراد نے شکایت کی کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور انہیں کوکین کی جگہ سفید چینی کا پاؤڈر دیا جارہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ پیکٹ پورے شہر میں پہنچ گئے ہیں اور یہ پتا لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہ مال اینڈ روف فیملی نے سپلائی کیا تھا۔ ڈیلی نیوز نے اس خبر کی سرخی لگائی اور اس کے ساتھ ہی جورجی کی تصویر بھی شائع کی۔ جورجی منظر سے غائب ہوگیا اور ایک ہفتے بعد اس کی لاش ایک ویران جگہ سے ملی۔

ڈیلی نیوز یا کسی دوسرے اخبار نے دیمتری اینڈ روف کے لنڈری ہاؤس سے جانے کی اصل وجہ نہیں بتائی کیونکہ وہ خود بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ دراصل یہ بھی ایلس کے منصوبے کا حصہ تھا۔ اس نے ایک طرف تو مارکو کی مدد سے کوکین کی جگہ شوگر پاؤڈر کے پیکٹ رکھ کر دیمتری کو بھاری مالی نقصان ہی نہیں پہنچایا بلکہ مارکیٹ میں اس کی ساکھ بھی خراب کردی..... لیکن ایلس جانتی تھی کہ دیمتری کی اس علاقے میں موجودگی خطرناک ہے۔ وہ اس صدمے سے سنبھلنے کے بعد دوبارہ اپنا کاروبار شروع کردے گا لہٰذا اس نے ایسا چکر چلایا کہ دیمتری کو لنڈری ہاؤس چھوڑ کر جانا پڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے گروہ کے دوسرے ارکان بھی غائب ہوگئے جو مختلف روپ بدل کر علاقے میں منشیات فروشی کرتے تھے۔

اس نے جورجی کی لاش ملنے کے ایک دن بعد کسی نامعلوم نمبر سے دیمتری اینڈ روف کو اس کے کارندوں کی وہ تصویریں بھیج دیں جو اس نے اپنے موبائل فون سے اس وقت اتاری تھیں جب وہ اسکول کے احاطے کے باہر منشیات فروخت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ان تصویروں کے ساتھ دیمتری کے لیے ایک مختصر پیغام بھی تھا۔ ”لنڈری ہاؤس سے چلے جاؤ ورنہ یہ تصویریں پولیس کو بھیج دی جائیں گی۔“

اس نے دیمتری کا پرائیویٹ فون نمبر جون سے حاصل کیا جو اس نے کوئی سوال پوچھے بغیر دے دیا۔ پھر اس نے ایک ناقابل شناخت پری پیڈ سیل فون کا بندوبست کیا اور اس کے ہونہار شاگرد ٹم ڈیوس نے اسے اس کے استعمال کا طریقہ بتادیا کہ اسے کس طرح اس میں پیغام ٹائپ کرکے تصویروں کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ یہ ایسے فون ہوتے ہیں جنہیں استعمال کرو اور پھینک دو۔ ٹم نے اسے یہی مشورہ دیا تھا چنانچہ ایلس نے ایسا ہی کیا۔

اس پیغام کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور صرف دو دن بعد ہی لنڈری ہاؤس میں دیمتری اینڈ روف کے شیئرز مارکیٹ میں فروخت ہونے کے لیے آگئے، جنہیں فوراً ہی خرید لیا گیا۔

اس کے بعد علاقے میں سکون ہوگیا۔ ایلس اور اس کے پڑوسی خوش تھے کہ انہیں جورجی اور اس کے اوباش ساتھیوں سے نجات مل گئی اور اب وہ بلاخوف وخطر اپنے روزمرہ کے معمولات انجام دے سکتے تھے۔ اس نے شیلف میں رکھے سفید پاؤڈر کے ڈبے کو دیکھا اور وہ مسکرادی۔ اسی کو دیکھ کر اس کے دماغ میں کوکین کی جگہ سفید چینی کا پاؤڈر رکھنے کا خیال آیا تھا۔ اس نے جون سے پوچھا۔ ”کیا واقعی شوگر پاؤڈر سے چوہے مرجاتے ہیں؟“

”ہاں اگر اس میں آٹا اور بیکنگ سوڈا ملا دیا جائے تو یہ چوہوں کے لیے زہر ہے، میٹھا زہر۔“

وہ سوچنے لگی کہ یہ میٹھا زہر بھی کتنا کارآمد ہے۔ اس کی وجہ سے صرف چوہے ہی نہیں بلکہ علاقے کے بدمعاش بھی بھاگ گئے۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور اوپر جانے لگی اسے مارکو کے لیے کھانا بنانا تھا۔

Digitized by Google

تاوان

محمد طاہر عمیر

اگر کچھ غلط ہو جائے تو انسان کو ازالہ کرنا ہی پڑتا ہے لیکن جرائم کی دنیا میں زبردستی اپنا آپ منوانے کے لیے اسے جو تاوان ادا کرنا پڑا وہ مرکس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی مگر... اس طرح تو ہوتا ہے ایسے عجیب کاموں میں...

مجرم کے مکروفریب پر مشتمل ایک مختصر مگر دلچسپ تحریر

1963ء میں سینٹرویل ٹاؤن کی واحد ٹریفک لائٹ نے کسی آوارہ گولی کی زد میں آ کر کام کرنا چھوڑ دیا تھا جسے بعد میں کبھی ٹھیک نہیں کیا گیا۔ مین اسٹریٹ اور سینٹرل ایونیو کو ملانے والے چوک پر لگی یہ بند لائٹ ہمیشہ باہر سے ٹاؤن میں آنے والے لوگوں کو پریشان کرتی۔ کچھ تو یہاں سے جب گزرتے تو رک کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتے اور اکثر چپ چاپ سیدھے گزر جاتے۔

اکثر اوقات میں بلیو بوٹیٹ کیفے کے فرنٹ ڈیسک پر بیٹھا اس چوک کو دیکھتا رہتا اور صرف اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی کرسی سے اٹھ کر اندر تبھی جاتا جب کسی آنے والے کے لیے

مجھے کھانا تیار کرنا ہوتا۔ یہاں صرف وہی لوگ آتے تھے جنہیں اچھے بُرے کھانے میں تمیز نہ ہوتی یا اچھے اور بُرے کھانے کی فکر نہ ہوتی۔ مینیو کارڈ پر جو ڈشز دستیاب تھیں ان کو تیار کرنے کا سامان بھی تقریباً ختم ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ مینیو کارڈ کے ایک اچھے حصے کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ اس کاروبار کو خریدنے کے لیے میں نے بینک سے جو رقم لی تھی، اگرچہ وہ میں کافی عرصہ قبل ہی ادا کر چکا تھا لیکن اب بھی اس بلیو بونیٹ کیفے کے لیے میں ایک مخصوص رقم ادا کر رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے اوپر والے حصے میں واقع دو بیڈ رومز پر مشتمل ایک اپارٹمنٹ تھا جس میں میں رہائش پذیر تھا۔ حکومت کی طرف سے سوشل سیکیورٹی کی مد میں ملنے والے چیک سے میں اپنے بلز ادا کر رہا تھا اور میں اس ریسٹورنٹ کو اس وقت تک کھلا رکھنا چاہتا تھا جب تک کہ یہ ٹاؤن ختم نہ ہو جائے یا میں خود مر نہ جاؤں۔

مین اسٹریٹ پر واقع دوسرے کاروبار کو ختم ہوئے کئی سال بیت چکے تھے۔ پیچھے صرف چند ٹوٹی پھوٹی عمارتیں رہ گئی تھیں۔ اپنے منشور کو کھودینے پر ضلعی انتظامیہ بھی اب ٹاؤن کی ذمے داریوں سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ ڈاک خانہ جس میں اب ایک کاؤنٹر کے سوا کچھ موجود نہیں تھا، اسے بھی بند ہوئے اب کافی سال بیت چکے تھے۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ جونہی میں واش روم سے باہر نکلا تو ایک اجنبی جوڑے کو ہال کی ایک میز پر بیٹھے دیکھا۔ لڑکا آدھے بازوؤں والی شرٹ پہنے ہوئے تھا جس کے نیچے اس کے ٹیٹو بنے مضبوط بازو اس کے صحت مند ہونے کا عندیہ دے رہے تھے۔ جبکہ لڑکی موٹے ہونٹ اور ایک آنکھ پر گہرے نیل کا نشان لیے بیٹھی تھی۔ میں ان کی میز کے قریب پہنچا۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

لڑکے نے مجھے بیف اسٹیولا نے کا کہا۔

''ہم یہ نہیں رکھتے۔'' میں نے بتایا۔

''لیکن مینیو کارڈ تو کچھ اور ہی بتا رہا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے مینیو کارڈ پکڑ لیا اور جیب سے کالا مارکر نکال کر بیف اسٹیو پر کراس لگا دیا۔

میں نے مینیو کارڈ دوبارہ لڑکے کو پکڑانا چاہا تو اس نے اسے پکڑنے کے بجائے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر اور کیا ہے تمہارے پاس کھانے کے لیے؟''

''برگر پنیر کے ساتھ اور بغیر پنیر کے..... اور فرائیڈ چپس۔'' میں نے جواب دیا۔

''برگر پنیر کے ساتھ اور فرائیڈ چپس۔'' وہ بولا۔

''اور آپ.....؟'' میں نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ مجھے جواب دینے کے بجائے بس اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔

''اسے بھی یہی چاہیے۔'' لڑکے نے کرخت لہجے میں کہا۔

''دو برگرز پنیر کے ساتھ اور فرائیڈ چپس۔'' میں نے آرڈر لکھتے ہوئے کہا۔

''اور کچھ پینے کے لیے؟''

''کوک.....'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے لیے آسان رہے گا۔''

''ہاں کیوں نہیں.....'' میں واپس مڑا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے فریزر میں رکھے ہوئے فرائز کو فرائیر میں ڈالا اور برگر تیار کرنے کے لیے گوشت کو گرل کرنے لگا۔ لڑکی کی آنکھ پر نیل کے نشان کو دیکھ کر مجھے کسی اور عورت کی یاد آنے لگی۔ اس عورت کے چہرے پر بھی نیل کا نشان تھا لیکن وہ نشان میرے غصے کی وجہ سے آیا تھا۔

لیڈیا اور میں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ ہم ہائی اسکول کے زمانے سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور گریجویشن میں ہی ہم نے شادی کر لی تھی۔ میں نے ہائی اسکول کے بعد ہی بلیو بونیٹ کیفے میں ایک ویٹر اور جونیئر باورچی کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیڈیا بھی ایک ویٹر کی حیثیت سے بلیو بونیٹ کیفے میں کام کر رہی تھی۔ پھر میں جنرل منیجر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ کچھ عرصے بعد مالکان نے مجھے اور لیڈیا کو یہ کیفے فروخت کر دیا۔ اس کے بعد میں اور لیڈیا اس کیفے کے اوپر والے اپارٹمنٹ میں رہنے لگے۔ ہم دونوں مل کر سارا دن کام کرتے۔ ہمارا سارا وقت ایک ساتھ گزرتا۔ پھر ٹاؤن غیر آباد ہونے لگا اور ہمارا کاروبار بھی ختم ہونے لگا۔ ہر ماہ آمدنی میں کمی ہوتی چلی گئی۔ خسارہ برداشت سے باہر ہونے لگا اور میرا غصہ وقت بے وقت لیڈیا پر نکلتا رہتا۔

میں نے بڑے اہتمام سے برگرز کو پلیٹ میں سجایا اور کھانے کے منتظر جوڑے کے سامنے پیش کر دیا۔ کیفے میں ایئر کنڈیشنر موجود نہیں تھا۔ صرف چھت پر لگا واحد پنکھا ہی ضرورت پوری کرتا تھا۔ میں کاؤنٹر کے دوسری جانب کھڑا ان دونوں کو کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ برگر کھانے کے بعد انہوں نے کچھ میٹھے کی فرمائش کی۔

''پیسٹریز میں کون کون سا فلیور ہے؟'' لڑکا بولا۔

جب سے میری بیوی مجھے چھوڑ کر گئی تھی، ہم نے پیسٹریز بنانا بند کر دی تھیں۔ میں نے اس پر یہ سب کچھ واضح کیا اور کہا کہ میٹھے میں اس وقت صرف کیلے کا حلوا ہے جو میں

Digitized by Google

نے تین دن پہلے تیار کیا تھا۔

''ہمیں یہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' لڑکے نے لڑکی کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہاں کے لیے بالکل اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

وہ ایک دم سہم گئی اور پھر سے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

''چھوڑو اب.....'' لڑکا بولا۔ ''اس کے لیے اب کہیں اور جانا ہوگا۔''

''میں آپ کا بل تیار کرتا ہوں۔'' جب تک میں دوسری جانب مڑ نہیں گیا، میں مسلسل لڑکی کو دیکھ رہا تھا .....جانے کیوں۔

جب میں کچن میں داخل ہونے لگا تو مجھے لڑکے کی آواز آئی۔ ''میں ٹوائلٹ سے ہو کر آتا ہوں۔''

میں کچن میں آیا۔ ان چیزوں کا ٹوٹل کیا پھر میں نے لوہے کا فرائی پین اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑا اور ڈائننگ ہال کی جانب بڑھا۔ لڑکا ابھی واش روم میں ہی تھا۔ میں نے لڑکی کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ اس نے کیا ہے تمہارے چہرے پر؟''

اس نے اچانک ہاتھ اپنے گال پر رکھا اور پھر واپس گود میں گرالیا۔ وہ کچھ نہ بولی اور شاید بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

''اسی نے کیا ہے۔'' پھر وہ کراہیت آمیز لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ اور پوچھتا، وہ لڑکا واپس آ گیا۔

''تم میری بیوی سے کیا باتیں کر رہے ہو؟''

میں اس کی طرف مڑا۔ ''کیا تم نے کیا ہے یہ.....اس کے چہرے پر؟''

''تو کیا ہوا.....اگر میں نے یہ کیا ہے تو؟''

''تمہیں ایک عورت پر ہاتھ اٹھانا پسند ہے؟''

''اپنے کام سے کام رکھو۔''

''تمہیں اس کے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''تم کیا کر سکتے ہو.....بوڑھے آدمی۔''

میں اس چیز کو ٹھیک تو نہیں کر سکتا تھا جو میں نے اس رات لیڈیا کے ساتھ کیا جس رات وہ لائٹ کسی آوارہ گولی سے ٹوٹی تھی۔ لیکن میں کسی اور عورت کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے سے تو بچا سکتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے فرائی پین کو گھمایا اور زور سے اسے دے مارا۔ وہ گھٹنوں کے بل نیچے گر گیا۔ پھر دوسری بار میں نے اسی زور سے اسے مارا تو وہ سر کے بل نیچے گر گیا۔ وہ لڑکی چپ چاپ دیکھتی رہی۔ میں نے لڑکے کی جیب خالی کی۔ ایک گاڑی کی چابی نکال کر میز پر پھینکی اور اس کے پرس سے نکلنے والے تمام پیسے بھی میز پر رکھ دیے۔

''جاؤ.....'' میں نے اس سے کہا۔ ''جتنی دور ہو سکے چلی جاؤ۔''

اس نے چابی اور پیسے اٹھائے اور بنا کچھ کہے اور بغیر پیچھے دیکھے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ہمارا اپارٹمنٹ جو کیفے کے اوپر والی منزل پر تھا، اس کی کھڑکیاں رات بھر کھلی رہتیں جس سے ٹھنڈی ہوا اندر آتی اور اس گرم موسم کو کم کرنے میں مدد دیتی تھی۔ اس رات میں ایک عجیب سی آواز سے اٹھا اور میں نے دیکھا کہ میری بیوی لیڈیا اندھیرے میں سوٹ کیس تیار کر رہی ہے۔ میں نے اس کی بائیں کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔''

لیڈیا کی ایک آنکھ سوجن سے تقریباً بند ہو چکی تھی جہاں میں نے اسے آخری شام مارا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ گھوما جہاں ہمارا کیش رجسٹر پڑا تھا۔ اس نے وہاں سے ''اسے'' اٹھا لیا اور میری طرف کر دیا۔ اس نے یہ سب مجھے ڈرانے کے لیے کیا تھا لیکن اس حرکت سے مجھے اور غصہ آ گیا۔ میں نے ایک اور تھپڑ اسے رسید کر دیا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ باہر ٹریفک لائٹ سے ایک شعلہ سا بھڑکا اور میں اسٹریٹ اور سینٹرل ایونیو کو ملانے والا چوک اندھیرے میں ڈوب گیا۔

لیڈیا میرا مکا لگنے سے پیچھے کی جانب گری اور اس کا سر میز کے کنارے سے لگا اور پھر میں دوبارہ کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھا پایا۔ میری بیوی سب کو بتا چکی تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ تو اس کے اچانک غائب ہونے سے کسی کو شک نہ گزرا۔ کچھ دوستوں میں اس وقت شک پیدا ہوا جب چلے جانے کے کئی ماہ بعد بھی اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہ کیا لیکن وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ اس کو جاننے والے کچھ تو مر گئے اور باقی کہیں دور چلے گئے۔

میں اس لڑکے کی لاش کو گھسیٹ کر تہ خانے میں لایا اور دھکا دے کر بڑے فریزر میں دھکیل دیا جہاں میری بیوی لیڈیا اس کا ساتھ دینے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔

اس کے بعد میں نے کھانے والی میز کو صاف کیا اور پھر واپس اپنی اسی ٹوٹی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اس ٹکٹکی ہوئی ٹوٹی ٹریفک لائٹ کو دیکھنے لگا اور اب یہاں میں اپنے دن گزارتا ہوں۔ جب تک یہ ٹاؤن ختم نہ ہو جائے یا میں ختم نہ ہو جاؤں۔

قسط نمبر: 21

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری

سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھائو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے بلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ''علی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان فیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی ٹینی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے فیکساس کے علاقے اسٹفلن میں واقع ''سرکل اے'' نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ''سرکل اے'' میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کوئی فنس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (فیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (فیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''ونی لاؤنج'' نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے دردِ دل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر رخصت ہو گئی..... اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو نارگٹ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹینلے اسٹورز سے گروسری خرید نے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈ تا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے ملیشیا کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو پیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال..... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک باروخ لاؤ اور یرما ایپل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ''اسکل اینڈ بونز'' کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے بسی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی

Digitized by Google

سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کررہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہوگئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آگیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہوگیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے ویزٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کردی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کرکے علی کی والدہ کو قتل کردیا۔ علی نے تہیہ کرلیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ علی نے تمام حقیقت پتا کرلی بتادی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور ہمراز بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائشگاہ کے پتے پر ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا اعتراف کیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ نادر شاہ کو اغوا کرکے اس سے سچ اگلوایا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو اغوا کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کرکے بتایا کہ ان کے آدمیوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور اغوا کنندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر بنگلا چھوڑ دیا اور ہیتا کے ہمراہ اس کے فلیٹ پر آگیا۔ علی نے بنگلے پر جمشید کو چھوڑا تھا اور خاص نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن شیفرڈ کی مدد سے تلاش کیا جارہا تھا۔ اس کے ورپردہ ڈیلفینیا کا ہی ہاتھ تھا۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرکے پولیس کو پیچھے لگا دیا تھا جو بڑی شدومد سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کرکے اسے ہمیشہ کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے بنگلے کو نذر آتش کردیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کرلیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ راس آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی مل گئی جس سے دوستی ہونے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ بونز کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ علی، کایا کے ساتھ آئی لینڈ کی سیر کے لیے نکلا کہ اچانک کایا کا پیر برف میں دھنس گیا۔ علی، کایا کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو وہ بھی برف میں دھنستا چلا گیا۔ اسے لگا کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے اور وہ برف کے نیچے یخ بستہ پانی میں گرگیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ علی کو ہوش آیا تو اس نے خود کو کچھ لوگوں کے نرغے میں پایا۔ اچانک کایا نمودار ہوئی اور اس نے فائر کیا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ ہٹ میں پیڈرو نامی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چنگیز خان ہے۔ علی نے اسے اذیت ناک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ کایا نے علی کو اشارہ دیا کہ وہ بھی اپنے دشمن کو اسی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتی ہے۔ علی کے اس استفسار پر اس نے بتایا کہ سوسائٹی کے ممبر آسکر نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے اور وہ اس سے بھیانک انتقام لینا چاہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق جب آسکر کایا کو لینے آیا تو علی کی مدد سے اسے قابو کرلیا گیا اور کایا نے اسے بھیانک موت دی۔ علی نے آسکر کا روپ دھارلیا اور کایا اور وہ بذریعہ جہاز کرائسٹ چرچ ائرپورٹ پر لینڈ کرگئے۔ علی اور کایا ایک ولا میں پہنچ گئے، مگر اسکل اینڈ بونز نے انہیں ٹریس کرلیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے اور کافی مارا ماری ہوئی۔ تاہم وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں ایک موٹیل میں ٹھہرے جہاں سے کایا کو اغوا کرلیا گیا۔ علی اس کی مدد کے لیے گیا، مگر وہ کایا کو نہ بچا سکا اور وہ ماری گئی۔ وہیں اچانک اس کی ملاقات جی ایم سرے سے ہوگئی۔ جی ایم سرے نے علی کو آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تفصیل سے بتایا وہ کسی سرجن کا انتظار کررہے تھے۔ علی سرجن کا سن کر الجھن کا شکار ہوگیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بعض الفاظ صوتی اعتبار سے اتنے دلدوز اور ناخوشگوار کن اثرات کے حامل ہوتے ہیں کہ ان کی ادائیگی میں چاہے کتنا بھی نرم لب ولہجہ اختیار کرلیا جائے وہ انسان کے دماغ میں ہلچل مچائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ ''سرجن'' بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے۔

جی ایم سرے نے کسی سرجن کی آمد کی اطلاع دے کر دفعتاً میرے اندر ایک نامعلوم سی بے چینی بھر دی تھی۔ ناشتے کے بعد سے اب تک انہوں نے مجھ سے جس اونچے درجے کی گفتگو کی تھی اس کے سبب پہلے ہی میرے دماغ کی چولیں ہلی ہوئی تھیں، اوپر سے کسی سرجن کی آمد کی نوید ''سونے پہ سہاگا'' والا معاملہ بن کر رہ گیا تھا۔ ہم اس وقت شہری آبادی سے میلوں دور ایک الگ تھلگ ساحلی ہٹ میں موجود تھے اور ہم دونوں میں سے کسی کو بھی سرجری کی قطعاً ضرورت نہیں تھی پھر سرجن کی اس ہٹ پر آمد..... چہ معنی دارد!

ان لمحات میں میرا ذہن مختلف زاویوں پر سوچ بچار میں مصروف تھا اور نگاہیں بے صبری سے جی ایم سر کی واپسی

Digitized by Google

کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ مالک کا شکر کہ مجھے زیادہ دیر تک انتظار کی صعوبت سے نہیں گزرنا پڑا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جی ایم سر ایک عمر رسیدہ چینی بوڑھے کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس عمر رسیدہ چینی کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس کے احترام میں یکا یک اسٹینڈ اپ ہو گیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ اپنی زندگی کی ایک سینچری تو مکمل کر چکا تھا۔ جی ایم سر کے ایک ہاتھ میں مجھے بیگ بھی دکھائی دیا۔ یہ فرسٹ ایڈ ٹائپ کا مگر سائز میں کافی بڑا بیگ تھا جو یقیناً اسی چینی بوڑھے کا ہو سکتا تھا کیونکہ جب جی ایم سر میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے تو ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

جی ایم سر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے گرد کے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران میں نو وارد سرجن بھی تشریف رکھ چکا تھا۔ جی ایم سر نے چینی زبان میں اس سے چند باتیں کیں جو بالکل میرے پلے نہیں پڑیں البتہ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ مہمان سے میرا تعارف کرا رہے تھے۔ میرے لیے یہ بھی کسی انکشاف سے کم نہیں تھا کہ جی ایم سر فراٹے سے چینی بولتے تھے۔ ہر موڑ پر جی ایم سر کی شخصیت کا ایک نیا پہلو میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا اور مجھے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔

''یہ ڈاکٹر منگ ہیں۔'' جی ایم سر نے مہمان کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''منگ (Ming) بڑے پائے کے سرجن ہیں اور اس شعبے میں سو سال سے زیادہ کا تجربہ رکھتے ہیں۔''

''اگر ان کا سرجری کا تجربہ سو سال سے زیادہ کا ہے تو پھر ان کی عمر کتنی ہے؟'' میں نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سر کی جانب دیکھا۔

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوئے۔ ''آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے؟''

''میں نے تو ان کی عمر کا اندازہ سو کے آس پاس لگایا تھا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان کا تو پیشہ ورانہ تجربہ ہی میرے اندازے سے کہیں زیادہ نکلا.....''

''ہاں، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولے۔ ''منگ اس وقت اپنی عمر عزیز کے ایک سو چھیالیسویں سال میں ہیں۔ ان سے میری دوستی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے جیسے ہمارے دوستانہ تعلقات کو کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔''

''ہاں، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سر کا جملہ دہرا دیا۔ ''تعلق جتنا گہرا ہوتا ہے اس کی عمر اتنی ہی طویل محسوس ہونے لگتی ہے۔''

''ڈاکٹر منگ اپنا شجرۂ نسب منگ بادشاہوں کے خاندان سے جوڑتے ہیں۔'' جی ایم سر گہری سنجیدگی سے بتانے لگے۔ ''منگ بادشاہوں نے چودھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک چین پر حکمرانی کی تھی۔ آج کل بیجنگ کے شاہی قبرستان میں صرف ان کے مقبرے باقی ہیں۔''

''ہاں، میں نے ان چینی بادشاہوں کے بارے میں پڑھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ مکموپیتھی کے ماہر تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز بھی تھا۔''

''مثلاً کس قسم کی مکموپیتھی؟'' سر نے دلچسپ نظر سے مجھے دیکھا۔

''شہنشاہ جلال الدین اکبر جیسی مکموپیتھی سر۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جس طرح اکبر بادشاہ نے متحدہ ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں پر بیک وقت حکمرانی کرنے کے لیے مکموپیتھی کی سائنس استعمال کر کے اپنا ''دین اکبری'' بنا ڈالا تھا۔ بعین منگ بادشاہوں نے بھی اسی نوعیت کی سیاسی اور نفسیاتی سائنس استعمال کر کے تاؤازم، کنفیوشزم، بدھ ازم، اسلام اور رومن کیتھولک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے اس کے ماننے والوں کو بھائی بھائی کا درجہ دے دیا تھا یعنی بادشاہِ وقت ہر مذہب کو سچا مانتے تھے۔''

''تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔'' جی ایم سر نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اس شغل کو جاری رکھیں گے۔''

''سر! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''آپ کی باتوں پر عمل کرنا میرے لیے باعثِ فخر ہے لیکن فی الحال تو آپ میری ایک الجھن دور کریں۔''

ہمارے بیچ جاری بات چیت کے دوران میں ڈاکٹر منگ چپ چاپ بیٹھا ہماری صورتیں دیکھ رہا تھا۔ جی ایم سر نے پوچھا۔

''آپ کس الجھن کی بات کر رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر منگ کی آمد کا کیا مقصد ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ روٹین کی کوئی ملاقات تو ہو نہیں سکتی.....!''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ اثبات میں

Digitized by Google

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ واقعی کوئی ''ہیلو ہائے'' والی ملاقات نہیں ہے۔''

''پھر.....'' میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ یہاں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھانے آئے ہیں؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''اس ہٹ پر آپ ہیں یا پھر میں ہوں۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''ہم میں سے کس کی سرجری ہونے والی ہے؟''

''آپ کی.....!'' جی ایم سر کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مم.....میری.....؟'' میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میری الجھن کئی گنا بڑھ گئی۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''مجھے کیا ہوا ہے؟ میری سرجری کس سلسلے میں ہونے والی ہے؟''

''بہت ہی مائنر سی سرجری ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے ''نمبر دو'' کا جواب مانگا تھا یعنی.....سوسائٹی کے لوگ کس طرح اب تک آپ کو ٹریک کرتے رہے ہیں؟ آپ یہ راز جاننا چاہ رہے تھے نا.....؟''

''جی.....'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ سوسائٹی والے ایک بہت ہی طاقتور ٹریکنگ ڈیوائس کی مدد سے آپ کا سراغ لگایا کرتے تھے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''ایسی ٹریکنگ ڈیوائس جو آپ کے جسم میں موجود ہے لیکن آپ اس سے بے خبر ہیں۔''

''سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے تعجب خیز نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''آپ یہی سمجھ رہے تھے کہ کراچی والے بینا کے ساحلی اپارٹمنٹ میں ایلومینیم کی سیڑھی پر گرنے سے تمہارے پیٹ کے زیریں حصے میں کوئی چوٹ لگ گئی تھی اور آپ بے ہوش ہو گئے تھے۔ حالتِ بے ہوشی ہی میں میڈم ڈیلفینا کی ٹیم نے آپ کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور بعد ازاں آپ کو انٹارکٹیکا کے ایک جزیرے راس آئی لینڈ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں آپ کے زخم کی سرجری کر کے اس پر بینڈیج لگا دی گئی تھی۔''

''تو کیا ایسا نہیں ہوا تھا.....؟'' میں نے یقین سے عاری لہجے میں پوچھا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ پوری قطعیت سے بولے۔ ''ایلومینیم کی سیڑھی پر گرنے سے آپ کے پیٹ پر کوئی ہلکی پھلکی خراش ضرور آئی ہوگی لیکن وہ ایسا خطرناک زخم نہیں تھا کہ اس کی سرجری کرنا پڑتی۔ یہ آپریشن انہوں نے ٹریکنگ ڈیوائس چھپانے کے لیے کیا تھا۔ اسی ڈیوائس کی بدولت وہ لوگ آپ کی لوکیشن کا پتا لگا لیا کرتے تھے۔''

''او مائی گاڈ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ تسلی بھرے لہجے میں بولے۔ ''ڈاکٹر منگ ایک مائنر سرجری کے بعد آپ کو اس منحوس ڈیوائس سے نجات دلا دیں گے۔''

سی ویو کراچی والے بینا کے لگژری اپارٹمنٹ سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات میری چشمِ تصور کے سامنے ابھرنے لگے۔ راس آئی لینڈ والے ہٹ پر کایا نے میرے زخم کی بھرپور دیکھ بھال کی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''کیا کایا اس راز سے واقف تھی؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولے۔ ''اگر یہ بات کایا کے علم میں ہوتی تو وہ پہلی فرصت میں آپ کو اس ڈیوائس سے چھٹکارا دلا دیتی۔ یہ کام اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کیونکہ وہ خود بھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر کایا کو ڈیوائس کا راز معلوم ہوتا تو وہ بہ آسانی اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے آپ کو یہیں سے کہیں نکال لے جاتی۔ وہ سوسائٹی سے بغاوت کر چکی تھی اور اس بغاوت کی تحریک اس کے اندر آپ کی محبت نے جگائی تھی۔ کایا آپ کے ساتھ صد فیصد مخلص تھی لیکن سوسائٹی کے کرتا دھرتا نے اس کے باغیانہ خیالات کو سونگھ لیا تھا لہٰذا وہ ماری گئی۔ سوسائٹی کو اگر کسی کی وفاداری پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو وہ اسے ایسی ہی عبرت ناک موت دیتے ہیں۔ خیر.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئے پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر منگ صرف ایک گھنٹے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ پہلے ہمیں ضروری کام نمٹا لینا چاہیے۔''

میں ان کا اشارہ سمجھ گیا اور کہا۔ ''او کے سر!''

ابھی جی ایم سر نے بینا والے اپارٹمنٹ، کایا،

سوسائٹی اور ٹریننگ ڈیوائس کے حوالے سے جتنی بھی باتیں کی تھیں ان میں سے میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا مگر ان کا علم بالکل درست تھا۔ اب یہ انتہائی احمقانہ سوال ہوتا اگر میں ان سے پوچھتا کہ..... سر! آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ میں جس حد تک بھی ان کی شخصیت کو سمجھ پایا تھا اس کی روشنی میں میرا تجربہ اور مشاہدہ تو اسی امر کا متقاضی تھا کہ جی ایم سر ایک ''کرنی'' والے انسان تھے۔ وہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتے تھے۔

میں کسی معمول کے مانند جی ایم سر کے حکم کی تعمیل میں بستر پر دراز ہو گیا۔ اس دوران میں عمر رسیدہ مگر انتہائی چاق و چوبند ڈاکٹر منگ نے اپنا باکس کھول لیا تھا۔ یہ چھوٹے اٹیچی کیس کے سائز کا چوبی باکس تھا جس کے اندر آلات جراحی کے علاوہ مختلف اقسام کی ادویات کی بوتلیں اور ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے میری شرٹ اتروالی گئی تھی۔ میں چپ چاپ پڑا کمرے کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر اور سر کے بیچ چینی میں چند مکالمات ہوئے۔ اس کے بعد سر نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کو فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ منگ قدیم چینی طریقہ علاج کے قائل ہیں۔ یہ آج بھی جڑی بوٹیوں کی مدد سے وہ علاج کرتے ہیں کہ جدید میڈیکل سائنس بھی انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ منگ آپ کو بے ہوش کیے بغیر ٹریننگ ڈیوائس کو آپ کے پیٹ کے اندر سے باہر نکال لیں گے اور آپ کو تکلیف کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوگا اور سب سے مزے کی بات یہ کہ آپ یہ سارا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپریشن کے بعد کوئی تکلیف ہوگی؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ چند لمحات تک میری آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا آپ تکلیف سے گھبراتے ہیں؟''

ان کے سوال پر لمحے بھر کے لیے میں گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ہرگز نہیں۔''

''مجھے آپ سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''انسان جس چیز سے گھبراہٹ محسوس کرتا ہے وہ کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ تکلیف سے ڈرنے والے ہمیشہ دکھی رہتے ہیں اور موت سے خوف زدہ انسان ہر لمحہ مرتا رہتا ہے۔''

کل سے اب تک وہ کسی نہ کسی بہانے گھما پھرا کر موت کا ذکر ضرور کر رہے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کہا۔

''جی سر۔''

''اس لیے ضروری ہے کہ آپ جس چیز کو بھی شکست دینا چاہتے ہیں، پوری توانائی کے ساتھ ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ اس طرح وہ مفتوح ہو جائے گی اور آپ فاتح۔''

''آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں سر۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

اسی لمحے ڈاکٹر منگ ہمارے نزدیک آ گیا۔ یہ دیکھتے ہوئے جی ایم سر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ منگ نے ایک ڈبے میں سے شہد جیسی گاڑھی کوئی کالی دوا نکال کر میرے پیٹ کے زخم کے چاروں جانب دو انچ موٹے دائرے کی شکل میں لگا دی۔ میرے پیٹ کا زخم اس دوا کے سرکل کے اندر قید ہو گیا تھا۔ اگرچہ مذکورہ زخم پوری طرح بھر چکا تھا تاہم ٹانکوں کے نشانات ابھی باقی تھے۔

چند سیکنڈ کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیٹ کا وہ حصہ میرے بدن کا جزو نہیں رہا۔ منگ کے گاڑھے پینٹ نے یقیناً پیٹ کے اس حصے کو سن کر دیا تھا۔ اس کے بعد منگ کے ایما پر جی ایم سر نے میرے سر اور کندھوں کے نیچے دو تین تکیے لگا دیے۔ اس طرح میری گردن اتنی بلندی پر آ گئی کہ میں بہ آسانی منگ کی کارروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ تجربہ تھا۔

آئندہ دس منٹ کے اندر منگ نے میرے پیٹ کے مخصوص حصے کو چاک کر کے ایک چمٹی کی مدد سے پیٹ کے اندر سے ایک کیپسول نکال لیا۔ اس کیپسول کا سائز پانچ سو ملی گرام کے کیپسول سے تھوڑا زیادہ تھا اور وہ کسی ٹرانسپیرنٹ میٹریل کا بنا ہوا تھا کیونکہ اس کے اندر کا منظر بالکل واضح نظر آ رہا تھا اور یہ منظر سگنل لائٹ جیسا تھا۔ اس ٹرانسپیرنٹ کیپسول کے اندر موجود ٹریننگ ڈیوائس ریڈ سگنل دے کر اپنے ایکٹو ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ سگنلز برقی مقناطیسی لہروں کی مدد سے موسائٹی والوں کے ٹریکنگ سسٹم تک رسائی حاصل کر کے انہیں میری لوکیشن سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ساری کہانی روز روشن کے مانند میری نگاہ کے سامنے عیاں ہو گئی تھی۔

منگ نے انتہائی دیسی انداز میں اس پیسٹ نما دوا کو دھکیل کر میرے پیٹ کے زخم کا منہ بند کر دیا۔ آئیوڈیکس سے مشابہ اس گاڑھی لیس دار کالی دوا نے زخم کو اپنے اندر

چھپالیا۔ اس دوا کا رنگ تارکول کی طرح سیاہ تھا اور اس کے اندر سے بھینی بھینی خوشبو بھی اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔

اس مائنر سرجری سے فارغ ہونے کے بعد منگ نے مجھے آدھے کپ کے برابر کوئی محلول پلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد منگ اس ہٹ سے رخصت ہوگیا۔ سر اسے سی آف کرنے ہٹ کے داخلی دروازے تک گئے تھے جیسا کہ انہوں نے منگ کو ریسیو بھی کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئے اور بتایا۔ ''اس منحوس ٹریکنگ ڈیوائس کو میں نے سمندر کی لہروں کے حوالے کردیا ہے۔''

منگ نے مجھے جو محلول پلایا تھا اس نے مجھ پر نیند کی سی کیفیت طاری کرنا شروع کردی تھی۔

''آپ نے اس ڈیوائس کو ڈیفیوز تو کردیا ہے نا؟'' میں نے خواب ناک لہجے میں پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں، یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا۔'' وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے نزدیک بیٹھ گئے۔ ''لیکن میں نے ڈیوائس کو ایکٹیو حالت ہی میں سمندر برد کیا ہے تاکہ آپ کے دشمن مسلسل دھوکے میں رہیں۔ میں نے سوسائٹی والوں کے لیے ''دشمن'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ بہرحال وہ آپ کے دوست نہیں ہیں۔''

جی ایم سر سے میری پہلی ملاقات کراچی کے ایک ریجنل ٹی وی چینل پر ہوئی تھی۔ اس ٹریکنگ ڈیوائس کو ڈی ایکٹیویٹ یا ڈیفیوز کرنا گویا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

''اسد صاحب!'' ان کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''آپ کوشش کیجیے گا کہ آیندہ کبھی سوسائٹی والوں کے ہتھے نہیں چڑھنے پائیں۔ اگر شومیِ قسمت سے وہ آپ پر قابو پا بھی لیں تو ہر ممکنہ حد تک خود کو بیدار اور بہ قائمی ہوش وحواس رکھنا ہے کیونکہ ادھر آپ نے ذرا سی بھی غفلت برتی، ادھر انہوں نے آپ کے اندر کوئی اور ٹریکنگ ڈیوائس فٹ کردینا ہے۔ اب تو یہ مائیکرو چپ کی شکل میں بال کے سائز میں بھی دستیاب ہیں۔''

''جی، میں بے حد محتاط رہوں گا۔'' میں نے نحیف آواز میں کہا۔ ''مجھ پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔''

''یہ اس دوا کا اثر ہے جو منگ نے آپ کو پلائی ہے۔'' وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولے۔ ''تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ گہری نیند سو جائیں گے۔ یہ نیند کم از کم بارہ گھنٹے کی ہوگی اور زیادہ سے زیادہ دو دن کی لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب آپ اس نیند سے بیدار ہوں گے تو آپ کے پیٹ کا زخم ٹھیک ہوچکا ہوگا اور..... آپ کے حالات بھی ایک ڈھب پر آچکے ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے کیا کرنا ہے وہ میں آپ کو تفصیلاً سمجھا چکا ہوں۔ آپ کو وہ سب یاد ہے نا.....؟''

''جی!'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''اب آپ خود کو نیند کے حوالے کردیں۔'' وہ بڑے دلار سے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولے۔ ''انشاءاللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہر کام میں مالک کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ.....''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئے۔ میرے جی میں تو آئی کہ ان کی خواہش جاننے کی کوشش کروں لیکن باوجود کوشش کے بھی میں کچھ بول نہ سکا۔ منگ کی دوا نے شاید میری قوتِ گویائی سلب کرلی تھی تاہم میری سماعت ابھی تک کام کر رہی تھی۔ جی ایم سر کی مخصوص آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ ان کی زبان سے نہیں بلکہ کسی گہرے کنوئیں سے برآمد ہوتے محسوس ہو رہے تھے پھر بھی میرا ایم بیدار ذہن بہ آسانی ان کی بات کو سمجھ رہا تھا۔

''میں نے سوچا تھا، ایک آدھ روز کے لیے چین کے جنوبی صوبے گوانگ ڈونگ (Guang dong) جاؤں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہے تھے۔ ''گوانگ ڈونگ کے سب سے زیادہ آبادی والے شہر گوانگ ژاؤ (Guangzhou) میں ایک جلیل القدر عاشقِ رسولؐ اور خادمِ دینِ سعد بن ابی وقاصؓ کا مزار شریف ہے۔ میں ان کے مزار پر حاضری کی خواہش رکھتا تھا مگر ان صحابیِ رسولؐ کے مزارِ اقدس پر حاضری کے لیے میرے پاس وقت نہیں بچا.....'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوئے۔ اس کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بوجھل آواز میں کہنے لگے۔

''اب آپ مجھ سے یہ نہیں کہیے گا کہ میں کب سے وقت کا محتاج ہوگیا۔ جب میں نے آپ کو چھ ماہ بعد کے زمانے میں پہنچا دیا ہے تو پھر خود ایک جست بھر کر گوانگ ژاؤ کیوں نہیں جاسکتا؟ اسی چیز، اسی بے بسی اور اسی بے اختیاری کا نام تقدیر ہے اسد صاحب! انسان ''ٹائم اینڈ اسپیس'' کی سائنس پر قدرت حاصل کرنے کی لے پھر بھی اسے تائیدِ ایزدی کی ضرورت بہرحال رہتی ہے۔ مالک کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ کاش! انسان مالک کی مرضی کو سمجھ لے اور راضی برضا ہوجائے..... اے کاش.....!''

اس کے بعد بھی اگر جی ایم سر نے کچھ کہا تو وہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں کیونکہ میری سماعت سننے اور سمجھنے کے

قابل نہیں رہی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں نے خود کو شارو کے ساتھ دیکھا۔ ہم دونوں ایک سجے سجائے گھر میں موجود تھے۔ وہ گھر قدیم طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا جس میں زیادہ تر کام لکڑی کا ہوا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس وقت ہم دنیا کے کس ملک میں تھے، البتہ میرے محسوسات مجھے بتا رہے تھے کہ وہ یورپ کا کوئی شہر ہے جیسے پیرس، زیورخ، ایمسٹرڈیم، برلن، میونخ..... وغیرہ۔ بس، میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ شارو میرے ساتھ تھی اور اس گھر میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ رات کا وقت تھا اور گھر کے باہر بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس طرح جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ من و تو کا فرق باقی نہیں رہا تھا۔ وہ میری بانہوں کے حصار میں تھی مگر وقفے وقفے سے باہر کی طرف بھی دیکھ رہی تھی اور جب وہ ایسا کرتی تھی تو اس کے چہرے پر ایک بے نام سا خوف پھیل جاتا تھا اور یہ دیکھ کر میرا دل گھٹنے لگتا تھا۔

''کیا بات ہے شارو.....'' میں نے اس کی پیشانی پر ایک بھرپور بوسہ ثبت کرنے کے بعد پوچھا۔ ''اب تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ تم اتنی اداس کیوں نظر آ رہی ہو؟''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ.....'' وہ اپنا سر میرے سینے پر ٹکاتے ہوئے بولی۔

''کہ..... کیا؟''

''کہ ہم مل چکے ہیں.....''

''یہ ایک حقیقت ہے شارو۔ تمہیں اس کا یقین کرنا چاہیے۔'' میں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں ان کی قید سے آزاد کرا لیا ہے۔ اب ہم ایک ساتھ ہیں۔ جدائی کا زمانہ بیت گیا، یہ وصل کی گھڑیاں ہیں۔ ان لمحات کو انجوائے کرو۔''

''علی! ایک بات سچ سچ بتاؤ۔'' وہ میرے اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے.....؟''

''یہ خواب نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں اس سچائی کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔''

''میں تمہاری بات کا بھروسا کرتی ہوں علی۔'' وہ چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ''میں نے تمہارے ہجر میں ہر رات وصال کے خواب دیکھے ہیں اس لیے شاید میرا ذہن اس حقیقت کو آسانی سے تسلیم نہیں کر رہا۔''

''میں ابھی تمہارے ذہن کو تسلیم کراتا ہوں۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''بس، مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارا دل تو ہمارے ملن کو تسلیم کر رہا ہے نا؟''

''میرے دل سے تو تم کبھی جدا ہوئے ہی نہیں۔'' وہ جذب کے عالم میں بولی۔ ''میرے دل میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جس دن تم دل سے جدا ہو گئے، میں ایک پل، ایک لمحہ بھی نہیں پاؤں گی۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا پھر یکبارگی اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ پتا نہیں، میں کب کا پیاسا تھا۔ جب شارو کی سانس الجھنے لگی تو میں نے اپنی گرفت کو قدرے ڈھیلا کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا اب یقین آ گیا کہ ہم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے؟''

''ایسا تو تم ہر خواب میں کرتے ہو۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''بلکہ میرے نزدیک آتے ہی تم پر ایک جنون سا سوار ہو جاتا ہے۔''

''تم جسے میرا جنون کہہ رہی ہو یہ دراصل تمہاری محبت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری محبت میں پاگل ہو جاتا ہوں پھر مجھے تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔''

میں نے کہا تو وہ سراسیمہ انداز میں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اب کی بار میں نے بھی بے ساختہ اسی سمت نگاہ اٹھا دی اور پوچھا۔

''یہ تم بار بار باہر کی جانب کیوں دیکھ رہی ہو؟ تمہیں کس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے؟''

''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، یہ میرا واہم ہے یا یہ کوئی حقیقت.....!''

''یہ سراسر تمہارا واہم ہے شارو۔'' میں نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔ ''تم طویل عرصے تک مجھ سے جدا رہی ہو۔ شاید یہ اسی فراق کا اثر ہے۔''

''شاید!'' وہ بدستور کھڑکی کی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو، میں تمہارا واہم نکالتا ہوں۔'' میں نے اٹھ کر مذکورہ کھڑکی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

ہمارے گھر کی وہ کھڑکی باہر کی جانب کھلتی تھی یعنی وہاں سے ہم اپنی اسٹریٹ کا نظارہ کر سکتے تھے۔ تاہم اس وقت وہ کھڑکی بند تھی۔ میں نے بہ آہستگی چوبی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا پھر سڑک پر دور دور تک نگاہ دوڑائی مگر ہر

Digitized by Google

جانب مجھے بارش ہی نظر آئی یا پھر اسٹریٹ لائٹس دکھائی دیں۔ برستی بارش کا یہ نظارہ بڑا دلفریب تھا خصوصاً ملگجے اندھیرے میں اس کی دیدہ زیبی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کھڑکی میں کھڑے کھڑے اسی دلکش منظر کو دیکھتا چلا جاؤں لیکن پھر مجھے شارو کے خوف کا خیال آ گیا اور میں نے کہا۔

''شارو! ذرا یہاں آؤ۔''

''کیا ہے وہاں؟'' اس نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا تمہیں کوئی دکھائی دے رہا ہے؟''

''یہ ضروری نہیں کہ انسان کا ہر خدشہ حقیقت کا روپ دھار لے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اندیشوں کے جال سے ذہن کو باہر نکالنا پڑتا ہے۔ آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔''

''اس کا مطلب ہے، تم نے واقعی کسی کو دیکھ لیا ہے۔'' وہ متوحش انداز میں بولی۔ ''آخر میرا وہم ٹھیک ہی نکلا..... کون ہے وہاں؟''

''یہ جو کوئی بھی ہے، ہمارا دشمن نہیں ہے۔'' میں نے اس کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم اسے دیکھو گی تو مست ہو جاؤ گی۔''

''ایسا کیا ہے علی؟'' وہ میرے نزدیک پہنچ کر الجھن زدہ انداز میں بولی۔

میں نے کھڑکی کو پوری طرح وا کرتے ہوئے کہا۔ ''خود دیکھ لو۔''

اس نے سہمی ہوئی ہرنی کے مانند کھڑکی کے سامنے اور دائیں بائیں نگاہ دوڑائی پھر چونکنے انداز میں بولی۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے.....''

''میں تمہیں یہی دکھانا چاہتا تھا۔''

وہ میرے ساتھ چپکتے ہوئے بولی۔ ''مگر تم تو کہہ رہے تھے یہاں جو کوئی بھی ہے وہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔ یہ تم نے کس کے بارے میں کہا تھا؟''

''اس بے ایمان موسم کے شریر نظارے کے بارے میں کہا تھا۔'' میں نے کمر میں بازو ڈال کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا؟''

''میں نے تم سے دور رہ کر جدائی کے جو لمحات گزارے ہیں انہوں نے مجھے بہت کمزور کر دیا ہے۔'' وہ اپنی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے بولی۔ ''اب تو مجھے خود سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔''

میں نے کھڑکی بند کر دی اور اسے اپنے ساتھ بیڈ کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں آ گیا ہوں نا پھر کس بات کا ڈر؟''

''ہاں، اب مجھے کسی چیز کا خوف نہیں۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وعدہ کرو کہ پھر کبھی مجھ سے دور نہیں جاؤ گے۔''

''میں تو پہلے بھی تم سے دور نہیں گیا تھا۔'' میں نے اسے بستر پر پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو ہمارے دشمنوں نے ہمارے درمیان ہزاروں میل کے فاصلے حائل کر دیے تھے لیکن اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔''

''علی!'' وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''سب ٹھیک ہو گیا ہے نا.....؟''

اس سے پہلے کہ میں شارو کے سوال کا جواب دیتا، بیرونی دروازے پر دھیمی دستک سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''دیکھا..... میں نہیں کہتی تھی، باہر کوئی ہے۔''

''تم ادھر ہی رکو۔'' میں نے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں بولی۔ ''جو کوئی بھی ہے، ہماری طرف سے جواب نہ پا کر خود ہی واپس چلا جائے گا۔''

ڈور بیل کی موجودگی میں دروازے پر کسی کا دستک دینا مجھے ہضم نہیں ہوا تھا اور وہ بھی آدھی رات کو..... اس دستک میں ایک خاص قسم کی پراسراریت پائی جاتی تھی۔

یہ خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ اس دوران میں ایک بار پھر وہی دستک سنائی دی۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ میری سماعت کو دھوکا ہوا ہے۔ اس برساتی رات میں بھلا کون ہمارا دروازہ کھٹکھٹائے گا لیکن دوسری دستک نے مجھے ریڈ الرٹ کر دیا۔ یہ نہ تو میرا وہم تھا اور نہ ہی میری سماعت کا دھوکا۔ باہر دروازے پر کوئی موجود تھا۔

''یہ جو کوئی بھی ہے، ایسے نہیں ٹلے گا۔'' میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ادھر ہی ٹھہرو۔ میں اس کی سن کر آتا ہوں۔''

''میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔'' وہ مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اس بار اگر وہ تمہیں لے گئے تو میں پھر تنہا رہ جاؤں گی۔''

''وہ کون؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

Digitized by Google

''جنہوں نے اب تک ہمیں ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''میں تمہارے معاملات میں کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی۔ میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ ہم جہاں بھی جائیں گے، ایک ساتھ ہی جائیں گے۔''

اس کی یہ مطالبہ نما خواہش اگرچہ انتہائی طفلانہ تھی لیکن یہ بحث کا موقع نہیں تھا کیونکہ اس اثنا میں ایک بار پھر وہی دستک کی آواز ابھری تھی۔ باہر جو کوئی بھی تھا، تحمل مزاج اور ثابت قدم تھا۔ اس کی استقامت سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مجھ سے شرفِ ملاقات حاصل کیے بغیر وہ واپس نہیں جائے گا۔ اگر میں نے صبح تک بھی دروازہ نہ کھولا تو وہ وقفے وقفے سے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ میرے دروازے پر ''ٹھک ٹھک'' کرتا رہے گا۔

''ٹھیک ہے، ہم جہاں بھی جائیں گے، ایک ساتھ ہی جائیں گے۔'' میں نے شارو کی موجودہ ذہنی کیفیت کے پیش نظر مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''چلو، فی الحال ہم ایک ساتھ گھر کے داخلی دروازے تک چلتے ہیں.....''

پھر میں اس کے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر دروازے تک پہنچ گیا۔ شارو نے میری تقلید میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ میں نے آئی گلاس سے آنکھ لگا کر باہر کا جائزہ لیا۔ میری نگاہ کے دائرے میں ایک شخص دکھائی دیا۔ مذکورہ شخص نے فیلٹ ہیٹ لگا رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کوئی پیکٹ جبکہ دوسرے ہاتھ میں چھتری تھی۔ اس نے خود کو بارش سے بچانے کے لیے اپنے اوپر چھتری تان رکھی تھی۔ اس کا چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا تاہم شکل صورت سے وہ ایک معقول اور شریف انسان دکھائی دیتا تھا۔

میں نے دروازہ کھولنے کا فیصلہ کرلیا اور احتیاطاً پوچھ لیا۔

''تم کون ہو بھائی؟''

اس نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''سر! کوریئر سروس۔''

''کوریئر سروس!'' میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کے الفاظ دہرائے۔ ''اور وہ بھی برستی بارش میں آدھی رات کو؟''

''سر! ہمیں اپنے کلائنٹس کی خواہش کا احترام کرنا پڑتا ہے۔'' وہ بدستور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری کمپنی چوبیس گھنٹے سروس فراہم کرنے کی دعویدار ہے۔ آپ کی شپمنٹ دو گھنٹے پہلے بک کرائی گئی تھی اور کلائنٹ کی خواہش ہے کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے یعنی نئی تاریخ شروع ہونے سے پیشتر شپمنٹ ڈیلیور کردی جائے۔ کیا آپ مسٹر علی ہی بات کررہے ہیں..... اسد علی؟''

''ہاں، میں اسد علی ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سر! بارہ بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔'' وہ ملتجانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ جلدی سے اپنی شپمنٹ وصول کرلیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ اس طرح ہماری کوریئر کمپنی کا مان سلامت رہے گا اور میری جاب کے لیے بھی کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔''

میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے رکوع تک جھک کر میرا شکریہ ادا کیا پھر اپنے رجسٹر پر شپمنٹ کی وصولی کے دستخط لے کر وہ پیکٹ میرے حوالے کردیا۔ اس کے بعد وہ بیگ تھینکس ادا کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ چند سیکنڈ ہی میں وہ ایک سائڈ اسٹریٹ پر مڑ کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے دروازہ لاک کردیا۔

''بہت عجیب وغریب کوریئر والا تھا۔'' میں نے خود کلامی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کے پاس نہ کوئی گاڑی ہے اور نہ کوئی بائیک۔ بس، چھتری اٹھا کر دھواں دھار بارش میں آدھی رات کو ڈاک پہنچانے نکل کھڑا ہوا۔''

''تم صرف بائیک اور گاڑی کی عدم موجودگی پر حیران ہورہے ہو۔'' شارو نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''اس بے چارے کے پاس تو کوئی کمپنی بھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ذرا اس پیکٹ کو غور سے دیکھو۔'' وہ شپمنٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ساری بات خود ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔''

شارو کے توجہ دلانے پر جب میں نے اس پیکٹ کا جائزہ لیا تو میری حیرت اور الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اس پیکٹ پر صرف میرا نام اور گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں پر نہ کوئی تحریر تھی، نہ کوئی ٹکٹ اور نہ ہی کوئی مہر یا لیبل یا اسٹیکر حتیٰ کہ پیکٹ پر کوریئر کمپنی کا لوگو بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اس پیکٹ کو بھیجنے والے کا نام و پتا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک دستی پیکٹ تھا جو اس پر درج نام و پتے پر پہنچا دیا گیا تھا۔

''علی! اس پیکٹ میں کیا ہوسکتا ہے؟'' شارو نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو پیکٹ کو کھولنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پیکٹ کو کھولنے کا عمل شروع

Digitized by Google

کردیا۔

''اور اگر اس کے اندر کوئی خطرناک چیز ہوئی تو.....؟'' وہ متوحش نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''اس امر کا اندازہ بھی پیکٹ کھلنے کے بعد ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تم کلمہ پڑھ لو۔ ہوسکتا ہے، تمہاری دعا کی قبولیت کا وقت آگیا ہو۔''

''کون سی دعا؟'' اس کی آنکھوں میں استعجاب تیرنے لگا۔ ''اور یہ کلمہ کیا ہوتا ہے۔ میں کیا پڑھ لوں؟''

''کلمہ پڑھنے کا مطلب اور مفہوم میں بعد میں کسی وقت تمہیں سمجھاؤں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک تمہاری دعا کا تعلق ہے تو..... تم نے ''ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے'' کی خواہش کر رکھی ہے۔ اگر اس پیکٹ کو کھولنے کے بعد کوئی ہولناک دھماکا ہوا تو انشاءاللہ! ہم ایک ساتھ ہی دارِ فانی سے رخصت ہوں گے اور تمہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملے گا کہ کیا اتنی جلدی بھی دعا قبول ہوجاتی ہے.....''

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''ایسی بری باتیں زبان پر نہیں لایا کرتے۔''

''تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمیں ایک دن مرنا نہیں ہے؟''

''یہ بات نہیں علی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''موت کا تو ایک دن مقرر ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے قدم قدم پر یاد کیا جائے۔''

موت کو ہر لمحہ یاد رکھنا عین ضروری ہے لیکن میں اس وقت شارو سے کوئی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''اُف اوکے بنی۔''

پھر قبل اس کے کہ شارو میرے ہاتھ سے وہ پیکٹ چھین کر کھڑکی سے باہر اسٹریٹ پر پھینک دیتی، میں نے مذکورہ پیکٹ کو بہ سرعت کھول ڈالا۔ ریپر کے اندر سے ایک خوبصورت گتے کا مستطیل باکس برآمد ہوا جیسا کہ عموماً ٹیبل کیلنڈر رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ باکس کا رنگ سرخ تھا۔

کوئی دھماکا ہوا اور نہ ہی کوئی اور مہلک واقعہ پیش آیا۔ شارو نے حوصلہ پکڑتے ہوئے کہا۔

''علی! ذرا کھول کر دیکھو۔ اس باکس کے اندر کیا ہے؟''

شارو نہ بھی کہتی تو میں گتے کے اس سرخ رنگ کے مستطیل باکس کو ضرور کھولتا۔ میں نے اگلے چند لمحات میں مذکورہ باکس کا آپریشن کر ڈالا۔ باکس کے اندر ایک رول کیا ہوا آف وہائٹ پیپر تھا جس پر خوبصورت سرخ ربن بڑے سلیقے سے باندھا گیا تھا۔ میں نے ربن کو کھول کر پیپر کو سیدھا کیا تو چونک اٹھا۔ شارو بھی وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

اس پیپر کی پیشانی پر سرخ رنگ کا سوسائٹی کا مخصوص لوگو بنا ہوا تھا۔ خوف ناک تاثر پیدا کرتی ہوئی کھوپڑی، اس کے نیچے کراس کی شکل میں دو ہڈیاں اور سب سے نیچے نائٹ ٹیمپلرز والی تلوار۔ پیپر کے درمیانی حصے میں یہ سطریں درج تھیں۔

تمہیں سوسائٹی نے چن لیا ہے۔ مبارک ہو۔
کونسل میٹنگ آئندہ جمعرات کو ہوگی۔
وقت کی پابندی لازمی ہے۔

میرے ساتھ ساتھ شارو نے بھی اس تین سطری مختصر سے مضمون کو پڑھ لیا تھا۔ اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''علی..... یہ تو وہی لوگ ہیں..... ہیں نا؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو ذہن میں دو چیزیں گھوم رہی تھیں۔ ایک شارو، دوسری ''اسکل اینڈ بونز'' سوسائٹی۔ خواب میں، میں نے خود کو شارو کے ساتھ دیکھا تھا یعنی بالآخر میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ بڑا طمانیت بخش احساس تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے خود کو سوسائٹی کے برادر ہڈ کا حصہ بنتے دیکھا تھا جو کہ مجھے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں تھا۔ میں سوسائٹی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک خیال نے مجھے بے طرح بے چین کر دیا۔

میں اس وقت ویلنگٹن کے ایک ساحلی ہٹ میں موجود تھا اور اس ہٹ میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ جی ایم سر کے ایما پر ڈاکٹر منگ نے ایک مائنر سرجری کر کے میرے پیٹ میں سے ٹریکنگ ڈیوائس کو نکال دیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور بے ساختہ میرا ہاتھ پیٹ کے متاثرہ حصے پر چلا گیا۔ ڈاکٹر منگ نے وہاں جس مرہم کا لیپ کیا تھا، وہ سوکھ کر پپڑی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے اس پپڑی کو ہٹایا تو اس کے نیچے اپنے زخم کو بالکل ٹھیک پایا۔ اسی لمحے مجھے جی ایم سر کا خیال آیا اور میں بیڈ سے اتر کر سر کو تلاش کرنے لگا۔

وہ ساحلی ہٹ سر کے وجود سے خالی تھا۔ میں نے ہٹ سے باہر نکل کر بھی انہیں دور تک دیکھا اور آوازیں بھی دیں لیکن میری آواز ''صدا بہ صحرا'' ہی ثابت ہوئی۔ تھک ہار

Digitized by Google

کر میں واپس ہٹ میں آ گیا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ میرا گرو، ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ اب ان کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ تھیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم میرے لیے مشعلِ راہ تھی۔ میں کافی دیر تک خاموش بیٹھا بھاری دل کے ساتھ جی ایم سر کو یاد کرتا رہا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے خاتمے کی مجھے پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں نے ذہن بٹانے کے لیے ٹی وی آن کیا تو ایک اور حیرت نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا۔

یکم فروری کی دوپہر ڈاکٹر منگ نے میرا آپریشن کیا تھا اور میں اس کے پلائے ہوئے محلول کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا اور آج صبح لگ بھگ سات بجے میری آنکھ کھلی تھی اور دلچسپ بلکہ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ آج چار فروری کی صبح تھی۔ گویا، میں کم و بیش ڈھائی دن تک سوتا رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا اب تک کا سب سے زیادہ سونے کا ریکارڈ تھا۔

میں نے اپنا سامان چیک کیا تو پتا چلا کہ آج ہی مجھے نیوزی لینڈ سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے جلدی جلدی پیکنگ کی، نہا دھو کر تیار ہوا اور ہٹ کو الوداع کہہ کر ویلنگٹن سٹی پہنچ گیا۔ سب سے اہم اور ضروری کام ہیئر اسٹائل کی تبدیلی تھی۔ میں نے ایک سیلون میں جا کر اپنے بالوں کو کرلی کروایا۔ اب میں مکمل طور پر ڈاکٹر رافیل بن چکا تھا جو سیر و تفریح کے لیے نیوزی لینڈ آیا ہوا تھا اور اب واپس اپنے ہوم ٹاؤن بارسلونا جا رہا تھا۔ جی ایم سر نے میرے لیے بڑا زبردست بندوبست کیا تھا۔ انہوں نے یہ سب کیسے کیا، میں نے ان سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کیونکہ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ''کرنی والے'' تھے اور وہ کچھ بھی کر سکتے تھے..... کچھ بھی۔

میری فلائٹ کا ٹائم شام پانچ بجے کا تھا لیکن میں اڑان سے لگ بھگ پون گھنٹا پہلے کوانٹس انٹرویز کے بوئنگ سیون تھری سیون کے اندر سیٹل ہو چکا تھا۔ ویلنگٹن (نیوزی لینڈ) سے بارسلونا (اسپین) تک کل اکتیس گھنٹے اور پچیس منٹ کا سفر تھا جس میں دو اسٹاپ اوورز (بریک جرنی) بھی تھے۔ کوانٹس انٹرویز کی فلائٹ ون سیون ٹو صرف ویلنگٹن سے میلبورن تک تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک سرو قد البیلی حسینہ میرے نزدیک آ کر رکی۔ میں ونڈو سائڈ سیٹ پر براجمان تھا اور میرے برابر والی سیٹ خالی تھی۔ اس نے ہسپانوی لہجے والی انگلش میں مجھ سے کہا۔

''یہ سیٹ میری ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے خالی سیٹ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ وہ اگر اشارہ نہیں بھی کرتی تو میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی سیٹ کون سی ہو سکتی تھی کیونکہ میں تو سو فیصد اپنی ہی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور خوش اخلاقی سے کہا ''شیور.....''

اس کا قد چھ فٹ کے اریب قریب تھا اور عمر پچیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت عورت کا ویسے بھی ایک وبدبہ ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد کہ وہ حسن لاجواب کی بھی مالک تھی گویا شخصیت کے دبدبے میں رعب حسن کے بگھار نے اس کے سراپا میں چاندنی بھی بھر دی تھی۔

وہ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک ہینڈ بیگ تھا جیسا کہ ایگزیکٹو کے ہاتھ میں دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اس کے بیٹھنے کے عمل کے لیے ''کوشش'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ اس نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ خطرناک حد تک چست تھا۔ وہ مکمل لباس میں تھی مگر پوری کی پوری لباس سے باہر دکھائی دیتی تھی۔ تاہم اسے اس لباس کو پہننے اور برتنے پر ملکہ حاصل تھا لہٰذا وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی سیٹ پر فروکش ہو گئی۔ سفر چاہے کتنا بھی طویل کیوں نہ ہو، اگر اس سفر میں آپ کو کسی کا حسین ساتھ میسر آ جائے تو فاصلوں کی طوالت اپنے معنی کھو دیتی ہے۔ بلاشبہ وہ مرقع حسن و جمال تھی۔

وہ جب سے اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی، بار بار ونڈو سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی میرے دل میں کھد بدی ہونے لگی تھی۔ من اس سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''تمہیں ونڈو سائڈ پر بیٹھنا پسند ہے؟''

''ہاں!'' اس نے زبان کے ساتھ آنکھوں کو بھی بڑے دل آویز انداز میں حرکت دی۔ ''مجھے فطرت کے قریب رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ فضائی سفر کے دوران میں ونڈو سیٹ پر بیٹھ کر فطرت کے مظاہر کو بخوبی انجوائے کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر جب سفر بھی طویل ترین ہو.....''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا ''تمہاری منزل کہاں ہے؟''

''میں نے ابھی تک اپنی منزل کا تعین نہیں کیا۔'' وہ

گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''انسان جب تک بے منزل ہوتا ہے، وہ زیادہ خوش رہتا ہے۔''

میں نے تو یہی پڑھا اور سنا تھا کہ حسن اور عقل ایک جگہ نہیں رہ سکتے لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس دکھائی دے رہا تھا۔ اس دراز قد ساتھی مسافر کی خوب صورتی اور دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا اور وہ زندگی کے بارے میں بہت گہرا فلسفہ بھی بول رہی تھی۔ یہ میرے لیے قدرے حیرت کی بات تھی۔

''میرے پوچھنے کا مطلب تھا، تم کہاں جارہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''ابھی تو میں بارسلونا جارہی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مگر دو چار دن وہاں رکنے کے بعد میڈرڈ چلی جاؤں گی۔ میڈرڈ میرا ہوم ٹاؤن ہے۔''

''اوہ اچھا.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''بارسلونا تک تو تمہیں، مجھے برداشت کرنا ہی ہوگا!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں بارسلونا جارہا ہوں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جب تم لگیج کروا رہے تھے تو میں نے تمہارے سوٹ کیس پر لگا ٹیگ دیکھا تھا۔'' وہ بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بس مجھے پتا چل گیا کہ تم بھی بارسلونا ہی جارہے ہو اور پھر اتفاق دیکھو کہ بورڈنگ کے وقت ہمیں ایک دوسرے کے برابر کی سیٹیں بھی مل گئیں.....''

وہ دلفریب حسن کی مالک ہونے کے ساتھ ہی خاصی شاطر اور عیار بھی تھی۔ ویلنگٹن سے بارسلونا کسی بھی ایئر لائنز کی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں تھی۔ ہمیں ویلنگٹن سے میلبورن، میلبورن سے دبئی اور دبئی سے بارسلونا جانا تھا یعنی ہمارے اس سفر کے دوران میں دو اسٹاپ اوور بھی تھے اور ایئر لائن بھی تبدیل ہونا تھی لہٰذا میرے لگیج پر ایسا کوئی ٹیگ نہیں لگا ہوا تھا جس کا وہ ذکر کر رہی تھی۔ ہر ایئر لائن اپنا ٹریولنگ پروسس کرتی ہے۔ میرے ساتھ میرے لگیج کو بھی ہر بار اس پروسس سے گزرنا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ میرے ساتھ مائنڈ گیم کھیل رہی تھی۔ اس کی جانب سے ہوشیار ہوجانے کے بعد میں نے معصومیت سے کہا۔

''تم تو بہت ذہین ہو.....!''

''گراسیاس۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

وہ ہسپانوی میں میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتادو کہ تمہیں ونڈو سیٹ چاہیے یا نہیں؟''

''بالکل چاہیے۔'' وہ دھڑلے سے بولی۔ ''اگر تمہیں کوئی مشکل نہ ہو تو.....!''

''میرے ساتھ بہت ساری مشکلات ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر سیٹ تبدیل کرنے میں کوئی مشکل نہیں کیونکہ یہ جہاز نہ میرا ہے اور نہ تمہارا۔''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے اس کے لیے ونڈو سیٹ تک جانے کا راستہ ہموار کردیا۔ وہ اپنی سیٹ بیلٹ شفٹ ہونے کے بعد معنی خیز لہجے میں بولی۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ جہاز میری ملکیت ہے تو؟''

''تو میں تم سے بحث نہیں کروں گا لیکن دل میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم اول درجے کی جھوٹی ہو۔''

''وہ کیوں.....؟'' اس نے برق رفتاری سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ اگر یہ جہاز تمہاری ملکیت ہوتا تو تم اس وقت جہاز کے کسی آرام دہ پرائیویٹ کیبن میں سفر کر رہی ہوتیں۔ تمہیں عام مسافروں کے بیچ میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''تمہاری سوچ بڑی سطحی سی ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اس دنیا کے ننانوے فیصد افراد اسی انداز میں سوچتے ہیں۔''

اس نے میرے بڑی بھرپور چٹکی لی تھی۔ میں بھی کہاں خاموش بیٹھنے والا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی دلچسپی سے استفسار کیا تاہم میرے سوال میں اچھی خاصی کڑواہٹ بھی جھلکتی تھی۔

''اس دنیا کے ایک فیصد افراد میں شامل تم جیسے لوگوں کے سوچنے کا کیا انداز ہوتا ہے؟''

''میرے خیال میں کوئی بھی انسان خاص یا عام نہیں ہوتا۔'' وہ معتدل لہجے میں بولی۔ ''انسان کا کام اسے دوسروں کی نظر میں خاص یا عام بناتا ہے۔''

''خود کو اس جہاز کی مالکن ظاہر کرنے میں ایسی کون سی حکمت پوشیدہ ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اپنے اس عمل سے آپ مجھے کیا بتانا چاہتی ہیں؟ اگر واقعی یہ جہاز تمہارا ہے تو پھر اکانومی کلاس میں سفر کیوں اور وہ بھی اتنا طویل سفر.....؟''

''بعض اوقات اپنے مقام سے گرنے میں بڑا مزہ آتا

ہے۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ''نرم وملائم آرام دہ بستر کو چھوڑ کر زمین پر سونا اچھا لگتا ہے۔''

اس کے جواب نے پل بھر کے لیے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میری یہ طرح دار ہم سفر بڑی عجیب وغریب سوچ کی مالک تھی۔

''انسان کو اپنا مقام بنانے کے لیے برسوں محنت کرنا پڑتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ خود ہی اپنے مقام سے گرنے کی کوشش کیوں کرے گا اور وہ بھی وقتی مزے کے لیے، کسی عارضی فائدے کے لیے.....؟''

وہ جتنی طاقتور لائنیں بول رہی تھی اس سے ایک لمحے کے لیے مجھے یوں بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ بھی کسی ڈارک سوسائٹی کی پروردہ تو نہیں؟ اس سوچ نے مجھے حد درجہ محتاط بنا دیا اور میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''تو بس..... میں نے یقین کرلیا کہ تم اس جہاز کی مالکن ہو!''

وہ زیرلب مسکرا کر رہ گئی۔

کوانٹس کی فلائٹ دن سیون ٹو نے چار گھنٹے فضا میں محو پرواز رہنے کے بعد شام سات بجے ہمیں آسٹریلیا کے شہر میلبورن پہنچا دیا۔ سابی فارمولا کے تحت تو ہمیں نو بجے رات میلبورن میں لینڈ کرنا چاہیے تھا لیکن نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے مقامی وقت کا فرق یعنی دو گھنٹے مائنس کرنے کے بعد یہ سفر محض دو گھنٹے کا رہ گیا تھا۔ میلبورن میں تین گھنٹے پندرہ منٹ کا اسٹاپ اوور تھا۔ رات دس بج کر پندرہ منٹ پر ہم ایمریٹس ایئرلائنز کی ایئربس پر سوار ہوئے اور دبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ جس نے چودہ گھنٹے کی پرواز کے بعد اگلی صبح پانچ بج کر پندرہ منٹ پر ہمیں دبئی پہنچا دیا۔ اگرچہ جہاز نے پورے چودہ گھنٹے فضا کا سینہ چیرنے کا کام کیا تھا مگر آسٹریلیا اور یو اے ای کے مقامی وقت کے تفاوت سات گھنٹے نے بیچاری ایئربس اے۔ تھری اینی کی محنت کو آدھا کر دیا تھا۔ دبئی ایئرپورٹ پر ہمارا تین گھنٹے کا اسٹاپ اوور تھا۔ آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر ہمیں ایمریٹس ہی کی ایک دوسری ایئربس دبئی سے لے کر بارسلونا کے لیے روانہ ہوگئی۔

اس دوران میں ہمارے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میرے لیے اس کا ابتدائی تعارف بھی بڑا حیران کن تھا۔ دوران سفر میں، میں نے اس سے کہا تھا۔

''میرا نام ڈاکٹر رافیل ہے۔ میں بارسلونا سے ہوں اور وہیں کے ایک اسپتال میں کام کرتا ہوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اصولاً اسے میری بات کے جواب میں اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں وہ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ذرا مختلف انداز میں کوشش کی۔

''تم نے میڈرڈ کو اپنا ہوم ٹاؤن بتایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اسپین کے شہر میڈرڈ میں بیٹھ کر آسٹریلیا کی ہوائی کمپنی ''کوانٹس ایئرویز'' چلاتی ہو؟''

میں نے اس پر گہری چوٹ کی تھی۔ اس نے ذرا سا بھی برا نہیں منایا اور عام سے لہجے میں بولی۔

''وہ تو میرے مذاق کیا تھا۔''

''گڈ جوک!'' میں نے ستائشی مگر طنز بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم جو بھی کرتی ہو، کمال کرتی ہو مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ادھر میڈرڈ میں تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟''

وہ بے ساختہ بولی۔ ''ایسٹوئی پورٹو گریفو۔''

وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ''فحش نگاری'' اس کا پیشہ تھا۔ وہ عریاں فوٹو گرافی کی ماہر تھی۔ اس کے جواب نے مجھے اندر باہر سے ہلا... کر رکھ دیا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ میں ڈاکٹر رافیل تھا اور بارسلونا کا باشندہ تھا۔ اس کے پیشے کے بارے میں جان کر مجھے دماغی جھٹکا نہیں لگنا چاہیے تھا۔ مغربی دنیا خصوصاً یورپ ہر قسم کے آرٹ میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور پورنوگرافی یعنی ''فحش نگاری'' کو بڑا طاقتور اور متاثر کن آرٹ مانا جاتا ہے۔

''ونڈرفل!'' میں نے خوش دلی سے اس کی تعریف کی۔

''میں نے میڈرڈ کی یونیورسٹی ''ڈی لاویدا'' سے اس فن کی تعلیم حاصل کی ہے۔'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بتانے لگی۔ ''لاویدا (La vida) بہ معنی ''دی لائف'' میں بڑے زبردست علوم وفنون سکھائے جاتے ہیں۔ آج کل تو میں میڈرڈ میں اپنا ایک اسٹوڈیو چلا رہی ہوں۔ میں اپنے ایک فوٹو شوٹ کے سلسلے میں نیوزی لینڈ آئی ہوئی تھی۔''

''تم سے مل کر اور تمہارے بارے میں جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے اخلاقیات کے تقاضے نبھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو ایک عظیم فنکار ہیں۔''

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں مناسب طور پر اپنا تعارف نہیں کرا پاتی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں خود کو جیسا سمجھتی ہوں اگر وہ لوگوں کو بتاؤں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''مجھے بتاؤ، تم خود کو کیا سمجھتی ہو؟'' میں نے اس کی

Digitized by Google

ذات میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، تمہارا تعارف میری عقل میں اتر جائے۔''

''میں..... میں.....'' اس نے ایک گہری سانس لی پھر ونڈو سے باہر بادلوں کو دیکھتے ہوئے خلا سے جذباتی لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''میں آسمان ہوں، میں زمین ہوں، میں سورج ہوں، چاند ہوں، ستارہ ہوں۔ میں خود ہوں، باقی ساری [illegible]

''روماتل!'' میں نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ تمہارا اصل نام ہے؟''

''ہاں!'' اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''روماتل توریز۔''

''وہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم ایسٹ اور ویسٹ کا کمبو ہو؟''

دراصل ''روماتل'' ترکش زبان کا لفظ تھا اور ''توریز'' خالصتاً اسپینش تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا باپ ترکی سے اسپین آیا تھا اور میری ماں کا تعلق میڈرڈ سے تھا۔ دونوں کی شادی ہوگئی۔ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی محبت کی نشانی ''روماتل توریز'' زندہ ہے۔ تم جانتے ہو، اس میں میرا کوئی کمال نہیں.....!''

''میں واقعی نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''انسان خود کو تاریخ میں زندہ رکھنے کے لیے عظیم الشان عمارتیں اور پل تعمیر کراتا ہے اور نہ جانے کون کون سے جتن نہیں کرتا لیکن یہ سب فضول ہے۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ ''کائنات کی تاریخ میں زندہ رہنے کا سب سے سیدھا اور سادہ سا فارمولا ہے..... محبت! محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور محبت کرنے والے بھی۔ اسی لیے میں محبت میں غرق ہوں۔ فطرت سے محبت کرنا میرا جنون ہے۔ کاش! میں فطرت کے رنگ میں فطرت کی محبت کے تقاضے پورے کرسکتی.....!''

اس کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''روماتل! کیا تم ابھی فطری زندگی نہیں جی رہی ہو؟''

''کسی حد تک جی رہی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن رافیل، میں مکمل طور پر فطرت سے ہم آہنگ ہوکر زندگی کی محبت اور لذت کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔''

''ابھی اس ''ہم آہنگی'' میں کون سی کمی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جاننا چاہتے ہو.....؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر تم بتانا چاہو تو ضرور۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''سیدھا سا جواب ہے کہ انسان جس حالت میں پیدا ہوتا ہے، اسے ویسے ہی زندگی گزارنا چاہیے۔'' وہ ایک ہندی سنگیت پر رقص کرتے ہوئے بولی۔ ''مگر مجھے نہیں لگتا، میری یہ تمنا کبھی پوری بھی ہو۔''

پرفیوم پرفیوم گرافیر روماتل توریز بے لباس زندگی گزارنے کی خواہاں تھی۔ لباس کا تکلف اسے پسند نہیں تھا۔ ایسی ناقدری چشم فلک نے کاہے کو دیکھی ہوگی۔

بعد ازاں روماتل نے اپنے لیپ ٹاپ پر مجھے، اپنے چند فن پارے بھی دکھائے۔ اگر عریانیت کے فیکٹر کو ایک طرف رکھ کر بات کی جائے تو وہ فوٹو گرافی واقعی لاجواب تھی۔ اس فن کے حوالے سے روماتل قابلِ تعریف تھی۔ اس نے اپنے ماڈلز کو شوٹ کرتے ہوئے ایسے ایسے اینگلز استعمال کیے تھے کہ بے لباس ہونے کے باوجود بھی ماڈل شیڈ کے باعث عریاں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

دبئی سے بارسلونا تک ہم سات گھنٹے میں آئے تھے۔ ''ایل پریٹ ڈی لوبریگاٹ'' بارسلونا کا دنیا کے خوبصورت ایئرپورٹس میں سے ایک ہے۔

وقتِ رخصت میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ روماتل کی جانب بڑھایا تو وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔

''نو..... اس کی ضرورت نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھے اپنا کارڈ چاہے نہ دو لیکن میرا تو رکھ لو۔''

''میں نہ تو تمہارا کانٹیکٹ لوں گی اور نہ ہی تمہیں اپنا کانٹیکٹ دوں گی۔'' وہ قدرے رکھائی سے بولی۔ ''جس طرح آج ہم اتفاق سے ملے ہیں، اگر زندگی نے وفا کی تو آئندہ بھی ایسے اتفاقات پیدا ہوتے ہی رہیں گے۔''

ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ روماتل کی بداخلاقی تھی لیکن میں اسے بداخلاقی نہیں کہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں، یورپ کے لوگ بڑے اصول پرست اور صاف گو ہوتے ہیں۔ انہیں جو کہنا ہوتا ہے، بغیر لگی لپٹی کہہ ڈالتے ہیں۔

Digitized by Google

میں نے بھی روماتل کی اس ادا کا برا نہیں منایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اٹس اوکے!''

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا پھر اس انداز میں جانے کے لیے مڑ گئی جیسے ہمارے بیچ کبھی شناسائی کا ایک لمحہ بھی نہ گزرا ہو۔ میں ایئرپورٹ سے باہر نکل آیا۔

''مالک! آپ نے اپنی دنیا کو سجانے کے لیے پتا نہیں، کس کس مزاج کے لوگ پیدا کر رکھے ہیں۔''

☆☆☆

میں میسونک لاج (Masonic Lodge) کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ لاج ییل یونیورسٹی کے الگ تھلگ حصے میں بنا ہوا تھا اور ٹومب کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ یہ لاج ایک بڑے سے ہال پر مشتمل تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا گنبد بنا ہوا تھا۔ ییل (Yale) یونیورسٹی ہمیشہ سے علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے اور یہ ٹومب سوسائٹی کی سرگرمیوں کا مرکز و محور۔

لاج کا چوبی منقش دروازہ دل پر ہیبت طاری کر دینے والا ایک دیو قامت دروازہ تھا۔ گہرے سبز رنگ کے اس عظیم الجثہ دروازے پر مربع شکل میں منقش ڈیزائننگ کی گئی تھی۔ لمبائی کے رخ پر آٹھ اور چوڑائی کے رخ پر چھ مربع بنے ہوئے تھے اور ہر مربع کے اندر کوئی خاص تصویر یا نقش کندہ کیا گیا تھا۔ کائی رنگ کے اس منقش چوبی دروازے کا سائز اتنا بڑا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا انسان خود کو بونا محسوس کرنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ کی پشت سے تین بار مخصوص انداز میں چوبی دروازے پر دستک دی تو وہ دروازہ کھل گیا۔ میں لاج کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اونچی، گنبد کی گول چھت والا ایک وسیع و عریض ہال تھا جہاں اس وقت نیم تاریکی کا راج تھا۔ ہال کے مختلف کونوں کھانچوں میں چند ایک لائٹس آن تھیں تاہم وہ ہال کو روشن کرنے میں مکمل طور پر ناکام تھیں اور ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ اس قسم کی سیٹنگ نے اس ہال کے ماحول کو انتہائی پراسرار بنا دیا تھا۔

میرے علاوہ لاج میں کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان سب کو بھی خوشخبری والا دعوت نامہ بھیج کر بلایا گیا تھا۔ ہمیں سرخ گاؤن پہنانے کے بعد چند ضروری ہدایات دی گئیں۔ گولائی کی شکل والے اس ہال کے وسط میں کشادہ قطر والا ایک دائرہ بنا ہوا تھا جس کے اندر ایک چھوٹے دائرے میں ڈیوڈ اسٹار یعنی چھ کونوں والا داؤدی ستارہ بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ عبرانی زبان کے الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔ ستارہ داؤدی والے دائرے میں سے لائنیں نکل کر بڑے دائرے کے آخری کنارے تک جاتی تھیں جو بڑے دائرے کو سنگترے کی پھانکوں کی طرح تقسیم کر دیتی تھیں۔ یہ بڑا دائرہ پنیر کے سلائس کی ساخت میں سولہ حصوں میں بٹ گیا تھا۔ دائرے کے باہر ہر حصے کے سامنے ہمیں گھٹنوں کے بل نیم سجدے کی حالت میں بٹھا دیا گیا۔

ہمارے عقب میں سوسائٹی کے سینئر ممبرز سیاہ گاؤن پہنے کھڑے تھے اور انہوں نے اپنے ہاتھوں میں روشن موی شمعیں تھام رکھی تھیں۔ ہم ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ ہمیں گردن جھکا کر خاموش بیٹھنے کی ہدایت تھی۔ ہمیں اس پوزیشن میں بیٹھے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ ہال میں ایک بارعب آواز گونجنے لگی۔

''سب سے پہلے تمہیں اس بات کی مبارک دی جاتی ہے کہ آج سے تم سوسائٹی کا حصہ ہو۔ نہایت ہی خوش قسمت لوگ اس عظیم مقصد کے لیے چنے جاتے ہیں۔ لگ بھگ ایک سو اسی سالوں سے ہمارا مشن جاری ہے اور سوسائٹی کے ممبرز میں اس دنیا کے عبقری افراد شامل ہیں۔ اس دنیا کے اصل حکمراں ہم ہی ہیں۔ ہم سب ایک ہیں..... ہم بونز مین ہیں اور ہم اسکل کے فرماں بردار ہیں۔ ہم بونز ہمیشہ متحد رہیں گے اور اپنے اسکل کے وفادار بھی۔ اسی میں ہماری کامیابی اور بقا ہے۔''

میں خاموشی اور توجہ سے اس متاثر کن آواز کو سن رہا تھا۔ یقیناً وہ ماسٹر ڈگری رکھنے والا کوئی بڑا تھا۔ سوسائٹی میں تھرٹی تھری ڈگری سب سے اونچی ڈگری تصور کی جاتی تھی۔ یہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ممبر کمانڈنگ پوزیشن میں آجاتا تھا۔ ڈیلفینیا اسی ڈگری کی حامل تھی۔

''اس پہلی میٹنگ میں آپ کو ''برادرہڈ'' کی حقیقت اور مفہوم سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ ''تاکہ تمہارے ذہن ہر قسم کی الجھن سے پاک ہو جائیں۔ سوسائٹی کا ابتدائی تعارف آپ کے ذہنوں کو صاف و شفاف کر دے گا اور آپ لوگ اپنے مقصد حیات کو بخوبی پہچان لو گے۔ اس بات کا یقین رکھو کہ ہم انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔''

ہم سب چپ چاپ بیٹھے وہ لیکچر سن رہے تھے۔ کسی کو سوال کرنے کی اجازت تھی اور نہ ہی ہمت۔

''یہاں سے جانے کے بعد آپ کا کام شروع ہو جائے گا۔ آپ کی مثال ایک شیفرڈ کی ہوگی۔ جس طرح

شیفرڈ (چرواہا) ہر لمحہ اپنی آنکھیں اور دماغ کو بیدار رکھتا ہے۔ بالکل ویسے ہی آپ سب نے بھی ریڈ الرٹ رہنا ہے۔ شیفرڈ کو اپنی ایک ایک بھیڑ اور بکری کی خبر ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ نے بھی اس کرۂ ارض پر بسنے والے سات بلین افراد پر کڑی نظر رکھنا ہے اور بنی نوع انسان کو ہر قسم کے خطرات سے بچانا ہے۔ اس وقت یہ کرۂ ارض کئی قسم کی آفاقی دھمکیوں کے نشانے پر ہے۔ اگر یہاں بسنے والے انسانوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو نسلِ انسانی کسی بہت بڑی تباہی سے دوچار ہوجائے گی۔ ہم سب نے مل کر اس کرۂ ارض اور اس پر موجود تمام انسانوں کی حفاظت کرنا ہے۔''

چند لمحات کے توقف کے بعد وہ آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔

''لوگ سمجھتے ہیں، اس کرۂ ارض پر دو سو سے زیادہ ممالک پائے جاتے ہیں۔ جو ایسا سوچتے ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔ ہم ون ورلڈ کے قائل ہیں اور ہم نے لوگوں کو یقین دلانا ہے کہ یہ کرۂ ارض صرف ایک دنیا، ایک ملک ہے جس کے حاکم ہم ہیں لہٰذا یہاں پر صرف اور صرف ہمارا حکم چلے گا۔ چند ماہ کی ٹریننگ میں آپ کو رموزِ حکمرانی سکھا دیے جائیں گے۔ جب آپ لوگوں کی تربیت مکمل ہوجائے گی تو پھر آپ سوسائٹی کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ آپ میں سے ہر کوئی اہم ہے۔ سوسائٹی کے ہر ممبر کے کندھے پر اس کرۂ ارض کو بچانے کی ذمہ داری ہے اور یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ اس دنیا کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں اور وہ بھی پورے اختیارات کے ساتھ اور یہ اختیارات سوسائٹی آپ کو دے گی۔ جب آپ اپنی پوزیشن پر کام کر رہے ہوں گے تو آپ کو یہی محسوس ہوگا..... آپ اس کرۂ ارض کے مالک و مختار ہیں.....''

ان الفاظ نے میرے اندر بے چینی بھر دی۔ وہ صریحاً کفر بک رہا تھا۔ ایک انسان بھلا مالک و مختار کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے جی میں آئی کہ ایک جھٹکے سے اٹھوں اور لاج سے نکل جاؤں لیکن باوجود چاہنے کے بھی میں ایسا نہ کرسکا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نادیدہ طاقت نے میرے حواس کو معطل کردیا ہو۔

''مالک و مختار یعنی زمینی خدا والی بات آپ میں سے بعض کو ہضم نہیں ہو رہی ہوگی۔'' وہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو مجھے یونہی محسوس ہوا کہ اس نے میری سوچ کو پڑھ لیا ہے۔ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں۔ تربیت کے دوران میں آپ کی ہر الجھن دور کردی جائے گی پھر آپ کا ذہن کسی بھی بات پر کھٹکے گا نہیں اور جب آپ کے اشاروں پر مختلف حکومتیں بننے اور بگڑنے لگیں گی۔ پوری دنیا میں گولڈ کے ریٹ آپ سے پوچھ کر طے کیے جائیں گے۔ اسٹاک مارکیٹیں آپ کے اشارۂ ابرو کی منتظر ہوں گی۔ دنیا کے تمام اسٹیٹ بینک تمہارے مقروض ہوں گے اور ان ملکوں کی حکومتیں ہر وقت تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں گی حتیٰ کہ فیڈرل ریزرو بینک جیسا طاقتور مالیاتی ادارہ بھی آپ کی مرضی کے بغیر ایک ڈالر کا نوٹ بھی نہیں چھاپ سکے گا تب آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کی مرضی کے بغیر اس دنیا میں ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس دنیا کا ہر انسان آپ کا محتاج ہے۔ آپ انسانوں کے حاجت روا ہیں۔ اس وقت آپ کو اپنی اہمیت کا بخوبی ادراک ہوجائے گا۔''

اس کی وضاحت اگرچہ منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی کیونکہ اس وقت دنیا میں کم و بیش یہی کچھ ہو رہا تھا اور مستقبل قریب میں یہ سب انتہا درجے تک پہنچ سکتا تھا گویا وہ لوگ اپنے ''ون ورلڈ ایجنڈا'' کو بروئے کار لانے کے لیے پوری طرح سرگرم ہوچکے تھے۔ سوسائٹی کے اعلیٰ عہدے دار کی تقریر جاری تھی۔

''تربیت کی تکمیل کے بعد آپ لوگوں کو ایوارڈز اینڈ ریوارڈز بھی دیے جائیں گے مگر وفاداری شرط ہے۔ بے وفائی کو کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائے گا چاہے بے وفائی کوئی کونسل ممبر کرے یا تھرٹی تھری ڈگری کا حامل کوئی ماسٹر۔ بے وفائی کی سزا دردناک موت ہے اور کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جو سوسائٹی ایک انسان کو خدائی طاقت سے نواز سکتی ہے، وہ پلک جھپکتے میں اسے خاک میں بھی ملا سکتی ہے۔''

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا تکبر اور کروفر پایا جاتا تھا جیسے اگر کسی نے اس کے احکامات سے سرتابی کی تو وہ ابھی اسے الٹا لٹکا کر اس کی کھال کھینچ لے گا۔

''صرف سوڈن کی ابتدائی ٹریننگ ہے جس کے لیے آپ میں سے ہر ایک کو سو ہزار یو ایس ڈی (امریکن ڈالرز) بطور وظیفہ دیے جائیں گے یعنی ایک ہزار ڈالر روزانہ کے حساب سے۔'' اس نے مدعو مین کی نیندیں اڑانے کا عمل شروع کردیا۔ ''یہ آپ کی پاکٹ منی ہے۔ خوب کھاؤ پیو، عیش کرو اور مزے اڑاؤ۔ جب آپ لوگوں کی ٹریننگ مکمل ہوجائے گی اور آپ میں سے جو جو امتحان پاس کرلے گا وہ سوسائٹی کا لیگل ممبر بن جائے گا۔ لیگل ممبر یا فل ممبر کو گرانڈ

لاج کے آرڈر سے ابتدا میں دو ملین یو ایس ڈی ماہانہ دیے جائیں گے تاکہ وہ معاشرے میں اپنے اسٹیٹس کو برقرار رکھ سکے۔ دو ملین یو ایس ڈی کی یہ رقم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو لیگل ممبر کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی جائے گی جسے استعمال کرنے کے لیے اسے سوسائٹی سے پوچھنا نہیں پڑے گا۔ اس دولت پر ممبر کو پورا اختیار ہوگا۔ سوسائٹی کی بس ایک ہی ڈیمانڈ ہے..... وفاداری!''

وفاداری کا ذکر کرتے ہوئے اس کے الفاظ میں سنگین دھمکی عود کر آئی تھی۔ اس کی دی ہوئی پیشکش میں ایک عجیب سا نشہ تھا۔ دو ملین یعنی بیس لاکھ امریکی ڈالرز ماہانہ تنخواہ کوئی کم اماؤنٹ نہیں ہوتا۔

''اب آپ سے سو دن کے بعد دوبارہ کلام ہوگا۔''

اس نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا۔ ''لیکن آپ لوگوں کی تربیت کا آغاز آج ہی سے ہوجائے گا۔ سب سے پہلے آپ لوگوں کی انا کو ختم کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں سینئر ممبرز آپ کی راہنمائی کے لیے یہاں موجود ہیں۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ ایگو (انا) انسان کا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ جو انسان اپنی انا کو ختم نہیں کرسکتا، اسے زندگی میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ انا انسان کے اندر بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ یہ انسان کو سرکشی پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے بعد انسان نمک حرام ہوجاتا ہے یعنی وہ بے وفائی کا ارتکاب کرتا ہے اور..... بے وفائی چاہے کسی بھی قسم کی ہو، سوسائٹی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ دیٹس آل!''

آواز آنا بند ہوگئی۔ ماسٹر ڈگری رکھنے والے اس ممبر کا خطاب ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سینئر ممبرز ہمیں اپنے ساتھ ایک گول اکھاڑا نما جگہ پر لے گئے۔ مذکورہ اکھاڑا قدرے نشیب میں زمین کے اندر ایک گڑھے کی صورت بنا ہوا تھا جس کے اندر سرخ رنگ کی کیچڑ بھری ہوئی تھی۔ گول اکھاڑے کے گرد ماربل کے گول ستون ایستادہ تھے، جن کے اختتام پر گول ہی شکل کی بالکونی بنی ہوئی تھی جس میں سینئر ممبر کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ سب سوٹڈ بوٹڈ تھے اور انہوں نے فیلٹ ہیٹ لگا رکھے تھے۔ وہ اس گول بالکونی میں کھڑے ہوکر اکھاڑے میں ہونے والے تماشے کو انجوائے کرنا چاہتے تھے۔

ایک سینئر ممبر نے ہمیں سمجھایا کہ اس اکھاڑے کے اندر سب کو بے لباس اترنا ہوگا پھر ایک دوسرے کے بدن پر یہ کیچڑ ملنا ہوگی۔ اس کے بعد دو دو افراد آپس میں زور آزمائی کریں گے۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

2018ء کے آخری
شمارے کی یادگار کہانیاں

اولین صفحات
محتاط پسند کھلاڑیوں کا وہ کھیل جس میں معمولی سی بداحتیاطی نے بازی کو پلٹ ڈالا.....
دوستی، عنایت اور لالچ کے شرارے.....

انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ
زندگی کی رنگینی کو بے رنگ کردینے والے عوامل، سرورق کی تیکھی کہانی
لالچ..... انتقام اور رقابت کا سنگین امتزاج..... سرورق کا رنگ

چٹی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

''تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ تمہارا تعلق ایک ہی ''برادر ہڈ'' سے ہے لہٰذا تمہیں اپنے دوسرے بھائیوں کا خود سے زیادہ خیال رکھنا ہے۔ اپنے بھائی کی جیت کے لیے خود کو ہرانا ہے۔ اس زور آزمائی میں ہر ایک کی یہ کوشش ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مدمقابل بھائی سے ہار جائے۔ اس طرح بالآخر تم سب جیت جاؤ گے۔ یہی کامیابی کا سب سے بڑا گر ہے۔''

ہم میں سے کسی نے چوں نہیں کی اور سب لباس اتار کر اس اکھاڑے میں اتر گئے۔ اگلے ہی لمحے ہم نے دو دو افراد کی ٹیمیں بنالیں اور سینئر ممبر کی ہدایت کے مطابق ہم ایک دوسرے کے بدن پر وہ سرخ کیچڑ ملنے میں مصروف ہوگئے۔ اس وقت ہمیں اپنی برہنگی کی مطلق پروا نہیں تھی۔ اوپر گیلری نما بالکونی میں کھڑے لوگ ہماری ان اوٹ پٹانگ حرکتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کے بے ہنگم قہقہے مسلسل ہماری ساعتوں تک رسائی حاصل کر رہے تھے لیکن نہ تو ہمیں ان کی ہوٹنگ پر غصہ آرہا تھا اور نہ ہی اپنی بے پردگی پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا، ہم کسی تنویمی عمل کے زیر اثر یہ سب کر رہے تھے۔

وہ سرخ کیچڑ بھی بڑی عجیب قسم کی تھی۔ اس میں ایک خاص نوعیت کا چپچپا پن پایا جاتا۔ ذہن کہہ رہا تھا کہ اس کیچڑ کی تیاری میں دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانی خون بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن ان لمحات میں یہ احساس کسی ناپسندیدہ ردعمل کے لیے اکسا نہیں رہا تھا۔ شاید ہمارے لاشعور میں یہ بات نقش کردی گئی تھی کہ انا کو مارنے کا یہ پہلا ٹیسٹ ہے۔ اگر ہم اپنے کسی فوری ردعمل کے نتیجے میں اس ٹیسٹ میں فیل ہوگئے تو ووٹمین یو ایس ڈی ماہانہ کی نوکری ہاتھ سے نکل جائے گی.....

سب کچھ نارمل چل رہا تھا کہ بالکونی میں کھڑے سینئر ممبرز کی ایک بے ہودہ حرکت نے میرے ضبط کا بند توڑ ڈالا۔ اس وقت ہم سب کیچڑ میں لت پت تھے اور اپنے ساتھی کو جتوانے کے لیے بار بار خود ہی سرخ کیچڑ میں گر رہے تھے۔ تماشائی ہماری ان حرکتوں سے دل کھول کر انجوائے کر رہے تھے اور حسب توفیق ریمارکس بھی پاس کر رہے تھے۔

دل کھول کر ان کے انجوائے کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب انہوں نے اپنی پتلونیں کھول کر ہم پر سوسو کرنا شروع کیا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اپنے اپارٹمنٹ میں بیڈ پر لیٹا تھا۔ میرا پورا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی واہیات خواب دیکھا تھا مگر کیوں.....؟

آج بارسلونا میں میری پہلی رات تھی اور دن جمعرات کا گزرا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ویلنگٹن والے ساحلی ہٹ میں بھی سوسائٹی کے دعوت نامے والا خواب دیکھا تھا جب میں اور شارو یورپ کے کسی شہر میں تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں سوسائٹی میں اپنی شمولیت کے بارے میں ایسے خواب کیوں دیکھ رہا تھا۔ کایا کی موت کے بعد تو میں نے سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا تھا۔ میں تو کسی بھی قیمت پر سوسائٹی کو جوائن کرنے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا پھر یہ خواب کس سلسلے کی کڑیاں تھے؟

میں جس قدر سوچتا گیا، میرا ذہن الجھتا گیا۔ سب سے پہلے پریسٹن ہالو (ڈیلس) والے بنگلے پر ڈیلفینا نے مجھے سوسائٹی میں شمولیت کی سیدھی سادی دعوت دی تھی۔ اگر میں اپنی روح سوسائٹی کے پاس گروی رکھوا دیتا تو مجھے زمینی خدا بنا دیا جاتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سوسائٹی شیطان کے ایجنڈے پر کام کرتی ہے۔ اسی لیے میں نے ڈیلفینا کی آفر کو اپنے جوتے کی نوک پر مار دیا تھا۔ تب سے یہ ہاتھ دھو کر اور پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔

ڈیلفینا کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک فوری خیال نے مجھے چونکا دیا اور میرے پورے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

''کیا سوسائٹی والے مجھے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے قبالہ کا استعمال کر رہے ہیں؟''

جادو کی حقیقت اور اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس امر میں بھی کسی شک کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں کہ قبالہ نامی جادو کا شمار تاریخ کے خطرناک سحریات میں ہوتا ہے۔ یہودی خصوصاً سوسائٹی کے کرتا دھرتا قبالہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور میں ان کی ضرورت تھا۔ وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔

نوایشو..... میں بھی ہر حد پھلانگنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

☆☆☆

بارسلونا، اسپین کا ایک خوبصورت ساحلی شہر ہے۔ یہ اسپین کا سیکنڈ کیپٹل بھی کہلاتا ہے۔ اس کی اہمیت کسی بھی طور

میڈرڈ سے کم نہیں ہے۔ یہاں پر قدیم اور جدید دونوں طرزِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں جو بارسلونا کے قدرتی حسن میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔

میری رہائش پاسگ ڈی گریشیا کے صاف ستھرے علاقے میں تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جس میں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔ اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کی پارکنگ میں میرے لیے ایک وہائٹ سیاٹ لیون گاڑی بھی کھڑی تھی۔ سیاٹ لیون ایک پیور اسپینش گاڑی ہے جو چھوٹی فیملی کے لیے نہایت ہی موزوں خیال کی جاتی ہے۔ یہ تمام تر بندوبست میرے لیے جی ایم سر نے کیا تھا لیکن افسوس کہ اب وہ مجھے چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ ہمارا ساتھ طویل عرصے کا نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا انمول اور یادگار تھا۔ وہ مجھے داغِ مفارقت دے گئے تھے لیکن میرے دل میں وہ زندہ تھے۔ میں انہیں کسی بھی قیمت پر بھلا نہیں سکتا تھا۔

میں چار فروری کی سہ پہر ویلنگٹن سے روانہ ہوا تھا اور پانچ فروری کی دوپہر بارسلونا پہنچ گیا تھا۔ ویلنگٹن کو الوداع کہتے ہوئے میں بہت اداس تھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ چند روزہ قیام کے دوران میں مجھے سرزمین نیوزی لینڈ سے محبت ہوگئی تھی بلکہ میری رنجیدگی کا سبب جی ایم سر کی ابدی جدائی تھا۔ یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر بھی یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

نو فروری پیر کے روز میں نے اسپتال جوائن کرلیا۔ میں علمِ نفسیات کا اسٹوڈنٹ رہا تھا اور اس شعبے میں مجھے اچھی خاصی مہارت بھی حاصل تھی۔ میری یہ جاب آن لائن ہوئی تھی اور اس سلسلے میں ضروری ڈاکیومنٹس کا انتظام بھی میرے اتالیق جی ایم سر ہی نے کیا تھا۔ میرا اپائنٹمنٹ ''سینٹرو سائیکاٹرک اسپتال'' بارسلونا میں ایک سائیکاٹرسٹ کی حیثیت سے ہوا تھا۔ میں اس نفسیاتی اسپتال کا سب سے کم عمر ماہر نفسیات تھا۔ سینٹرو اسپتال میرے اپارٹمنٹ کے قریب ہی پاسگ ڈی گریشیا بلیوارڈ پر واقع تھا' پاسگ ڈی گریشیا بارسلونا کی ایک معروف اور بارونق شاہراہ ہے۔ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر کیورن ٹیکنان اسپتال ہے جہاں پر میری آمد سے ایک ہفتہ قبل یعنی پچھلی جمعرات انتیس جنوری کو شکیرا نے اپنے دوسرے بیٹے ساشا کو جنم دیا تھا۔

چھ ماہ پر لگا کر اڑ گئے۔ اسپتال کی جاب کے ساتھ ساتھ میں خود پر بھی بھرپور توجہ دے رہا تھا۔ میں نے ایک جیم بھی جوائن کرلیا تھا جہاں میں پابندی سے جایا کرتا تھا جس کی وجہ سے میری عمومی صحت شاندار اور قابلِ رشک ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی فائٹنگ اسکلز کو امپروو کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ میں نہایت ہی باقاعدگی کے ساتھ ارتکاز توجہ کی مشقیں بھی جاری رکھے ہوئے تھا اور جی ایم سر کی ہدایات کی روشنی میں، میں نے اپنی پاور آف امیجنیشن کو کافی حد تک بڑھا لیا تھا اور لوکیشن فائنڈنگ کے فن میں بھی خاطر خواہ مہارت حاصل کرلی تھی۔ اسی ٹیکنیک کے طفیل میں نے میوخ میں شارو کے حوالے سے اچھی خاصی معلومات اکٹھا کرلی تھیں۔ اگرچہ میں اس کی اقامت گاہ کے بارے میں بالکل واضح طور پر تو کچھ نہیں جان سکا تھا تاہم اتنا معلوم ہوچکا تھا کہ وہ میوخ میں کس لوکیشن پر ہوسکتی ہے۔ میرا وجدان کوہِ ایٹلیس کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ میں جب بھی شارو کے مقام کی تلاش میں مراقبہ کرتا تو میرے تصور میں چہار سو برف ہی برف پھیل جاتی۔ مجھے امید تھی کہ میری یہ کوشش بہت جلد مجھے شارو تک پہنچا دے گی۔

جی ایم سر کی ہدایات کے مطابق میں نے بارسلونا میں چھ مہینے بخیر و عافیت گزار لیے تھے۔ اب میں زمانۂ حال میں واپس آچکا تھا۔ میں نے پاسگ ڈی گریشیا والا کرائے کا اپارٹمنٹ چھوڑ دیا تھا اور اسپتال کی جاب بھی ختم ہوچکی تھی۔ اس وقت میں بارسلونا کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک آدھ روز میں بانی روڈ جرمنی جانے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ شارو کو حاصل کرسکوں۔ ایک اچھی بات یہ کہ اس دوران میں اسپتال کی آمدنی سے میں نے جبرالٹر (Gibraltar) میں ایک چھوٹا سا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ بھی خرید لیا تھا۔ میرا پروگرام یہی تھا کہ شارو کو حاصل کرنے کے بعد میں سیدھا جبرالٹر لے جاؤں گا۔ اسپین کے جنوبی کنارے پر واقع یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے جو برٹش گورنمنٹ کے کنٹرول میں ہے۔ چھ اعشاریہ سات مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے اس مختصر سے ملک کی آبادی محض بتیس ہزار نفوس ہے۔ میں شارو کے ساتھ بہ آسانی یہاں کھپ سکتا تھا۔ یہ میرا فوری منصوبہ تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔

جم میں کڑی کسرت کے بعد میں کافی تھک جاتا تھا لہٰذا اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے میں ڈیل لائسیو کا رخ کرتا تھا۔ ڈیل لائسیو ایک اوپیرا ہاؤس تھا جو گراں تھیٹر کے

Digitized by Google

نام سے بھی مشہور تھا۔

ایسی کوئی بات نہیں کہ مجھے اوپیرا پسند ہو۔ میں ڈیل لائسیو میں اوپیرا دیکھنے نہیں بلکہ آرام کرنے جایا کرتا تھا۔ اوپیرا فن کاروں کی مہکتی ہوئی آواز میں اور موسیقی کی مست دھنیں نیند کے لیے اکسیر تھیں۔

ایک روز میں آنکھیں بند کیے اوپیرا کی دھنوں پر ریلیکس کر رہا تھا کہ روماتل پھم سے میرے دماغ میں آ گئی، وہ دراز قامت حسینہ جو ویلنگٹن سے بارسلونا تک میری ہم سفر رہی تھی۔ میں اس عجیب وغریب ماہ جبیں کو بھول بھال گیا تھا۔ میرے تصور میں اس کا چہرہ روشن ہوا تو لامحالہ میں نے اس پر توجہ مرکوز کر دی۔

روماتل توریز بارسلونا ائرپورٹ پر بڑے روکھے انداز میں رخصت ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے اسے یاد رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اب اچانک ہی اس کا خیال آ جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحات کی توجہ کے بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ روماتل میرے انتہائی قریب موجود ہے۔ اس احساس نے یکا یک مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے اپنے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی لیکن اس رو میں وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہال میں اتنی زیادہ روشنی نہیں تھی کہ میں دور تک لوگوں کے چہروں کو دیکھ سکتا تاہم روماتل کی موجودگی کی فیلنگز اتنی اسٹرانگ تھیں کہ میں اس کی تلاش کے لیے بے چین ہو گیا۔ لہٰذا میں نے سیٹ چھوڑ دی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں یہی سوچ کر تھیٹر سے اٹھ آیا تھا کہ ایگزٹ پر ایک طرف کھڑے ہو کر روماتل کے باہر نکلنے کا انتظار کروں گا اور وہ جیسے ہی نظر آئے گی، میں اس کے نزدیک جا کر پوچھوں گا۔۔۔''ڈی نیدو این بارسلونا!'' (ایک بار پھر بارسلونا میں)

میں اوپیرا ہاؤس کے ایگزٹ پر نگاہ جمائے کھڑا تھا کہ لارمبلا روڈ کی دوسری جانب واقع ایک بلڈنگ کے صدر دروازے پر مجھے ہلچل کے آثار نظر آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھی خاصی افراتفری مچ گئی۔ ایک ایمبولینس اور پولیس کی دو گاڑیاں مذکورہ بلڈنگ کے سامنے آ کر رکیں۔ ان کے ہارن کی آوازوں نے فضا کی خاموشی کا سینہ چیر کر رکھ دیا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈیل لائسیو کے ایگزٹ سے میری توجہ ہٹ گئی اور میں سڑک کی دوسری جانب ہونے والی ہنگامی صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ یقیناً اس عمارت میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔

اچانک پیدا ہو جانے والی اس سچویشن کے پیشِ نظر روماتل میرے ذہن سے نکل گئی تھی اور میں موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا، سامنے والی عمارت میں سے ایک معمر شخص کو باہر لایا گیا۔ دو افراد نے اسے بازوؤں سے سہارا دے رکھا تھا۔ مذکورہ معمر شخص نے بلیک پینٹ پر سفید شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کا ایک کندھا زخمی تھا۔ میں نے اس کی سفید شرٹ پر خون کے واضح نشانات دیکھے۔ دونوں افراد نے بہ سرعت اس معمر شخص کو ایمبولینس کے اندر پہنچایا اور خود بھی ایمبولینس میں بیٹھ گئے۔ پھر وہ ایمبولینس لارمبلا روڈ پر ایک جانب روانہ ہو گئی۔ پولیس کی گاڑیاں بھی ایمبولینس کے پیچھے چلی گئی تھیں۔

فوری طور پر جو بات میری سمجھ میں آئی وہ تو یہی تھی کہ معمر شخص کوئی اہم شخصیت تھا جو شدید زخمی ہو گیا تھا اور اسے فوری طور پر کسی قریبی اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس معمر شخص پر گولی چلائی گئی تھی یعنی کوئی اس کی جان لینے کا خواہش مند تھا مگر اس کا نشانہ چوک گیا اور گولی بھیجے یا دل میں اترنے کے بجائے معمر شخص کے کندھے میں جا لگی۔

میں اس سچویشن کو خیر باد کہہ کر دوبارہ ڈیل لائسیو کے ایگزٹ پر توجہ مرکوز کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک دلچسپ منظر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جس عمارت میں سے زخمی معمر شخص کو نکال کر ایمبولینس میں ڈالا گیا تھا اس عمارت کی چھت پر مجھے غیر معمولی سرگرمی نظر آئی۔ میں نے ایک انسان کو چھت کی کگار کے ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھا۔

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا فارمولا۔ ون کی طرز کا اسپورٹس کاسٹیوم زیبِ تن کر رکھا تھا اور اس کے کندھے پر ایک تھیلا بھی لٹک رہا تھا۔ وہ بہت تیزی میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے چھت کے آخری سرے پر پہنچی پھر کندھے سے تھیلا اتار کر اس کے اندر سے مضبوط رسی کا ایک لچھا نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے رسی کے ایک سرے کو چھت کی منڈیر سے باہر نکلے ہوئے ایک پائپ کے ساتھ کس کر باندھا اور دوسرے سرے کو نیچے پھینک دیا۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ رسی کی مدد سے اس بلڈنگ کی چھت سے نیچے آنا چاہتی تھی۔

Digitized by Google

یہ تمام عمل مجھے کسی ٹی وی اسکرین کے مانند واضح نظر نہیں آرہا تھا لیکن چونکہ اس وقت میری تمام تر توجہ اسی عورت پر لگی ہوئی تھی اس لیے میری چشمِ تصور مجھے بہت واضح پرنٹ دکھا رہی تھی۔

اس عورت نے بلڈنگ سے باہر نکلنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے ایک بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ وہ سیدھے راستے سے باہر آنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ گویا وہ اس بلڈنگ میں کوئی ''حرکت'' کر کے فرار ہو رہی تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ سنسنی خیز سوال ابھرا..... اس معزز شخص کو زخمی کرنے میں کہیں اس عورت کا ہاتھ تو نہیں؟

میرے دیکھتے ہی دیکھتے فارمولا۔ون والے چست ڈریس میں ملبوس وہ عورت رسی کی مدد سے بحفاظت نیچے اتر آئی پھر اس نے روڈ کراس کر کے میٹرو اسٹیشن کی جانب دوڑ لگا دی۔

لائسیو میٹرو اسٹیشن، اوپیرا ہاؤس سے ملحق تھا اور میں اسی گراں تھیٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ جب وہ مہم جو عورت میرے نزدیک سے گزری تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ روماتل توریز تھی۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟''

میری فیلنگز نے میری بالکل درست راہنمائی کی تھی۔

گراں تھیٹر ''ڈیل لائسیو'' میں اوپیرا کی دھنوں پر ریلیکس کرتے ہوئے جب میں نے روماتل کا تصور کیا تھا تو وہ مجھے اپنے نزدیک محسوس ہوئی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اوپیرا ہاؤس کے اندر ہی کہیں موجود ہے لیکن وہ سامنے والی بلڈنگ سے نمودار ہوئی تھی اور اس کی یہ جلوہ گری بڑی دلکش ٹائپ کی تھی۔ میں روماتل کے اس روپ سے واقف نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ کہ میں اس کے کسی بھی روپ سے آشنا نہیں تھا۔ وہ چھ ماہ پہلے ایک فضائی سفر میں چند گھنٹے تک میری پڑوسن رہی تھی اور اس مختصر ہم سفری میں، میں اس کے بارے میں جو کچھ جان پایا تھا وہ اسی کا بتایا ہوا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ اس کا کوئی بہروپ ہو.....!

روماتل کسی اجنبی کے مانند میرے قریب سے گزر کر سڑک کے کنارے کھڑی ایک اسپورٹس موٹر بائیک تک پہنچی۔ اس نے بڑی مہارت سے ہیلمٹ پہنا پھر بائیک کو اسٹارٹ کر کے لارمبلا روڈ پر ایک جانب روانہ ہوگئی۔ اس دوران میں میری نگاہ مسلسل اسی پر لگی ہوئی تھی اور میں نے ایک دوبارا سے پکارا بھی تھا لیکن اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اس کی اس بے رخی اور بے اعتنائی نے میرے اندر ضد کو بیدار کر دیا۔ مجھے یہی لگا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میری آواز نے بھی اس کی سماعت تک رسائی حاصل کر لی تھی لیکن وہ مجھے دانستہ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔

''روماتل! میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

اگلے ہی لمحے میری وہائٹ سیاٹ لیون روماتل کے تعاقب میں لارمبلا روڈ پر رواں دواں ہو چکی تھی۔ اس وقت یہ گاڑی ہی میرا سب کچھ تھی۔ اسپتال اور اپارٹمنٹ میں چھوڑ چکا تھا اور عارضی طور پر بارسلونا کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا تمام تر سامان ایک بیگ پر مشتمل تھا جس کے اندر کپڑوں کے علاوہ میرے ضروری ڈاکیومنٹس بھی رکھے ہوئے تھے جن میں میرا سی آئی ڈی اور ڈرائیونگ لائسنس سرفہرست تھا جن کے مطابق میں بارسلونا کا شہری تھا۔ پاسپورٹ کو میں نے سوٹ کیس کے ایک خفیہ خانے میں چھپا دیا تھا کیونکہ اس پاسپورٹ کے مطابق میں نے چار فروری دو ہزار پندرہ کو ویٹلنگن سے بارسلونا تک سفر کیا تھا لیکن میں اس وقت اگست دو ہزار چودہ میں سانس لے رہا تھا۔ اگر یہ پاسپورٹ کسی کے ہتھے چڑھ جاتا تو میرے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی، اسی لیے میں نے اسے اپنے سفری بیگ کے خفیہ خانے میں چھپا دیا تھا۔ اسی خانے میں اس اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے ڈاکیومنٹس بھی تھے جو میں نے جبرالٹر میں خریدا تھا۔ ایک آدھ روز میں مجھے جرمنی کے شہر میونخ روانہ ہو جانا تھا۔ میں اپنی پلاننگ سے مطمئن تھا کہ اچانک بیچ میں پورنوگرافر لیلی حسینہ روماتل توریز ٹپک پڑی تھی۔

یہ تمام تر خیالات تین سیکنڈ میں میرے ذہن میں گزر گئے۔ اس دوران میں میری تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی اور ان لمحات میں، میں خاصی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ مجھے نظر آ گئی۔ وہ اسپورٹس بائیک کو فارمولا۔ون کے کھلاڑیوں کے مانند دوڑا رہی تھی۔ کالی بائیک، کالا لباس، کالا ہیلمٹ اور کالی آندھی جیسی رفتار.....!

ہمارے بیچ میں بہ مشکل دو سو گز کا فاصلہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک منٹ سے پہلے میں اسے جالوں گا۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے زیرلب کہا۔

Digitized by Google

''روماتل! جتنا تیز بھاگ سکتی ہو، بھاگ لو۔ مگر تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ آج تک پتا جائے گا۔ تی اترا پارے.....''

آخری جملہ میں نے ہسپانوی میں ادا کیا تھا جس کے معنی تھے ''میں تمہیں پکڑلوں گا۔''

جلد... ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے بے ساختہ سائڈ مرر میں دیکھا۔ مجھے اپنے عقب میں ایک کار اور دو ہیوی بائیک نظر آئیں جو آندھی اور طوفان کی رفتار سے میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ درحقیقت وہ لوگ روماتل کے تعاقب میں تھے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جو وہ اس خونخوار انداز میں میری طرف لپکتا البتہ میں نے روماتل کو جس انداز میں وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا وہ مشکوک اور فکرانگیز تھا۔

آناً فاناً وہ لوگ میرے سر پر آن پہنچے۔ میں روماتل اور متعاقبین کے بیچ سینڈوچ بنا ہوا تھا۔ میرے پیچھے موجود افراد کے ارادے ہرگز نیک نہیں تھے۔ روماتل وہاں جو گل کھلا آئی تھی اس کی خوشبو لارمیلا روڈ پر بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

دفعتاً روماتل نے سائیلنسر لگی گن سے متعاقبین پر فائر کیا۔ اس کی ڈرائیونگ کی مہارت کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ ایک پرفیکٹ رائیڈر تھی۔

ایک گولی ایک موٹر سائیکل سوار کے سینے میں لگی اور دوسری گولی دوسرے موٹر سائیکل سوار کے ٹائر میں پیوست ہوگئی۔ روماتل کمال کی نشانے باز ثابت ہوئی تھی۔ اس کی فائرنگ کے نتیجے میں دونوں ہیوی بائیک لارمیلا روڈ پر دور تک پھسلتی چلی گئیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روماتل نے اپنی بائیک ایک سائڈ اسٹریٹ میں موڑلی۔

اسی لمحے مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ دونوں متعاقب بائیک والوں کو تو روماتل نے ناکارہ کردیا تھا۔ پتا نہیں، ان میں سے اب کوئی زندہ بھی تھا یا نہیں لیکن یہ طے تھا کہ وہ روماتل کا پیچھا کرنے کے قابل نہیں رہے تھے مگر وہ کار ابھی تک صحیح سلامت تھی جو ان دونوں بائیک والوں کی معیت میں ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی تھی اور اسی کار نے میری سیاٹ کو ایک زوردار ٹکر ماری تھی۔

ایک لمحے کے لیے اسٹیرنگ پر میں قابو نہ رکھ سکا اور سیاٹ لہرا کر رہ گئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب میں اپنی گاڑی کو روماتل کے تعاقب میں سائڈ اسٹریٹ پر موڑ رہا تھا۔ وہ جھٹکا اتنا قیامت خیز تھا کہ اگر میں اپنے حواس کو قابو میں نہ رکھتا اور حاضر دماغی سے کام نہ لیتا تو میری سیاٹ قلابازیاں کھاتی نظر آتی۔ مالک کا شکر کہ انتہائی تیز رفتاری کے باوجود بھی میں نے گاڑی کو سنبھال لیا تھا۔

اس دوران میں روماتل کافی آگے نکل گئی تھی۔ میں نے یکا یک سیاٹ کی اسپیڈ بڑھا دی۔ میری دیکھا دیکھی متعاقب کار والوں نے بھی اپنی رفتار میں اضافہ کردیا اور تیزی سے میرے پہلو میں آنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس گاڑی میں خطرناک صورتوں والوں دو افراد موجود تھے۔ ان کے ساتھی بائیک رائیڈرز کا جو حشر ہوا تھا اس نے انہیں آتش زیر پا کردیا تھا۔ میں عجیب وغریب صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میرے پیچھے آنے والے مجھے روماتل کا ساتھی سمجھ رہے تھے اور روماتل شاید مجھے متعاقبین کا ساتھی خیال کررہی تھی۔

پھر میرے اور متعاقب گاڑی کے درمیان باقاعدہ ''ٹکر ٹکر'' کا کھیل شروع ہوگیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے سے ہٹا کر روماتل تک پہنچنا چاہتے تھے اور میں ان کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش میں تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ۔ میرا عمل کیوں اور کس کے لیے تھا؟ کیا میں اس روماتل کو بچانے کا ارادہ رکھتا تھا جس نے میری ذات کے حوالے سے بے رحمی کا عالمی ریکارڈ قائم کررکھا تھا.....

انسان جب بلاسوچے سمجھے کچھ کرگزرتا ہے یا کچھ کر رہا ہوتا ہے تو اس عمل کے پیچھے اس کا لاشعور کام کررہا ہوتا ہے۔ شاید میں بھی اس وقت کسی لاشعوری جذبے کے تحت اس کا حصہ بنا ہوا تھا۔

دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کو ڈیچ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہرگزرتے لمحے کے ساتھ میری سیاٹ لیون کا بیڑا غرق ہورہا تھا۔ جواب میں، میں نے بھی متعاقب گاڑی کا سواستیاناس کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ ہماری اس کشتم کشتی میں روماتل کو زیادہ سے زیادہ دور جانے کا موقع مل رہا تھا اور لاشعوری طور پر مجھے اس بات کی خوشی بھی تھی لیکن ثابت یہی ہورہا تھا کہ روماتل کو میری یہ خوشی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اچانک اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں ششدر رہ گیا۔

ہمارے بیچ لگ بھگ تین سو میٹر کا فاصلہ حائل ہوچکا تھا۔ اس نے یکبارگی اپنی بائیک سڑک کے عین بیچ روک دی۔ اسپورٹس بائیک کے اچانک بریک لگانے سے فضا ٹائروں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھی۔ غیر ارادی

Digitized by Google

طور پر میں نے بھی بریک لگا دیے۔ اسی لمحے متعاقب گاڑی، سیاٹ لیون سے ٹکرائی پھر ایک سائڈ سے ہوتے ہوئے الٹ گئی۔

یقیناً میرے تعاقب میں آنے والوں نے بھی اس صورت حال کے پیش نظر بریک لگا کر اپنی گاڑی کو روکنے کی کوشش کی ہوگی اور اسی کوشش میں ان کی گاڑی میری گاڑی سے ٹکراؤ کے بعد الٹ گئی تھی۔

میں روماتل کی دلیری پر اش اش کر اٹھا۔ اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اگر مجھے بریک لگانے میں ایک مائیکرو سیکنڈ کی بھی تاخیر ہوجاتی تو سیاٹ لیون نے روماتل اور اس کی اسپورٹس بائیک کو بری طرح کچل ڈالنا تھا۔

میں اس کی جرأت پر ابھی پوری طرح حیرت زدہ بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے ایک اور ناقابل یقین حرکت کر ڈالی۔ وہ اپنی بائیک کو چلاتے ہوئے الٹی ہوئی گاڑی کے نزدیک پہنچی۔ اس دوران میں متعاقبین اپنی گاڑی میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روماتل نے انہیں یکے بعد دیگرے فائر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا پھر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ میرے نزدیک سے گزرتے ہوئے اپنی بائیک کو آگے بڑھا لے گئی۔

روماتل کا رویہ کئی لحاظ سے میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ نمبر ایک، اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش نہیں کی تھی، یعنی وہ مجھے اپنا دشمن نہیں سمجھتی تھی۔ نمبر دو، اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی، مطلب یہ کہ اس واقعے کے حوالے سے اس کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ نمبر تین، اس دوران میں اس کے چہرے پر میں نے شناسائی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی، گویا وہ مجھ سے انجان تھی، ہمارے بیچ کوئی جان پہچان نہیں تھی۔

مجھ پر ایک ضد سی سوار ہوگئی۔ روماتل کی اصلیت تک رسائی حاصل کرنے کی ضد۔ آخر وہ کن ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور کیا کرتی پھر رہی تھی۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے اپنے چار دشمنوں کو واصل جہنم کیا تھا اور وہ بھی کسی ماہر شوٹر کے انداز میں۔ پھر وہ جس اسکل کے ساتھ بائیک ڈرائیو کر رہی تھی وہ بھی میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ روماتل کوئی عام عورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا حتمی فیصلہ کر کے میں روماتل کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

روماتل کی سفا کی کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ پر گولی نہیں چلائی تھی اور یہی بات مجھے اس کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری دشمن نہیں ہے اور مجھے یہ خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ وہ میری دوست ہے۔ بس، میں ایک ضد، ایک جنون کے زیر اثر اس تک پہنچنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

متعاقب گاڑی کی دھواں دھار ٹکروں نے میری سیاٹ لیون کا انجر پنجر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ چل رہی تھی یہی غنیمت تھا مگر صرف چلنے سے بات نہیں بن سکتی تھی۔ سیاٹ کو بھگانا تھا اور روماتل کی بائیک سے زیادہ تیز بھگانا تھا ورنہ میں روماتل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنی سی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا مگر ہمارے بیچ فاصلہ بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔ میں پاسگ ڈی لاریینا پر کافی دور تک گیا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔

پتا نہیں، روماتل کو زمین نے نگل لیا تھا یا آسمان کھا گیا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اڑن چھو ہوگئی تھی۔ معلوم نہیں، اس جادوگرنی نے خود کو بائیک سمیت غائب کرنے کے لیے کون سا سحر پھونکا تھا۔ روماتل میرے لیے ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کی شخصیت کے جتنے پہلو مجھ پر آشکار ہوئے تھے وہ مجھے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ اپنی گاڑی کو ٹرن کیا اور راستہ بدل کر اس ہوٹل کی جانب بڑھنے لگا جہاں ان دنوں میں ٹھہرا ہوا تھا لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اور مصیبت میری منتظر تھی۔

میں نے پاسگ ڈی لاریینا کو چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پکڑی تھی اور اس سڑک پر میں بمشکل دو منٹ ہی ڈرائیو کر پایا تھا کہ دو گاڑیاں تیزی سے عقب میں سے نمودار ہو کر میرے دائیں بائیں آگئیں اور مجھے رکنے کا اشارہ دیا۔ ان میں سے ایک گاڑی پر ٹنٹیڈ گلاس لگے ہوئے تھے۔

میری چھٹی حس نے فوراً سے پیشتر مجھے بتا دیا کہ وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ میں نے رکنے کے بجائے اپنی گاڑی کی اسپیڈ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ شاید وہ لوگ میرے ارادے کو بھانپ گئے تھے۔ قبل اس کے کہ میں انہیں جل دے کر نکل جاتا، ٹنٹیڈ گلاس والی گاڑی سے مجھ پر فائرنگ کی گئی۔

دو گولیاں سیاٹ لیون پر چلائی گئی تھیں۔ یہ فائرنگ ایک طرح کی وارننگ تھی کہ اگر میں نے گاڑی نہیں روکی تو ان کا اگلا نشانہ میں ہوں گا۔ ایک بات تو سمجھ میں آگئی کہ وہ میری جان نہیں لینا چاہتے تھے۔ میں اس وقت انتہائی

غیر مسلح تھا اور میری سیاٹ بھی ''زخموں سے چُور چُور'' تھی اگر میں ان کی خواہش کے مطابق اپنی گاڑی نہیں روکتا تو وہ مجھ پر براہ راست بھی فائرنگ کر سکتے تھے۔ میں اپنی جان کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا مگر اس سے پہلے کہ میں ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے عملی قدم اٹھاتا، انہوں نے میری گاڑی کو سینڈوچ بنا ڈالا۔

میرے دائیں بائیں چلنے والی دونوں گاڑیوں نے مجھے اپنے بیچ میں دبانا شروع کیا پھر ان میں سے سادہ گلاس والی گاڑی اچانک آگے نکلی اور میری گاڑی کے سامنے آکر اس نے اپنی رفتار کم کردی۔ یہ مجھے روکنے کا ایک اشارہ تھا۔ لامحالہ مجھے بریک لگانا پڑے۔

تینوں گاڑیاں یکے بعد دیگرے رک گئیں۔ پھر مجھے رکنے کے لیے مجبور کرنے والی گاڑی کے دروازے کھلے اور اندر سے دو۔۔۔گن بردار افراد باہر نکلے اور مجھ پر اپنی گن تانتے ہوئے خطرناک انداز میں بولے۔

''باہر آجاؤ!''

انہوں نے اگرچہ انگلش میں مجھے حکم دیا تھا لیکن ان کا لہجہ چغلی کھاتا تھا کہ وہ انگلش اسپیکنگ نہیں تھے۔ ان کے حکم کی تعمیل کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کو آف کیا اور باہر نکلنے لگا تو ان میں سے ایک دہاڑا۔

''اے، کوئی چالاکی نہیں۔ ہاتھ سر کے اوپر۔''

دوسرے نے گن لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہری اپ!''

اگر میرا چالاکی دکھانے کا کوئی ارادہ ہوتا تو میں رکنے کے بجائے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ میں دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھے سیاٹ لیون سے باہر نکل آیا۔

ان میں سے ایک میکانکی انداز میں میرے نزدیک آیا۔ اس نے بڑی مہارت سے میرے بدن کو ٹٹول کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں میں نے اپنے لباس کے اندر کوئی گن وغیرہ تو نہیں چھپا رکھی۔ اس دوران میں دوسرے گن بردار نے بڑے چوکنا انداز میں مجھے اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔

چند سیکنڈ میں میری تلاشی لینے والے کی تسلی ہوگئی۔ اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''گاڑی میں بیٹھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹنٹیڈ گلاس والی گاڑی کی جانب اشارہ بھی کردیا۔ میں نے بےچون وچرا اس کے حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹنٹیڈ گلاس والی گاڑی حرکت میں آگئی۔

عقبی نشست پر پہلے سے ایک گینڈا نما شخص موجود تھا۔ اس نے ایک خطرناک خنجر کی نوک میری پسلیوں میں چبھوتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں۔ اگر جان پیاری ہے تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔''

میں اس گینڈے کی دھمکی میں آگیا کیونکہ مجھے اپنی جان بہت پیاری تھی اور عین ممکن تھا، یہ روماتل کے بھیجے ہوئے ہوں.....

روماتل کا خیال آتے ہی میں نے اپنی فیلنگز کا اینٹینا اس کی جانب موڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ میں ٹنٹیڈ گلاس سے باہر دیکھتے ہوئے روماتل کو قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے گینڈے نے میرے سر کو کوئی تکیہ جانتے ہوئے غلاف پہنا دیا۔ یہ بندوبست اس لیے کیا گیا تھا کہ میں باہر کے مناظر کو نہ دیکھ سکوں۔ انہیں یقیناً یہ خدشہ تھا کہ میں راستوں کو اپنے ذہن میں نقش کرلوں گا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی منزل سے آگاہ ہوں۔

نقاب مجھے پہنانے کے بعد گینڈا نما شخص اپنے ساتھی سے بات چیت میں مصروف ہوگیا تھا۔ ان کی گفتگو میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ اطالوی میں بات کر رہے تھے۔

ٹنٹیڈ گلاس والی اس گاڑی میں کُل چار افراد تھے۔ ایک ڈرائیور، دوسرا پسنجر سیٹ والا شخص جو گینڈے سے اطالوی میں گفتگو کر رہا تھا، تیسرا وہ گینڈا نما شخص جس نے ایک تیز دھار خنجر کی خطرناک نوک میری پسلیوں میں چبھو رکھی تھی اور چوتھا میں۔

میں نے خیال ہی خیال میں ان تینوں پر لعنت بھیجی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ اگلے ہی لمحے میری فیل کا اسٹیئرنگ روماتل کی جانب گھوم چکا تھا۔

☆☆☆

لگ بھگ پندرہ منٹ تک ہمارا سفر جاری رہا اور اس دوران میں کم از کم پندرہ بار ہی ٹنٹیڈ گلاس والی گاڑی نے موڑ کاٹے تھے۔ پتا نہیں، اتنی زیادہ ٹرننگ ان کے روٹ کا تقاضا تھا یا وہ مجھے دھوکا دینے کے لیے یہ سارا ناٹک کر رہے تھے تاکہ میں اس مقام کی لوکیشن کا اندازہ نہ لگا سکوں جہاں وہ مجھے پہنچانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ اتنا مجھے محسوس ہوگیا

تھا کہ روماتل اس وقت میرے انتہائی قریب نہیں تھی جس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ لوگ مجھے روماتل تک پہنچانے والے نہیں تھے۔

بالآخر ایک مقام پر ہمارا سفر ختم ہوا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ بارسلونا کا کوئی مضافاتی علاقہ تھا کیونکہ فضا میں شہر والی رونق اور شور شرابے کی آوازیں مفقود الخبر تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے نتھنوں نے سمندری ہواؤں کی مخصوص بو بھی سونگھ لی جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ لوگ مجھے بارسلونا کے کسی ویران ساحل پر لے آئے تھے۔

جلد ہی مجھے گاڑی سے نکال کر ایک عمارت کے کسی بالائی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے بمشکل سیڑھیاں چڑھی تھیں اس سے میں یہی اندازہ قائم کر پایا تھا کہ مذکورہ کمرا اس عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ کمرے کے اندر پہنچانے کے بعد تکیے کے غلاف نما تھیلا میرے سر سے ہٹا دیا گیا۔ میں دیکھنے کے قابل ہوا تو اس کمرے کا منظر میری نگاہ میں روشن ہوگیا۔

وہ کمرا ایک عارضی آفس کا نقشہ پیش کرتا تھا جیسے کسی مقصد کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اسے ترتیب دیا گیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک دراز قامت شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک اور حرکات وسکنات میں مستعدی پائی جاتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی گینڈا نما شخص الرٹ ہوگیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دراز قامت زیرک شخص اس گینڈے کا کوئی باس وغیرہ تھا۔

باس کی طرح دکھائی دینے والے شخص نے گینڈے سے اطالوی میں کچھ کہا تو وہ گردن جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ اب میرے اور اس دراز قامت چاق وچوبند شخص کے سوا اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے میز کے پیچھے رکھی کرسی سنبھال لی پھر ایک سگریٹ سلگانے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

میں ایک کرسی کھینچ کر چپ چاپ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں پہلے سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور اگر کسی شخص کے اندر کا گھی جم چکا ہو تو پھر میں انگلی کو ٹیڑھا کر کے اس کے جسم کے ہر حصے میں گھما ڈالتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ مجھ سے انگلش میں ہم کلام تھا۔ میں نے اس کے دھمکی آمیز سوال کا جواب دینے کے بجائے انگلش ہی میں استفسار کیا۔

''تم لوگ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟''

''کوئی سوال نہیں۔'' وہ غرایا۔ ''صرف جواب دو۔ میں پوچھوں گا اور تم بتاؤ گے۔ سمجھ گئے نا.....؟''

''میں اس شہر کا ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔'' میں نے اس کے حاکمانہ لب ولہجے سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ ''مجھے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ تم لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟''

''بارسلونا کے معزز ڈاکٹر.....!'' اس نے تحقیر آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ میں کتنا خطرناک سرجن ہوں۔ اگر میں شرافت کی زبان میں بات کر رہا ہوں تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوجانا۔ مجھے زبان کھلوانے کے ایک سو ایک گر زبانی یاد ہیں۔''

''تم کس سلسلے میں میری زبان کھلوانا چاہتے ہو؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

وہ چند لمحات تک ڈرل کرنے والی نگاہ سے مجھے گھورتا رہا پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لینے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''کون.....؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''جسے کوردے کرتم نے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''بتاؤ، وہ اس وقت کہاں ہے؟''

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے روماتل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اسی گروپ سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے لارمبلا روڈ سے روماتل کا تعاقب کیا تھا اور چاروں کے چاروں روماتل کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے تھے میں نے انجان پنچھی کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا، تم کیا انٹ شنٹ بول رہے ہو۔''

''ابھی سب تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔'' اس نے خونخوار نظر سے مجھے گھورا پھر دروازے کی جانب دیکھتے

Digitized by Google

ہوئے اطالوی میں صدا لگائی۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور دو مسلح افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ باس نے اطالوی ہی میں انہیں ہنگامی ہدایات دیں۔ انہوں نے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے مجھے اس کمرے کے ایک آٹھ انچ موٹے چوبی ستون تک پہنچایا پھر زور زبردستی کر کے میری پشت کو مذکورہ ستون کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے بعد میرے ہاتھوں کو ستون کے پیچھے لے جا کر مجھے الٹی ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اب میں اس ستون کے ساتھ اس طرح بندھ چکا تھا کہ میرا چہرہ باس نظر آنے والے اس شخص کی جانب تھا۔ اس نے مسلح افراد کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا پھر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ میں نے تمہیں بے بس کر دیا ہے۔ اگر اب بھی تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے ٹکڑے کر کے بلی ایرک سی میں پھکوا دوں گا۔ تمہارے بدن کے پارچہ جات سے اس سمندر کی مچھلیاں آج شاندار ڈنر کریں گی۔ بولو..... مچھلیوں کی خوراک بننا منظور ہے یا زبان کھولو گے؟''

''بلی ایرک سی'' دراصل ... بحیرۂ روم کا ایک مخصوص حصہ ہے جو بارسلونا کے ساحل سے لگتا ہے۔

میں نے اس شخص کی بلی ایرک سی والی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے مجھے سمندر میں پھکوانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر میرے ٹکڑے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی مجھے سالم سمندر برد کر دو۔ مچھلیاں اپنے حصے کا کام خود کر لیں گی۔''

''تمہیں شاید حالات کی نزاکت کا اندازہ نہیں ہے۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے مذاق سوجھ رہا ہے۔ اگر الفانسو کو کچھ ہو گیا تو تم بھی نہیں بچ گے اور تمہاری وہ ساتھی بھی عبرت ناک موت مرے گی جسے تم نے فرار ہونے میں مدد دی۔''

اب صورت حال کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ مجھے وہ معمر زخمی شخص یاد آیا جسے دو افراد نے کندھے سے تھام کر ایمبولینس تک پہنچایا تھا۔ اس کے بعد بلڈنگ کی چھت سے رسی کی مدد سے روماتل کا نیچے پہنچنا اور پھر آناً فاناً میں فارمولا۔ ون کے طرز پر روماتل کا جائے وقوعہ سے فرار..... ایک سے ایک کڑی مل رہی تھی۔ مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر اس نے کہا۔

''تمہارے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''میں نے ابھی تک تم سے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور آئندہ بھی سچ بولنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے بتاؤ، یہ الفانسو کون ہے اور میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر گمبھیر انداز میں بتانے لگا۔ ''الفانسو اٹلی کی ایک اہم سیاسی شخصیت ہے جسے آج کیونٹی ہال میں ... سرِشام تمہاری ساتھی نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نشانہ چوک گیا اور الفانسو زخمی حالت میں پہنچا دیا گیا۔ میرے بندے تمہاری ساتھی کے تعاقب میں تھے کہ تم نے اسے بھرپور کور دیا اور وہ کمینی میرے چار بندوں کو قتل کر کے رفو چکر ہو گئی۔ اب تم ہی ہمیں اس عورت تک پہنچا سکتے ہو۔''

''تم مجھے بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس عورت کو کوئی کور نہیں دیا بلکہ میں تو خود اس کے تعاقب میں تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی اور مجھے چل دے کر غائب ہو گئی۔''

''بکواس.....!'' اس نے طیش کے عالم میں میز پر ہاتھ مارا۔ ''کیا تم نے مجھے جھنجھنا سمجھ رکھا ہے جو مجھ سے کھیل رہے ہو؟''

''میری بات کا یقین کرو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں واقعی اس عورت کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور اس بات کی تو مجھے بالکل خبر نہیں کہ اس نے آج شام کیونٹی ہال میں کیا گل کھلایا ہے۔''

''جب تم اسے جانتے نہیں تو پھر اس کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' اس نے کریدنے والی نظر سے مجھے دیکھا۔

''چند ماہ پہلے ایک فضائی سفر میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس نے مجھے اپنا نام روماتل تورین بتایا تھا۔ اس کے مطابق وہ میڈرڈ میں رہتی تھی اور پورنوگرافی اس کا پیشہ تھا۔ آج شام جب وہ مجھے لارمیلا روڈ پر نظر آئی تو میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی لہٰذا میں نے اپنی گاڑی میں اس کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ تمہارے سامنے ہیں۔''

''وہ واقعات ہی تو مجھے ہضم نہیں ہو رہے۔'' وہ دوبارہ میز پر ایک مکا رسید کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تمہاری ساتھی نہیں لیکن اس نے تم پر گولی نہیں چلائی۔ کیوں؟ جب میرے بندوں کی گاڑی الٹ گئی تو اس نے بھی بائیک روکی اور گاڑی کے نزدیک آ کر میرے بندوں کو شوٹ کر دیا اور تمہیں چھوڑ دیا۔ کیوں؟''

''میں جو جانتا تھا، وہ تمہیں بتا دیا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ اس وقت تم کن لوگوں کے قبضے میں ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے مستفسر ہوا۔

میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ہمارا تعلق ایز سے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیا تم ایز سے ہو جو کبھی سزی ہوا کرتی تھی؟''

میں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایز یا سزی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ایز اٹالین انٹیلی جنس ہے۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم بہت جلد الفانسو پر قاتلانہ حملہ کرنے والی اس شوٹر کو کھوج نکالیں گے اور اس کام میں تم ہماری مدد کرو گے۔''

''آئی ایم سوری۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ میں روماتل کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ میڈرڈ میں پورنوگرافی کا ایک اسٹوڈیو چلاتی ہے۔''

''یہ اس کا کور ہے۔'' وہ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ اس کا کور ہے تو پھر روماتل کی حقیقت کیا ہے؟''

''روماتل تورینز نام کا ایک حقیقی کردار میڈرڈ میں موجود ہے وہ واقعتاً پورنوگرافر ہی ہے اور اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم نے جس کردار کے ساتھ فضائی سفر کیا اور ہمیں جس کی تلاش ہے اس کا اصل نام ایسا ہے اور یہ عورت لینگھی کے لیے کام کرتی ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ.....'' میں بے یقینی سے انٹیلی جنس آفیسر کو دیکھنے لگا۔

''آج کیسونی ہال میں یورپی یونین کے اہم عہدے

خدا کے نام پر

''خدا کے نام پر کچھ دے دو۔'' ایک فقیر نے صدا لگائی۔

لڑکا۔ ''یہ لے میری بی کام کی ڈگری رکھ لے۔''

بھکاری۔ ''یہ نہیں چاہیے۔ مجھے چاہیے تو میری ایم بی اے کی ڈگری رکھ لے۔''

☆☆☆

وجہ خاص

ایک شخص میڈیکل اسٹور پر گیا اور بولا۔ ''مجھے زہر چاہیے۔''

میڈیکل اسٹور والا بولا۔ ''میں آپ کو اس وقت تک زہر نہیں دے سکتا جب تک آپ کے پاس اجازت نامہ نہ ہو۔'' آدمی نے اسے دو نکاح نامے دکھائے۔

تب میڈیکل اسٹور والا اپنے اسسٹنٹ سے چیخ کر بولا۔ ''پپو پتر! وڈی بوتل دے پائی نوں۔''

☆☆☆

ابھی تک

''دیکھو..... وہ آدمی جو پارٹی میں ڈانس کر رہا ہے۔'' بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔

''ہاں کون ہے؟'' شوہر نے پوچھا۔

''دس برس پہلے اس نے مجھے پرپوز کیا تھا مگر میں نے اسے مسترد کر دیا تھا۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' شوہر نے حیرت سے سر پر ہاتھ مارا۔ ''یہ ابھی تک خوشی سے ناچ رہا ہے۔''

☆☆☆

امتحان

زندگی میں اگر بندہ ایک بار محبت میں ناکام ہو جائے تو کوشش جاری رکھنی چاہیے کیونکہ پاس ہونے کے تین مواقع تو یونیورسٹی بھی فراہم کرتی ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

Digitized by Google

داروں کی ایک خصوصی میٹنگ تھی۔'' وہ مجھے بتانے لگا۔''اسی سلسلے میں ہمارے ملک کے ایک اہم سیاستدان مسٹر الفانسو اس میٹنگ میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔ یورپی ممالک کا اتحاد جتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے وہ لینگلی کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ یورو کے مقابلے میں ڈالر کی قدر و قیمت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ کمی واقع ہو رہی ہے۔ یورو، ڈالر سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔ اب پوری دنیا کو یہ نظر آنے لگا ہے کہ یورپی ممالک کا اتحاد دنیا کی دوسری سپر پاور کی حیثیت اختیار کرنے والا ہے لہٰذا یہ انقلابی تبدیلی دنیا کی واحد سپر پاور کا دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ الفانسو پر قاتلانہ حملہ بھی اسی مذموم سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایلسا بڑی ماہر شوٹر ہے لیکن الفانسو کی خوش قسمتی سے اس کا نشانہ چوک گیا اور الفانسو محض زخمی ہوا۔''

جی ایم سر نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ لینگلی یا دنیا کی کسی بھی ایجنسی کے معاملات سے مجھے دور رہنا ہے۔ اسی طرح مجھے کسی ملک کی سیاست میں بھی خود کو ملوث نہیں کرنا اور یہاں تو سراسر خطرناک حالات تھے لہٰذا میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔

''مجھے ایلسا کے معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں۔ آپ جانیں اور آپ کا کام جانے۔ مجھے جانے کی اجازت دیں۔''

''تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑا جاسکتا۔'' وہ... دوٹوک انداز میں بولا۔ ''جب تک ایلسا ہمارے ہتھے نہیں چڑھ جاتی، تم ہماری کسٹڈی میں رہو گے۔ بتاؤ، ایلسا کو آخری بار تم نے کہاں دیکھا تھا؟''

''پاسگ ڈی لارینا پر۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تیس لارٹینا سے پہلے یا بعد میں؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا۔

''یہ بھلا میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ تیس لارٹینا سے پہلے یا بعد میں؟'' میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں روماتل کا تعاقب کر رہا تھا، وہاں کے بلاکس کے نمبر حفظ نہیں کر رہا تھا۔''

''روماتل نہیں ایلسا!'' وہ زور دیتے ہوئے بولا۔

''جو بھی ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''اس کمبخت کی وجہ سے میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

''اسی کمبخت کی وجہ سے تم اس مصیبت سے نکل بھی سکتے ہو۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''وہ کیسے؟''

''تیس پاسگ ڈی لارینا پر یو ایس کونسلیٹ ہے۔'' وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بتاؤ، تم نے ایلسا کو اس مقام سے پہلے کھو دیا تھا یا بعد میں؟''

مجھے بارسلونا میں ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے اور میں نے اس دوران میں اپنے میجور کی ہدایت کے مطابق صرف اپنے کام سے کام رکھا تھا لہٰذا ادھر ادھر کے چونچلوں پر میرا زیادہ دھیان نہیں رہا تھا البتہ بنیادی طور پر ایک امریکی شہری ہونے کے ناتے یو ایس کونسلیٹ میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا تھا چنانچہ میں نے اس کے جواب میں کہا۔

''یو ایس کونسلیٹ کے بعد وہ میری نظر سے اوجھل ہوئی تھی۔''

''اوہ.....!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر تو اسے ڈھونڈنا آسان نہیں ہوگا۔''

میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیوں..... کیا یو ایس کونسلیٹ کے آگے پاسگ ڈی لارینا کسی نادیدہ دنیا میں چلی جاتی ہے؟''

''کونسلیٹ سے تھوڑے فاصلے پر آگے لینگلی کا سیف ہاؤس ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر ایلسا سیف ہاؤس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی ہے تو پھر فوری طور پر اس تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ میری ذاتی معلومات کے مطابق سیف ہاؤس اور کونسلیٹ کے درمیان زیرِ زمین ایک خفیہ راستہ موجود ہے جو ادھر کے لوگوں کو اُدھر اور اُدھر کے لوگوں کو ادھر کرنے کے کام آتا ہے۔''

''تمہاری یہ مشکل باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔'' میں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''میں اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ ڈاکٹر ہوں۔ مجھے صبح اسپتال بھی جانا ہے۔ مجھے چھوڑ دو تو مہربانی ہوگی۔''

''تم نے اپنا نام ڈاکٹر رافیل بتایا تھا نا؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''تم کس چیز کے ڈاکٹر ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں۔''

''کس اسپتال میں؟''

''سینٹرو سائیکاٹرک اسپتال میں۔'' میں نے بتایا۔

''اور تمہاری رہائش کس علاقے میں ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

Digitized by Google

میں نے اپنے اپارٹمنٹ والی بلڈنگ کا نام بتانے کے بعد کہا۔ ''اسپتال اور رہائش دونوں پاسگ ڈی گریشیا بلیوارڈ پر ہیں۔''

''ابھی چیک کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

جاتے ہوئے اس نے دھڑ سے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے میں اچانک ایک نئی پریشانی میں گھر گیا۔ میں نے ایز کے اس آفیسر کے ساتھ کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی لیکن یہ سفاک سچائی میرے لیے انگنت مصائب کھڑے کرنے والی تھی۔

پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ دروازہ کھلا اور وہ آفیسر غضب ناک انداز میں کمرے میں داخل ہوا پھر میرے سامنے پہنچ کر وہ نفرت انگیز انداز میں بولا۔

''میں نے تمہیں تنبیہ کی تھی نا کہ میرے ساتھ کوئی چکر بازی نہیں کرنا۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

اس نے طیش کے عالم میں میرے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا اور دہاڑ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''میں نے چیک کروایا ہے۔ سینڈرو سائیکاٹرک اسپتال میں ڈاکٹر رائیل نامی کوئی سائیکاٹرسٹ کام نہیں کرتا۔ اسی طرح تم نے پاسگ ڈی گریشیا کی جس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے بارے میں بتایا تھا وہاں بھی تم کبھی رہائش پذیر نہیں ہوئے۔ اتنا بڑا جھوٹ یقیناً تم نے کسی سچ کو چھپانے کے لیے بولا ہے اور.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور سچ یہ ہے کہ تم ایلسا کے ساتھی ہو لیکن تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ میں نے تمہاری زبان کھلوانے کے لیے کیا بندوبست کیا ہے۔ آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ بتاؤ، ایلسا اس وقت کہاں ہے؟''

حقیقت یہی تھی کہ میں ایلسا یا روماتل کے بارے میں واقعتاً کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا اس شخص کے سوال کا جواب دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جو تمہارا فیصلہ۔ تھوڑی ہی دیر میں تمہیں لینگلی اور ایز کا فرق پتا چل جائے گا۔ تمہارے بدن کا ایک ایک جوڑ پکار اٹھے گا کہ ایز لینگلی سے زیادہ سفاک اور خونخوار ہے۔''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے گھورا اور بھاری قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے اس شخص سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن وقت میری مخالفت میں چل رہا تھا۔ میں جس عرصے کے دوران میں مذکورہ اسپتال میں جاب کرتا رہا تھا وہ زمانہ تو ابھی آیا ہی نہیں تھا۔ یہ سب واقعات تو چھ ماہ بعد پیش آنا تھے جب کوئی ڈاکٹر رائیل ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے سینڈرو اسپتال میں کام کرتا اور پاسگ ڈی گریشیا کے اپارٹمنٹس میں قیام پذیر ہوتا۔ وہ ماہر نفسیات ڈاکٹر رائیل میں ہی ہوتا یا کوئی اور شخص، یہ تو سب بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال تو معاملہ یہ تھا کہ میں سچا ہونے کے باوجود بھی خود کو سچا ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ رات میرے لیے کسی بھی طرح شب ظلمات سے کم نہیں تھی۔ ایک جفا کار اور ستم گر رات۔ میں اس وقت اٹالین انٹیلی جنس کی تحویل میں تھا اور ان کی نگاہ میں دروغ گو درجہ اول ثابت ہو رہا تھا۔ میں کسی بھی طور پر انہیں اپنی سچائی کا یقین نہیں دلا سکا تھا اور مستقبل قریب میں بھی میرے راست گو ثابت ہونے کا کوئی امکان دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ سب وقت کا کھیل تھا کہ میں کسی سے حقیقت گوئی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی بھی ذی ہوش شخص میری اس بات پر یقین نہ کرتا کہ میں نے آج سے چھ ماہ بعد آنے والا زمانہ گزار لیا ہے۔ سب مجھے فاتر العقل سمجھ کر میری بکواس کو نظر انداز کر دیتے لیکن مصیبت یہ تھی کہ انٹیلی جنس والوں کو جس طرز کی ٹریننگ دی جاتی ہے اس کی روشنی میں وہ اس نوعیت کی کہانیوں کو چھل فریب کے کھاتے میں ڈال کر اپنے ٹارگٹ کے بال کی کھال نکالنے میں کسی حیل وحجت سے کام نہیں لیتے۔

میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ''ایز'' والے میرے ساتھ کون سا سلوک کرنے والے تھے۔ میں ان سے بدترین رویے کی توقع رکھتے ہوئے اپنے بچاؤ کی کوئی محفوظ راہ تلاش کرنے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا۔ مالک کا شکر کہ ان کا مسٹر الفانسو جاں بحق نہیں ہوا تھا ورنہ تو وہ مجھے پکڑتے ہی شوٹ کر دیتے۔ یہ روماتل کی بچی نے بیٹھے بٹھائے مجھے کس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ روماتل تھی یا ایلسا، اب مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ پورنوگرافر تھی یا لینگلی کے

Digitized by Google

پینل پر کوئی خطرناک شوٹر، مجھے اس امر سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، میری طرف سے جائے بھاڑ میں.....

روماتل کے بارے میں اس انداز میں سوچتے ہوئے میری سوچ میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ ان لمحات میں مجھے اس سے ایک طرح کی نفرت سی ہوگئی تھی۔ میں تو اچھا خاصا ایک آدھ روز میں میوزخ جانے والا تھا۔ اس فتنہ پرداز نے میرا سارا پلان چوپٹ کردیا تھا۔ ''چوپٹ'' تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ یہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں ان لمحات کو کوسنے لگا جب میں نے روماتل کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور میں نے اپنے مالک کے حضور توبہ کی۔ وقت کو کبھی برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ وقت تو مالک کا ایک بھید ہے۔ اس کے اندر کس کے لیے کیا چھپا ہوا ہے یہ بات کوئی نہیں جانتا لیکن مالک بخوبی جانتا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ رات کی تاریکی کے بطن سے روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے میری یہ پریشانی بھی عارضی ہے۔ اسی کے اندر سے میری نجات کی راہ نکلے گی۔

میں اپنے حالات پر غور و فکر کررہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دو افراد مجھے اندر داخل ہوتے نظر آئے جن میں سے ایک تو وہی گینڈا نما انسان تھا جو مجھے اغوا کرکے یہاں تک لایا تھا جبکہ دوسرا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔

پتا نہیں، اس مضافاتی عمارت میں کتنے لوگ موجود تھے۔ ابھی تک میں پانچ سے چھ افراد کو وہاں دیکھ چکا تھا۔ گینڈا نما ڈشکرے کے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک گن تھی۔ اس نے تھوڑے فاصلے سے مجھے نشانے پر رکھتے ہوئے اٹالین (اطالوی) زبان میں.... اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔

میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا البتہ اس گینڈے کا ساتھی اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تھے تو میں نے گینڈے کے ساتھی کے ہاتھ میں ایک ٹیبلٹ دیکھا تھا۔ گینڈے کی ہدایت پر وہ بندہ ٹیبلٹ کے ساتھ میرے عقب میں پہنچا تو میرے ذہن نے چیخ کر کہا۔

''یہ کوئی عام ٹیبلٹ نہیں بلکہ ایک حساس اسکینر ہے۔''

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ شخص میرے ہاتھوں کو اسکین کرنے کا ارادہ رکھتا تھا صورتِ حال روزِ روشن کی طرح مجھ پر عیاں ہوگئی۔ وہ لوگ میرا بائیومیٹرک کرنے والے تھے۔

میں پہلے ہی کوئی کم مصیبت زدہ نہیں تھا۔ اوپر سے یہ نئی افتاد۔ ایز والوں کی نظر میں، میں ایک جھوٹا انسان تھا اور اب اس بائیومیٹرک کے نتیجے میں یہ ثابت ہونے والا تھا کہ میرا نام اسد علی ہے اور میں ایک امریکی شہری ہوں۔ موجودہ سچویشن میں، یہ حقائق کینگھی سے میرا تعلق جوڑنے کے لیے کافی تھے۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں پیدا ہوا تھا لیکن نامساعد حالات کے باعث والد صاحب نے میری حفاظت کے پیشِ نظر ایک سال کی عمر میں مجھے نیویارک (امریکا) بھجوادیا تھا۔ یہ تمام واقعات گوش گزار ہوچکے ہیں۔ امریکا میں انکل علی سلطان نے میری پرورش کی تھی اور اپنے تعلقات استعمال کرکے میری پیدائش کا ریکارڈ اپنے حسب منشا بنوالیا تھا جس کے مطابق میں امریکا میں پیدا ہوا تھا۔ میں یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ امریکی گورنمنٹ کے پاس انیس سو ساٹھ اور اس کے بعد یو ایس اے کے اندر پیدا ہونے والے تمام افراد کے فنگر پرنٹس کا ریکارڈ موجود تھا اور کینگھی کو اس ریکارڈ پر سب سے زیادہ دسترس حاصل تھی۔ یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ دنیا بھر کی ایجنسیاں اپنے ذاتی مفادات کے لیے ایک دوسرے سے انفارمیشنز کا تبادلہ کرتی رہتی تھیں۔ اگر میرے فنگر پرنٹس ایز والوں کو حاصل ہوجاتے تو پھر ان کے لیے یہ جاننا قطعاً مشکل نہ ہوتا کہ میں ایک امریکی شہری ہوں اور ریکارڈ کے مطابق میرا نام اسد علی ہے۔ جوائن کرنے کے لیے آپ کا پیدائشی امریکی شہری ہونا بنیادی شرط ہے۔

میرے دل کی تہ سے یہ صدا بلند ہوئی۔ ''مالک! مجھے ان ایجنسیوں کے شر سے محفوظ فرما۔''

جس شخص نے اسکینر تھام رکھا تھا اس نے میرے عقب میں پہنچ کر اطالوی میں گینڈے سے کچھ کہا۔ اس کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی تاہم گینڈے کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات نے مجھے بہت کچھ بتادیا۔

مجھے جس چوبی ستون کے ساتھ باندھا گیا تھا وہ لگ بھگ آٹھ انچ موٹا تھا۔ الٹی ہتھکڑی کے باعث میری کمر اور اگلا چوبی ستون کے بیچ ذرا سی بھی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ وہ ستون مجھے اپنی پشت میں گھستا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ان

Digitized by Google

حالات میں، میرے دونوں ہاتھوں کو اسکین کرنا ناممکن نظر آتا تھا اور یقیناً اسکینر بردار نے اسی پرابلم کی طرف گینڈے کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

گینڈے نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اپنی جیب میں سے ایک چابی نکالی پھر مجھے سائیلنسر لگی آٹو میٹک گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے اس نے وہ چابی میرے عقب میں موجود شخص کی جانب پھینک دی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے انگلش میں بولا۔ ”اے..... کوئی ہوشیاری نہیں، اگر تم نے اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو اس گن کی ساری گولیاں تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا۔“

”میں نے پہلے کوئی گڑبڑ کی ہے جو اب کروں گا۔“ میں نے اسے چڑ دینے کے لیے مسکین سے لہجے میں کہا۔ ”تم لوگوں کو جو بھی کرنا ہے وہ جلدی کرو اور مجھے جانے دو۔“

”جانے کے خیال کو دل سے نکال دو۔“ وہ دھمکی آمیز انداز میں سائیلنسر لگی گن کو لہراتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم نے ہمیں لمسا تک نہیں پہنچایا تو پھر تم کہیں بھی جانے کے قابل نہیں رہو گے۔“

اس بات چیت کے دوران میں، میں اپنے اور گینڈے کے درمیان حائل فاصلے کو ذہن میں رکھ کر کسی فوری عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کسی ہارے ہوئے جواری کے مانند کہا۔ ”میں تم لوگوں کے قبضے میں ہوں۔ بے بس اور لاچار ہوں۔ تم جیسا چاہو گے ویسا ہی کرو گے۔ میں بھلا تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔“

میں اپنے انداز سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں ان کی کارروائی سے کافی خوف زدہ ہو چکا ہوں اور پہلی فرصت میں ان سے نجات چاہتا ہوں۔ میری بے کسی کو دیکھ کر گینڈے کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

اسکینر بردار نے جیسے ہی ہتھکڑی کے لاک میں چابی گھمائی مجھے ایک طاقت ور عمل محسوس ہوئی۔

”اسد صاحب! اگر ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”لبیک.....“

میرے ہاتھ ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد ہوئے تو میں نے سکھ کی سانس لی اور عین فطری انداز میں دونوں کلائیوں کو باری باری سہلاتے ہوئے میں نے خود کلامی کی۔ ”او مائی گاڈ! میرے دونوں بازو تو لکڑی کی طرح اکڑ چکے ہیں۔“

”اے! چالاکی نہیں۔“ گینڈا نما گن بردار نے مجھے وارننگ دی۔ ”پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو اسکین کرواؤ۔ بازوؤں کی مالش بعد میں کرتے رہنا۔ ابھی تو ہم نے تمہارے پورے وجود کو لکڑی کا تختہ بنانا ہے۔“

اس دوران میں دوسرے شخص نے اسکینر کو آن کر کے میرے سامنے کر دیا تھا۔ میری پشت اب بھی چوبی ستون کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ گن بردار گینڈا مجھ سے بہ مشکل آٹھ فٹ کی دوری پر بڑے چوکنا انداز میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں کے بیچ میں اسکینر والا تھا۔

میں نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اسکینر کی اسکرین پر رکھا پھر قبل اس کے کہ وہ شخص اسکیننگ کا عمل شروع کرتا، میں نے جسم و جان کی پوری قوت سے اسے ایک زوردار لیگ پش دیا۔ اس کام کے لیے میں نے اپنا دایاں پاؤں استعمال کیا تھا۔ یہ ایک طرح کی فرنٹ کک تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فرش پر رولنگ کی۔

میری اس حرکت کی برکت کے نتیجے میں اسکینر بردار کے ہاتھ سے اسکینر نکل کر فضا میں بلند ہوا اور وہ خود کسی بھری ہوئی بوری کے مانند ہوائی سفر کرتے ہوئے گینڈا نما شخص سے ٹکرایا۔

اس اچانک بدلتی ہوئی صورت حال نے گینڈے کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اسکینر والے شخص سے ٹکراؤ کے باعث بے ساختہ ٹریگر پر اس کی انگلی دب گئی۔ ”ٹھک“ کی آواز سے ایک گولی چلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں پیچھے کو لڑھک گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ مکمل طور پر زمین بوس ہو چکے تھے۔

دونوں کے خوف ناک ٹکراؤ کے باعث سائیلنسر لگی گن گینڈے کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔ میں نے اس موقع پر کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک لمبی لوٹ لگائی تھی۔ اس رولنگ کے نتیجے میں، میں فائرنگ رینج سے کافی باہر نکل گیا تھا اور وہ گن مجھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر گری تھی۔

میں نے فوراً سے پیش تر گن پر قبضہ جمایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں گینڈے نے اپنے جثے کی نفی کرتے ہوئے بڑی پھرتی دکھائی تھی اور لگ بھگ میرے ساتھ ہی وہ بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے گن کو اس کے سینے کی جانب سیدھا کرتے ہوئے خطرناک انداز میں کہا۔ ”ہینڈز اپ۔“

وہ اپنے بے سدھ پڑے ساتھی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔“

”بکو مت۔“ میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ”میں اپنا کام کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔“

”تم بہت بڑی مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔“

Digitized by Google

اس نے مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک بار پھر زمین پر بے حس و حرکت پڑے شخص کی طرف دیکھا۔ ''تم جو بھی کر رہے ہو، اس کا نتیجہ بہت بھیانک ہوگا۔''

''میں نتائج کی پروا کیے بغیر کام کرنے کا عادی ہوں۔'' میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ''لہٰذا میرے سامنے کوئی بکواس نہیں۔ ہاتھ اوپر..... ہری اپ!''

میری چلائی ہوئی گولی نے اس کے گھٹنے کی چٹنی کا سوا ستیاناس مار دیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک کرب ناک آواز برآمد ہوئی۔ مالک کا شکر کہ اس وقت کمرے کا دروازہ بند تھا لہٰذا ہمارے درمیان ہونے والی مکالمے بازی اور سائیلنسر لگی گن کے فائر کی آواز یعنی مخصوص ''ٹھک'' باہر نہیں سنی جاسکتی تھی البتہ گینڈے کی چیخ نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس امر کا اغلب امکان تھا کہ اس کی اذیت باہر کسی کی سماعت پر ریکارڈ ہو گئی ہوگی۔

''دوسری گولی میں تمہاری بے ہنگم توند میں اتاروں گا۔'' میں نے غضب ناک نظر سے اسے گھورا۔ ''لہٰذا میں جو کہتا ہوں۔ کرتے چلے جاؤ..... او کے۔''

اس نے ناپسندیدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے اطالوی میں کچھ کہا۔ یقیناً اس نے مجھے کوئی غلیظ گالی دی ہوگی ورنہ اینگوچیچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر وہ بیزاری سے تفسیر ہوا۔

''تم مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہو؟''

اس دوران میں وہ بار بار فرش پر پڑے اپنے ساتھی کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ بندہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ گینڈے کی چلائی ہوئی غیر ارادی گولی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ کمرے کے فرش پر پڑے اس کے بے حس و حرکت جسم کے نزدیک ہی خون کا ایک ننھا سا تالاب بن چکا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں کی اسکیننگ کی خواہش دل میں لیے دوسرے جہاں کا ٹکٹ کٹوا چکا تھا۔

''اگر تم کچھ کرنے کے قابل ہوتے تو میں تمہیں کولہو کے بیل کی جگہ جوتتا۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا پھر چوبی ستون کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''چلو..... اس ستون کو چھی ڈالو۔''

''کک..... کیا؟'' وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تمہارے گوشت کے پہاڑ کو لہے الٹی ہتھکڑی لگانے کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے۔'' میں نے زمین پر پڑی ہتھکڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

اس گینڈا نما انسان کی توند اور کولہے واقعتاً لامحدود تھے۔ چنانچہ اس کے بازوؤں کو پیچھے موڑ کر ستون کے ساتھ اسے الٹی ہتھکڑی لگانا ممکن نظر نہیں آتا تھا لہٰذا میں نے اسے ستون کے ساتھ بغلگیر ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اگرچہ پھیلاؤ میں اس کی توند بھی کچھ کم نہیں تھی تاہم سامنے سے ستون کو بیچ میں رکھ کر اس کی کلائیوں کو سیدھی ہتھکڑی لگانا قدرے آسان تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طور یہ کام کر ڈالا۔

میرے جارحانہ انداز نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں ہوں لہٰذا مجھے اپنا کام کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ بادل ناخواستہ گینڈے کو مجھ سے تعاون کرنا پڑا۔ اگر میں چاہتا تو اس کے سینے میں ایک بے آواز گولی اتار کر اسے اس کے ساتھی کی طرح ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اول تو میں خوامخواہ کسی کی جان لینے کے حق میں نہیں تھا اور دوسرے مجھے اس گینڈے کے حلق سے بہت کچھ اگلوانا تھا۔

''اس بلڈنگ میں اور کتنے لوگ ہیں؟'' میں نے آٹو میٹک گن کی نال کو اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے سفاک لہجے میں سوال کیا۔

''تین!'' وہ متوحش انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی حالت دیدنی اور پوزیشن مضحکہ خیز تھی۔ وہ اپنی توند کو بیچ میں رکھ کر چوبی ستون کے ساتھ آگے کو جھک کر اس طرح معانقہ کر رہا تھا جیسے کسی مجبوری اور لاچاری سے اسے یہ ناپسندیدہ کام کرنے پر آمادہ کیا گیا ہو۔

''ان تینوں میں کیا تمہارا وہ تنبا کو نوش چیف بھی شامل ہے جس نے تھوڑی دیر پہلے میرا انٹرویو کیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نن..... نہیں۔'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''کہاں گیا ہے وہ؟''

''وہ سر الفانسو کو دیکھنے اسپتال گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک گھنٹے میں واپس آجائے گا۔''

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ''تمہارے چیف کو گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''لگ بھگ چالیس منٹ۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پندرہ سے بیس منٹ میں لوٹ آئے گا۔'' میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے گن کی نال کو اس کی پیشانی میں دھنسانے کی کوشش کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں پوچھا۔ ''غلط بیانی کا انجام جانتے ہو نا؟''

''میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتایا ہے۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں اپنے جارحانہ انداز سے اس چربی دار گینڈے پر اپنی دہشت طاری کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ان کے چیف کی آمد سے قبل مجھے وہاں سے نکل جانا تھا۔ تین افراد اس کمرے کے باہر بھی موجود تھے۔ ابھی ان سے نمٹنا باقی تھا لہٰذا میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا کام نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ تینوں کسی بھی وقت ادھر متوجہ ہو سکتے تھے۔

''میری گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے گن کے بیرل کو اس کی توند کے اندر گھماتے ہوئے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم لوگوں نے میری گاڑی کے ساتھ کیا کیا؟ کیا وہ بھی ادھر ہی کہیں موجود ہے؟''

''ہم تمہاری گاڑی کو ساتھ نہیں لائے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو کیا میری گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں سے تم لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن جھٹکی اور بتایا۔ ''ہمارے آدمیوں نے تمہاری گاڑی کو کہیں اور پہنچا دیا ہے۔''

''کہیں اور کہاں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''وہ اس وقت سانتا یولالیا کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔''

سانتا یولالیا ایک لگژری بوتیک تھی جہاں پر صرف دنیا کے اعلیٰ درجے کے برانڈ ملبوسات ہی فروخت ہوتے تھے۔ یہ بوتیک بھی پاسنگ ڈی گریشیا ہی کے علاقے میں تھی۔ اس بوتیک کے قریب ایک آئس پارلر تھا جہاں اکثر میں آئس کریم کھانے جایا کرتا تھا۔

''اور میرا سامان؟'' میں نے گینڈے سے پوچھا۔ ''اس گاڑی کے اندر ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی تھا وہ کہاں ہے؟''

مذکورہ سوٹ کیس میرے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے اندر کپڑوں کے علاوہ میرے تمام ضروری ڈاکیومنٹس بھی رکھے ہوئے تھے۔ اسی سوٹ کیس کے ایک خفیہ خانے میں، میں نے اپنے جیرالڈ والے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے کاغذات بھی چھپا رکھے تھے۔

''وہ سوٹ کیس چیف کی الماری میں ہے۔'' گینڈے نے بتایا۔

میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن وہاں مجھے کوئی الماری دکھائی نہیں دی۔ میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے چیف کی الماری کہاں ہے؟''

''اس کے برابر والے کمرے میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کمرے کی بائیں جانب چیف کا کمرا ہے۔''

''او کے۔'' میں نے گن کی نال اس کی توند سے ہٹاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہاری ایک بھی بات غلط نکلی تو میں تمہاری توند..... میں اتنے سوراخ کروں گا کہ آئندہ کسی کو اپنے بدن پر اس قدر چربی چڑھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔''

''تم جا کر خود چیک کر لو۔'' وہ اپنے بدن پر سے گن ہٹتے ہی قدرے سکھ کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں نے کوئی جھوٹ کہا ہو تو واپس آ کر مجھے شوٹ کر دینا۔''

اپنے جسم سے گن ہٹنے کے بعد اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔ یہ آٹو میٹک سائیلنسر لگی گن اسی گینڈے کی تھی جس سے پتا نہیں آج تک اس نے کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ آج یہی گن اس کا پتا پانی کر رہی تھی۔ ہتھیار کسی کا رشتے دار نہیں ہوتا یہ جس کے ہاتھ میں ہو، بس اسی کا وفادار ہوتا ہے۔

''میں تمہاری فراہم کردہ معلومات کو ضرور چیک کروں گا۔'' میں نے میز کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے میں تمہارا بندوبست کر لوں۔''

''تت..... تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ مجھے میز کی سمت قدم اٹھاتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''میں تمہاری زبان بندی کے لیے ایک خاص عمل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے میز کی درازوں کو کھول بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ میرے جانے کے بعد تم آہ و فغاں نہ کر سکو۔''

مجھے کسی کپڑے، کسی ڈسٹر، کسی ٹیپ کی تلاش تھی۔ ایسی چیزیں عموماً دفتری استعمال میں آتی رہتی ہیں اور میز کی درازوں میں رکھی ہوتی ہیں۔ میں گینڈے کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس کر اس کے اوپر ٹیپنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسکینر بردار آنجہانی کی طرف سے تو کسی شر کا اندیشہ نہیں تھا مگر یہ چربی دار موٹا مرغا وقت، بے وقت کی بانگ دے سکتا

Digitized by Google

تھا۔ گینڈا تشویش بھری نگاہ سے میری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

جب میز کی درازوں میں مجھے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تو ایک فوری خیال کے تحت میں نے میز کے نیچے جھانک لیا اور اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ وہ چوبی میز تین اطراف سے بند تھی۔ بس، کرسی والی سائڈ کھلی ہوئی تھی تاکہ کرسی پر بیٹھنے والا اپنی ٹانگیں اندر رکھ سکے جس کی وجہ سے میز کی ٹاپ کے نیچے تین دیوار والا ایک چھوٹا سا مربع شکل کا کمرا بن گیا تھا اور میرے چونکنے کا سبب وہ سوٹ کیس تھا جو اس کھانچے کے اندر پڑا تھا۔ وہ میرا سوٹ کیس تھا۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا اور گن سونتے گینڈے کی جانب بڑھا اور دہاڑ کر کہا۔ ''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟''

''مجھے معاف کردو۔'' وہ منت ریز لہجے میں گھگیایا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''کسی غلیظ مخلوق کی کمینی اولاد! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے سوٹ کیس کو گھما کر اسے رسید کیا پھر گن کو اس کے سینے کی جانب سیدھا کر کے پوچھا۔ ''بتاؤ! تم نے اور کون کون سی غلط بیانی کی ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو..... مجھے نہیں مارو..... ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی۔''

اس کے آخری جملے پر ہنسی تو بہت آئی لیکن میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو بدستور کرخت رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم شادی کر کے کون سا بنی نوع انسان پر کوئی احسان کرو گے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دی پھر اٹالین میں کچھ کہا گیا۔ یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ گینڈے یا اس کے آنجہانی ساتھی سے کچھ پوچھا گیا تھا۔

میں نے سوالیہ نظر سے گینڈے کی جانب دیکھا اور اپنی بھوؤں کو استفساریہ انداز میں اچکایا۔ اس نے بتایا۔ ''وہ پوچھ رہا ہے، اسکیننگ میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟''

میں نے دھیمی آواز میں گینڈے کو ہدایت دی۔ ''اس سے کہو کام ہوگیا ہے۔ بس ہم باہر آرہے ہیں۔''

گینڈے نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر بہ آواز بلند اٹالین میں کچھ کہا۔ میں یہی سمجھا کہ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی ہوگی لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ حرام الدہر ثابت ہوا تھا کیونکہ اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر موجود افراد نے دروازے کو کھولنے کی تگ و دو شروع کردی تھی۔ گینڈے نے یقیناً اطالوی میں انہیں اندر کی گمبھیر صورت حال سے آگاہ کردیا تھا اسی لیے وہ دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کررہے تھے۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ گینڈے کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ہمارے علاوہ اس عمارت میں مزید تین افراد موجود تھے اور اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ تینوں مسلح بھی ہوں گے۔ نہتا ہونے کا بھی نہیں تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں خاموش فائرنگ کرنے والی آٹو میٹک گن تھی اور دوسرے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ میں ہر نوعیت کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے کھولنا آسان نہیں تھا لہٰذا کھولنے کی کوشش کو ترک کر کے انہوں نے دروازے کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگلے ہی لمحے باہر سے کسی ہیوی گن سے فائرنگ کی گئی۔

یہ ایک خوفناک برسٹ فائر تھا جو دروازے کے لاک کو نشانہ بنا کر کیا گیا تھا۔ میں دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا لہٰذا اس فائرنگ سے محفوظ رہا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ باہر اس وقت ایک شخص تھا یا دو یا وہ تینوں جن کے بارے میں گینڈے نے مجھے بتایا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تین سے زیادہ ہوں۔ وہ جتنے بھی تھے، میرے لیے موت کے پیامبر تھے اور میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ہیوی گن کے برسٹ نے دروازے کے لاک کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس کی جگہ پر ایک موکھلا سا بن گیا تھا۔ یہ دروازے کے اندر دروازہ کھل جانے کا منتظر تھا۔ میں نے سانس روک لی اور فوری ایکشن کے لیے خود کو ریڈی کرلیا۔ میری تمام تر توجہ باہر سے آنے والوں پر مرکوز تھی۔

اسی لمحے باہر سے کسی نے لاک ندارد دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی۔ دروازہ دھاڑ سے کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں سے دو گن بردار بھرا مار کر کمرے میں داخل ہوگئے۔

امیدوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

Digitized by Google

ذات

عبدل جی

ٹکڑیوں میں تقسیم انسان اونچ اور نیچ کے درمیان درحقیقت اپنا اصل مقام ہی کھو دیتا ہے۔ اسے بھی اس تلخ حقیقت کا بہت آخر میں ادراک ہوا مگر وقت کی اس تاخیر کے باوجود اس کی زندگی کے آخری لمحات نے اسے یہ سمجھا دیا کہ دنیا میں کسی کو کسی پر برتری نہیں البتہ اعمال کی کسوٹی پر پورا اترنے والے ہی خود کو برتر یا کمتر ثابت کر سکتے ہیں۔

خون کی ہولی کھیلنے والے ایک خوبصورت رشتے کا بدصورت عکس

بہن گھر سے بھاگ جائے تو دل و دماغ میں چنگاریاں سی بھر جاتی ہیں۔ آج کاکے کا بھی حال کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا، پُر امید انداز میں دیکھتا..... شاید اندھیرا آج رہ جائے، دن طلوع نہ ہو شاید..... مگر جب افق پر ہلکی سی سفیدی کی رمق جھلکی تو بہت کچھ اس کے اندر ٹوٹ کر رہ گیا۔ ساری رات مانگی دعائیں یوں بے توقیر ہو جائیں گی، کوئی معجزہ، کوئی انہونی..... کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ پیار کرنے والا بھائی اور شریف انسان بھی تھا۔ کیسے

Digitized by Google

سامنا کرتا دنیا کا..... کیا جواب دے گا سوالوں کا؟ کہاں ہے تیری بہن..... بھاگ گئی اپنے یار کے ساتھ؟ کب سے چکر تھا اس کا..... کہاں کہاں منہ چھپاتا پھرے گا؟ ان لمحوں میں بہت تیز آندھی چل رہی تھی اور وہ حیران تھا کہ درختوں کی شاخیں تک اپنی جگہ پرسکون ہیں تو پھر یہ آندھی کیسی۔ بہنیں تو بھائیوں کا مان ہوتی ہیں نا..... اور سبین تو بہت لاڈلی تھی اس کی۔ پھر بھی وہ بھاگ گئی..... رات کے اندھیرے میں اس کے مان کو توڑ کر.....

اس نے ایک بار پھر گھر کا جائزہ لیا۔ سبزی کاٹنے والی چھری کے علاوہ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے رعایت دے کر اسلحہ کہا جاسکتا۔ اس نے جنونی انداز میں چپ چاپ چھری نیفے میں اڑس لی اور گھر سے نکل پڑا۔ کاکے کی منزل تو اس کی بہن ہونی چاہیے تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بس یہ معلوم تھا کہ ماسٹر سجاد اسے بھگا کر لے گیا ہے۔ ماسٹر سجاد کا گھر اگلی ہی گلی میں تھا اور اس کے بوڑھے ماں باپ اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے بے خبر چین کی نیند سو رہے تھے۔ جب وہ دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا ماسٹر سجاد کا باپ عنایت ویڑھے میں ہی سویا ہوا تھا اس لیے وہ آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''اوئے..... کاکے تو..... خیر تو ہے اور یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' اسی سال کا ہو جانے کے باوجود عنایت چاچا کی نظر کی تیزی کا وہ قائل ہو گیا۔ اتنی برق رفتاری سے پہچان لیا تھا اس نے کاکے کو۔

''ہاتھ میں چھری ہے چاچا اور تو نے ٹھیک پہچانا..... میں کاکا ہوں۔ تجھ سے میری کوئی دشمنی نہیں۔ بس اتنا بتا دے تیرا بیٹا سجاد کہاں ملے گا؟'' یہ کہہ کر کاکے نے عنایت چاچا کی ناتواں سی گردن گرفت میں لے لی جس پر عنایت چاچا حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز میں بولا۔

''اوئے کاکے! تو..... تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا کر دیا ہے میرے بیٹے نے؟''

جواب میں، کاکا بولا تو حیران کن طور پر اس کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ ''تیرا بیٹا..... میری بہن کو گھر سے بھگا کر لے گیا ہے چاچا..... جلدی بتا کدھر ملے گا وہ؟'' اب اس نے چھری اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا تو چاچا عنایت لرزنے لگا۔

''کاکے..... یہ تو کیا کہہ رہا ہے..... میرا سجاد ایسا نہیں کر سکتا۔'' وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کاکے نے اس کی بات تلخی سے کاٹ دی۔

''میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ میری سبین ایسا نہیں کر سکتی مگر اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ خط چھوڑ کر بھاگی ہے وہ۔ قسمیں دی ہیں اسے اور سجاد کو تلاش نہ کرنے کی..... اب تو ہی بتا چاچا عنایت..... وہ کمینہ کہاں ملے گا؟ وعدہ ہے تجھ سے ناانصافی نہیں کروں گا۔ دونوں کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتاروں گا۔'' چاچا عنایت اس کی بات سن کر لرزنے لگا۔

''کاکے! مجھے سچ میں نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔''

اس کی یہ بات کاکے کے طیش کو بڑھا گئی۔ ''چاچا عنایت! میری خواہش تھی کہ پہلا قتل اس کا کروں مگر..... مجرم تو بھی ہے۔ تو نے بھی اپنے بیٹے پر نظر نہیں رکھی۔ اسے بگلا بھگت سمجھتا رہا اور وہ ایسا نیچ کام کر گیا اس لیے تو مرنے کے لیے تیار ہو جا۔'' یہ کہہ کر اس نے چھری کے تیز وار سے چاچا عنایت کی گردن کاٹ دی۔ چاچا کی خرخراہٹ نے اندر موجود چاچی خیراں کو نیند سے بیدار کیا اور وہ باہر کا منظر دیکھ کر چلانے لگی مگر اس کے اندر اک عجیب سا اطمینان در آیا تھا۔ کاکا اس کے پاس پہنچا، اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں کسا اور چھری کا ایک تیز وار اس کے پیٹ میں کر دیا۔ خیراں چاچی کی آنکھوں میں خوف..... اذیت اور حیرت جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

''تیرا قصور یہ ہے خیراں چاچی کہ تو نے اپنے بیٹے کو اپنے جیسا معصوم سمجھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک اور زوردار وار اس کے پیٹ پر کیا اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تاکہ وہ تسلی سے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے سکے۔ اتنی دیر میں باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ وہی چھری لے کر باہر آ گیا۔ پاس پڑوس والے اکٹھے ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے لہو میں لتھڑے ہاتھ اور چھری ان کی طرف بلند کی اور غرایا۔ ''تم میں سے جس نے مرنا ہے وہ آگے آ جائے۔ سجاد ماسٹر میری بہن کو بھگا لے گیا ہے اس لیے میں چن چن کر ہر اس شخص کو ختم کروں گا جو سجاد ماسٹر کی طرف جانے والی راہ میں مزاحم ہو گا۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کاکے کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک پہلوان نما شخص اختر بھی تھا جسے کچھ تو اپنی پہلوانی پر ناز تھا اور غضب ناک انداز میں کاکے کی جانب لپکا مگر اس کا چھری والا ہاتھ برق رفتاری سے بلند ہوا اور اس کے پہلو کا مزاج پوچھ گیا۔ ایک بھیانک چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ پھر کاکے نے بھاگنا شروع کر دیا اور اس وقت تک بھاگتا رہا جب تک ہانپ کے گر نہیں گیا۔ اس کے ہاتھ، چہرہ، کپڑے سب خون آلود تھے۔ یوں لگتا تھا سبین اور اس کمینے سجاد ماسٹر تک پہنچتے پہنچتے جو بھی رستے میں آئے گا، مارا جائے گا۔ ایک رات میں تین قتل بتا رہے تھے کہ حساب میں گڑبڑ ضرور ہے کیونکہ یہ تینوں قتل بعد میں ہوئے تھے۔ ان سے پہلے کوئی اور..... یعنی کاکا.....

Digitized by Google

بیدردی سے مار دیا گیا تھا۔ ایک بزدل، ایک شریف..... ایک بھائی، اپنی لاڈلی سبین کا بھائی مرا تھا..... لوحہ جس قدر کیا جاتا کم تھا۔

اچانک اس کی سماعتوں نے فضا میں کچھ آوازوں کو شناخت کیا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ وہ بہت سے کتوں کی خرخراہٹ کی آوازیں تھیں جو لحہ بہ لحہ واضح ہوتی جا رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے اب تب میں وہ اس کے سر پر پہنچنے والے ہوں۔ وہ جلدی سے اٹھا مگر شاید اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ چار قد آور شکاری کتے تھے جو اچانک ہی نمودار ہوئے اور اسے گھیر لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چاروں اس پر پل پڑے۔ بہت خوفناک لحہ تھا وہ۔ کاکے کو موت قریب دکھائی دینے لگی مگر کیسی موت؟ وہ تو زندوں میں شمار ہی نہ تھا۔ اس کے اندر کا حیوان آج رات مر جاتا تو دھرتی پر ہونے والے بہت سے قتل رک جاتے۔ یہی سوچ کر پل بھر میں ہی اس کے اندر کی تمام تر حیوانیت نقطۂ عروج کو جا پہنچی۔ اس نے خودکشی نما مزاحمت کا آغاز خود ہی کرنا مناسب جانا مگر اگلے ہی لمحے ان میں سے دو کتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر نیچے گرے جبکہ تیسرے کی چھلانگ نما گرفت میں اس کا پاؤں آ گیا۔ جبکہ چوتھے کتے نے کاکے کے سینے پر اپنے نکیلے پنجے جما کر اس کی گردن کی طرف اپنے کریہہ نوکدار دانت بڑھائے۔ درد کی ایک کٹیلی لہر اس کے وجود میں اتر گئی۔ اف وہ اگلا لحہ..... جب اس کا پاؤں کتے کے دونوں خونخوار جبڑوں کے بیچ میں تھا اور گردن پر دانتوں کا لمس اس کا کام تمام کرنے والا تھا۔ اچانک ہی اس کی مدھم پڑتی سماعتوں نے ایک تیز سیٹی کی آواز سنی اور وہی آواز باعثِ رحمت ثابت ہوئی کیونکہ کتے اگلے ہی لمحے یکلخت وارد ہونے والے ہیولے کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تب تک وہ نووارد کو چودھری زریاب کے نام سے شناخت کر چکا تھا۔ وہ بھی تیزی سے کاکے کی طرف لپکا۔

''اوئے کاکے..... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟'' چودھری زریاب کے سوال کرنے تک اس کا نڈھال بدن بے ہوشی کی وادی میں داخل ہو چکا تھا۔ بے ہوشی جو ماں جیسی مہربان لگی تھی۔

نہ جانے کتنے وقت بعد اسے ہوش آیا تو اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ ''اوئے کاکے! لیٹے رہو..... تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے۔'' چودھری زریاب کی آواز سماعتوں میں اتری تو اسے حالات کی سنگینی یاد آ گئی۔

آہ..... ایک رات میں تین، تین قتل اور وہ خونخوار جبڑے..... ''چودھری زریاب! میں اس وقت کہاں ہوں؟'' جواب میں چودھری زریاب نے کہا۔

''تم اس وقت میرے ڈیرے پر ہو۔ وہ تو شکر ہے ہم وہاں پہنچ گئے ورنہ ہمارے شکاری کتوں نے تمہاری تکا بوٹی ایک کر دینا تھی۔''

چودھری نے احسان جتانے والے انداز میں کہا تو کاکے کو نئے اندیشوں نے آن گھیرا۔ چودھری زریاب گاؤں کا سرپنچ اور کرتا دھرتا تھا۔ کاکے کے خلاف دل میں بغض اور کدورت رکھتا تھا۔ ویسے تو کاکے جیسے شریف النفس اور بے ضرر انسان سے چودھری کو کوئی تکلیف نہ تھی تاہم ناپسندیدگی کی واحد وجہ شاید اس کا اپنی چھوٹی بہن سبین کو تعلیم دلانا تھی۔

کئی بار چودھری نے اسے تنبیہہ کی تھی کہ لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اپنی لاڈلی بہن کو، اس کی خواہش کے مطابق تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے، معاشرے کا باعزت اور باوقار انسان بنانا چاہتا تھا مگر..... ہوا کیا..... اسی بہن نے کاکے کے گلے میں بدنامی اور اذیت کا طوق ڈال دیا۔

اب تک کی ساری صورتِ حال ذہن میں رکھتے ہوئے وہ چودھری زریاب کو سراسیمہ نگاہوں سے تک رہا تھا۔ چودھری اس کی نگاہوں میں پوشیدہ ہراس کو پہچانتے ہوئے مسکرایا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر درد کی جان لیوا لہر نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

''لیٹے رہو کاکے! تمہیں مجھ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' چودھری زریاب نے پرسکون لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''مگر چودھری صاحب! آپ تو پہلے ہی مجھے پسند نہیں کرتے تھے..... اور اب تو میں قاتل بھی بن چکا ہوں۔'' اس کے حلق سے نقاہت زدہ آواز برآمد ہوئی۔

''یہ سچ ہے کہ تم تین قتل کر چکے ہو مگر یہ جھوٹ ہے کہ مجھے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔'' چودھری مسکرایا۔ ''بلکہ آج تو مجھے تجھ پر فخر محسوس ہو رہا ہے کاکے۔''

''فخر.....؟'' وہ ہکلایا۔

''ہاں فخر! کیونکہ آج تو نے ایک غیرت مند بھائی ہونے کا ثبوت دیا۔''

وہ حیرت زدہ سا چودھری کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''سچ کہوں کاکے! آج تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک غیرت مند اور جی دار انسان ہو۔'' چودھری نے فخر سے اپنی مونچھوں کو یوں بل دیا جیسے یہ تینوں قتل کاکے نے نہیں بلکہ خود اس نے کیے ہیں۔

Digitized by Google

''شکریہ چودھری صاحب! مگر مجھے اب زندگی میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ میرا مقصد بس ان دونوں کو عبرت ناک موت کا نشانہ بنانا ہے جنہوں نے مجھے نظر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ بس اتنی سی اور زندگی درکار ہے مجھے..... لیکن اب جذبات میں آکر کیے گئے قتل میرا رستہ روک دیں گے، یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔ کیا قانون کے شکنجے سے بچ پاؤں گا؟..... یقیناً نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی جس پر چودھری زریاب نے ایک بار پھر مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا۔

'' کاکے! تم مجھے شدید زخمی حالت میں ملے تھے۔ وہاں سے یہاں ڈیرے پر لانے والے میرے دو ملازم تھے بس..... کسی کو علم نہیں کہ تم یہاں ہو۔ تمہارے زخموں کی نوعیت دیکھتے ہوئے میں نے بھروسے کے ڈاکٹر کو یہاں بلوایا جس کی محنت سے تمہاری حالت اب خطرے سے باہر ہے اور تمہاری یہاں موجودگی بھی راز میں ہے۔ تم نے جو کیا وہ جذبات میں آکر کیا ہے اور جذبات میں کیے گئے قتل کے مقدمے کو طول دینا میرا کام ہے۔ تم فکر مت کرو میں اپنا سارا اثر رسوخ استعمال کر کے تمہیں سزائے موت سے بچا لوں گا۔'' چودھری زریاب کی باتوں کو وہ ششدر انداز میں سن رہا تھا۔ ایک وہ چودھری زریاب تھا..... جو سین کی پڑھائی کے معاملے میں اسے نفرت بھرے انداز میں مخاطب کرتا تھا اور آج..... شاید چودھری اس کا تذبذب بھانپ گیا۔

''تم شاید ماضی کی بات پر اور اب کے رویے پر حیران ہو رہے ہو کاکے..... مجھے سین سے اور تجھ سے کوئی ذاتی خار نہیں تھی پہلے بھی۔ دیکھ..... یہ ہمارا گاؤں ہے۔ یہاں کا ماحول ہم نے خود بگاڑا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے تیری لاڈلی بہن ایسا کام کر سکتی تھی..... یہ ہمت، یہ بغاوت کا جذبہ اور یہ بے شرمی اسی تعلیم کی مرہونِ منت ہے جو تو نے اسے دلائی..... میں بات کرتا ہوں تو تم لوگ سمجھتے ہو، اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ ہے مگر دیکھ کیا ہوا۔ دیکھ تیرا منہ کالا کر کے رکھ دیا نا اس نے..... اوئے یہ عورت ذات گھر سنبھالنے کے لیے ہوتی ہے ڈگریاں لینے کے لیے نہیں۔ اب سن میری بات..... اگر تو چاہتا ہے کہ کل کو کوئی اور سین کسی اور کاکے کو یہ دن نہ دکھائے تو..... تو بس وہی کرتا جا جو میں تجھے کہتا ہوں۔ ماسٹر سجاد اور سین کی تلاش میں، میں نے بندے دوڑا دیے ہیں تو ان کی فکر نہ کر۔ تیرا قصہ میں نے گاؤں کی پنچایت کے بڑوں کو رازداری میں لے کر بتایا ہے اور..... گاؤں کا ہر بااثر گھرانا تیرے اس قدم پر خوش ہے۔'' چودھری زریاب کی باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں اسے۔

کاکے نے پھر پوچھا۔'' مگر چودھری صاحب! ان ساری باتوں میں وہ بات کدھر ہے جو آپ کو مجھ سے کرنی ہے۔'' چودھری نے اس کی بات کے جواب میں لب کھولے مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

''چل وہ تجھے بعد میں بتاؤں گا..... بس ابھی کے لیے تو اتنا سمجھ لے کہ باہر پولیس آگئی ہے اور تجھے وہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ایس ایچ او بھی اپنا ہی بندہ ہے۔'' اس لمحے اسے خود پر بہت حیرت ہوئی۔ پولیس کی آمد کا سن کر عجیب سا خوف اس پر مسلط ہوا جا رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے..... سین کا ایک انتہائی قدم اسے وحشی بنا گیا تھا تو اب یہ خوف کیسا تھا؟ زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا اور پولیس اندر آگئی۔ ایس ایچ او کی معیت میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جب وہ پولیس والوں کے سہارے..... جھگڑی میں جکڑا باہر آیا تو باہر کا منظر حیران کن تھا۔ گاؤں کی بہت سی بااثر شخصیات موجود تھیں اور ان کی آنکھوں میں اپنے لیے موجود نرمی اسے حیران کیے دے رہی تھی۔ ابھی وہ پولیس وین کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک ایک طرف سے کوئی دوڑتا ہوا آیا اور پولیس والوں کے گھیرے کو پھلانگتا ہوا اس کی طرف لپکا۔

کاکے کی طرف جارحانہ انداز میں جھپٹنے والا کوئی اور نہیں بلکہ موجو تھا جسے نشے کی لت نے بالکل آوارہ اور ناکارہ کر رکھا تھا۔

بہن..... لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے بوڑھی ماں اور نکمے بھائی کا پیٹ پال رہی تھی۔

اس کے مہربان رویے نے کاکے کو حیران کر دیا۔ وہ اس کے جھگڑی میں بندھے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ کر چومنے لگا۔

''کاکے! تم ہمارے گاؤں کے ہیرو ہو..... میں تمہیں سیلیوٹ پیش کرتا ہوں۔'' اس نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ ''تم جیسے جی دار اور غیرت مند نوجوان ہمارے گاؤں کا اثاثہ ہیں۔'' اس کی مدح سرائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو جھگڑی کی زنجیر پکڑنے والا کانسٹیبل جھنجلا کر بولا۔

''اوئے جہاز! ایک سائڈ پر ہو کر اپنے ہیرو کو شاباشی دیتا رہ۔ ہماری راہ کھوٹی نہ کر۔ چل پیچھے ہٹ۔'' کانسٹیبل نے ہاتھ سے موجو کو پیچھے دھکیلا اور اسے موبائل کے اندر دھکا دیا۔

جب کاکا وین میں، پولیس اہلکاروں کے ہمراہ بیٹھ گیا تو چودھری زریاب آگے آیا۔

''کاکے! گھبرانا بالکل نہیں۔ میں تمہیں جلد سے جلد رہا کروانے کی کوشش کروں گا۔ بڑے بڑے وکیل کا بندوبست

کروں گا جو تمہیں اس کیس سے ایسے بری کروالے گا جیسے مکھن میں سے بال نکال لیتے ہیں۔"

چودھری کی باتوں سے کاکے کے دل کو بڑی ڈھارس ملی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گاڑی چل پڑی اور گاؤں کے لوگ چہروں پر ہمدردی سجائے گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہ شریف آدمی بھی بڑا مہینا ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی خواہش تھی کاکے کو کہ اسے عام انسانوں کی طرح نہ سمجھا جائے۔ اسے اتنا ہی خاص سمجھا جائے جتنا وہ ہے مگر..... توجہ کا ترسا ہوا کاکا ہر جگہ عام انسان ہی سمجھا گیا تھا لیکن آج تو..... لوگوں کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش اور تفاخر دیکھ کر اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے دل سے سارا احساسِ ندامت اور احساسِ جرم جاتا رہا۔

گاڑی پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جا رکی۔ کاکے کو حوالات کا دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا گیا۔ پہلے سے موجود اندر بیٹھے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک اس کے قریب کھسک آیا۔

"کس جرم میں آئے ہو؟" اس نے سرگوشی کی۔

"قتل کے جرم میں۔" اس نے نارمل انداز میں ایسے جواب دیا کہ جیسے کسی بہت معمولی جرم کی بات کر رہا ہو۔

"تین قتل؟" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

شکل وصورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دینے والے، اس وقت حیرت زدہ نگاہوں سے کاکے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی ماورائی مخلوق ہو۔

"تین قتل..... مگر کیوں.....؟ کس جرم میں مارا انہیں تم نے؟" اس سوال نے اسے ان سے اب غیر محسوس انداز میں دور ہونے پر مجبور کر دیا۔

"غیرت کے نام پر..... جو کوئی بھی میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کرے گا، اس کا انجام یہی ہوگا۔" کاکے کی جھکی ہوئی گردن میں اب جیسے سرایت ہو گیا۔

"ہوں..... یعنی تیری بہن بھاگ گئی اور تم نے اسے اور اس کے عاشق کو ٹھکانے لگا دیا۔ ہے نا؟"

"نہیں....." سر نے ایکدم موم کا روپ دھار لیا۔ اکڑی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کان میں پڑے۔

"تیری بہن بھاگ گئی۔" اف یہ جملہ تازیانہ بن کر اس کی روح کو گھائل کرنے لگا تھا..... اور اسے تازندگی اس زخم کی اذیت سہتے سہتے گزارنی تھی۔

وہاں پر موجود ہر شخص اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھ رہا تھا مگر وہ یہ شرمناک فقرہ سن کر جواب دینے کی سکت کھو بیٹھا تھا۔ سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگا۔

"آہ سین..... کاش یہ قدم اٹھانے سے پہلے مجھے زہر دے کر موت کی نیند سلا جاتیں تم۔ اس روز روز کی نشتر زنی سے یوں کلیجا تو چھلنی نہ ہوتا۔"

"حوصلہ کر جوان!" دور ہونے والا پھر سے قریب ہو گیا۔ اس نے کاکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اگلے دن کالے کوٹ اور سفید سوٹ میں ملبوس ایک باوقار سا وکیل تھانے میں آیا۔ وہ حوالات کی سلاخوں کے پاس آ کر رک گیا۔ کانسٹیبل نے کاکے کو پکارا تو وہ حوالات کی آہنی سلاخوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات کو اس کی طرف بڑھایا۔

"کاکے! ان کاغذات پر سائن کر دو۔ یہ تمہارا وکالت نامہ ہے جسے چودھری زریاب کے خصوصی ایما پر تیار کیا ہے میں نے۔"

اس نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر وہ کاغذات پکڑے اور اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کر دیے۔ کاغذات کا پلندا کاکے کے ہاتھ سے واپس لیتے ہوئے، اس نے اگلی بات چھیڑی۔

"کاکا! ایک اور ضروری بات بھی تم سے کرنا تھی۔"

"جی کہیے!" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بات یہ ہے کہ تمہیں عدالت میں یہ بیان دینا ہوگا کہ تمہاری بہن ایک بدکردار لڑکی تھی۔ اس کے کئی نوجوانوں سے ناجائز تعلقات تھے۔" وکیل نے جھجکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی جسے سن کر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"نہیں! میری بہن ایسی نہیں تھی۔" وہ مضطربانہ انداز میں بے اختیار چلایا۔

"کیا مطلب ایسی نہیں تھی؟ اگر ایسی نہیں تھی تو گھر سے کیسے بھاگ گئی اپنے یار کے ساتھ.....؟ دیکھو کاکے! تمہارا اس طرح کا بیان کیس کو تمہارے حق میں بہت کمزور کر دے گا کیونکہ تمہاری بہن قانونی طور پر جب چاہے جس سے چاہے شادی کر سکتی ہے۔ تم اگر کہتے ہو کہ تمہاری بہن نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی تو اس ملک کا قانون ایسا ہے کہ تمہارا موقف کوئی نہیں سنے گا۔ اس کے بجائے تم اگر بات کو اس کے کردار پر لے آتے ہو تو ہمدردی تمہارے ساتھ ہوتی جائے گی اور تمہیں کم سے کم سزا ہوگی۔" وکیل کی تاویلیں سن کر سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ سین اس کی بہن تھی۔ وہ نہ جانے کیوں اس انتہائی قدم پر گئی تھی مگر اندر سے ایک یقین زندہ تھا

Digitized by Google

کہ اس نے سجاد سے نکاح کرلیا ہوگا..... اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کتنی پاک دامن تھی وہ۔ ہاتھوں کا چھالا بنا کر تو پالا تھا اسے..... مگر اب..... اب اس کی وجہ سے کاکے کی زندگی جہنم بن چکی تھی۔ جب اس نے اس کا مان نہیں رکھا تھا تو کاکے کو اسے بدکردار کہنے میں نہیں ہچکچانا چاہیے۔ ایک بیان ہی کی تو بات ہے۔ اس کا سر جھک گیا۔

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ جیسا کہیں گے ویسا بیان ہی دوں گا۔'' اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنویں سے برآمد ہوئی۔

وکیل کے جانے کے بعد اس نے پھر سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر دے دیا۔

☆☆☆

تھانے میں ضروری کارروائی کے بعد اسے ''ڈسٹرکٹ جیل'' میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک ایک بیرک میں ان گنت انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا گیا تھا۔

یہاں کاکے کو مائی ملا۔ وہ چھوٹی موٹی وارداتوں میں، کئی مرتبہ پہلے بھی جیل یاترا کر چکا تھا۔

کاکے جیسے ناتجربہ کار کے لیے اس تجربہ کار کا ساتھ بڑا حوصلہ افزا تھا۔ جیل میں رہتے ہوئے، زندگی نے کئی نئے رخ دکھائے۔ چودھری زریاب کے کارندے اسے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں پہنچا جاتے تھے۔ کچھ عرصے بعد کیس عدالت میں لگ گیا۔ آہنی زیور کو زیب تن کیے کئی پیشیاں بھگتتے کمرائے عدالت سے بھی ہو آیا تھا وہ۔

ایک دن وہ مائی کے ساتھ مل کر میلے کپڑے دھو رہا تھا جب دو پولیس اہلکار اس کے پاس آئے۔ انہوں نے پیغام دیا کہ جیلر صاحب تجھے یاد فرما رہے ہیں۔ جیلر کے بلاوے پر وہ حیران ہوا۔

وہ ہاتھ پونچھتے ہوئے ان کے ساتھ چلنے لگا۔

چودھری زریاب کا چہرہ چھاپک سے نظر کے سامنے آیا تو اسے خیال آیا۔

''اوہ..... تو آج اتنے عرصے بعد آخر چودھری کو مجھ سے ملنے کا خیال آ ہی گیا۔'' وہ زیرلب مسکرانے لگا۔

مگر جیلر کے آفس میں قدم رکھتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اندر کا منظر دیکھ کر حیرانی عود کر آئی۔

جیلر صاحب اپنی آرام دہ کرسی میں دھنسے، میز کے اس پار اپنے سامنے بیٹھی ہوئی پری وش کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے۔

کاکے کو اس لڑکی کا چہرہ جانا پہچانا سا محسوس ہوا مگر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

اس لڑکی کے ساتھ دوسری کرسی پر ایک نوجوان براجمان تھا۔

''سر جی! مجرم حاضر ہے۔'' کاکے کی بائیں طرف کھڑے اہلکار نے جیلر کو مخاطب کیا۔

''اوہ اچھا!'' جیلر صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سامنے بیٹھی ماہ جبیں کو پیار سے مخاطب کیا۔

''مس زارا شاہ! آپ کا مطلوبہ بندہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ جو بھی سوال پوچھنا چاہتی ہیں، پوچھ سکتی ہیں۔''

''جی جی کیوں نہیں جیلر صاحب!'' زارا شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کاکے کی نظریں زارا شاہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اچانک یہ اُلجھن بھی حل ہوگئی کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ وہ ایک معروف نیوز چینل کی سینئر اینکر پرسن تھی۔

وہ اپنے جارحانہ اندازِ گفتگو سے مدِمقابل کو لاجواب کر دیا کرتی تھی۔ پتا نہیں، آج وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اس نے چائے پی کر خالی کپ میز پر رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ارے تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ پلیز۔'' اس نے مسکراتے ہوئے، بڑے نرم لہجے میں کاکے کو مخاطب کیا تو وہ جیلر کے اشارے پر بے فکری سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' زارا شاہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔ اس کی ہنسی بھی اس کی شخصیت کی طرح بڑی دل آویز تھی۔ اس کا ساتھی اب کیمرا وغیرہ سیٹ کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد اس نے کیمرا سیٹ کر کے زارا کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں نے ایک بہت حیران کن منظر دیکھا۔

اس نوجوان کے اشارہ کرتے ہی زارا شاہ نے اچانک ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا مائیک تھاما، کیمرا مین کا اشارہ پا کر ریڈی ہونے کا سگنل دیا اور کیمرے کی طرف چہرہ کر کے سخت لہجے میں بولی۔

''معزز ناظرین! یوں تو انسان اشرف المخلوقات ہے مگر جب یہی انسان انسانیت کا چولا اتار کر بربریت کا لباس پہن لیتا ہے تو اس کی سفاکی دیکھ کر خونخوار درندے بھی لرز جاتے ہیں۔ آج میں آپ کی ملاقات ایک ایسے ہی درندہ نما انسان سے کروانا چاہوں گی۔ یہ ہے تین بے گناہ

اور معصوم انسانوں کا قاتل۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا رخ کاکے کی طرف موڑ لیا۔

کیمرامین نے بھی اسے فوکس کیا۔ اب زارا شاہ کی زبان زہر اگل رہی تھی جبکہ آنکھوں سے شعلوں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پہلے سے پوچھے گئے سوال کو ایک نئے انداز میں پوچھا۔

کاکا اس کے اچانک بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر بوکھلا گیا۔

''کاکا!'' اس نے نام بتا کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لڑکی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مائیک اپنے منہ کے پاس کیا اور کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''ناظرین..... اس شخص کی بھولی صورت سے دھوکا مت کھائیں۔ یہ شقی القلب حیوان تین بے گناہ انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سب قتل اس نے گھر سے بھاگ جانے والی اپنی بہن کی وجہ سے کیے ہیں۔ کیا تصور تھا ان بوڑھے میاں بیوی کا..... جنہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تم نے؟'' اس نے مائیک کاکے کے منہ کے آگے کیا۔

''وہ..... وہ سجاد کے ماں باپ تھے۔'' اس نے تھوک نگل کر یہ مشکل جواب دیا۔ اس کی پیشانی پر پسینا قطروں کی صورت جھلملا رہا تھا۔

''سجاد کون؟'' وہ دہاڑی۔

''وہ..... جس کے ساتھ میری بہن گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔'' یہ بات کرتے کرتے اسے پھر سے اذیت کے سمندر کو پار کرنا پڑا۔

''اس میں اس لڑکے کے ماں باپ کا کیا تصور تھا؟ انہیں کیوں اتنی بے دردی سے ذبح کر ڈالا؟ اور ویسے بھی ہمارے مذہب نے لڑکی اور لڑکے کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا اختیار دیا ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو کسی کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے..... زندگی چھین کر موت کے حوالے کرنے والے؟'' وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی اور وہ بری طرح ہراساں ہو رہا تھا۔

''تم نے اپنی بہن کے آشنا کو قتل کرنے کے بجائے اس کے بوڑھے ماں باپ کو اپنی سفاکی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس بات پر کوئی شرمندگی محسوس کرتے ہو؟'' وہ پھر سے مائیک اس کی طرف بڑھائے جارحانہ انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

''ج..... جج..... جی نہیں! جی ہاں۔'' وہ بری طرح

خوشبو محسوس کریں

☆ مطالعہ کتب دل کی غذا ہے کیونکہ اس سے ہمیں اپنے معبود اور اس کی مخلوق کا حال معلوم ہوتا ہے، خاص کر انسان خود کو پہچانتا ہے۔

☆ خود اعتمادی ساری ترقیوں کا سرچشمہ ہے۔ دماغی صلاحیت اس وقت بروئے کار آتی ہے جب انسان اپنی مدد آپ کرنے لگتا ہے۔

☆ جب دنیا میں کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کا انجام بھی لازمی سوچ لو۔

☆ جس طرح مچھلی دانے کو دیکھتی ہے اور جال پر اس کی نظر نہیں پڑتی اسی طرح نادان نفع کو دیکھتا ہے نقصان پر اس کی نگاہ نہیں پڑتی۔

☆ محبت کی ترجمانی کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ ماں ہے۔

☆ ہر شخص انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ماں کے چہرے پہ دیکھ سکتا ہے۔

☆ عورت کی مقدس آغوش بہترین یونیورسٹی ہے جہاں ادب واحترام کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ جہاں انسانیت سکھائی جاتی ہے اور جہاں عدل وانصاف اور رحم وکرم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

☆ عورت اور مرد کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ڈوری اور کمان۔ ڈوری کمان کو جھکاتی ہے پھر بھی اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بیکار ہیں۔

☆ اگر تو ذرا ذرا سی بات میں اپنے دوست سے خفا ہوتا رہے تو خیال کرو کہ ایسا دوست تمہیں کہاں سے ملے گا جس سے تجھے کوئی شکایت نہ ہو۔

☆ دنیا میں اتنی جدوجہد کرنا جتنی دیر رہنا ہے اور دنیا میں اپنا مرتبہ بلند کرنے کے لیے تم جس قدر کوشش کرتے ہو کم ہے، سو اسی قدر اگر آخرت کے لیے بھی کوشش کرو تو بہت زیادہ ہے۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، بورے والا

بوکھلا چکا تھا۔ اس کے تند و تیز سوال کسی نشتر کی طرح روح کو گھائل کر رہے تھے۔

کاکے نے اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہیں جھکالیں۔

''اور تمہیں کوئی پچھتاوا بھی نہیں؟'' وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

''جی..... پچھتاوا تو ہوتا ہی ہے آخر۔'' اس نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

''ناظرین..... ذرا آپ لوگ اس کا چہرہ دیکھ کر بتائیں۔ کیا یہاں پچھتاوے جیسی کوئی چیز نظر آرہی ہے؟'' وہ اب کیمرے سے مخاطب تھی۔

کیمرامین نے کاکے کو فوکس کیا تو وہ مضطربانہ انداز میں پہلو بدلنے لگا۔

''تیسرا شخص کون تھا جو تمہاری درندگی کی بھینٹ چڑھا؟''

''وہ اختر تھا جی..... اختر پہلوان!'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''اسے کیوں مارا؟''

''اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی جی۔''

''یعنی اس بیچارے نے تمہیں تمہارے مذموم ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی اور تم نے اسے بھی اپنی راہ سے ہٹا دیا..... چ چ چ۔ اگر ہمارے ملک کا قانون تمہیں موت کی سزا نہ دے سکا تو تم باہر نکل کر کیا کرو گے؟ کس کی جان لو گے؟ اب کسے قتل کرنے کی خواہش ہے تم جیسے درندے کو؟''

''اپنی بہن سین کی جان لوں گا اور اس حرامزادے ماسٹر سجاد کی۔'' اس نے پھنکارتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیونکہ جب تک ان کو ان کے کیے کی سزا نہ دے لوں، میں سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔''

''سن رہے ہیں ناظرین! یہ سفاک درندہ آنے والے وقت کے لیے، کیسے کیسے گھناؤنے عزائم دل میں دبائے بیٹھا ہے۔ اس کی رہائی کتنی معصوم اور بے گناہوں کی زندگی کے لیے خطرہ ہے۔'' کچھ توقف کے بعد وہ پھر سے بولی۔ ''ویسے تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ تم اپنا انتقام لینے کے لیے بچ جاؤ گے۔'' اس کی بات کے جواب میں وہ کہہ بیٹھا۔

''جی چودھری صاحب کہتے ہیں وہ مجھے بچالیں گے۔''

اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

وہ جیسے سے اکھڑ گئی۔ ''یعنی اس سے بھی زیادہ خطرناک تو وہ چودھری ہے جو اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے اس کی پیٹھ پر تھپکی دے رہا ہے۔''

کاکے کو شدت سے اپنی زبان کے پھسلنے پر افسوس ہو رہا تھا مگر شکر تھا خدا کا کہ منہ سے صرف چودھری کا لفظ نکلا تھا۔ ساتھ زریاب نہیں نکلا مگر اگلے ہی لمحے یہ اطمینان غارت ہو گیا۔ وہ باخبر ترین اینکر تھی۔

''ناظرین! یہ وہ سچ حقیقت تھی جسے آپ کے سامنے لانے کے لیے ہم نے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ آپ نے دیکھا غیرت کے نام پر قتل کو کاکے کا کارنامہ بھی قرار دیا گیا۔ یہ شخص جو آپ کی اسکرین پر موجود ہے..... اس کی بہن سین کا پروفائل فوٹو بھی ہمیں حاصل ہو گیا ہے جو ساتھ ساتھ اسکرین پر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ سین ایک پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھی جس کا اسی کے گاؤں کے رہائشی ماسٹر سجاد کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا اور..... ''اف وہ زہر..... زارا شاہ کے الفاظ..... عین تہذیب کے مطابق تھے مگر اس کا لہجہ..... یوں لگتا تھا دنیا بھر کی غلاظت اس کے لہجے میں سما گئی ہو۔ اگلے کچھ لمحے اذیت کی انتہاؤں پر جا پہنچے..... سین اس کی بہن تھی۔ اس کی بے خبری پر اسے غصہ تھا مگر یہ سب کیا تھا؟ کیا بہن کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر..... زارا شاہ جیسے لوگوں کے لیے چٹخارے لینے کی چیز تھی؟ تین تین انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے اس کا دل نہیں کانپا تھا مگر زارا شاہ کی وہ لغو گفتگو اسے گھٹن میں مبتلا کر رہی تھی۔ کیمرا بند ہو گیا۔

جیلر صاحب نے بھی عاجزانہ اور فدویانہ انداز میں اسے، اس کی عمدہ کارکردگی پر خراج تحسین پیش کیا اور اس سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر رخصت کر دیا۔

''اگر اس طرح کا کوئی ہاٹ کیس دکھائی دیا تو پھر سے حاضر ہو جاؤں گی۔'' اس نے ایک بھرپور مسکراہٹ جیلر کی جانب اچھالی اور کمرے سے نکل گئی۔

کاکا جو ہکا بکا بیٹھا یہ تماشائے حیرت دیکھ رہا تھا، سر پر کھڑے کانسٹیبل نے ایک بھاری ہاتھ گردن پر مارا تو ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔

''اٹھ جا پتر! تُو تو ایسے بے فکری سے بیٹھا میڈم کے خیالوں میں کھویا ہوا ہے جیسے اس کے ساتھ ڈیٹ پر بیٹھا ہو..... یا پھر..... جیسے اپنے باپ کے ویسے پر آیا ہو۔''

اس کی بات پر دوسرے کانسٹیبل کے علاوہ جیلر بھی ہنسنے لگا۔

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سلگنے لگا۔ وہ اٹھ کر مرے مرے قدموں سے ان کے ساتھ چلتا ہوا آفس سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن ملک کے بڑے بڑے ٹی وی چینلز پر سین

Digitized by Google

اور سجاد کا تذکرہ تھا..... کاکا کے انٹرویو کو زارا شاہ اپنا من چاہا رخ دینے میں کامیاب رہی تھی اور لوگ بھی اسے سخت ترین سزا دینے کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ گھر سے بھاگنے والے جوڑوں کو تحفظ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ ششدر تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ بہن گھر سے بھاگ جائے تو وہ اسے قتل کرنے کو جائز مانتا تھا مگر کسی کی بہن کے بھاگ جانے کی خبر کو روزی روٹی بنالینا..... یہ کیسے ممکن تھا؟ کیا دنیا میں رہ جانے والا وہ آخری غیرت مند تھا؟ وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ تقدیر اس کی سوچ پر بے رحمی سے مسکرا رہی تھی۔

یہ اگلی شام کا واقعہ ہے، مانی کو دوسری بیرک میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ نئے قیدی کو بڑے کروفر سے لایا گیا تھا۔ اس کا نام عنایت تھا اور ٹھاٹ بتا رہے تھے کہ وہ چھٹا ہوا بدمعاش ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے اثر رسوخ والا بھی ہے۔ ایک لمحے کاکا کے پر نظر ڈالنے کے بعد وہ اپنی موج مستی میں گم ہو گیا۔ رات تک یہ سلسلہ تمام ہوا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

''اوئے تو مجھے جانتا نہیں ہے یا تجھے اپنی جان پیاری نہیں۔'' اس کی بات پر کاکا ٹھٹک گیا۔

''کیا مطلب بھائی۔'' کاکے کی بات کے جواب میں وہ غصے سے دہاڑا۔

''اوئے بھائی ہوگا تیرا باپ..... عنایت ڈنگا نام ہے میرا..... نام کی طرح مزاج بھی ڈنگا پایا ہے۔'' اس کی بات سن کر کاکا کے اندر کا شریف انسان بولا۔

''جی..... عنایت ڈنگا.....'' اپنی بات کا اثر ہوتا دیکھ کر اسے سکون ملا اور اس نے بڑے ٹھاٹ سے کاکا کے کو اپنے پاس بلایا۔

''ادھر آ اوئے.....'' وہ تو اس ایک ظالم رات کو چھوڑ کر سدا کا بزدل انسان تھا، چپ چاپ اس کے پاس جا کر پوچھا۔

''جی؟'' جواب میں اس کی بات نے کاکا کے کو پریشان کر دیا۔

''اوئے تجھے میں نے کہاں دیکھا ہے بھلا..... نام کیا ہے تیرا؟'' کاکا کے نے تھوک نگل کر کہا۔

''جی کاکا.....'' اس کی بات سن کر عنایت نے اثبات میں سر ہلایا مگر پھر چونک پڑا۔

''اوئے تو وہی ہے..... جس کی بہن بھاگ گئی تھی؟'' اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''جی وہی.....'' یہ بات سن کر ایک لمحے کے لیے وہ چپ ہوا پھر اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسی پر بس نہیں پھر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

''ہاہاہا..... لو سو میں بھی تو سوچوں..... تجھے کہاں دیکھا ہے۔ ہاہاہا..... اچھا تو تو ہے کاکا..... کیا نام تھا تیری بہن کا؟'' کاکے کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

''جی سین.....'' عنایت ڈنگا نے نہایت اوباشانہ انداز میں کہا۔

''سب..... این..... کیا شے تھی بھئی تیری بہن..... فوٹو دیکھا تھا اس کا ٹی وی پر..... بھاگتا تو بنتا تھا اس کا..... رس ملائی تھی وہ رس ملائی۔'' کاکے نے اب کی بار عنایت ڈنگا کی اس بات کو سن کر اپنے جھکے ہوئے سر کو مزید جھکانا چاہا مگر گنجائش بچی ہی نہیں تھی۔ شریف آدمی بھی کسی گورکھ دھندے سے کم نہیں ہوتا۔ کہاں تو اس کے اندر اتنی گھٹن بھر گئی تھی کہ ایک رات میں ہی اپنے سامنے آنے والی ہر مزاحمت سے بھڑ گیا تھا وہ اور کہاں یہ عالم کہ وکیل کے کہنے پر بہن کو بدکردار کہہ دینا اسے گوارا ہو گیا۔ زارا شاہ کے سوالات جھلکتی غلاظت..... وہ بھی اس نے سہہ لی اور اب..... عنایت ڈنگا لذت کشید کرنے والے تماشائی کی طرح اس کی بہن کے بارے میں بے تکان بولے جا رہا تھا۔ اس کی لغو گفتگو اور نان اسٹاپ ہنسی بھی جاری تھی۔ وہ سکہ بند بدمعاش تھا۔ یہاں تو اس کی اچھی خاصی صاحب سلامت بھی تھی..... اور پھر اس کی بیرک کا ساتھی..... جس کی بہن کے بارے میں..... اس کے جسمانی خدوخال پر..... اس کے معاشقے پر وہ بلا تکان بولے جا رہا تھا۔ بھلا اس کاٹھ کے الو سے کیا جھجک..... یہ اس کے پرہوس دماغ کے لیے نیا تجربہ تھا۔ لذت انگیز تجربہ..... بھائی کے سامنے بہن کی ایسی کی تیسی کر کے..... باتوں ہی باتوں میں..... سب تقدس پامال کر کے وہ ہنستا جا رہا تھا مگر اچانک ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ اسے اپنے جسم پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔ بے اختیار نظر پڑی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا ڈرا سہما..... جھکی گردن والا کاکا اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ عنایت ڈنگا کی گردن پر تھے اور سیکنڈ کے شاید دسویں حصے سے بھی کم وقت میں کاکا کے ہاتھوں کی گرفت اس کی گردن پر مضبوط ہو چکی تھی۔ عنایت ڈنگا کی جسمانی حالت قابل رشک تھی۔ ذرا سا زور لگا کر وہ دبلے پتلے وجود کے حامل کاکا کے کو پرے دھکیل سکتا تھا مگر نہیں..... عنایت ڈنگا کاکا کے کے ہاتھوں کے بجائے اس کی آنکھوں کے ذریعے موت کو اپنے جسم میں پھڑپھڑاتا محسوس کر رہا تھا۔ اف وہ آنکھیں..... خون نہیں تھا ان میں..... جنون تھا وہ مریل سا کاکا..... اپنے وجود کی ساری

Digitized by Google

طاقت ہاتھوں میں منتقل کرتا ہوا..... عنایت ڈنگا کو موت کے منہ میں دھکیل رہا تھا۔ موت شاید ایسی ہی ہوتی ہے..... بے رحم اور سفاک۔ عنایت ڈنگا کی خرخراہٹ..... دم ہارتی سانسیں..... اور اندھیروں میں ڈوبتا ذہن اور پھر فل اسٹاپ..... اندھیرا..... دی اینڈ..... وہ مر چکا تھا مگر دو ہاتھ اس کی بے جان گردن کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ بوکھلائے ہوئے سنتری..... ڈنڈوں کی بے دریغ بارش اور نہ جانے کتنے ہی لاتوں مکوں کے بعد ان دو ہاتھوں کی گرفت سے عنایت ڈنگا کی گردن آزاد کروانے میں کامیاب ہوئے۔ کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اسٹریچر، ایمبولینس، ہڑبڑاہٹ..... اور تھوڑی ہی دیر میں اس بیرک کا ہنستا کھیلتا مکین قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ کاکا دم سادھے..... پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کو تک رہا تھا۔ وہی کاکا جس نے اپنی بہن سین کو قتل کرنے کی ٹھانی تھی..... وہی کاکا..... جس نے چودھری زریاب کے کہنے پر اپنی بہن سین کو بے حیا قرار دیا تھا۔ وہی کاکا جو زاراشاہ کے سوالوں پر یوں گردن اکڑائے بات کر رہا تھا جیسے سین سے بدتر کوئی ہو ہی نہ..... وہی کاکا..... چند لمحے پہلے چوتھی بار قاتل کہلا رہا تھا اور اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کو تک رہا تھا..... اچانک وہ چیخ اٹھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔ وہ ہر کس و ناکس کے لیے گالیاں نکال رہا تھا..... مغلظات بک رہا تھا..... چودھری زریاب سے لے کر زاراشاہ تک..... اور عنایت ڈنگا سے لے کر خود اپنے آپ تک..... اس کی چیخیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ حلق پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ اس کا ذہن نہیں مان رہا تھا۔ اس کے حالات نہیں مان رہے تھے مگر وہ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہا تھا۔ ''وہ میری لاڈلی تھی..... وہ مجھ سے پریوں کی کہانی سن کر سوتی تھی۔ وہ میری پری تھی..... پاکیزہ تھی..... وہ بے حیا نہیں..... اس کا کردار برا نہیں کاکے..... کمینے..... کتے..... ذلیل..... تو جھوٹ بکتا ہے..... وہ میری لاڈلی تھی۔''

کاکے کا دماغ شاید الٹ چکا تھا مگر کیسے؟ جب دل پکار پکار کر سچ اگل رہا ہو تو کیا اسے دماغ کا الٹ جانا کہتے ہیں؟ کاکا زار و قطار رو رہا تھا۔ آج اسے لگ رہا تھا کہ اس سے گناہ ہوا ہے..... گناہ جو بھاری ہوتا ہے..... گناہ جو آہ و زاری ہوتا ہے.....

وہ رات اس بیرک کے مکینوں کے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی تھی۔ جو ظلم کو زیور سمجھ کر اپناتے ہیں، ان کے مقدر میں شاید کاکے جیسی دربدری لکھ دی جاتی ہے۔ کہاں تو کچھ دن پہلے کا پرامن، شریف اور صلح جو کاکا اور کہاں یہ کال کوٹھری میں خود سے ہونے والے چوتھے قتل پر آہ و زاری کرتا شخص..... مگر کاکا یقینی طور پر چوتھے قتل پر نہیں رو رہا تھا..... جو ایک بار قاتل بن جائے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ کاکا بھی عنایت ڈنگا کو مارنے پر کیسے پشیمان ہو سکتا تھا..... یہ پشیمانی..... یہ آہ و زاری کسی اور وجہ سے تھی۔ اس کے اندر کا یقین ڈھے گیا تھا۔ ریت کی دیوار کی طرح..... اسے اچھی طرح یاد تھا وہ بہن کو نام سے نہیں پکارتا تھا، ہمیشہ لاڈلی کہہ کر بلاتا تھا۔ بس ایک رات..... ایک سیاہ رات ہی تو لگی تھی لاڈلی سے سین تک کے بے رحم سفر میں۔ وہ گھر سے بھاگ گئی تھی اور اسے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھنے والا کاکا اس سے شدید ترین نفرت کرنے لگا تھا۔ پھر ماسٹر سجاد کے بوڑھے والدین اور پہلوان اختر نفرت کی اس آندھی کا شکار ہو گئے تھے اور اب..... اسی بہن کی لفظی بے توقیری پر عنایت ڈنگا کا قتل بتا رہا تھا کہ کاکے کے اندر دور کہیں سین اب بھی لاڈلی ہی تھی۔ کچھ ایسا ضرور تھا جو کاکے کو انتہا پر جا کر بھی سین سے نفرت کرنے پر آمادہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ کچھ ''کیا کچھ'' تھا، کاش کاکا جان پاتا۔

بیرک میں ہونے والے قتل نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ عنایت ڈنگا اور کاکے کے چرچے میڈیا کی زینت بنے ہوئے تھے۔ ضابطے کی کارروائی اور لاش ورثاء کے حوالے کیے جانے تک..... کاکا بھی پولیس کی معیت میں قریبی اسپتال منتقل کیا جا چکا تھا جہاں ڈاکٹرز نے اس کی دماغی حالت کو غیر تسلی بخش قرار دیا تھا۔ جیل انتظامیہ اپنی ریپوٹیشن پر اٹھنے والے سوالات سے پہلے ہی بوکھلاہٹ کا شکار تھی چنانچہ کاکے کو مسلسل دماغی امراض کے اسپتال میں رکھا جا رہا تھا تاکہ اس کی کوئی بھی مزید حرکت جیل انتظامیہ کی قابلیت پر سوالیہ نشان بن کر نازل نہ ہو جائے۔ تین دن بعد کی بات ہے..... رات آدھی بیت چکی تھی۔ کاکا مسلسل خواب آور ادویات کے زیر اثر گہری نیند میں تھا۔ جب اچانک اسپتال کے پُرسکون سناٹے میں دھماکے اور فائرنگ کی آوازوں نے ہلا بول دیا۔ وہ پندرہ افراد کا مسلح گروہ تھا۔ ان کے قدم تیزی سے دوسری منزل پر موجود ایک وارڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے مطلوبہ وارڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں مریض کا لباس پہنے طویل قامت شخص بے تابی سے ان کا منتظر تھا۔ وہ سب اس کے گرد ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے تو اس شخص نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شخص ان لوگوں کے لیے انتہائی اہم ہو۔ دراز قد لیڈر نے ایک بیڈ پر..... خواب آور ادویات کے

Digitized by Google

زیر اثر سوئے ہوئے مریض کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئے۔ وہ اپنے لیڈر کے مزاج آشنا تھے۔ اگلے دس منٹ میں ہر رکاوٹ کو روندتے ہوئے وہ مریض اور لیڈر وین میں شفٹ ہو چکے تھے اور وین فراٹے بھرتی نامعلوم منزل کی طرف جا رہی تھی۔

شاکر نام تھا اس کا، مگر اسے سب پیرو کہتے تھے۔ ساتھیوں کے ہمراہ مفرور ڈاکو تھا۔ کئی قتل اس کے کھاتے میں تھے۔ سفاک انتہا درجے کا تھا۔ ایک بار نانا کا لگا کر بس لوٹ رہا تھا کہ اس کی سفاکیت مکمل کر سامنے آگئی۔ سات افراد پر مشتمل ایک فیملی کو بس سے اتارا..... بچے بھی تھے، عورتیں بھی تھیں مگر اس کا ظلم ذرا بھی نہیں ہچکچایا۔ سات افراد کے سروں میں گولیاں مار کر انہیں سفاکی کی بھینٹ چڑھانے والا شاکر پیرو تب سے لے کر اب تک..... پولیس کو اپنے پیچھے دوڑاتا آیا تھا۔ بلا کا عیار تھا۔ اصل چہرہ چھپا کر رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب گرفتار بھی ہوا تو پولیس کو بھنک تک نہیں پڑی کہ وہ شاکر پیرو کو شکنجے میں کسنے میں کامیاب ہو گئے ہیں..... دس دن لگے تھے اثر رسوخ استعمال ہونے میں اور گیارھویں دن اسے معمولی سیکیورٹی کے ہمراہ اسپتال لایا گیا تھا..... اور بیچارے لانے والے..... اس وقت میڈیا کی زینت بنے لاشوں کا روپ دھار چکے تھے..... وہ تو جیسے دہشت کا دیوتا بنتا جا رہا تھا اور اب جبکہ وہ قانون کی نااہلی کی بدولت آزاد فضاؤں میں سانس لے رہا تھا تو بہت سی سانسیں گھٹن کا شکار ہونے والی تھیں۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا مگر..... وہ خطرناک ترین شخص جاتے جاتے اپنے ساتھ ایک ایسے بے ہوش مریض کو لے کر گیا تھا جس نے چند دن پہلے ہی اپنی زندگی کا چوتھا قتل کیا تھا۔ کاکا..... جس کا کبھی بھی پیرو سے کوئی گٹھ جوڑ نہیں رہا تھا، اسے ایسی حالت میں ساتھ لے کر جانا کسی معمے سے کم نہ تھا۔ کاکے کی شہرت پہلے ہی کیا کم تھی..... اب پیرو کے واقعے نے کاکے کی ذات کو بے انتہا سوالوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا جب اچانک کاکے کے خوابیدہ ذہن نے ہوش کی دنیا کی سرسراہٹ سنی۔ دھیرے دھیرے اندھیروں میں ڈوبا ذہن جاگنے لگا۔ کچھ شور سا تھا جسے اس کا ذہن شناخت کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ بہت سی آوازیں..... اجنبی سی..... نا آشنا سی..... اس کے خوابیدہ پپوٹوں میں حرکت ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی پھر اسے لگا کہ وہ منظر کو شناخت کرنے لگا ہے۔ یہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ آرام دہ بستر پر وہ دراز تھا۔ اس کے بازو پر کینولا پاس کیا گیا تھا اور اس

جان پہچان

''بھئی تم کمال کرتے ہو۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''ہاں ہاں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن ہم تو بہ مشکل تمام صرف تین بار ملے ہوں گے اور تم مجھے جانتے بھی نہیں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میں نے تین سال اس بینک میں نوکری کی ہے جس میں تمہارے ابا میاں کا اکاؤنٹ ہے۔''

☆☆☆

کام کی باتیں

☆ کچھ دکھ راکھ کے مانند ہوتے ہیں، ذرا سا کریدیں تو آنچ دینے لگتے ہیں۔

☆ خوش رہنے کی ایکٹنگ کیجیے، رفتہ رفتہ آپ حقیقتاً مسکرانا اور خوش رہنا سیکھ جائیں گے۔

☆ زندگی مضبوط قوتِ ارادی کے بغیر ناکامیوں کے پرخار راستوں سے اٹا جنگل ہے۔

☆ اگر آپ دوسروں کے ہمیشہ دوست رہنا چاہتے ہیں تو انا کا لفظ اپنی لغت سے نکال ڈالیے اور خودداری کا لفظ جلی حروف میں لکھ لیجیے۔

☆ عقلیت پسند آخری عمر تک مشکوک رہتے ہیں۔

☆ محبت دی جاتی ہے، ہو جاتی ہے مگر خریدی نہیں جا سکتی۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

چور

بلاشبہ چور ایک برگزیدہ ہستی کا نام ہے بلکہ شرافت کا دوسرا روپ ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے شرافت نہیں ملتی ایسے ہی چور بھی نہیں ملتا۔ چور کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں چور کی آمد کا غلغلہ ہو وہاں لوگ راتوں کی نیند بھول کر اس کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

چور ایک ایسی دوا ہے جس کے نام سے نیند اڑ جاتی ہے شاید اسی لیے سفارش کے ذریعے ہر محکمے میں ایسے لوگ بھرتی کیے جا رہے ہیں تاکہ ہم غفلت کی نیند نہ سو سکیں۔

اقتباس از: ڈاکٹر یونس بٹ

انتخاب۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

وقت بھی ڈرپ لگی ہوئی تھی پھر اس کی نظر بیڈ کے ساتھ کرسی پر براجمان شخصیت پر پڑی۔ ایک لمبا تڑنگا جوان جس کی لمبی لمبی زلفیں اور چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ وہ کمرے میں موجود ایک اور ملازم نما شخص سے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ شاید ان کی یہی گفتگو کاکے کی بیداری کا سبب بنی تھی۔ کاکے نے بہت زور ڈالا ذہن پر مگر اسے یاد نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے۔ اتنے میں کاکے کو جاگتا دیکھ کر وہ شخص کاکے کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ ''تو تمہیں ہوش آ گیا کاکے۔'' کاکے کو اپنا نام اجنبی نوجوان کے منہ سے سن کر محسوس ہوا کہ وہ شخص اس کے بارے میں شاید بہت کچھ جانتا ہے۔

''تم کون ہو..... یہ کون سی جگہ ہے؟'' کاکے کے سوال پر وہ شخص مسکرا دیا۔

''ایک سانس میں اتنے سوال؟ میں کون ہوں یہ جاننا تمہارے لیے غیر ضروری ہے۔ تم اس وقت میرے ڈیرے پر ہو اور یہاں تم اس لیے آئے ہو کیونکہ سرکاری اسپتال سے تمہیں میں لایا ہوں اپنے ساتھ۔'' کاکا اجنبی جوان کی اس بات پر یکلخت سن ہو کر رہ گیا۔ اس شخص نے ڈور کا سرا اپنے جواب میں کاکے کو دے ڈالا تھا اور اسی سرے نے کاکے کو خود پر بیتی ساری بپتا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یاد دلا ڈالی تھی۔ ساری باتیں ایک طرف اور اپنی لاڈلی بہن سین کا دکھ ایک طرف۔ وہ قاتل تھا..... اسے موت کی سزا بھی کم تھی مگر..... پہلی بار وہ یہ سوچ کر فکر مند ہو رہا تھا کہ سین کہاں ہے۔ اس نے ماسٹر سجاد کے ساتھ بھاگ جانے جیسا انتہائی قدم کیوں اٹھایا مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ بغیر مطلب کے تو تم بھی مجھے یہاں نہیں لائے ہو گے۔'' کاکے کے سوال کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے اجنبی جوان نے کہا۔

''تم یہ سوال اس لیے کر رہے ہو کیونکہ تم مجھے جانتے نہیں۔ شاکر نام ہے میرا..... لوگ پیرو ڈاکو کے نام سے یاد کرتے ہیں مجھے..... اور پیرو ڈاکو اتنا بے دست و پا نہیں ہے کہ اسے تجھ جیسے سے کام پڑ جائے۔'' کاکا یہ بات سن کر پریشان ہو گیا۔

پیرو ڈاکو کا نام اس نے سن رکھا تھا۔ انتہائی سفاک انسان تھا۔ کتنے ہی بے گناہوں کا قتل اس کی گردن پر تھا..... اور اب کاکے کو یہ بھی یقین ہو چلا تھا کہ اس جیسا شخص کاکے کا محتاج نہیں ہو سکتا تھا مگر پھر.....؟

''پیرو ڈاکو..... اگر ایسا ہے تو تم نے یہ احسان کیوں کیا مجھ پر..... وہیں مر جانے دیا ہوتا۔'' کاکے کی بات سن کر پیرو ڈاکو مسکرایا اور کہا۔

''ٹھیک کہتا ہے تو..... تجھ جیسے اسی قابل ہیں..... بس ایک وجہ تجھے اب تک زندہ رکھنے میں معاون بنی ہوئی ہے اور وہ ہے عنایت ڈنگا کا قتل..... غدار تھا وہ..... ہماری مخبریاں کرتا تھا۔ مجھ سے بچنے کی خاطر جیل چلا گیا مگر وہاں تیرے ہاتھوں آئی موت نے اس شخص خنزیر کا کام تمام کر دیا مگر تجھے یہاں لانے کا مقصد ایک اور بھی ہے۔ یہ بتا تیری بہن کہاں ہے؟ اور وہ جس کے ساتھ بھاگی تھی اس کی کیا خیر خبر ہے؟'' پیرو ڈاکو کی بات پر کاکا دم بخود رہ گیا۔

''اگر میں جانتا ہوتا تو اب تک اس تک پہنچ چکا ہوتا مگر تمہیں سین اور ماسٹر سجاد سے کیا دلچسپی ہے؟'' پیرو ڈاکو کاکے کی بات سن کر زور سے ہنسا۔

''دلچسپی مجھے نہیں تجھے ہونی چاہیے۔ پیرو ڈاکو کسی کا احسان خود پر نہیں رکھتا۔ تو نے عنایت ڈنگا کا قتل کر کے میرے سینے کی جلتی آگ پر پانی ڈالا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تجھے ان کمینے اور مفاد پرست گدھوں کے درمیان تماشا بننے کے لیے چھوڑ دیتا۔'' کاکے نے پیرو ڈاکو کی بات پر غور کیا اور اچانک اس کے دل میں امید جاگی۔

''تمہارا مطلب ہے..... تم سین کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو گے؟'' پیرو ڈاکو نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

''اسی لیے تو تجھے وہاں سے لایا ہوں..... پر ایک بات بتا، وہ دونوں تجھے مل بھی گئے تو، تو کیا کرے گا؟'' یہ بہت مشکل سوال تھا جو پیرو ڈاکو نے کر ڈالا تھا..... کبھی وہ طیش میں آتا تھا تو اس کا دل بے اختیار دونوں کو قتل کر دینے کو چاہتا تھا اور کبھی سین کے خلاف کی گئی تعزیرات بھی اسے قاتل بنا دیتی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیا چیز تھی اس کے اندر جو اسے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ بنا تی تھی۔

''پیرو! مجھے نہیں معلوم میں ان کے ساتھ کیا کروں گا..... مگر میں سین سے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' پیرو کا کے کی بات سن کر کہنے لگا۔

''اچھی بات ہے مگر..... یہ بات تجھے چار چار قتل کرنے سے پہلے کیوں نہیں سمجھ آئی؟ لوگ مجھے پیرو ڈاکو کہتے ہیں..... اور ڈاکو کا کام لوٹنا ہوتا ہے بس..... مگر آج مجھے کچھ اور کرنا پڑ رہا ہے۔ تجھ جیسے غیرت مند کی آنکھوں سے غیرت کی بندھی پٹی اتارنی پڑ رہی ہے۔ اب غور سے میری بات سن عقل کے اندھے۔ میں تجھے بتاتا ہوں سین نے..... تیری بہن نے ایسا کیوں کیا؟'' ان الفاظ نے کاکے کی بے چینی کو بڑھا دیا۔ پیرو ڈاکو کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سین کے متعلق بہت کچھ جانتا

ہے۔ ایسا بہت کچھ جو کاکا کے ذہن میں چبھتے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ وہی ایک سوال کہ سین رات کی تنہائی میں پرائے مرد کے ساتھ کیوں بھاگی؟

پیروڈا کو نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ”وہ جو تیرا ہمدرد تھا نا چودھری زریاب..... اس کا آوارہ بیٹا چودھری فواد بری نظر رکھنے لگا تھا تیری بہن پر۔ ایک دو بار رستے میں ہتھ بھی پکڑ لیا تھا سین کا مگر عین موقع پر ماسٹر سجاد کے آنے سے چودھری فواد اپنے مکروہ ارادے پورے نہیں کر پایا اور سجاد کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا چلا گیا۔ سین بہت پریشان تھی کہ کیا کرے۔ اسی دوران ماسٹر سجاد نے اسے تحفظ دینے کی قسم کھائی اور اس کو اپنی خلوص بھری چاہت کا یقین دلایا مگر سین لمحوں کی اس نئی چاہت کو تیری برسوں کی پُرخلوص محبت پر قربان نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سجاد سے رشتہ بھیجنے کا کہا اور تجھے اعتماد میں لینا چاہا۔ بہن تھی..... شرم والی تھی..... تجھ سے براہِ راست بات کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی..... اسی لیے تجھے اشاروں کنایوں میں سجاد کے حوالے سے بتایا مگر یاد ہے تجھے..... تو ہتھے سے اکھڑ گیا تھا اور تو نے کہا تھا کہ سجاد بدنسلا ہے۔ اس کی ماں خاندان سے باہر بیاہی گئی تھی۔ وہ لوگ ذات کے موچی تھے۔ تیری اس قدر حقارت دیکھ کر سین نے ٹوٹے دل کے ساتھ سجاد کو منع کر دیا رشتہ بھیجنے سے مگر یہ مسئلے کا حل تھوڑی تھا۔ چودھری فواد کی بڑھتی گستاخیاں اس بات کی متقاضی تھیں کہ اس مسئلے کا فوری حل نکالا جائے۔ سین تحفظ کا شکار تھی۔ وہ تجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ تو شرافت کا پتلا تھا اور انتہا کی سیدھا بھی تھا..... مگر اس سے بھی بڑھ کر..... تو اس سے دیوانوں جیسی محبت بھی کرتا تھا۔ تجھے چودھری فواد کے عزائم کے بارے میں بتا کر..... شاید وہ چودھری فواد سے تو نجات پا لیتی لیکن بدلے میں تجھے کھونا یقینی تھا۔

”دوسری جناب ماسٹر سجاد جیسے انسان کی محبت تھی جو اس کے ایک اشارے پر چودھری فواد سے ٹکرا جانے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا..... قانون جانتا تھا۔ شہر میں اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی تھے۔ انہیں بیچ میں ڈال کر وہ چودھری فواد کو منہ کی کھانے پر مجبور کر سکتا تھا مگر اس میں سب سے بڑی قباحت سین تھی۔ ایسا کرنے سے وہ بدنام الگ ہو جاتی۔ اور تجھ سے بھی اندیشہ تھا کہ تو طیش میں آ کر کچھ حماقت کر ڈالتا اور اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو یہ سوال تو ضرور اٹھنا تھا کہ ماسٹر سجاد کس حیثیت سے سین کے لیے اتنا کچھ کر رہا ہے۔ ماسٹر سجاد تعلیم یافتہ تھا، اس کے پاس سو دلیلیں تھیں ذات پات کی نفی کی مگر سین..... اس نے تجھ پر پی ایچ ڈی کی ہوئی تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ تیرے اندر بھری یہ ذات پات کی نفرت..... کئی نسلوں نے بوئی ہے، ماسٹر سجاد کی علمی دلیلیں اسے کھرچ نہیں سکتیں۔

اس رات بھی ماسٹر سجاد یہ ساری باتیں سوچ کر پریشان تھا کہ اسے اچانک طافو کا فون آیا۔ طافو اس کا شاگرد تھا جو کچھ سال پہلے اسکول سے بھاگ گیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے دل سے ماسٹر سجاد کی قدر نہیں بھاگ سکی تھی۔ ان دنوں طافو چودھری فواد کے ایک جونیئر کارندے کے طور پر اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اب بھی اس نے ماسٹر سجاد کو چودھری فواد کے تازہ ترین عزائم سے آگاہ کیا تھا جس کے مطابق..... آج رات سین کے گھر ہلا بول کر اسے اٹھانا تھا اور کاکا کے کورستے سے ہٹانا تھا۔ یہ منصوبہ یقینی طور پر روایتی مگر بے داغ تھا۔ نیند سے ہڑبڑا کر جاگنے والا کاکا کتنی دیر مزاحمت کر سکتا تھا۔ وہ سین کو لے جاتے..... کاکا زخمی ہو جاتا یا پھر قتل..... اور اگلی صبح چودھری زریاب بندوں کو تھانے دوڑاتا کہ پنڈ میں قتل کی واردات ہو گئی ہے۔ ماسٹر سجاد کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے مختصر وقت تھا۔ وہ فوراً سین کے پاس پہنچا اور اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ ساتھ ہی ماسٹر سجاد نے سین کو اس کے ساتھ بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ سین یہ سب جان کر پریشان ہو گئی مگر اب فیصلہ کن موڑ آ چکا تھا۔ عام حالات میں وہ کبھی بھی ایسا فیصلہ نہ کرتی کیونکہ یہ فیصلہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی کی نظروں سے گرا دیتا مگر ماسٹر سجاد کے بتائے ہوئے اس آپشن میں اس کے بھائی کی سلامتی تھی۔ محبت حساب کتاب میں ایسی ہی ہوتی ہے شاید..... بھائی کی محبت برسوں پر پھیلی ہوئی تھی اس لیے دل نے بھائی کی سلامتی کے حق میں فیصلہ دے ڈالا۔ ماسٹر سجاد کی چاہت چند روزہ تھی اس لیے وہ اسے داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جلدی سے کچھ ضروری چیزیں اپنے پیارے ویر کے لیے..... اداس نظروں سے گھر کو دیکھا اور سجاد کا ہاتھ تھامے چپ چاپ رخصت ہونے لگی۔ ماں باپ تھے نہیں..... ڈبڈبائی آنکھوں سے آخری بار تجھے دیکھا تھا اور چپ چاپ گھر چھوڑ دیا تھا اس رات.....“

پیروڈا کو مسلسل بولتے بولتے خاموش ہوا تو کاکا کے کو یوں لگا جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے والی فلم یکدم رک سی گئی ہو۔

لفظ تھے یا برچھیاں تھیں.....

کاکا کے کو اس گڈریا مولوی صاحب کی جھڑکی کے بیان میں کی گئی ایک بات یاد آئی جس میں جہنم کا تذکرہ تھا۔ انہوں

نے کہا تھا گناہ گار لوگ جب عذاب کی تکلیف دیکھیں گے تو اس قدر پچھتائیں گے کہ اپنا ظلم کرنے والا ہاتھ منہ میں ڈال کر چبا ڈالیں گے۔ کاکے کو خبر بھی نہ تھی کہ وہ کب سے رو رہا ہے۔ آنسوؤں نے اس درجہ شدت سے ہجرت باندھی کہ اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ تو سبین میری لاڈلی..... مجھے بچانے کے لیے بھاگی تھی گھر سے..... اور میں سمجھتا رہا وہ بے حیا تھی..... خود پر قابو نہیں تھا اسے..... پرائے مرد کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ ایک سوال کا جواب کاکے کو نہیں ملا تھا جس پر اس نے بائیس سال کی اس کی پاک دامنی پر سوالیہ نشان لا کھڑا کیا تھا.....

انسان ایسا کیوں ہوتا ہے؟ عمر بھر کی محبت کو اپنوں کی ایک غلطی پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ چبا ڈالتا تو بھی ناکافی ہوتا کیونکہ مجرم اس کا ہاتھ ہی نہیں اس کا دل بھی تھا..... جس نے پریوں جیسی لاڈلی بہن کو بے حیا سمجھا تھا۔ کبھی کاغذ کے بنے جان ٹکڑے پر لکھی مصلحت زدہ سطروں کی وجہ سے..... کبھی زار اشاہ جیسی جینئل رینگنگ کی ڈسی ہوئی اینکر کے مکروہ سوالوں کی وجہ سے اور کبھی چودھری زریاب کی جانب سے کیے گئے وکیل کے تیار کردہ بیان پر آمین کہہ کر۔ کاکا زار و قطار رو رہا تھا۔ آج جیسے یوم جواب تھا۔ اسے جواب مل چکا تھا کہ سبین نے اس کی سلامتی کی خاطر خود کو اس کی نظروں سے گرانا منظور کیا تھا۔ کاکا نہ جانے کتنی ہی دیر روتا رہا پھر اچانک پیرو ڈاکو دوبارہ کہنے لگا۔

"بس چپ کر جا..... مرد روتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔"

کاکے نے آنسو پونچھے اور بے اختیار ہو کر پوچھا۔ "تم یہ سب کیسے جانتے ہو اور میری سبین اب کہاں ہے؟" پیرو ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر کہنے لگا۔

"پہلے تو یہ بات جان لے تو کہ وہ دونوں جب گاؤں کی حدود سے نکل رہے تھے تو تیرے گھر آنے والے چودھری فواد کے بندوں نے دونوں کو دیکھ لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں پکڑ پاتے، ماسٹر سجاد اپنی موٹر سائیکل پر سبین کو لے کر اڑن چھو ہو گیا۔ پھر کچھ دن پہلے مجھے چودھری زریاب نے ایک لڑکی کی تلاش کا کام سونپا تھا۔ وہ لڑکی ڈھونڈنے اور اسے چودھری زریاب کے حوالے کرنے تک..... میں اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ چودھری زریاب کا اس لڑکی سے مدعا کیا ہے۔ میں نے لڑکی کو چپ چاپ چودھری زریاب کے حوالے کیا اور اپنے پیسے وصول کر لیے جو کہ میرا دھندا ہے۔ اس سے اگلی رات..... میرے ڈیرے پر حملہ ہوا..... چار بندے زخمی ہوئے۔ ایک شکاری کتا بھی کام آ گیا لیکن حیران کن طور پر یہ سب نقصان پہنچانے والا صرف ایک آدمی تھا جسے بڑی مشکلوں سے زندہ پکڑا گیا۔ مجھے ایک طرف تو اپنے بندوں کی بزدلی پر تاؤ آ رہا تھا اور دوسری جانب اس بندے کی جی داری حیران کر رہی تھی۔ تب اس نے بتایا کہ وہ ماسٹر سجاد ہے اور اپنی بیوی کو چھڑانے آیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اسی لڑکی کی بات کر رہا ہے جو میں چودھری زریاب کے حوالے کر چکا ہوں۔ یہ میرے لیے اب غیر اہم بات تھی۔ اہم تو یہ تھا کہ وہ جی دار شخص نتیجے کی پروا کیے بغیر شیر کی کچھار میں گھس آیا تھا۔ میں چاہتا تو اس کو چپ چاپ زندہ دفن کروا دیتا یہیں ڈیرے کی مٹی میں مگر مجھے اس کی جی داری پسند آئی تھی اس لیے میں نے اس کو آزاد کرتے ہوئے بتا دیا کہ سبین اب کہاں ہے۔ وہ حقیقت جان کر بے تابی سے وہاں سے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے رات تک رکنے پر مجبور کیا۔ اس رات اس نے مجھے سارے واقعات تفصیل سے سنائے اور تب پہلی بار مجھے تیرے بارے میں معلوم ہوا۔ اگلے دن سجاد کے جانے سے پہلے ہی چودھری زریاب کا کارندہ آن پہنچا جس نے سجاد کو میرے ڈیرے پر دیکھ کر چودھری زریاب کو مطلع کر دیا۔ چودھری زریاب نے مجھ سے سجاد کی حوالگی کا مطالبہ کر ڈالا جو میرے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اسی بات پر چودھری زریاب کی مجھ سے ٹھن گئی اور چودھری زریاب نے پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ آگے کے واقعات سے تم آگاہ ہو کہ کس طرح میں ان کے چنگل سے آزاد ہوا اور آتے آتے تمہیں بھی اپنے ساتھ لے آیا۔"

پیرو مسکراتے ہوئے خاموش ہوا تو کاکے نے سر سراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تو اس وقت ماسٹر سجاد تمہارے پاس ہے؟" جواب میں پیرو نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں..... وہ یہاں سے جا چکا ہے اور میرے ایک بندے نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اطلاع دی ہے کہ اسے اس کے آبائی گاؤں جاتے دیکھا گیا ہے۔" آبائی گاؤں کی بات پر کاکے کے ذہن میں بے اختیار ماسٹر سجاد کے والدین کی خون آلود لاشیں گھوم کر رہ گئیں۔ کچھ ندامتیں آتے آتے اتنی دیر کر دیتی ہیں کہ تب تک سب کچھ داؤ پر لگ چکا ہوتا ہے۔ کاکے کو بے اختیار خیال آیا کہ وہ سبین کے ساتھ ساتھ سجاد کا بھی مجرم ہے۔ اب اس کا سجاد سے سامنا ہوا تو سجاد اپنے ماں باپ کے قاتل کا وجود کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ اچانک ایک خیال نے کاکے کو لرزا دیا۔

"پیرو! سجاد سبین کو لینے گیا ہے تو چودھری زریاب سے ٹکراؤ لازمی ہے۔ وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکے گا۔" پیرو کاکے کی بات سن کر کہنے لگا۔

''ہاں یہ میں جانتا ہوں..... اسی لیے میں اپنے بندوں کے ہمراہ تھوڑی دیر میں گاؤں کی طرف نکلنے والا ہوں۔ ماسٹر سجاد بھی رات گہری ہونے کا انتظار کرے گا، تب تک ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔'' کاکا، پیرو کی بات سن کر تڑپ کر اٹھا۔

''ٹھیک ہے میں بھی تیار ہوں جانے کے لیے۔'' پیرو کے چہرے پر تردد کے آثار نمودار ہوئے۔

''تم..... مگر تم کیا کرو گے؟ تم تو زخمی ہو۔'' کاکے نے یہ بات سن کر کہا۔

''پیرو..... سین آج اس درندے کی حویلی میں ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ میں ہوں۔ کچھ قرض مجھ پر ایسے ہیں جنہیں ادا کرنے کا یہی موقع ہے۔'' یہ کہہ کر کاکا ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

پیرو نے ایک لمحے کے لیے اس کے جذبات کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم آدھے گھنٹے تک نکل رہے ہیں..... تیار رہنا۔'' پیرو نے کہا تو کاکا بولا۔

''پیرو..... تم اتنے بے رحم ڈاکو لگتے تو نہیں ہو؟'' جواب میں پیرو مسکرایا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تم بھی تو قاتل نہیں لگتے۔'' یہ سن کر کاکا نے سر جھکا لیا۔

''اپنا مواز نہ مجھ سے نہ کرو۔ میں خود کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔'' جواب میں پیرو پہلے مسکرایا پھر ہنسنے لگا۔ وہ پہلی بار کھل کر ہنسا تھا۔

''کاکے.....! میں تو تب سے قابلِ نفرت ہوں جب سے میں چھ سال کا تھا اور ماں کو اس لیے میری آنکھوں کے سامنے میری دادی نے زندہ جلا دیا تھا کہ میرا باپ اپنے سے کم ذات کے خاندان سے میری ماں کو بیاہ کر لایا تھا۔ پھر میری دادی نے میرے باپ کی دوسری شادی ہم پلہ برادری میں کروائی..... پھر میرے بہن بھائی دنیا میں آئے تو تب..... مجھ سے روا رکھے جانے والا سلوک اور کم ذات کے لقب نے..... میرے اندر درندہ بو دیا۔ قابلِ نفرت تو کوئی نہیں ہوتا کاکے! قابلِ نفرت ہم بن جاتے ہیں چپ چاپ..... انجانے میں..... جیسے تو بنا۔ وہی ذات پات وہی خاندان برادری کا تعصب تجھے بھی ایسا بنا گیا۔ خیر میں ذرا تیاریاں دیکھ لوں پھر نکلتے ہیں۔'' آخری بات اس نے جلدی سے مکمل کی۔ کاکے کو یوں لگا جیسے اس کے لہجے میں آزردگی اتر رہی تھی جسے وہ کاکے پر عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ دو جیپیں تھیں جو طوفانی رفتار سے سفر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ سب اسلحے سے لیس تھے۔ کاکا بھی ایک عدد پستول اپنی گود میں رکھے ہوئے پیرو کے ساتھ چپ چاپ رستوں کو دیکھ رہا تھا۔ چودھری زریاب عیار تھا تو اس کا بیٹا عیاش..... اور سین ان کے چنگل میں تھی جبکہ کاکے کی لاڈلی بہن کا مجرم اس سے کافی دور۔ یہی بات اسے مضطرب کر رہی تھی۔ ادھر پیرو کے چہرے پر ایک گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ یہ تین گھنٹے کا سفر تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر بھی وہ رکے نہیں بلکہ سیدھا آگے بڑھ گئے۔ پروگرام یہی تھا کہ گاؤں کی عقبی سمت سے گاؤں میں داخل ہو کر حویلی پر دھاوا بولا جائے۔ تھوڑی ہی دور جا کر دونوں جیپیں ایک طے شدہ مقام پر رک گئیں۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سناٹے میں کاکے نے پیرو کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔ اتنے میں سامنے سے کسی نے ٹارچ روشن کر کے بجھا دی۔ جواب میں پیرو نے بھی ایسا ہی کیا تو ایک ہیولا پیرو کی طرف بڑھا۔ قریب آنے پر پیرو نے اسے اپنے کارندے کے طور پر شناخت کیا۔

''سائیں..... حویلی کی طرف جانا فضول ہے۔ وہ سارے ڈیرے پر ہیں..... کچھ مہمان بھی بلا رکھے ہیں شہر سے..... اور سین بی بی کو ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچایا گیا ہے۔'' جواب میں پیرو نے کاکے کو ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پوچھا۔

''سین ٹھیک تو ہے؟''

''سائیں! سین بی بی تو ٹھیک ہے مگر انہوں نے اس کے گھر والے کو گاؤں میں دیکھ لیا ہے اسی لیے وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

یہ بات سن کر پیرو نے کچھ سوچا پھر ایک اشارے سے کارندے کو رخصت کر دیا۔ اب ترتیب کچھ یوں بنی تھی کہ کاکے اور پیرو سمیت پانچ بندوں نے ڈیرے کا رخ کرنا تھا جبکہ دوسری جیپ پر مشتمل بندوں نے ڈیرے کے داخلی اور خارجی راستوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ماسٹر سجاد کی آمد کی صورت میں اسے کمک بھی فراہم کرنا تھی۔ دونوں گاڑیاں ایک بار پھر روانہ ہو گئیں۔ اب کی بار ان کی منزل حویلی کے بجائے چودھری زریاب کا ڈیرا تھا۔ انہیں وہاں پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ڈیرے کے رستے سے ذرا پہلے ہی انہوں نے جیپ ایک ویران کھیت میں چھوڑی اور اسلحہ لے کر نیچے اتر آئے۔ پیرو نے کاکے سمیت سب کو ایک ایک خنجر دیا

اور سمجھایا۔

''ڈیرے پر چودھری زریاب..... اس کا بیٹا چودھری فواد اور شہر سے بلائے گئے مہمان بھی ہیں اس لیے ڈیرے پر یقینی طور پر انسانوں کے علاوہ چودھری زریاب کے پالتو کتے بھی ہوں گے۔ میری معلومات کے مطابق ان کی تعداد چار سے زیادہ نہیں۔ اسی لیے اگر وہ مزاحم ہوں تو گولی کے بجائے خنجر سے کام چلانا۔'' یہ کہہ کر پیرو بنے کاکے سے پوچھا۔ ''کاکے اڈیرے کو جانے والا عقبی رستہ کونسا ہے؟''

جواب میں کاکے نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے..... میں تمہیں اس رستے سے لے کر جاسکتا ہوں مگر.....''

''مگر کیا کھل کر بتاؤ؟'' پیرو کے سوال پر کاکا کہنے لگا۔

''مگر یہ کہ وہ سارا رستہ جو ہڑ میں سے گزرتا ہے اور وہاں زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔''

پیرو نے ایک لمحے کا توقف کیا اور کہا۔ ''کچھ بھی ہو ہمیں وہیں سے جانا پڑے گا۔'' کاکے نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے چلتا ہوا ان کی راہنمائی کرنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر انہیں وہ جوہڑ نما رستہ نظر آ گیا۔

کاکے نے پہلا قدم اندر رکھا اور باقیوں نے اس کی تقلید کی۔ ابھی وہ کچھ ہی قدم چلے ہوں گے کہ کاکا ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے کانوں نے سرسراہٹ کی آواز سنی تھی۔ کاکا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک سانپ پر پڑی جو پھن اٹھائے اس کی طرف آ رہا تھا۔ کاکے نے خنجر دستے کی طرف سے تھاما اور سانپ کے سر کا نشانہ لے کر وار کر دیا۔ یہ سراسر حماقت تھی۔ رینگتے ہوئے سانپ کے سر کا نشانہ لینا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا اور وہی ہوا۔ نشانہ خطا گیا اور سانپ پھن اٹھائے کاکے کی ٹانگ کے پاس پہنچ گیا۔ اب تو لمحوں کی بات تھی..... ڈس لینے میں بھلا کتنا وقت لگنا تھا۔ پھر یوں لگا موت ٹلنے لگی ہو جیسے۔ پیرو نے کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بجلی لگائی اور سانپ کے پھن اور کاکے کی ٹانگ کے درمیان اپنا تیز دھار خنجر رکھ دیا۔ اگلا ہی لمحہ فیصلہ کن تھا۔ سانپ کا ڈنک کے لیے لگایا گیا زور..... خود اسی کا سر قلم کرنے کی وجہ بن گیا۔ کاکا ایک یقینی موت سے بال بال بچ گیا تھا۔

وقت کم تھا۔ اس لیے وہ آگے بڑھ گئے۔ یہ پندرہ منٹ کا سفر ثابت ہوا۔ ایک پُرخطر مرحلہ کامیابی سے طے ہوا تو انہیں دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ یہ ڈیرے کی عقبی سمت تھی اور یہاں بھی چودھری زریاب کے تین کارندے پہرا دے رہے تھے۔ پیرو نے اب کاکا کے کو پیچھے رکھا اور اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا قریب جا کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور پہلے پہرے دار کے سر کا نشانہ لے ڈالا اور وہ ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ قریبی پہرے دار نے اسے گرتے دیکھا تو تیسرے ساتھی کو آواز دیتا ہوا مضروب پہرے دار کی طرف لپکا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنے میں تیسرا پہرے دار بھی وہاں آن پہنچا۔ پیرو اپنے ساتھی کے ہمراہ جیسے اسی موقع کا منتظر تھا۔ ایک ہی جست میں ایک پہرے دار کو رگیدتا ہوا زمین پر گرا، اگلے ہی لمحے پیرو کا خنجر پہرے دار کی گردن کا مزاج پوچھ گیا۔ ادھر پیرو کے ساتھی نے تیسرے پہرے دار کا بھی یہی حال کیا تھا۔ پیرو نے ساتھیوں سمیت آگے بڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک پیرو پر ایک افتاد آن پڑی۔ یہ شکاری کتا تھا جو خطرے کی بو محسوس کرتے ہی نازل ہو گیا تھا مگر پیرو اور اس کے ساتھی نے اس افتاد سے بھی جان بچائی۔ نیچے گرتے ہی اس نے کتے کا ناکام وار دیکھتے رہنے کے بجائے تیزی سے کروٹ بدلی اور اگلے لمحے اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کر لیا۔ یہ بڑے قاتل لمحے تھے۔ پیرو کے ہاتھ میں دبا خنجر اس کی گردن میں دھنس گیا۔ اف کیا خوفناک خرخراہٹ تھی وہ۔ پیرو نے بمشکل خود کو پیچھے دھکیلا ہی تھا کہ اچانک..... دو کتے اندھیرے سے نمودار ہوئے اور پیرو پر جست لگا دی مگر پیرو کے دست راست صادق نے فائرنگ کا رسک لے کر پیرو کی جان بچائی تاہم پیرو فائرنگ سے ناخوش تھا مگر یہ بھی ادراک رکھتا تھا کہ یہ فائرنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔

اب ماحول بدل چکا تھا۔ رات کے سناٹے میں ہونے والی فائرنگ نے ہلچل مچا دی تھی۔ بہت سے بھاگتے قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یہ عمل کا وقت تھا اور تب پیرو نے عجیب کام کیا۔ اس نے کاکے سمیت سب کو فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود وہیں موجود برگد کے پیڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ صادق پیرو کے ارادے بھانپ کر تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ کاکے سمیت وہ گنتی کے لوگ تھے جبکہ ڈیرے پر درجنوں اسلحہ بردار انہیں مارنے کے لیے لپک آئے تھے۔ تب وہ لمحہ آن پہنچا جب وہ سب حملہ آور ان کی طرف بڑھتے ہوئے درخت کے پاس پہنچے۔ بس وہی قیامت خیز لمحہ تھا۔ پیرو نے ان پر فائرنگ کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ عقب سے ہونے والی اس فائرنگ نے انہیں مزاحمت کا موقع تک نہیں دیا اور وہ ایک ایک کر کے ڈھیر ہونے لگے۔ اس کے باوجود پیرو نے احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا اور درخت سے چھلانگ لگا دی جو اس کے حق میں بہتر

ثابت ہوا کیونکہ اسی وقت آڑے ترچھے انسانی جسموں میں سے ایک نے فائرنگ کرنے والے کو تلاش کر کے برسٹ چلا دیا تھا۔ پیرو نے چھلانگ لگاتے ہی گن سیدھی کی اور اس آخری مزاحمت کو بھی خاموش کر دیا۔ اس کے بعد پیرو نے وہاں بالکل بھی دیر نہیں لگائی اور ساتھیوں کے ہمراہ ڈیرے کے دالان تک جا پہنچا جہاں چودھری زریاب اپنے مہمانوں کو تسلی دے رہا تھا کہ اس کے ورجنوں ڈشکروں کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو یہاں تک پہنچ سکے مگر اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پیرو کی گن اس کے سر تک آن پہنچی۔ چودھری زریاب ہکا بکا رہ گیا۔ اسی دوران پیرو کے آدمیوں نے مہمانوں کو بھی گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔ کاکا، صادق کے ہمراہ دیوانہ وار سبین کو ڈھونڈ رہا تھا جو بالآخر اسے ایک کمرے میں پند گی مل گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ سبین کے لرزتے وجود کو تسلی دیتے دیتے رک گیا۔ وہ سبین کا مجرم تھا۔ سبین اسی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی اور اب نہ جانے وہ اسے بہن کہنے کا حق بھی رکھتا تھا یا نہیں؟

اس نے لرزتے ہاتھوں سے سبین کو بندشوں سے آزاد کیا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ سبین کتنے ہی لمحے بے تاثر نگاہوں سے اسے تکتی رہی۔ اف ان آنکھوں کا اجنبی تاثر..... کاکے نے جذبات سے مغلوب ہو کر سبین کو..... اپنی لاڈلی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر دلاسا دینا چاہا مگر اسی لمحے..... سبین جیسے اپنے حواسوں میں لوٹ آئی اور اس نے وہ کیا جس کی کاکے کو ہرگز امید نہیں تھی۔ اس نے کاکے کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کاکے تم بالکل کاکے جیسے دکھتے ہو نا..... مگر..... کاکے کو تو مارنے نکلا تھا سجاد..... کاکے کی مجرم میں تھی اور اسے جب چاچی چاچا کے قتل کا علم ہوا تب اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ کاکے کو نہیں چھوڑے گا..... جس پر میں نے اس کی منتیں تک کیں مگر وہ اپنی بات پر قائم رہا..... مگر دیر..... میں اس سے ناراض ہوں اگر اس نے کاکے کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔"

بولتے بولتے اسے غشی کا دورہ پڑا اور کاکے کے بازوؤں نے بروقت اسے سہارا دیا۔ وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی اور کاکا..... خود سے نظریں ملانے جوگا بھی نہیں رہا۔ وہ اس کی لاڈلی..... جسے دشمن نے مکروہ عزائم کے ساتھ اغوا کر لیا تھا، اس بیگانگی کی حالت میں بھی اسے فکر تھی تو بس کاکے کی۔ آہ..... کاکے کا جرم سبین کو اس دوراہے پر لے آیا تھا جہاں ایک طرف اس کی خاطر ہر خطرہ مول لینے والا اس کا شوہر سجاد تھا اور دوسری جانب کاکا تھا، اس کا بھائی..... جس نے اپنی بہن کی زندگی کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یکلخت جیسے کاکے کی دل گرفتگی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے اندر دھواں سا بھر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک بوسیدہ سا کمبل سبین کے گرد لپیٹا اور اسے کاندھے پر اٹھا کر باہر آیا ہی تھا کہ ایک بار پھر شدید فائرنگ کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔ باہر بازی پلٹ چکی تھی۔ چودھری فواد کی اچانک انٹری نے پیرو اور اس کے ساتھیوں کو ہینڈز اپ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ صادق نے اسی اثنا میں کاکے کو پسٹل پکڑوایا اور خود بھی فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اگلا لمحہ قیامت خیز تھا۔ چودھری فواد کی جانب سے جوابی فائرنگ نے صادق اور کاکے کو زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ تب صادق نے کاکے کو دیکھا جو بت بنا بس سامنے کھڑے چودھری فواد کو تکے جا رہا تھا۔ اگر صادق اسے بروقت دھکا دے کر نہ گراتا تو اس کا وجود یقینی طور پر چھلنی ہو جاتا۔ اب کاکا جیسے حواسوں میں واپس آیا اور اس نے صادق کی تقلید میں چودھری کے بندوں کو فائرنگ کر کے پیچھے ہٹانا شروع کیا مگر تب اچانک..... چودھری زریاب نے میدان مارتے ہوئے پیرو ڈاکو کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیا۔

چودھری زریاب کی اس ہوش مندی نے ایک بار پھر بازی پلٹ دی اور اگلے دس منٹ میں صادق اور کاکے سمیت وہ تمام بندے پڑے تھے اور چودھری زریاب خطرناک عزائم کے ہمراہ سبین کی طرف بڑھا۔ اس کے گرد لپٹا کمبل کھینچ کر ایک طرف کر دیا پھر وہ خباثت سے اپنے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یار خان! یہ ہے وہ کمینی جس نے میرے بیٹے کی مت ماری ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے اتنا کھڑاگ ہوا۔ اب تم سودے کی بات کرو۔ میرا بیٹا آج اس کا غرور خاک میں ملائے گا اور صبح تم اسے ریکی بائی کے ہاں لے جا کر بیچ دو گے۔ پانچ لاکھ تو آرام سے مل جائیں گے تمہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پسٹل سیدھا کیا اور پیرو ڈاکو کا نشانہ لیا مگر فائر کرنا اسے نصیب نہیں ہوا..... یکدم کسی اور جانب سے کیے گئے فائر نے اس کے ہاتھ سے پسٹل گرا دیا۔ تب سب کی نظر ایک ڈھانا پوش پر پڑی جس کے ہاتھ میں موجود گن نے اپنا کام دکھایا تھا..... پھر اس نے نقاب ہٹایا تو کاکا چونک گیا۔ وہ ماسٹر سجاد تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ہمراہ پیرو ڈاکو کے دوسری جیپ میں سوار پانچ بندے تھے جنہوں نے بیک وقت سب کو گھیر کر بازی ایک بار پھر پلٹ دی تھی۔ اب چودھری..... اس کا بیٹا اور مہمان یاور بے بسی سے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔ اگلے کچھ لمحوں میں پیرو ڈاکو ساتھیوں سمیت

آزاد ہو گیا اور اس نے یکدم ہی گن اٹھائی اور چودھری زریاب..... اس کے بیٹے چودھری فواد اور یاور نامی شخص پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اونچی پگڑیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے ان کی پگڑیاں زمین بوس ہوئیں اور پھر وہ مٹی چاٹنے پر مجبور ہوئے۔ پگڑیاں ہار گئی تھیں اور عزت جیت گئی تھی۔ پیرو کے ساتھیوں نے اسی دوران وہاں موجود چودھری کے بچے کھچے کارندوں کا بھی صفایا کر ڈالا۔

پیرو ڈاکو سے بغل گیر ہونے کے بعد..... ماسٹر سجاد بے تابی سے سبین کی جانب بڑھا۔ اسے بانہوں میں اٹھایا اور دیوانہ وار چومنے لگا۔ ''سبین..... سبین..... ہوش میں آؤ دیکھو..... میں واپس آ گیا ہوں۔'' اس کے لہجے سے چھلکتا اضطراب اور سبین کے لیے اتنے خطرات مول لینا گواہی دے رہا تھا کہ وہ سبین سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس محبت کو دو آنکھیں..... پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ کاکا چپ چاپ دونوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ تب اسے اچانک ایک خیال نے لرزا دیا۔ ماسٹر سجاد اسے یہاں پائے گا تو یقینی طور پر اس پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کاکے کو اپنی پروا نہیں تھی۔ وہ اب جینا نہیں چاہتا تھا مگر..... وہ سجاد کے ہاتھوں مر کر اپنی لاڈلی بہن کا گھر بھی اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لاڈلی تھی..... اور اب وقت آ گیا تھا کہ کاکا سجاد کو اور سبین کو جدا ہونے سے بچائے۔ اس نے الوداعی نظروں سے سبین کو سجاد کے مضبوط بازوؤں میں کسمساتے دیکھا اور پیچھے سرکتے سرکتے اندھا دھند دوڑ لگا دی۔ وہ بے پناہ تیزی سے بھاگ رہا تھا..... اسے اس بات کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی کہ پیچھے کیا ہوا ہوگا..... کاکے کو گم پا کر انہوں نے اسے تلاش کیا ہوگا یا نہیں..... ان سب باتوں سے بے نیاز وہ بھاگتے بھاگتے خاصا دور نکل آیا۔ رکنا وہ اب بھی نہیں چاہتا تھا مگر اچانک اسے پیروں کے نیچے دلدلی زمین محسوس ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ تب اسے اچانک خیال آیا کہ یہ ڈیرے کی مشرقی سمت سانپوں والے جوہڑ کے ساتھ والی دلدلی زمین ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی اور تب پہلی بار خوف کی ایک لہر نے اسے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ وہ دلدل کے اس حصے میں گرا تھا جو سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ اس کی معمولی سی حرکت بھی اسے اور دھنسا رہی تھی۔ اف اس قدر بے بسی کی موت..... مگر اب جی کر اس نے کرنا بھی کیا تھا۔ تب اچانک جیسے وہ بے خوف ہو گیا۔ سبین..... اس کی لاڈلی کو سنبھالنے کے لیے ماسٹر سجاد کی صورت میں اب دو توانا بازو اس کے ساتھ تھے۔ دونوں کے درمیان کاکے کا وجود تنازعے کا سبب بنا تھا مگر اب نہ رہے گا وجود اور نہ بنے گا تنازعہ..... کاکے کو کندھوں تک زمین نے نگل لیا تھا۔ تب اس نے ایک نظر آسمان کی جانب ڈالی۔ آنکھیں بند کیں اور اسے ایک منظر یاد آیا۔ ''بھائی! وہ خالہ خیراں ہے نا..... وہ بڑی باؤلی سی ہے۔ کہتی ہے کاکے پتر کو کہنا اگلے مہینے میں اور سجاد کے ابا آئیں گے، کچھ بات کرنی ہے.....'' اور جواب میں کاکے کو اپنا ہتھے سے اکھڑنا یاد آیا۔

''وہ کم ذات..... ذات کے موچی..... میرے منہ نہ ہی لگیں تو اچھا ہے۔''

اور آج اس گھڑی جبکہ وہ کندھوں سے ذرا اوپر تک دلدل میں دھنس چکا تھا، تب اسے خیال آیا کہ ذات کا موچی ہو یا کاکے جیسا شہ زور..... سب نے جانا تو مٹی میں ہی ہے..... پھر کیسا غرور؟ چودھری زریاب ہو یا چودھری فواد..... زارا شاہ جیسی اینکر ہو یا عنایت ڈنگا جیسا خبیث..... اپنی لاڈلی کا سب سے بڑا مجرم تو وہ خود تھا..... اعلیٰ ذات ہونے کے باوجود وہ آہستہ آہستہ زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔ اب اس کی گردن کے زمین میں دھنسنے کی باری تھی۔ اس نے نظریں آسمان کی جانب اٹھائیں۔

''میری لاڈلی کا اور اس کی محبت کا خیال رکھنا۔'' پھر وہ چلا کر بولا۔

''دنیا کی ساری نیچ ذاتیں مجھے دے دے مولا..... میں سب کو ساتھ لے کر دفن ہونا چاہتا ہوں..... تاکہ آج کے بعد کوئی کاکا کسی لاڈلی کو اس کی محبت کے کم ذات ہونے کے جرم کی وجہ سے جہنم میں دھکیلنے کا سامان نہ کرے۔ ساری... بد ذاتیں، ساری نیچ ذاتیں، میرے سر پر رکھ مولا اور دفن کر دے میرے ساتھ۔''

یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا مگر پھر کچھ دلدلی کیچڑ نما مٹی کو اس کے آنسوؤں کی بے بسی پر ترس آیا..... اس کے گالوں پر پھیلتے کیچڑ نے اس کے آنسو خود میں جذب کیے اور پھر اگلے چند لمحوں میں..... دلدل نے اسے مکمل طور پر نگل لیا مگر کیا کاکے کی آخری دعا قبول ہو گئی تھی؟ کیا ساری کم ذاتیں..... ساری نیچ ذاتیں..... کاکے کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی تھیں یا..... شرافت کا لبادہ اوڑھے ہمارے اندر بھی کوئی کاکا رہ گیا تھا جس نے انسانوں کو ذاتوں میں بانٹ رکھا تھا؟ دلدل چپ تھی..... یوں جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا..... دلدل کاکے جیسی نہیں تھی..... ذات تک نہیں پوچھی تھی اس سے..... بس چپ چاپ نگل لیا تھا اسے۔

”جو باتیں کہ میں نے کتاب میں لکھ کر رکھ چھوڑی ہیں ان پر اگر احتیاط سے عمل نہیں کرو گے اور مجھے معلوم ہے کہ تم نہیں کرو گے تو خداوند مصر کے سب روگ جن سے تو ڈرتا تھا، تجھے لگائے گا اور ان سب بیماریوں اور آفتوں کو بھی جو اس کتاب میں درج نہیں ہیں خداوند تجھ کو لگائے گا، جب تک تیرا ناس نہ ہو جائے۔ تم کثرت میں آسمان کے

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا... یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا... ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے... حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بتا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے... جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا... پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

بارہواں اور آخری حصہ

تاروں کے مانند ہو پھر تم شمار میں تھوڑے رہ جاؤ گے اور خداوند تمہیں زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کرے گا۔ وہاں تو لکڑی اور پتھر کے معبودوں کی جن کو تو یا تیرے باپ دادا جانتے بھی نہیں پرستش کرے گا۔

''دیکھو! میں چالیس برس بیابان میں تم کو لیے پھرا۔ نہ تمہارے تن کے کپڑے پرانے ہوئے اور نہ تمہارے پاؤں کی جوتی اور جب تم اس جگہ آئے تو حسبون کا بادشاہ سیحون اور بسن کا بادشاہ عوج ہمارا مقابلہ کرنے کو نکلے اور ہم نے ان کو مار کر ان کا ملک لے لیا۔ بس تم اس عہد کی باتوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا تاکہ جو کچھ تم کرو، اس میں کامیاب ہو۔

''جو باتیں کریں.... لعنت کی تجھے بتائیں اور اگر وہ تجھ پر آئیں تو ان احکام پر عمل کرنا جو آج میں تجھے دیتا ہوں۔ پھر خداوند تجھ سے بھلائی کرے گا اور تیرے باپ دادا سے زیادہ تجھ کو بڑھائے گا۔ اگر تو نے عمل نہ کیا اور دوسرے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تو میں تم کو جتا دیتا ہوں کہ تم ضرور فنا ہو جاؤ گے اور اس ملک میں جس پر قبضہ کرنے جا رہے ہو، تمہاری عمر دراز نہ ہوگی۔

''میں نے زندگی اور موت یعنی برکت اور لعنت کو تیرے سامنے رکھا ہے پس تو زندگی کو اختیار کر کہ تو بھی جیتا رہے اور تیری اولاد بھی۔

اس کے بعد انہوں نے یوشع علیہ السلام کو قریب بلایا اور ان سے مخاطب ہوئے اور اس طرح کہ ساری قوم بھی سن لے۔ ''میں اردن پار نہیں جا سکتا۔ اب یوشع ہی تمہیں اس پار لے کر جائے گا۔ اے یوشع! تو مضبوط ہو جا اور حوصلہ رکھ کیونکہ تو اس قوم کے ساتھ اس ملک میں جائے گا جس کو خداوند نے ان کے باپ دادا سے قسم کھا کر دینے کو کہا تھا اور تو ان کو اس کا وارث بنائے گا اور خدا ہی تیرے آگے آگے چلے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شریعت کی یہ تمام باتیں کتاب میں لکھ کر ''عہد کے صندوق'' میں رکھ دیں اور اسرائیل کے بزرگوں کے سپرد کر کے انہیں حکم دیا۔

''ہر سات برس کے آخر میں چھٹکارے کے سال کے معین وقت پر عید خیام میں تو اس شریعت کو پڑھ کر سب کو سنایا کرنا تاکہ وہ ان باتوں پر عمل کریں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ رہا ہوں۔ میں اچھی طرح تمہیں جانتا ہوں۔ تم میرے جیتے جی خداوند سے بغاوت کرتے رہے ہو تو میرے مرنے کے بعد کیا کچھ نہیں کرو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے مرنے کے بعد اس طریقے سے پھر جاؤ گے جس پر میں نے تمہیں چلایا ہے۔ اس وقت تم یہ گیت یاد کرنا جو اس وقت میں تمہیں سناتا ہوں۔ تم اسے اچھی طرح حفظ کر لو تاکہ یہ گیت میرا گواہ رہے۔

''کان لگاؤ اے آسمانو اور میں بولوں گا
اور زمین میرے منہ کی باتیں سنے
میری تعلیم مینہ کی طرح برسے گی.....''

گیت مکمل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری وصیت کے طور پر اپنے لوگوں کو یہ نصیحت بھی کی۔

''جو باتیں میں نے تم سے آج کے دن کہیں ان سب سے تم دل لگانا اور اپنے لڑکوں کو حکم دینا کہ وہ احتیاط رکھ کر اس شریعت کی سب باتوں پر عمل کریں کیونکہ یہ تمہارے لیے کوئی بے سود بات نہیں بلکہ یہ تمہاری زندگانی ہے اور اسی سے اس ملک میں جہاں تم یردن پار جا رہے ہو کہ اس پر قبضہ کرو، تمہاری عمر دراز ہوگی۔''

توریت میں ایک گیت اور بھی ملتا ہے جس میں اپنی وفات سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو برکت دی۔ یہ گیت بہت طویل ہے۔ غرض ایک ایک قبیلے کا نام لے کر موسیٰ علیہ السلام نے اسے برکت دی۔ ایک اور خطبے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مختلف قواعد و ضوابط بتائے جن پر انہیں عمل کرنا تھا۔

''جب کسی نے کوئی نئی عورت بیاہی ہو تو وہ جنگ کے لیے نہ جائے اور نہ کوئی کام اس کے سپرد ہو۔ وہ سال بھر تک

اپنے ہی گھر میں آزادرہ کر اپنی نو بیاہتا کو خوش رکھے۔ اگر کوئی شخص اپنے اسرائیلی بھائی کو غلام بنائے یا بیچنے کی نیت سے چراتا ہوا پکڑا جائے تو وہ چور مار ڈالا جائے۔ کوڑھ کی بیماری کی طرف سے ہوشیار رہنا۔

"جب تو اپنے بھائی کو کچھ قرض دے تو گروی کی چیز لینے کو اس کے گھر میں نہ گھسنا۔ وہ خود گروی کی چیز تیرے پاس باہر لائے۔

"تو اپنے غریب اور محتاج خادم پر ظلم نہ کرنا خواہ پردیسیوں میں سے کیوں نہ ہو۔

"بیٹوں کے بدلے باپ مارے نہ جائیں اور نہ باپ کے بدلے بیٹے مارے جائیں۔

"تو پردیسی یا یتیم کے مقدمے کو نہ بگاڑنا بلکہ یاد رکھنا کہ تو مصر میں غلام تھا اور خدا نے تجھے چھڑایا۔ جب تو اپنے کھیت کی فصل کاٹے اور کوئی پولا کھیت میں بھول جائے تو اسے لینے واپس نہ جانا۔ وہ پردیسی، یتیم اور بیوہ کے لیے رہے تاکہ خداوند تیرے سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے، تجھ کو برکت بخشے۔ اسی طرح جب تو اپنے زیتون کے درخت کو جھاڑے تو اس کے بعد اس کی شاخوں کو دوبارہ نہ جھاڑنا بلکہ وہ پردیسی، یتیم اور بیوہ کے لیے رہے۔

"ایک قاعدہ یہ بھی اپنے درمیان رکھنا کہ اگر تیرا بھائی بے اولاد مرجائے تو اس کی بیوی کسی اجنبی سے بیاہ نہ کرے بلکہ اس کا بھائی اس کے پاس جائے اور اسے اپنی بیوی بنالے اور اس عورت کے جو پہلا بچہ ہو، وہ اس آدمی کے مرحوم بھائی کے نام کا کہلائے تاکہ اس کا نام اسرائیل میں سے مٹ نہ جائے۔ اگر کوئی دیور اپنی بھابی سے شادی پر انکار کردے تو وہ عورت سب بزرگوں کے سامنے اس کے پاؤں سے جوتی اتارے اور اس کے منہ پر تھوک دے اور یہ کہے کہ جو آدمی اپنے بھائی کا گھر آباد نہ کرے، اس کے ساتھ ایسا ہی کیا جائے گا۔ پھر تمام اسرائیلیوں میں اس کی شہرت یہ ہو کہ یہ وہی شخص ہے جس کی جوتی اتاری گئی تھی۔

"ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرنا، تیرا باٹ پورا اور ٹھیک اور تیرا پیمانہ بھی ٹھیک اور پورا ہو تاکہ اس ملک میں جس میں تجھے جانا ہو تیری عمر دراز ہو۔

"تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا، خواہ وہ روپے کا سود ہو یا اناج کا سود۔

جب تو کوئی منت مانے تو اسے پورا کرنے میں دیر نہ کرنا۔"

اسی زمانہ خطابت میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جس کے الفاظ بتا رہے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو زمانہ مستقبل میں ایک عظیم پیغمبر کی آمد کی اطلاع دے رہے ہیں اور اپنی قوم کو ہدایت دے رہے ہیں کہ تم اپنی اولادوں کو بتادو، وہ اپنی اولادوں کو بتائیں کہ جو بھی اس وقت موجود ہو، اس پیغمبر کی بات پر کان دھرے۔ اس پیغمبر کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"خداوند خدا تیرے ہی لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی پیدا کرے گا تم اس کی سننا۔

"یہ تیری اس درخواست کے جواب میں ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا کے مجمع کے دن..... کی تھی اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

اس خطبے کے چند لفظوں کو غور سے پڑھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ان کی قوم کو "بشارت النبی ﷺ" سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ بھی کہ اس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمدؐ کے سوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

یہ کہنا..... "میں تیرے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" صاف بتاتا ہے کہ اشارہ ذات اقدس حضرت محمد ﷺ کی طرف ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد ﷺ کے سوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کے مانند کہلایا جاسکے

حضور اکرم ﷺ کا تعلق ... بنی اسمٰعیل سے تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسحٰق سے۔ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق دونوں بھائی تھے۔ گویا ایک بھائی کی اولاد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ دوسرے بھائی کی اولاد سے حضور اکرم ﷺ۔

''میں تیرے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی پیدا کروں گا۔''

اسی خطبے میں کہا گیا۔ ''میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا۔ وہ سب ان سے کہے گا۔''

حضور اکرم ﷺ کی صفات کا بیان کرتے ہوئے قرآن بھی یہی گواہی دیتا ہے۔

''وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔''

ایک اور جگہ یہ الفاظ ہیں۔

''اور یہ یقیناً جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو روح الامین (جبریلؑ) نے تیرے قلب پر اتارا تاکہ تُو گمراہوں کو ڈرانے والوں میں سے ہو۔ یہ ہے صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔''

بشارت کے ان جملوں اور قرآن کی ان آیات میں اتنی مماثلت ہے کہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے۔

وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے بھی ہیں اور وہی کہتے ہیں جو ان کے قلب پر اتارا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خطبے میں تیسرا جملہ یہ تھا۔ ''جو کوئی میری باتوں کو جو وہ میرا نام لے کر کہے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔''

قرآن کہتا ہے۔

''اور پھر کیا حال ہوگا (اے پیغمبر) اس دن جبکہ ہم ہر ایک امت میں سے ان پر ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔ سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی، وہ اس دن (قیامت کے دن) یہ پسند کریں گے کہ کاش (وہ دھنس جائیں) اور زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکیں گے۔''

اس خطبے میں ایک اور نہایت معنی خیز بات کہی گئی تھی۔

''جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور وہ میرا نام لے یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔''

قرآن نے بھی بعینہٖ یہی بات کہی۔

''اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بلاشبہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اس وقت تم میں سے کوئی اس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔''

توریت کی پیش گوئی اور آیاتِ قرآنی کو سامنے رکھا جائے تو دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ذکر کردہ صفات کا حامل ذات اقدس محمد ﷺ کے سوا کوئی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خطبے میں حضور اکرم ﷺ کی آمد کی پیش گوئی فرما رہے تھے اس لیے کہ یہ صفات نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صادق آتی ہیں، نہ حضرت داؤد علیہ السلام پر اور نہ ہی حضرت زکریا یا یحییٰ علیہ السلام پر۔

اگر ان صفات کا حامل کوئی دوسرا نبی بنی اسرائیل ہوتا تو یہود اس پر ضرور اصرار کرتے۔ وہ یہ کہہ کر گریز کر جاتے ہیں کہ وحی واضح جواب نہیں دیتے کہ وہ ہستی ابھی آنے والی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ توریت میں درج اس پیش گوئی کو جھٹلا بھی نہیں سکتے۔

"خدا کو معلوم تھا کہ جب وہ (خدا) انہیں اس ملک میں پہنچا دے گا جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے اور وہ (بنی اسرائیل) خوب کھا کھا کر موٹے ہو جائیں گے تب وہ اور معبودوں کی طرف پھر جائیں گے اور ان کی عبادت کریں گے اور مجھے حقیر جانیں گے اور میرے عہد کو توڑ ڈالیں گے۔ پس جب ان کی حالت اتنی ابتر ہو جائے گی تو اس کے بعد میری غیرت حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعے خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخشوں گا جو ان پڑھ اور تمدن سے دور ہے۔"

تاریخ نے ثابت کیا کہ یہی صحیح تھا۔ بنی اسرائیل اس ملک میں پہنچ گئے جس کا خدا نے ان سے وعدہ کیا تھا اور پھر صراط مستقیم سے ہٹتے چلے گئے۔ یہ باغیانہ روش اس حد تک بڑھی کہ اپنے پیغمبروں کو قتل کرنے لگے۔ پھر خدا نے ان سے "منہ چھپا لیا" اور ایک ایسی قوم کو پسند کیا جو تمدن سے دور تھی اور ایک ایسے نبی کو شرف نبوت بخشا جو "امی" تھا۔ اسی قوم اور اسی نبی نے متمدن قوموں کے ظالمانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ نبوت حضرت اسحٰق و یعقوبؑ کے خاندان سے نکل کر حضرت اسمٰعیل کے خانوادے میں چلی گئی۔ اب یہ جملہ کتنا بامعنی ہو گیا۔

"میں تیرے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔"

اب سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ یہودیوں کو مسلمانوں سے اتنی پرخاش کیوں تھی اور ہے۔

اسی کتاب توریت میں یہ بھی درج ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعائے خیر دیتے ہوئے کہا تھا۔

خداوند سینا سے آیا
اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا
وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا
اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا

وادی سینا میں طور کے پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ "شعیر" اس پہاڑی سلسلے کا نام ہے جو شام سے یمن تک پھیلا ہوا ہے اور یروشلم کے سامنے سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہیں بیت اللحم ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کا مقام ہے۔ فاران عبرانی میں اس حصے کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں وہ بے آب و گیاہ وادی تھی جس کی آغوش میں "مکہ" تھا۔ یہی وہ مقام ہے جو مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کا۔

خدا کا نور ہدایت سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نمودار ہوا اور شعیر پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں اور فاران پر محمد ﷺ کی شکل مبارک میں۔

توریت کی یہ بشارتیں بنی اسرائیل کے سامنے تھیں۔ انہیں نبی آخر الزماں کی آمد کا انتظار بھی تھا۔ جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آ جاتی تو کہا کرتے کہ ہمارا نبی آنے کو ہے۔ ہم اس کی قیادت میں تم سے جنگ کریں گے اور پھر یقیناً تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نسلی تعصب میں اضافہ ہوتا گیا اور جب آفتاب ہدایت طلوع ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ کو پھیلا دیا۔ اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ ان کی اولاد کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا کہا تھا۔ یاد بھی رہا تو اسے بھلانے کے لیے حیلے بہانے تراشنے لگے چنانچہ قرآن نے ان کی اس چوری کو اس طرح پکڑا۔

"جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے باوجود یہ کہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آ گئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر۔ کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے جس بندے کو خود چاہا، نواز دیا۔" (سورۃ بقرہ)

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں..... ہم تو صرف اسی چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی بنی اسرائیل میں) اتری۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔'' (سورۃ بقرہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلہ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو..... یہود ان کے مقابلے میں فتح و نصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے۔

''خدایا! ہم تجھ سے اس نبی امی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں ہوں گے کہ تو ہم کو ان پر فتح و نصرت عطا فرما۔''

ایک جگہ منقول ہے کہ یثرب (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلے کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے۔

''خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے۔'' جب آپ حضور اکرمؐ پر غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ کو سورۂ اقرا کی چند یا دآیتیں پڑھائی گئیں۔

''پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔''

جب آپ حرا سے واپس آئے تو قلب مبارک شدت وحی سے کانپ رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مسیحی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ عبرانی زبان سے واقف تھے اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے ان کے پاس پہنچ کر گزرا ہوا واقعہ سنایا اور اس فرشتے (جبریلؑ) کا ذکر کیا جس نے آکر کہا تھا۔

''پڑھیے۔'' ورقہ بن نوفل نے سنتے ہی کہا۔ ''یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لے کر آیا تھا۔''

ورقہ بن نوفل عالم تھے اور اس بشارت سے واقف تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیان فرمائی تھی۔

یہود (بنی اسرائیل کی نسل) جانتے تھے کہ یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا سین نوی، جماعی اور ی حسد نے ان کو اس اطاعت سے باز رکھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین آگیا تھا کہ اب ان کا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ انہیں اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ بار بار خدا کے حضور درخواست گزارتے تھے۔ اس درخواست کا جواب بھی مل چکا تھا کہ انہیں اس سرزمین میں جانا نصیب نہ ہوگا۔

''اے اللہ! مجھے بیت المقدس کے قریب کر دے۔''

یہ دعا آپ اکثر فرماتے تھے کہ اگر وہ بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکتے تو اس کے قریب ہی پہنچ جائیں۔ اسی آرزو میں وہ اپنی قوم کو لے کر آگے بڑھتے رہے تھے اور وفات کے وقت موآب کے میدانوں میں، بیت المقدس کے قریب تر شہر ''اریحا'' (جسے توریت میں یریحو کہا گیا ہے) کے بالکل سامنے تھے۔ آرزو اب بھی یقیناً یہی ہوگی کہ دو چار قدم اور۔ یہ سامنے ہی تو سرزمین مقدس ہے لیکن ٹوٹی کہاں کمند! حکم الٰہی ہوا کہ کوہ پسگہ کی چوٹی پر چڑھ کر ملک موعود کا نظارہ کر لو۔ ہم یہ علاقے تمہاری آنکھوں کے سامنے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ اللہ نے اتنی طاقت دے دی کہ آپ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے بھی آپ نے ان علاقوں کا مشاہدہ کیا تھا لیکن اب تو یہ علاقے بالکل واضح اور قریب نظر آرہے تھے۔ خدا نے یہ بھی بتایا کہ میں کون سا علاقہ بنی اسرائیل کے کس قبیلے کو دوں گا۔

''یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا۔ سو میں نے ایسا کیا۔ تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے پر تو اس پار وہاں جانے نہ پائے گا۔''

وحی الٰہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی وفات کا وقت قریب ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وقت قریب آگیا ہے۔ یہ نازبھی تھا کہ وہ کلیم اللہ ہیں۔ جب بھی یہ وقت آیا تو خدا انہیں پہلے سے مطلع ضرور کرے گا۔

بخاری مسلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو موت کا فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا، اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام اجل قبول فرمایئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ اس نے دربارِ الٰہی میں جا کر شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا۔ اس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی آنکھ پھر درست ہوگئی اور اس کو حکم ملا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوبارہ جاؤ اور کہو کہ اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمہاری مٹھی میں آجائیں گے ہم ہر ایک بال کے عوض تمہاری عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیں گے۔ فرشتے نے دوبارہ حاضر ہو کر خدائے تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا اس کے بعد کیا ہوگا۔ جواب ملا آخر کار پھر موت۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا نتیجہ موت ہے تو پھر وہ شے آج ہی کیوں نہ آجائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں جب موت کا فرشتہ حاضر ہوا تو انسانی شکل میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پہچانا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتدا میں نہیں پہچان سکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ناگوار گزرا کہ ایک اجنبی شخص ان کی اجازت کے بغیر ان کے گھر میں کیسے آگیا اور اسے موت کا پیغام دینے کا کیا حق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر اس فرشتے سے کچھ سوالات بھی کیے جن کے وہ معقول جواب نہ دے سکا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتوں نے رفتہ رفتہ اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے پاس آنے والے فرشتے نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایسا گھبرایا کہ فوراً غائب ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے اس طرح غائب ہوجانے پر سمجھ لیا کہ یہ معاملہ انسانی نہیں چنانچہ جب فرشتہ اجل دوبارہ حاضر ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لب ولہجہ بدل گیا۔

''تو نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میری عمر ایک سو بیس سال ہو چکی ہے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا جینا۔''

انجام کار وہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں۔

''اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں پسگہ کی چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے، چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کر اس کو دکھلائی اور سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا ملک اور وادی یریحو جو خرمائوں کا شہر ہے جس کی بابت میں نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس کو میں تمہاری نسل کو دوں گا، سو میں نے ایسا کیا کہ تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے پھر تو اس پار وہاں جانے نہ پائے گا پس خداوند کے بندے موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اس میں سے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل دفن کیا۔ پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ ..... اپنی وفات کے وقت 120 برس کا تھا اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی۔'' (باب استثنا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بارے میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ ایک قبر کھود رہے ہیں۔ انہیں تعجب ہوا کہ اس ویرانے میں یہ کس کی قبر ہے اور کھودنے والے کون لوگ ہیں۔ وہ قریب چلے گئے۔ قبر بالکل تیار ہو چکی تھی۔ مردے کا پتا نہیں تھا اور قبر تیار تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسی تر و تازہ اور حسین قبر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کھودنے والے نہایت ماہر کاریگر معلوم ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبر کھودنے والوں میں سے

ایک سے پوچھا۔ ''یہ قبر کس کے لیے تیار کر رہے ہو؟''
فرشتوں نے جواب دیا۔ ''اللہ کے بندوں میں سے کسی کریم بندے کے لیے کھود رہے ہیں۔''
''اگر میں اپنے لیے قبر پسند کرتا تو ایسی ہی شاندار قبر پسند کرتا۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار نکلا۔
''اگر آپ کو پسند ہے تو آپ لے لیجیے۔''
''قبر تو اس کی ہوتی ہے جس کو موت آتی ہے۔''
''موت اور زندگی کا کیا ہے۔ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہے اس مرحلے سے گزار دے۔''
''خداوند نے مجھے یہ مہلت دی ہے کہ میں بیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دوں۔ جتنے بال میری مٹھی میں آجائیں گے اتنے ہی سال میری عمر بڑھا دی جائے گی لیکن آخر کار پھر موت ہے تو ابھی کیوں نہیں۔''
آپ قبر میں اترے اور دراز ہو گئے۔ اسی وقت ملک الموت حاضرِ خدمت ہو گیا اور آپ نے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ فرشتوں نے آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی اور دفن کیا۔
آپ کی قوم کے لوگوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ آپ کی وفات کب ہو گئی اور آپ کی قبر کہاں ہے۔
نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ نے نقل کیا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا نشان بتاتا کہ وہ سرخ ٹیلا (کثیب احمر) کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔
''فتح الباری'' میں ہے کہ اریحا (توریت کے مطابق یریحو) میں سرخ ٹیلے کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے۔
یہ قول صحیح نظر آتا ہے اس لیے کہ ''میدان تیہ'' کے سب سے قریب ''اریحا'' کی بستی ہے اور اسی جگہ کثیب احمر (سرخ ٹیلا) واقع ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔
جب حضور اکرم ﷺ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حلیے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا، جس رات مجھے آسمان پر لے جایا گیا، میں نے موسیٰؑ کو دیکھا۔ وہ چھریرے بدن کے تھے، بال سیدھے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوم شنوءہ کے لوگوں میں سے ہیں۔
ابن عباسؓ نے اسی بات کو دوسرے طریقے سے بیان کیا ہے۔
''میں نے معراج والی رات موسیٰ بن عمران کو دیکھا جو دراز قد اور گھنے بالوں والے تھے۔ گویا کہ وہ شنوءہ کے لوگوں میں سے ہیں اور میں نے عیسیٰ بن مریم کو دیکھا جو درمیانے قد اور سرخ سپید ہیں۔''
بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''مجھ کو موسیٰؑ پر فضیلت نہ دو کہ قیامت کے دن لوگوں پر دہشت طاری ہو جائے گی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا، وہ میں ہوں گا تو میں یہ دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں۔ اب نہیں کہہ سکتا کہ ان کو مجھ سے پہلے افاقہ ہو گیا یا وہ طور پر بے ہوش ہو جانے کے صلے میں عرش کا یہ پایہ پکڑے کھڑے ہیں اور وہ بے ہوشی سے بری کر دیے گئے۔''
مفسرین متفق ہیں کہ آپؐ کا یہ فرمانا کہ مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو، از راہِ تواضع و انکسار ہے ورنہ تو آپ کا خود یہ ارشاد ہے۔ بغیر فخر و مباہات کے کہتا ہوں کہ میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں اور پھر آپ نبی آخر بھی ہیں اور محبوب رب سبحانی بھی۔'' بہر حال اس روایت کی رو سے حضرت موسیٰ کی جلالت قدر اور عظمت کا اظہار ضرور ہے۔
انس بن مالک سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب معراج والی رات چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو جبریلؑ نے آپ سے فرمایا یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضور ﷺ نے ان کو سلام کیا۔ حضور فرماتے ہیں میں نے ان کو سلام کیا تو کہا خوش آمدید نبی صالح کو اور برادر صالح کو۔ پھر جب میں گزر گیا تو آپ رونے لگے۔ ان سے کہا گیا کہ کس چیز نے آپ کو رلا دیا۔ فرمایا کہ میں روتا ہوں کہ یہ لڑکا (حضورؐ) میرے بعد بھیجا گیا اور اس کی امت میری امت سے زیادہ جنت میں داخل ہو گی۔

یہ روایت بھی تواتر سے ملتی ہے کہ حضور ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی امت کے لیے دن بھر میں پچاس نمازیں فرض کی تھیں اور جب آپؐ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔

''آپ کو کیا حکم ملا ہے۔''

''میری امت پر پچاس نمازیں فرض کی گئی ہیں۔''

''کیا دن بھر میں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کی امت کے لیے انہیں ادا کرنا بہت بھاری ہو جائے گا۔ جایئے اور اس میں تخفیف کا سوال کیجیے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے بنی اسرائیل کو بار بار آزمایا ہے اور آپ کی امت تو کانوں، آنکھوں اور دلوں کے اعتبار سے بہت کمزور ہے۔''

حضور ﷺ پھر اللہ تعالیٰ کے پاس تشریف لے گئے اور واپس آ کر بتایا کہ اب چالیس نمازوں کا حکم ملا ہے۔

''یہ بھی بہت ہیں۔ آپ کی امت بہت کمزور ہے۔ وہ پابندی نہیں کر سکے گی۔ آپ پھر جایئے اور اس میں مزید تخفیف کی درخواست کیجیے۔''

حضور اکرمؐ، موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان بار بار آتے جاتے رہے اور ہر مرتبہ نماز میں تخفیف ہوتی رہی حتیٰ کہ دن رات میں پانچ نمازوں کا حکم ملا۔

''یہ ہیں پانچ لیکن ثواب پچاس ہی کا ملے گا۔''

بنی اسرائیل کے مزاج میں سرکشی، احسان فراموشی اور بغض وحسد کا مادہ غالب تھا۔ ایسی قوم کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضرورت سے زیادہ صبر و ثابت قدمی کے مظاہرے کی ضرورت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب مراحل سے گزرتے رہے، ان کی ہر خطا پر اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کرتے رہے۔ بنی اسرائیل ایسی قوم ثابت ہوئی کہ کثرت سے معجزے دیکھنے کے باوجود بار بار اپنی ذمے داریوں کو بھلا دیتی تھی۔ کوئی اور قوم ہوتی تو ان معجزوں کو دیکھ کر کب کی راہ راست پر آ چکی ہوتی لیکن ان بدبختوں نے قول و عمل دونوں طریقوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیتیں پہنچائیں حتیٰ کہ بہتان تک لگا دیے۔ بت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی، من وسلویٰ پر ناسپاسی، ارضِ مقدس میں داخلے سے انکار، توریت کے ماننے سے انکار جب تک کہ کوہِ طور ان کے سروں پر بلند نہیں ہو گیا۔ ان کی ہر ادائے خاص سے ضد اور ہٹ دھرمی ظاہر ہوتی رہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی ایذا رسانی پر مذمت کرتے ہوئے قرآن نے کہا۔

''اے ایمان والو! تم بنی اسرائیل کی طرح نہ بنو جنہوں نے موسیٰؑ کو ایذا پہنچائی۔ پھر اللہ نے اس کو اس بات سے بری کر دیا۔'' (سورۃ احزاب)

بنی اسرائیل کی بہتان طرازی سے متعلق ایک واقعہ بخاری اور مسلم میں مذکور ہے اور مفسرین کے نزدیک اس آیت میں جس واقعے کی طرف مذمت کی گئی ہے اور جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے حد صدمہ پہنچا تھا، وہ یہ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر شرم وحیا کا بے حد غلبہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ جسے پر نگاہ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام برہنہ ہو کر غسل کرنے میں کوئی شرم نہیں کرتے تھے اس لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ننگ کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ انہیں کوئی خاص مرض ہے اسی لیے سب کے سامنے کپڑے اتارنے سے کتراتے ہیں۔ آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ ان کو اس تہمت سے پاک کیا جائے۔ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیے۔ پتھر خدا کے حکم سے اپنی جگہ سے سرکا اور جہاں مجمعے میں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے، وہاں پہنچ گیا۔ مارے گھبراہٹ کے وہ اسی حالت میں پتھر کے پیچھے دوڑے اور کہتے جا رہے تھے۔ ''اے پتھر میرے کپڑے..... اے پتھر

Digitized by Google

میرے کپڑے۔'' پتھر چلتا رہا اور اس جگہ جا کر رک گیا جہاں بنی اسرائیل برہنہ نہا رہے تھے تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیان کردہ ہر عیب سے پاک ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس اچانک واقعے کا ایسا اثر ہوا کہ آپ نے طیش میں آ کر اپنی لاٹھی پتھر پر دے ماری۔

اس قوم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ یہ تہمت اپنے نبی پر لگا رہے ہیں۔

اسی طرح جب اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون کوہِ ہور پر گئے اور حضرت ہارون کا وہیں انتقال ہو گیا تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی کہ انہوں نے حضرت ہارون کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس تہمت سے سخت تکلیف پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ ہارون علیہ السلام کی نعش کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کریں۔ فرشتوں نے فضا میں حضرت ہارون کی نعش بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل کیا کہ واقعی حضرت ہارون علیہ السلام پر قتل کا کوئی نشان نہیں۔

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کو کسی بات سے اذیت پہنچی تو آپ نے غصے میں آ کر فرمایا۔ ''اللہ موسیٰ پر رحم فرمائے۔ ان کو اس سے بھی زیادہ اذیتیں دی گئیں پھر بھی آپ نے صبر فرمایا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انہی صفات کے اعتراف میں خداوند تعالیٰ نے قرآن میں ان کا بہت زیادہ ذکر فرمایا ہے اور ان کی تعریف فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کے واقعات میں ان کی (حضرت موسیٰ) جلالت و عظمت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے اس سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اور مجدد انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسول اور پیغمبر ہیں۔

''اور یاد کر قرآن میں موسیٰ کو۔ بے شبہ وہ تھے مخلص اور تھے رسول، نبی اور ہم نے ان کو طور ایمن کی جانب سے پکارا اور ان کو قریب کر کے ان سے سرگوشیاں کیں اور ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنایا۔'' (سورۃ مریم)

''اے موسیٰ! بے شبہ میں نے تم کو لوگوں پر بزرگی عطا کی اور تم کو چن لیا اپنی رسالت دے کر اور ہم کلامی کا شرف بخش کر۔'' (سورۃ مریم)

''اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور فرعون پر احسان کیا اور ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی اور ہم نے ان کی مدد کی، وہ (فرعون اور قوم فرعون) پر غالب رہے اور ہم نے ان دونوں کو روشن کتاب دی اور دونوں کو راہِ مستقیم کی ہدایت بخشی اور باقی رکھا ان کے متعلق پچھلے لوگوں میں کہ سلام ہو موسیٰؑ اور ہارونؑ پر بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نکوکاروں کو۔ بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔'' (سورۃ صافات)

☆☆☆

مؤلف ''قصص القرآن'' مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک تاریخی نکتہ بیان کیا ہے جسے ہم لفظ بہ لفظ یہاں نقل کرتے ہیں۔

''یہود (بنی اسرائیل) کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے کہ عرصۂ دراز قبل از مسیح یہود حجاز میں آ کر بس گئے تھے اور تیما، وادی قریٰ، فدک، خیبر اور مدینہ میں انہوں نے مکان، جائدادیں، مذہبی درس گاہوں اور فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کے ذریعے اپنا مستقل تمدن قائم کر لیا تھا اور بقول عرب مورخین بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی حارث بڑے بڑے یہود قبائل نے ان مقامات کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر دو سوال پیدا ہوتے ہیں جو حل طلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کون سا ناگزیر واقعہ ہے جس کی وجہ سے یہود کو وہ سرزمین چھوڑنی پڑی جس کو فلسطین کہتے ہیں اور جس کے متعلق یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ارضِ مقدس ہے اور وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی ناگزیر حالت میں ان کو یہ اپنی محبوب سرزمین چھوڑنی پڑی تھی تو پھر وہ کون سا سبب تھا جس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ قریب کے سرسبز و شاداب علاقوں کو چھوڑ کر ایسے علاقوں میں آ کر آباد

ہوئے جہاں گھاس پات اور زندگی کے لیے سامانِ خورونوش بھی وسعت کے ساتھ مہیا نہیں تھے حالانکہ مصر ان کی سرزمین سے قریب تھا۔ عراق تھا جو شاداب بھی تھا اور متمدن ساز و سامان کا مرکز بھی۔

پہلے سوال کا جواب تو تاریخ یہ دیتی ہے کہ فلسطین کی محبوب، مقدس اور پیاری سرزمین سے یہود کو 701ء قبل مسیح طیطس رومی کے زمانے میں جبراً نکلنا پڑا۔ اس بادشاہ نے فلسطین پر فوج کشی کر کے بلادِ فلسطین کو تہ و بالا کر ڈالا۔ بیت المقدس کو برباد کر ڈالا۔ اس ہیکل کو جس پر یہود کو ناز تھا اور جس کی وہ مثالیں دیا کرتے تھے اور جس کے ساز و سامان و ظروف پر وہ فخر کیا کرتے تھے، اس کو کھود کر پھینک دیا تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہود ''توریت'' میں پڑھ چکے تھے اور پیغمبروں کی زبانی سن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک زمانے میں اپنے اس ''عہد'' کو بنی اسرائیل کے بھائیوں ''بنی اسمٰعیل'' میں پھر تازہ کرے گا اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یثرب (مدینہ) میں آئے گا اور اس کی دعوت الٰہی کا مرکز قرار پائے گا اور یہ کہ بتوں کے مقابلے میں اس کی مجاہدانہ زندگی کامیاب ہوگی اور ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے اعلانِ حق کو دوبارہ اسی کے ہاتھوں سربلندی نصیب ہوگی۔ اس لیے جب وہ اس بت پرست بادشاہ کے ہاتھوں عاجز و ماندہ ہوئے تو انہوں نے اپنی سربلندی کی آخری پناہ ''حجاز'' کی اس سرزمین یثرب (مدینہ) کو سمجھا اور اسے اپنا وطن بنالیا جو اس نبی کے ظہور کے شہر اور فلسطین کے درمیان تھی اور اس طرح وہ اس نبی کے انتظار اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لیے زندگی بسر کرنے لگے چنانچہ یسعیاہ نبی کے صحیفے میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس نبی کا ظہور سلع پہاڑ کے قریب ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ ''مدینہ'' کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے جس کے مشرق میں جبل احد ہے اور مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں وادیٔ مدینہ ہے۔

''اے سمندر پر گزرنے والو اور اس میں بسنے والو۔ اے جزیرہ اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ، زمین پر سرتاسر اس کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں ''قیدار'' (حضرت اسمٰعیل کا دوسرا بیٹا) کے آباد گاؤں میں اپنی آواز بلند کریں۔ سلع کے بسنے والے گیت گائیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں۔ وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں اور جزیروں میں اس کی ثنا خوانی کریں۔ خداوند بہادروں کے مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت دکھائے گا۔ وہ نعرہ مارے گا۔ ہاں وہ للکارے گا۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا۔ میں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا۔ جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسا کرنے..... اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود ہو، وہ پیچھے نہیں ہٹیں گے اور وہ بہت شرمندہ ہوں گے۔ (یسعیاہ باب 43)

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی اکرم ﷺ کے سوا کوئی نبی اور پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے ''بت پرستوں'' سے جہاد کیا ہو اور انجام کار ان کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ پھر یہ نبی قیدار کون ہیں (حضرت اسمٰعیلؑ کے بیٹے کی نسل) سلع کس جگہ واقع ہے (مدینہ کے مغرب میں) جزیرہ اور پہاڑوں کا بار بار تذکرہ کیوں ہے؟ یہ تمام باتیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یہ ایسی شریعت اور ایسے نبی کی بشارت کا ذکر ہے جو جزیرۂ عرب میں حجاز کے خطے سے تعلق رکھتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعض علمائے یہود اس وسوسے میں گرفتار تھے کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام جبل سلع کے قریب بتایا گیا ہے لیکن اس کا ظہور بنی اسرائیل میں سے ہونا چاہیے اور اسی لیے وہ یہاں آ کر بس گئے تھے کہ خدا کا وعدہ ہم ہی میں سے پورا ہونا چاہیے جبکہ الفاظ میں یہ کہا گیا تھا کہ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے برپا کروں گا۔ وہ اس بات سے نا آشنا تھے کہ یہ نعمت اب ان کے بھائیوں بنی اسمٰعیل میں منتقل ہو کر ہم کو مستفیض کرنے والی ہے۔

الحاصل یہ وجہ تھی کہ صدیوں پہلے بنی اسرائیل جب زبردستی فلسطین کی سرزمین سے نکالے گئے تو انہوں نے مصر، شام اور عراق کے سرسبز و شاداب ممالک کو چھوڑ کر حجاز کی سرزمین کو ترجیح دی اور یثرب اور اطراف یثرب میں آ کر بس گئے اور اسی کو اپنا وطن و مسکن بنالیا مگر افسوس کہ اس کے ظہور پر حسد و بغض نے ان کو دولتِ ایمان سے محروم رکھا۔

Digitized by Google

☆☆☆

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ان کی وفات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی روایت کے مطابق تیس یوم کا سوگ منایا۔ اب انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایام سوگ میں ماتم و گریہ وزاری کرتے رہے۔

اللہ کا وعدہ پھر حرکت میں آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی ہی میں یوشع بن نون کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ حق تعالیٰ نے ظاہر کر دیا تھا کہ یوشع بن نون ہی ہیں جو بنی اسرائیل کے نوجوانوں کو لے کر جائیں گے اور کنعان اور بیت المقدس کو مشرکین سے پاک کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور یہ اعلان کیا تھا۔

''میں اب چل پھر نہیں سکتا اور خداوند نے مجھ سے کہا ہے کہ میں یردن پار نہیں جا سکتا سو خداوند تیرا خدا ہی تیرے آگے آگے پار جائے گا اور وہی ان قوموں کو تیرے آگے سے فنا کرے گا اور تو ان کا وارث ہوگا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی ہی میں انہیں بنی اسرائیل کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ انہی کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے اموریوں، مدینیوں، موآبیوں جیسی قوموں پر فتوحات حاصل کی تھیں۔

اب انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی جنگ کرنا تھی۔

ماتم کے دن ختم ہوتے ہی انہوں نے بنی اسرائیل کو تیار ہونے کے لیے تین دن کی مہلت دی۔

''تب یوشع نے سرداروں کو حکم دیا کہ تم لشکر کے بیچ ہو کر گزرو اور لوگوں کو یہ حکم دو کہ تم اپنے لیے زادِ راہ تیار کر لو کیونکہ تین دن کے اندر تم کو اسی یردن کے پار ہو کر اسی ملک پر قبضہ کرنے کو جانا ہے جسے خداوند تمہارا خدا تم کو دیتا ہے تاکہ تم اس ملک کے مالک بن جاؤ۔''

انہوں نے اس سرزمین کی طرف جاسوس بھیجے اور پھر قریبی شہر کے دروازے پر دشمن کو للکارا۔ بنی اسرائیل کو فتح نصیب ہوئی اور پھر بنی اسرائیل نے لڑتے لڑتے تمام ارضِ مقدس پر قبضہ کر لیا۔

قرآنِ عزیز میں ہے کہ جب (چالیس سال بعد) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا..... شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس نے حکم دیا کہ مغرور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ خدا کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح درگاہِ الٰہی میں جھکتے ہوئے اور توبہ کرتے ہوئے داخل ہونا مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی۔ وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متکبر انسانوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے اور توبہ و استغفار کے بجائے سوقیانہ الفاظ کہے۔

☆☆☆

ابتدا ہی ایسی ہوئی تھی پھر اس کے بعد بھی ان کا غرور اور نافرمانیاں بڑھتی ہی رہیں۔ خدا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تم سے اپنا منہ چھپا لوں گا۔ طویل عرصے تک وہ انہیں ڈھیل دیتا رہا پھر نبوت کی نعمت ان سے سلب کر کے حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان کی طرف لوٹا دی۔

بنی اسرائیل کا تکبر ہی تھا جس نے حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے سے انہیں باز رکھا اور اللہ کے نزدیک ہمیشہ کے لیے دھتکاری ہوئی قوم بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم اپنے کو بگاڑ لو گے اور میرے حکم سے پھر جاؤ گے۔''

(ختم شد)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمٰن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت..... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

Digitized by Google

''میرا نام ایلے ہے اور میں آسکر اسکوائر میں انویسٹی گیشن آفیسر ہوں۔'' میں نے اپنے عہدے کا کارڈ، جو کہ اس کا انتظار کرتے وقت میرے ہاتھ میں ہی تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے لکڑی کے کسی تختے کی طرح کیا تھا۔ میرے لہجے میں رعب اور برتری تھی۔ میں پہلے ہی تاثر میں اسے اپنے زیر اثر کر لینا چاہتا تھا۔ جیسا کہ ہمارا کام ہوتا ہے، اور جیسا ہمیں سکھایا جاتا ہے۔

''بیٹھیے.....'' برفانی ندی کے ٹھہرے ہوئے شفاف پانی جیسے لہجے میں ربیکا نے جواباً کہا۔ اپنی مژگاں کو اپنے گالوں پر بٹھاتے ہوئے خالصتاً مشرقی اور کسی قدر مؤدب انداز میں.....

میری آمد کچھ زیادہ ہی جلدی ہو گئی تھی یا شاید ربیکا دیر تک سونے کی عادی تھی۔ اس کے کھلے کھلے چہرے پر اب بھی ٹوٹتی نیند کا کچا خمار تھا جس میں مخملی مسکراہٹیں، کروٹیں

ماں کی بے بسی پر مجبور ایک محبت کرنے والی بیٹی کا انوکھا انتقام

کبھی کبھی ظالم کسی مظلوم کو اتنا بے حس بنا دیتا ہے جتنا شاید ظلم کرنے والے نے سوچا بھی نہ ہو... یہی حال اس کا بھی تھا جس نے انتہائی محبت سے انتقام کا انوکھا انداز اختیار کیا اور معصومیت کا لبادہ اوڑھے اپنے ہی عاشقوں کے خون سے کھیلتی رہی مگر... کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ خود ہر دن کیوں خون کے آنسو روتی ہے۔

سنگدل

ایمل رضا

لے لے کر، مدہوش کن مدوجزر پیدا کر رہی تھیں۔ سلک کی وائٹ نائٹی اور گاؤن میں وہ بے نیاز ایسی تھی کہ سب اس کے سامنے نیازمند ہو جائیں۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا اور چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی دلکشی میک اپ کی محتاج نہیں ہے۔ سیاہ اور گولڈن بال، بکھر کر پھر سے ترتیب میں آجانے کے مشتاق تھے جو بات کرتے وقت دائیں بائیں بڑے منظم طریقے سے جھولتے بھی تھے۔

''کیا آپ جانتی ہیں کہ لیونارڈو نے خودکشی کر لی ہے؟''

ایک ناقد کی طرح، اس کے حسن کا باریک بینی سے مشاہدہ کر لینے کے بعد میں اصل مدعا پر آیا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ اس کے مشاہدے کے دوران میں وہ میرا تجزیہ کر چکی ہے۔

''جی..... یہ پرسوں کا واقعہ ہے۔ مجھے میری ایک دوست کے ذریعے اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے لیونارڈو کی موت پر بے حد افسوس ہے۔'' اس نے ڈائننگ روم کی دیوار میں اچانک پراستادہ ایک شیر کے مصنوعی سر کو، جس کے خونی جبڑے کسی شکار کو پلک جھپکتے میں دبوچ لینے کے سے انداز میں کھلے تھے، دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیونارڈو میرا بہت اچھا دوست تھا۔'' اس کی نظریں اب بھی بدستور اس شیر کے خون آلود دانتوں کو گن رہی تھیں۔

''صرف دوست.....؟'' میں نے مبہم معنی خیزی سے پوچھا تو اس کی صراحی دار گردن نے، اس کے وجود کو ہلائے بغیر میری طرف رخ کیا۔

''جی..... کیوں.....؟''

''لیونارڈو کی خودکشی کی تحقیقات کے دوران ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ اکثر ہفتے کی شام پیراڈائز ہوٹل میں گزارتا تھا، اور اس کے ساتھ اس وقت کوئی اور نہیں..... آپ ہوتی تھیں۔'' میں نے اپنے طور پر بڑا دھماکا کیا تھا۔ جس نے اس کی آنکھوں میں جاپانی لائیٹر جتنی لو بھی نہیں بھڑکائی تھی۔

''تو.....؟ اس میں کیا برائی ہے مسٹر ایلے.....؟ ہم سب جب دنیا کی پریشانیوں سے اوب جاتے ہیں تو کسی ایک من پسند ساتھی کے ساتھ وقت بتا کر کیا پھر سے ہشاش بشاش نہیں ہو جانا چاہتے۔ آج کل بیشتر لوگ اسی اطوار کو اپنائے ہوئے ہیں۔ کیا آپ ایسا نہیں کرتے.....؟'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''اس سب کا لیونارڈو کی خودکشی سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے وہ سوال کیا، جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک خود پسندی کی کیفیت میں، میں اپنے علاقے کی حدود میں ہونے والی خودکشی کی تحقیقات کرنے آ تو گیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ مادام تساؤ کے میوزیم میں پڑے خوبصورت مومی مجسموں کی طرح دکھتی یہ لڑکی میری تحقیقات کو الگ رنگ تو دے سکتی ہے، لیکن میری کوئی مدد نہیں کر سکتی..... مجھے ازسرِنو اس لڑکی کا مشاہدہ کرنا پڑا۔

''شاید آپ اسے صرف دوست سمجھتی ہوں، لیکن اس کے خیالات آپ کے متعلق جذباتی تھے۔ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے ایک اور دھماکا کیا تھا، جو پھر سے پھلجھڑی ثابت ہوا۔

''خودکشی کی رات اس نے آپ کے لیے سنائے ہوٹل میں ایک ٹیبل بک کروایا تھا۔ کینڈل لائٹ ڈنر کے لیے..... ویٹرز کو اس نے ہدایات دی تھیں کہ وہ اس ٹیبل کے اردگرد لاونڈر کے پھول رکھوا دیں، جو یقیناً آپ کی ہی پسند کے ہیں کیونکہ اس وقت بھی آپ کے ڈرائنگ روم میں جا بجا لاونڈر کے پھول موجود ہیں۔'' میں نے اسے کریدتے ہوئے کہا اور مومی مجسمہ جیسے چند لمحوں کی زندگی لے کر دلکشی سے مسکرا اٹھا۔

''یہ انو مین کو اس نے ایل گرین کا گیت ''لیٹس لسٹے ٹوگیدر'' بجانے کو کہا تھا۔ آپ کو پرپوز کرنے کے لیے اس نے ایک مہنگی رنگ بھی خریدی تھی۔''

''وہ رنگ اس نے ''ٹیواسا ٹلز'' مال سے خریدی تھی جس کی مالیت بیس ہزار ڈالرز تھی۔ ایک محبوبہ کے لیے یہ بہت دلکش احساس ہے کہ اس کے محبوب نے اس کے لیے اتنی بڑی رقم خرچ کی۔ کیا آپ آگے یہ کہنا چاہتے ہیں؟'' آنکھوں کو مجھ پر سے نہ ہٹانے کا عزم کرتے ہوئے اس نے پوچھا اور مجھ پر اپنی گھبراہٹ پر حاوی ہونا بہت گراں گزرا۔ میں آنکھوں کی پتلیوں کو سکڑنے سے نہ روک سکا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ میں واقعی آگے یہی کہنا چاہتا تھا۔ اور دوسرا اس بات پر کہ جو جو میں اسے بتا رہا تھا، وہ پہلے سے ہی جانتی تھی اور یقیناً مجھ سے زیادہ.....

''یعنی آپ جانتی تھیں کہ وہ آپ کو پرپوز کرنے والا تھا؟''

''جی..... کیٹی نے مجھے وقت سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا، وہ اس ساری تیاری میں لیونارڈو کی شریک کار تھی اور راز داں بھی اور میں نے اسی وقت لیونارڈو کو فون کر کے انکار کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہوٹل میں جا کر سب کے سامنے اور اتنے انتظامات کروانے کے بعد میں اسے انکار کروں..... تب یقیناً اسے زیادہ دکھ ہونا تھا..... افسوس! میں نہیں جانتی تھی کہ میرا اس وقت کا انکار بھی اس سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔''

''لیکن آپ نے انکار کیوں کیا.....؟'' اس گہری

Digitized by Google

نوعیت کے سوال پر اس نے ایسے پوز کیا تھا کہ خود کو مزید عیاں کر دیا تھا۔

''کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بس میرا اچھا دوست تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ خودکشی کر لے گا ورنہ میں اسے اچھی طرح تفصیل سے سمجھا دیتی... میری زندگی میں شادی کی کبھی کوئی جگہ رہی ہی نہیں ہے۔'' ربیکا نے بہت اچھے سے اپنا موقف دیا۔

''یعنی لیونارڈو کی موت کی جذباتی وجہ آپ ہیں؟''

''نہیں .....'' اس نے سخت گوئی سے انگلی ہلائی۔

''اس کی غلط فہمی.....''

اب مزید میرا اور کوئی بھی سوال پوچھنے کا ارادہ دم توڑ گیا تھا۔

☆☆☆

لیونارڈو کی موت کی وجہ نیند کی وہ گولیاں بنی تھیں جنہیں وہ ایک ہی وقت میں کافی مقدار میں پھانک گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی۔ جو رسمی... کارروائی تھی، وہ مکمل کر کے میں نے اپنے ماتحت کو فائل بند کر دینے کو کہہ دیا تھا۔ اس خودکشی کی وجہ ربیکا تھی یا نہیں..... لیکن ملک کا قانون ایسا نہیں تھا کہ میں اسے گرفتار کر سکتا، تاہم اس نے مجھے اپنی سیاہ زیتون جیسی آنکھوں کی گرفت میں ضرور لے لیا تھا۔

شام کو وہ مجھے پھر نظر آئی تھی۔ لیونارڈو ہی کے جنازے پر..... میں وہاں کارروائی کو آخری شکل دینے گیا تھا۔ وہ سیاہ سوٹ پر سیاہ دستانے پہنے اور چہرے پر سیاہ چشمہ لگائے اپنے کسی دوست کے ساتھ آئی تھی اور اسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ سیاہ سراپا میں سے اس کا چہرہ ایسے جھانک رہا تھا جیسے سیاہ تاریک رات میں آسمان پر چاند کا وجود..... کتنے لوگوں نے جنازے کی مناجات کے دوران مڑ مڑ کر اسے دیکھا تھا اور اپنے کلے بھول گئے تھے۔ اس کی نازک ناک سے نکلتی سوں سوں پر مرد تو مرد، عورتوں کی گردنیں بھی اس کی سمت اٹھ جاتی تھیں۔ لیونارڈو نے اگر اس کے پیچھے خودکشی کی تھی تو بالکل ٹھیک کیا تھا۔ یہ لڑکی ایسی ہی پرستش کے لائق تھی کہ اس کی معیت میں گزرنے والی زندگی کو زندگی سمجھا جائے اور اس کے بعد جان گنوا دی جائے۔

اسے ایک اور لڑکے کے ساتھ اس قدر قریب دیکھ کر، دھند زدہ کہانی کچھ کچھ میرے ذہن میں واضح ہونے لگی تھی۔ یقیناً ربیکا کو اب یہ لڑکا پسند آ گیا ہوگا، جس کی بانہوں میں وہ اس وقت اپنے بازو لٹکائے ہوئے تھی اور اسی وجہ سے اس نے لیونارڈو کو شادی سے انکار کیا ہوگا اور لیونارڈو نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہوگی۔

جنازے کی ساری رسموں کے دوران میں اپنی اس خود ساختہ کہانی کو، ربیکا کی پرچھائی تلے، تقویت دیتا دیتا مزید مستند کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جسس کے مارے میں ہر اس جگہ پر تھا جہاں ربیکا تھی۔ اس کا رونا اس طرح کا تھا، جیسے واقعی اس کا کوئی قریبی دوست مر گیا ہو۔ اس کے رونے میں دکھاوا ہرگز نہیں تھا۔ جنازے کی تقریب ختم ہوئی تو تابوت کو تجہیز و تدفین کی سروس دینے والی انتظامیہ نے اپنی گاڑی میں رکھنا شروع کر دیا، دراصل لیونارڈو کا تعلق اٹلی سے تھا۔ اس لیے اس کی میت کو اس کے آبائی گھر اٹلی لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں اس کے گھر والے، غم میں ڈوبے ہوئے اس کی میت کا انتظار کر رہے تھے۔

''چلو انتونیو..... اب ہم بھی چلتے ہیں۔'' جنازے کے بعد اس نے اپنے نئے دوست سے کہا۔ میں چونکہ ان کے بے حد قریب تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری موجودگی سے باخبر ہے۔ اس لیے اس کی آواز مجھے بہ آسانی سنائی دی تھی۔ اس نے اپنی آواز کو مخفی رکھا بھی نہیں تھا۔ اسی عیاں آواز پر میں اپنی جگہ پر متحیر ہو کر ساکت ہو گیا تھا۔

دوست اسے کندھے سے تھام کر وہاں سے چلا گیا تھا اور ''چلو انتونیو.....'' کے الفاظ میرے کانوں میں جھکڑ کی طرح گھومنے لگے تھے۔

''انتونیو خالص اٹالین نام ہے اور..... لیونارڈو بھی اٹلی سے ہی تھا۔ کیا اس اتفاق کا کوئی آپس میں تعلق ہے؟''

اپنے آفس واپس آ کر بھی میں اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

''ربیکا کے بارے میں جتنی معلومات اکٹھی کر سکتے ہو کرو.....'' میں نے اپنے خاص ورکر مارک سے کہا۔

دو دن بعد وہ ایک رپورٹ لے کر میرے پاس آیا جسے پڑھ کر میری تخیلاتی کہانی کو نئی جہتیں ملیں۔

☆☆☆

''باسیلیو، برونو، گیبریل اور ڈومینکو..... کیا آپ ان چاروں کو جانتی ہیں مس ربیکا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو میری چبھن سے وہ اتنی ہی محظوظ ہوئی تھی کہ کھلکھلا کر مسکرا اٹھی۔ اس کے گھنے، مصنوعی لہریں ڈالے گولڈن بال گردن کو دائیں طرف خم دینے کے باعث اسی رخ پر ڈھلک گئے تھے۔ بلیک جیکٹ کے اندر پہنی سفید ٹی شرٹ میں سے جھلکتا ہوا اس کا سارا جسم ہی مسکرا اٹھا تھا۔ وہ یقیناً کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی اور میں نے اسے بلا

Digitized by Google

اجازت ہی تنگ کیا تھا لیکن اس نے میری بغیر اطلاعی آمد کو اپنی مدہوش کن ادا سے رخصت کر دیا تھا۔ تنگ جینز پر بڑے بڑے شوز پہنے، جو اس کے گھٹنوں کو چھوتے تھے، کو اتارنے کا تردد کیے بنا وہ ایرانی کارپٹ پر انہیں دھرے بیٹھی تھی۔ نفیس قالین کی صفائی کا خیال نظر انداز کرتے ہوئے ..... یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجھے چند لمحوں میں فارغ کر کے وہ پھر اپنی ڈیٹ پر روانہ ہو جائے گی۔ جیسے میں چند لمحوں سے بڑھ کر اس سے کیا بات کر لوں گا؟ ایک اوسط درجے کے آفیسر کے پاس واقعات کی گڈمڈ کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا ہے۔

''بہت اچھے سے..... چاروں مختلف وقت میں میرے بہترین دوست رہے ہیں۔'' وہ شیریں آمیز لہجے میں بولی۔ جیسے قریب بیٹھے اپنے کسی کتے کو پیار کر رہی ہو۔

''مسٹر پاسیلیو کا تعلق اٹلی سے تھا۔ پچھلے سال دسمبر میں اس نے خودکشی کر لی.....''

''خودکشی نہیں..... اس کی موت کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ہوئی تھی۔'' اس نے تصحیح کی۔

''ایک ہی بات ہے..... جبکہ ڈاکٹر اسے تلقین کر بھی چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے شراب پی ..... اور بہت پی..... اتنی کے بارٹینڈر کو دینے کے لیے اس کے پاس پیسے بھی نہ رہے..... اس نے اپنی گھڑی اتار کر بارٹینڈر کو دی..... اور پھر باہر سڑک پر نکل کر بے ہوش ہو گیا..... کیسا عجیب اتفاق ہے۔ اس کی ڈائری میں ہر جگہ آپ سے محبت کا اظہار لکھا گیا ہے۔''

''ہاں..... وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور مجھے اپنے ساتھ اٹلی لے کر جانا چاہتا تھا۔ میرے انکار پر ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے۔''

''مسٹر برونو کا تعلق بھی اٹلی سے تھا۔ اتفاق سے ان سے بھی آپ کا بریک اپ ہوا..... بریک اپ کے بعد برونو نے اٹلی واپس جا کر نئی زندگی شروع کرنا چاہی۔ اس نے شادی کی، اس کا ایک بچہ ہوا لیکن پچھلے دنوں دونوں میاں بیوی کی طلاق ہو چکی ہے۔ اس کی بیوی نے حرجانہ حاصل کرنے کے لیے موقف دیا ہے کہ اس کا شوہر اس سے رتی بھر بھی الفت نہیں رکھتا.....''

میری ساری کتھا پر ریکا نے کندھے اچکائے اور ایسا کرتے ہوئے اس کے کانوں میں پڑے لمبے آویزے اچھل کر سٹ سے گئے۔

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ان کی از..... اجی زندگی کی اتھل پتھل کی ذمے دار میں ہوں؟''

''مسٹر گیبریل کا تعلق بھی اٹلی سے تھا۔ آپ کی اس کے ساتھ دوستی پورے ایک سال رہی..... اور ہمیشہ کی طرح آپ نے اسے بھی شادی سے انکار کر دیا۔ گیبریل نے ایک نئی گرل فرینڈ بنا لی، وہ زندگی میں خوش رہنا چاہتا تھا لیکن عجیب بات ہے۔ اس کی گرل فرینڈ کی شکل ہو بہو آپ سے ملتی ہے۔ اس سے بریک اپ کے بعد اس نے ایک اور لڑکی سے دوستی کی اور یہ اس سے بھی زیادہ حیران کن اتفاق ہے کہ اس کی شکل بھی آپ سے ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ آپ کو ہی ہر لڑکی میں تلاش کر رہا ہے۔''

''یہ گیبریل کا مسئلہ ہے میرا نہیں..... میں کسی بھی لڑکے میں اس کو تلاش نہیں کر رہی.....''

''مسٹر ڈومینکو بھی آپ کے دوست تھے۔ وہ تیراکی کا ماہر تھا۔ اس کی موت کی اب تک وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی کہ وہ ڈوب کر کیسے مرا.....'' میں نے درشتی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پہلی بار جیسے اس کی صنف کو ٹھیس پہنچی۔

''ایک منٹ مسٹر ایلے..... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں کہ میں کوئی قاتل حسینہ ہوں..... یا سیریل کلر..... جو لڑکوں کو پھنساتی ہے اور پھر ان کا قتل کر دیتی ہے۔ یا میں قلوپطرہ ہوں..... جو اپنے محبوب کو موت کے گھاٹ اتار کر خوش ہوتی ہے۔'' درشتی کی حد پھلانگتی ہوئی وہ بولی۔

''اتفاقات تو یہی کہتے ہیں..... مس ریکا.....'' میں مطمئن تھا۔ میں اسے طیش دلانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بھڑک کر وہ اپنے رویے کی آگ لگا سکتی تھی۔ میں ایسا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولے لیکن میرے خیالات کے برعکس اور میری پروفیشنل کامیابی کو پیروں تلے روند کر اگلے ہی لمحے پھر سے پُرسکون ہو گئی۔

''پھر آپ غلطی پر ہیں مسٹر ایلے..... آپ جیسے سو آفیسرز بھی آ جائیں تو مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکتے..... کیونکہ آپ کا قیاس محض ایک من گھڑت جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں.....''

''مس ریکا آپ کیا سمجھتی ہیں کہ.....''

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے پار راہداری میں ایک شور بلند ہوا تھا۔ کسی کانچ کی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی اور یہ آواز اتنی گمبھیر، اتنی واضح تھی کہ چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ کسی سے نادانستگی میں چیز نہیں ٹوٹی ہے، بلکہ کسی نے کانچ کی اشیاء کو زمین پر دے مارا ہے یا دیوار پر..... پھر اگلے ہی لمحے کسی

Digitized by Google

کے چلّانے کی آواز ابھری۔ ریکا جست بھر کر باہر نکل گئی۔ میری اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اٹھ کر باہر جاتا..... یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ مجھے اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے میں خاموشی سے اپنی کرسی پر جما رہا۔

ریکا کے باہر نکلتے ہی باہر خاموشی چھا گئی۔ جیسے کسی نے بروقت درختوں کا جنگل اگا کر سیلاب کو روک لیا ہو۔ کسی بھی طرح کی کوئی آواز اندر نہیں آئی۔ نہ سرزنش کی اور نہ ہی نقصان پر دکھی ہونے کی.....

تھوڑی دیر بعد ریکا اندر آئی۔ دروازہ کھول کر وہ سامنے ہونے کے بجائے پیچھے کو ہوئی اور میں نے واضح طور پر دیکھا کہ اس نے عجلت میں اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کیا ہے۔ کیا وہ باہر کسی ڈیکوریشن پیس کے ٹوٹ جانے پر آنسو بہا رہی تھی؟ کوئی ڈیکوریشن پیس ٹوٹنے پر بھی کوئی روتا ہے؟ شاید وہ اس کا کوئی بہت ہی خاص تحفہ ہو..... یا کسی دادا، دادی کا دیا ہوا بچپن کا کھلونا..... لیکن ریکا جیسی شخصیت تھی، اسے ڈیکوریشن پیس تو کیا، خود کے ٹوٹنے پر بھی نہیں رونا چاہیے تھا۔

خود کو نارمل کرنے کی پوری کوشش کے باوجود بھی، ایک آدھ آنسو اس کی آنکھ میں ہی انگارہ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بڑے رعب سے پھر میرے روبرو تھی لیکن اس کو دیکھ کر میرے سوالوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔

''جی..... کیا کہہ رہے تھے آپ.....؟'' وہ آواز کو واپس اپنی نزاکت پر لاتے ہوئے بولی اور اس کوشش میں کامیاب رہی۔

''میں کہہ رہا تھا کہ یہ اتفاق کیسا عجیب ہے کہ آپ کے اب تک جتنے بھی دوست رہے ہیں، وہ سب کے سب اٹالین تھے۔''

''مجھے اٹالین لڑکے پسند ہیں۔ ان کے دھوپ کی تمازت سوکھے ہوئے چہروں پر ہلکے براؤن رنگ کی شیو، اپنی طرف کھینچتی ہوئی پراسرار آنکھیں، بکھرے بالوں میں کاؤبوائے دکھتے اٹالین..... مجھے بہت پسند ہیں۔''

''اوہ..... اچھا..... اٹالین لڑکوں کی وہ جتنی تعریفیں کر چکی تھی، وہ میری سمجھ سے پرے تھیں کیونکہ میں نے کبھی اٹالین لڑکوں کو ایک لڑکی کی طرح بن کر نہیں دیکھا تھا۔ ''تو پھر.....؟''

''تو پھر یہ کہ میں ان سے شادی کیوں نہیں کرتی.....؟'' اس نے میرا جملہ میرے منہ سے چرا لیا۔ ''دراصل مجھے شادی سے چڑ ہے۔ جب سے میری ماں کی شادی ناکام رہی ہے۔''

''تو پھر آپ اپنے دوستوں کو آس کیوں دلواتی ہیں۔ جبکہ آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں.....''

''میں تو انہیں آغاز میں ہی اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتی ہوں۔'' وہ تن کر بولی۔

''کیا آپ نے انتونیو کو بھی اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''جی.....'' اس نے اس قدر آہستگی سے کہا کہ مجھے لگا وہ اس بات کا جواب ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔

''گڈ..... پھر میں انتونیو کے حوالے سے مطمئن ہوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا..... اب کہنے کو کچھ تھا اور نہ ہی پوچھنے کو۔

☆☆☆

زندگی بہتے دریا کی طرح جاری و ساری تھی۔ وقت کی

جرمن کہاوتیں

☆ اگر مرغی کڑکنا چھوڑ دے تو آدمی نہیں جان سکتا کہ اس نے انڈا دیا ہے۔

☆ مرغ بانگ دینے سے پہلے آنکھیں میچ لیتا ہے کیونکہ بانگ اسے زبانی یاد ہوتی ہے۔

☆ نیند سب سے بڑی چور ہے، وہ انسان کی آدھی زندگی چرا لیتی ہے۔

☆ وہ زخم جو انسان خود اپنے آپ کو لگاتا ہے بہت مشکل سے مندمل ہوتے ہیں۔

☆ ہر پرندہ اپنا ہی ترانہ گاتا ہے۔

☆ ہر ماں کا بچہ خوبصورت ہوتا ہے۔

☆ امیر وہ نہیں جس کے پاس دولت بہت ہو بلکہ وہ شخص امیر ہے جس کی ضرورتیں محدود ہیں۔

☆ مذاق اور کھیل میں انسان اکثر سچ کہہ جاتا ہے۔

☆ بہرا خاوند اور گونگی بیوی بہترین جوڑا ثابت ہوتے ہیں۔

☆ پرندہ پنجرے میں گانا سیکھ جاتا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

Digitized by Google

سوئیوں میں پروئے پلوں کے نیچے سے بہت سی ساعتیں گزر چکی تھیں۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے.....

ایک سال گزر چکا تھا۔ اس دوران میں ربیکا اور اس کے عاشقوں کو میں تقریباً بھول چکا تھا۔ اگرچہ ربیکا ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اسے بھلایا جاسکے..... لیکن میری کوتاہی میں آپ میری حد سے زیادہ مصروف نوکری کو وجہ مان سکتے ہیں۔ پانچ سال آسکر اسکوائر پر نوکری کرنے کے بعد اب میرا تبادلہ ایک دور دراز کے علاقے میں کیا جارہا تھا۔ کیونکہ میں کوئی قابل آفیسر نہ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں جو بھی کیس آیا، وہ ادھورا ہی رہا۔ ربیکا والا کیس تو آپ کے سامنے ہی ہے۔ اسی لیے اب مجھے وہاں بھیجا جارہا تھا جہاں سرے سے کسی کیس کے پیدا ہونے کے امکانات ہی بہت کم تھے۔ یعنی ربیکا میرے ذہن سے پوری طرح غائب ہونے جارہی تھی کہ میرے ٹرانسفر سے ایک ہفتہ قبل ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔

انتونیو کی موت ہوگئی۔

.....اور مجھے غنودگی میں دکھتے، بھولے بسرے خواب کی طرح ربیکا ایک بار پھر سے یاد آگئی۔

انتونیو نے ٹھاٹھیں مارتے دریا کے پل پر سے کود کر خودکشی کی تھی تب اس کے پاس ربیکا بھی موجود تھی جسے تھوڑی بہت تفتیش کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ میرے ڈیوٹی پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ تھانے سے واپس اپنے گھر جا چکی تھی۔

''اسے روکنے کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اس وقت پل کے دوسرے سرے پر تھی۔ جب انتونیو نے اس کا نام پکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ بہت سے لوگ اس بات کے گواہ ہیں۔'' میرے ماتحت نے مجھے ربیکا کے بارے میں پوچھنے پر بتایا۔

اور پورے ایک سال کے بعد..... میں پھر سے ربیکا کے گھر میں موجود تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کے نرم، اونٹ کی کھال سے مشابہ صوفے پر بیٹھا، اس کی کمرے میں آمد کا منتظر..... اور میں دیوار میں نصب شیر کے سر کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا اب بھی ربیکا اتنی ہی مطمئن، سرشار، لاابالی بن کر میرے سامنے آئے گی؟ یا اس بار اس کے قتل کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر ثبت ہوچکی ہوں گی، جنہیں وہ محض ایک رات میں اتار نہ سکی ہوگی۔

''مجھے پتا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ میں آپ ہی کا انتظار کررہی تھی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کھلی مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ کل رات انتونیو کی موت اور کچھ وقت پولیس اسٹیشن میں گزارنے کے باوجود وہ اس تتلی کی چال کے مانند چلتے ہوئے میرے پاس آئے گی، جسے خود پر اس بات کا زعم ہوتا ہے کہ زمانے کے رنگ اس کے پروں کے عکس کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کی ایسی دلیرانہ آمد میرے لیے غیر متوقع تھی۔

''آپ کھڑے کیوں ہوگئے ہیں۔ بیٹھیے..... کیا جاننا چاہتے ہیں آج آپ.....؟ پوچھیے، تفتیش کا آغاز کیجیے.....'' اس کے آرام دہ لہجے نے مجھے بے آرام سا کردیا۔

''انتونیو نے تمہاری وجہ سے خودکشی کی ہے۔''

''جی..... وہ پل پر چڑھ گیا تھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اسے چھوڑ رہی ہوں یا اس کے ساتھ ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں اسے چھوڑ رہی ہوں..... پھر میں آگے بڑھ گئی اور پیچھے سے اس نے..... چپ چپ چپ..... اس نے کہا بھی تھا کہ میں اسے چھوڑ کر گئی تو وہ اس پل سے کود جائے گا۔ میں نے سمجھا وہ مذاق کررہا ہے۔ جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔ اب تک اتنی چھان بین تو آپ نے کرہی لی ہوگی لیکن اس بار وہ مذاق نہیں کررہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا اور وہ پل پر سے نیچے کود گیا۔ افسوس! کسے پتا تھا کہ وہ واقعی ایسا کرے گا۔ صد افسوس! کتنا خوبرو تھا بیچارہ انتونیو.....'' کہتے ہوئے اس نے کمینی سی ہنسی میری طرف اچھالی۔ ''ہے نا.....؟ تھا نا کافی خوبرو.....؟'' اور بھویں اچکائیں، جیسے کہہ رہی ہو کہ دیکھا میں نے ایک اور دلکش لڑکے کی جان لے لی اور تم کچھ بھی نہیں کرسکے۔ وہ کھل کر عریاں ہوچکی تھی۔ اب کوئی وضاحت نہیں چاہیے تھی۔ اس کے باوجود میں اسے پکڑنے سے قاصر تھا۔ اسے جیل میں بند کرنے کے لیے میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا اور اس خوبصورت حسینہ کی گردن دبوچنے کے لیے بھی میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔

''تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس سے شادی کرو گی اور اس کے ساتھ اٹلی جاؤ گی۔ اس کے ملک..... میں نے انتونیو کی ریکارڈنگ چیک کی ہے۔'' مجھے اپنی آواز اندھی چمگادڑوں کے غار سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ہاں! کیا تھا۔''

''پھر.....؟''

''تو کیا اس دنیا میں لوگ وعدہ خلافی نہیں کرتے..... سب ایسا ہی تو کرتے ہیں مسٹر ایلے.....'' وہ پھر سے مسکرائی، زہر آلود مسکراہٹ..... اور میرا دل چاہا کہ میں آگے بڑھ

کرا اپنا منجر اس کے دل میں اتار دوں جو آٹھ اٹالین کے دلوں سے کھیل چکی تھی۔

''اس سب کی کیا وجہ ہے ریبکا..... اس سوچی سمجھی بے وفائی کی؟'' میرا لہجہ بیچارگی اور بے بسی سے پُر تھا تو یہ کیس بھی میری ناکامی میں ایک حرف کا اور اضافہ کر گیا۔

''بے وفائی کی کیا وجہ ہوتی ہے مسٹر ایلنے.....'' ایک دم سے ہی وہ اداس ہو گئی۔ ''خدا کے وجود کے آغاز کی طرح بے وفائی کا آغاز بھی ہمیشہ انسانوں کے لیے مبہم ہی رہا ہے۔'' اس نے اتنی گہری بات کی تھی کہ میں اس کی بات میں گڑ کر رہ گیا تھا۔

''جب مجھے سمجھ میں آ جائے گی تو آپ کو بھی ضرور بتاؤں گی۔'' یہ لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اب مجھے وہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ میں اس ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا جس نے بازی میں سارے پتے چھپا چھپا کر رکھے ہوں اور پھر بھی اس کے پتے سب نے دیکھ لیے ہوں۔

وہ مجھے چھوڑنے باہر دروازے تک آئی اور پھر ذومعنی انداز سے یہ کہتے ہوئے کہ ''بہت جلد پھر ملاقات ہو گی.....'' اندر چلی گئی تھی۔ یعنی ابھی اس کالڑکوں کو خودکشی پر مجبور کرنے والا کھیل ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں وہیں دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ یہ کیس میری زندگی کا ایسا کیس تھا جس کا عدالت، پولیس، تھانے سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی میں اسے سلجھانا چاہتا تھا۔ ایک خلفشار تھا جو میرے دماغ سے جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ ایک بے چینی تھی جو میری جنبش جنبش میں رقم ہو چکی تھی۔

'زندگی نے دوبارہ موقع دیا تو ریبکا تم سے ضرور اگلوا لوں گا کہ تم ایسا کیوں کرتی رہی ہو؟' یہ سوچ کر میں وہاں سے چل دینے کا قصد باندھ رہا تھا کہ اپنی پشت پر مجھے ایک زوردار شور محسوس ہوا۔ ریبکا کے گھر کے بند دروازے کے پیچھے..... آوازیں، شور، چیخ و پکار، سب اتنا پیچیدہ تھا کہ باہر کھڑے مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید ریبکا کو میری ضرورت نہ ہو..... غیر ارادی طور پر میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا تو محسوس ہوا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہمت کر کے میں نے اسے پورا کھول دیا۔

اب میرے سامنے ریبکا کے گھر کی راہداری کا منظر تھا جہاں فرش پر بہت سی چیزیں ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھیں۔ ریبکا کے علاوہ وہاں ایک نرس بھی کھڑی تھی۔ ایک ملازمہ بھی جس کے ہاتھ میں کھانے کی خالی ڈش تھی کیونکہ سارا کھانا فرش پر گر چکا تھا۔

ریبکا ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو سینے میں بھینچے اس کے ساتھ نیچے فرش پر ہی بیٹھی تھی۔ اسے سختی سے گلے لگانے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہونے پر عورت باہر بھاگ جائے گی۔

''اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج آئے گا پھر وہ کیوں نہیں آیا..... کیوں نہیں آیا ریبکا..... کیوں نہیں آیا؟'' عورت نے شدت سے چلاتے ہوئے ریبکا سے پوچھا۔

''آ جائیں گے..... میں ابھی انہیں فون کرتی ہوں۔'' ریبکا نے عورت کو تسلی دی اور تب ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اپنی جگہ پر ساکت کچھ سمجھنے کی آخری حد تک کوششوں میں تھا۔

''نہیں..... وہ ہر بار اسی طرح کرتے ہیں۔ آنے کا وعدہ کرتے ہیں اور پھر نہیں آتے.....'' عورت کے آنسو اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا جسے ریبکا نے بڑے پیار سے صاف کیا پھر پاس کھڑی نرس اور ملازمہ کو اشارہ کیا کہ وہ اسے کمرے میں لے جائے۔

عورت چلی گئی تو ریبکا سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اب کی بار اس نے اپنے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجانے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی اپنے آنسو پونچھنے کی.....

''یہ..... یہ عورت.....'' میرے لہجے میں استفہام ہی استفہام تھا۔

''یہ میری ماں ہے اور پاگل ہے۔''

''کیا.....؟'' میری حیرانی فطری تھی۔ ''تم نے ان کا علاج نہیں کروایا کیا؟''

''علاج پاگل پن کا ہوتا ہے پیارے ایلنے..... دیوانگی کا نہیں۔'' اس نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''کب سے ہے ایسا.....؟'' میں نے بے محل سوال کیا۔ میں ریبکا کی پریشانی میں اس کے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا۔

''تیس سال سے..... جب سے ایک اٹالین انہیں محبت کا جھانسا اور میرے وجود کی نشانی دے کر چھوڑ کر چلا گیا۔''

اپنی نم آنکھوں سے میری جلتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کہانی مکمل کی..... اور جیسے مجھے سب کچھ سمجھ آ گیا..... اس کی اٹالین لڑکوں سے وابستگی اور انہیں جھوٹی محبت کا جھانسا دے کر انہیں اپنی جان لینے پر مجبور کر دینا..... سب سمجھ آ گیا تھا۔

Digitized by Google

پُراسرار حویلی

نشور ہادی

پل پل رگوں میں خون کی گردش تیز کرنے والے واقعات اور ناقابل یقین مناظر کا احاطہ کرتی دلچسپ داستان

کچھ گھڑیاں بڑی قبولیت کی ہوتی ہیں کہ اِدھر زبان سے کچھ ادا ہو اور اُدھر وہ پورا ہوجائے، بالخصوص بدفالیں... ایسے میں چند لمحات انسان کی زندگی میں اپنے دامن میں کئی بھید چھپائے آتے ہیں... اور جب وہ دھیرے دھیرے منکشف ہوتے ہیں تو بے بسی اسے پچھتانے پر مجبور کردیتی ہے کیونکہ ان لمحات کی تباہی کو برداشت کرنا اس کی ہمت سے بڑھ کر ہوتا ہے... جو زندگی اور محبت کو مذاق سمجھ بیٹھے تھے، اچانک ایک موڑ نے انہیں سنجیدہ ہونے پر مجبور کردیا... جہاں قدم قدم پر اسرار اور خوف نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کردی تھی مگر... یقین اور بے یقینی کی اس جنگ میں کوئی ایسا بھی تھا جو امید کی لاٹھی تھامے ان کے حوصلوں کو مہمیز کررہا تھا... اسے ہی شاید عشق کی طاقت کہتے ہیں کہ جہاں سارے گمان یا تو سراب میں ڈھل جاتے ہیں یا یقین کی سرحد پار کرلیتے ہیں۔

Digitized by

ماجد اور اشرف بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے غربت کی گود میں پرورش پائی تھی۔ انٹر کرنے کے بعد دونوں ہی کے سر پر سایہ پدری نہ رہا تھا اس لیے وہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ کنبے دونوں ہی کے چھوٹے تھے لیکن بے روزگاری کے سبب دونوں ہی اپنے کنبوں کی نگہداشت نہ کر سکے۔ تنگ دستی نے بیماریوں کو جنم دیا۔ اشرف کی ماں اور بہن اسے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماجد کا چھوٹا بھائی بھی چل بسا۔ ماں زندہ تو رہی لیکن ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی۔ خود اشرف اور ماجد کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہی تھی۔

اچانک اشرف کی قسمت نے کروٹ لی۔ ٹی وی کے ایک انعامی پروگرام میں اسے فتح حاصل ہوئی۔ کثیر رقم کا چیک ملنے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اگر یہ انعام اسے چند ماہ قبل مل جاتا تو شاید اس کا مختصر کنبہ دواؤں کی بدولت زندہ رہ جاتا۔

قدرت کے معینہ قانون کے تحت زندگی کو بہر حال رواں دواں رہنا تھا، سو یہی ہوا۔ اشرف نے چار کمروں کا ایک مکان اور ایک گاڑی خرید لی جو وہ بچپن سے خوابوں میں دیکھتا رہا تھا۔

ماجد اور اس کی ماں کو اس نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ انہی دنوں میں ماجد کو بھی ایک فلم میں ہیرو بننے کا چانس مل گیا۔ معاوضہ بہت کم ملا تھا لیکن کچھ نہ ہونے کے باعث وہ بہت زیادہ تھا۔

اشرف نے پیسے کے بل پر اللے تللے شروع کر دیے تھے۔ وہ شراب بھی پینا شروع کر دیتا لیکن ماجد نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔

اشرف کو ماجد سے بہت محبت تھی اور ایسی ہی محبت ماجد بھی اشرف سے کرتا تھا۔ مزاج دونوں ہی کا کسی نہ کسی حد تک مختلف تھا اس لیے ان میں جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔ بات چیت تک بند ہو جاتی تھی لیکن یہ کیفیت دو تین دن سے زیادہ برقرار نہیں رہتی تھی کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی کی خواہش ہوتی تھی کہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ اس میں ثالثی کا کردار ماجد کی ماں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار تو دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت بھی آ گئی تھی جس کا سبب فلم لائن کی ایک لڑکی تھی لیکن جلد ہی دونوں کو اس وقت عقل آ گئی جب ماجد کے ذریعے لڑکی نے اشرف کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد اشرف کی دولت پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔ ماجد نے لڑکی سے قطع تعلق کر لیا پھر چند دن میں اشرف کو بھی عقل آ گئی جب اس نے لڑکی کو ایک امیر آدمی کی کار میں دیکھا۔ اس نے ان کا تعاقب کیا۔ ساحل سمندر تک گیا۔ وہاں اس نے ان دونوں کی چہلیں دیکھیں۔ واپس آ کر اس نے ماجد سے معافی مانگ لی اور جھگڑا ختم ہو گیا۔

''اس طرح کب تک چلے گا جانی!'' چند روز بعد ماجد نے اشرف سے کہا۔ ''بہت پیسا آ گیا ہے تیرے پاس لیکن تیرے یہ ٹھاٹ باٹ چلتے رہے تو پھر قرض ادھار کی نوبت آ جائے گی۔ میری فلم تو فلاپ ہو چکی ہے۔ دوسری فلم ملنے کا چانس نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''یار! یہ ہوتی ہے دل سے دل ملنے کی بات..... کل ہی مجھے بھی خیال آیا تھا..... لیکن کریں کیا؟''

''ایک بات آئی ہے میرے دماغ میں.....''

''کیا؟''

''فلم بنائی جائے۔''

''اس کے لیے تجربہ چاہیے۔''

''تھوڑی بہت سمجھ تو تجھے بھی آ گئی ہے۔''

''تھوڑی بہت سمجھ تو ڈبو دے گی سب!''

''ارے تو کسی اچھے ڈائریکٹر سے بات کر لیں گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تو میں لکھنا شروع کروں کہانی؟''

''اب تو نے کی ہے سب کچھ ڈبونے کی بات.....! اچھے لکھنے والے مر گئے ہیں کیا؟''

''کوئی ہے تیرے پاس..... کوئی جاننے والا؟''

''میں نے جس فلم میں کام کیا ہے، اس کا رائٹر بہت اچھا ہے۔''

''اسی لیے فلاپ ہو گئی تیری فلم؟'' اشرف نے طنز کیا۔

''اس کی وجہ دوسری تھی جانی! کہانی تو اچھی تھی۔ وہ تو فلم پر پیسا لگانے والے صاحب نے اپنی محبوبہ کو ہیروئن بنایا تھا۔ سارے ہی اخباروں نے لکھا ہے کہ اس کے اناڑی پن کی وجہ سے فلم فلاپ ہوئی۔ کہانی کی تعریف تو سب نے کی ہے۔ تو بھی دیکھ تو چکا ہے میری فلم!''

''ہاں یار، کہانی تو اچھی تھی۔ تیری ایڈلک رہی۔ کام تیرا بھی اچھا تھا۔''

''ظہیر اختر صاحب کہانی لکھ رہے ہیں کوئی۔ ان سے بات کروں؟''

''کر لے۔''

اور ماجد نے بات کر لی۔ دوسرے ہی دن اس نے اشرف کو بتایا۔ ''ابھی آدھی سے کچھ زیادہ کہانی لکھی ہے۔

Digitized by Google

بہت اچھے آدمی ہیں وہ جانی! مجھے سنائی تھی انہوں نے کہانی۔ ابھی پوری نہیں ہوئی لیکن مجھے تو لگتا ہے بہت اچھی کہانی بنے گی۔ سسپنس بھی ہے، تھرل بھی ہے، کردار بھی کم ہیں اور اچھی بات یہ ہے کہ کم بجٹ میں بنے گی۔"

"تو ان سے بات کرنا۔"

"کی تھی، میری والی فلم کی کہانی بھی انہوں نے ہی لکھی تھی لیکن اس کے فلاپ ہونے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ان کی کہانی لینے کو تو تیار رہتے ہیں سبھی لوگ۔"

"یہ تو بتا کہ تیرے بات کرنے سے نتیجہ کیا نکلا؟"

"وہ کچھ ٹال مٹول کر گئے۔"

"کیوں؟"

"بہت مہنگے رائٹر ہیں یار! وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سے اتنا پیسا نہیں ملے گا۔"

"کتنے پیسے مانگ رہے ہیں وہ؟"

ماجد نے ایک اماؤنٹ بتایا۔

اشرف نے کہا۔ "اگر تجھے کہانی پسند ہے تو ڈیوڑھے معاوضے کی بات کر لے۔ آدھا معاوضہ ہم ایڈوانس دے دیں گے۔ جتنی کہانی لکھی گئی ہے، وہ میں بھی پڑھ سکتا ہوں کہ نہیں؟"

"کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی تو آدھا معاوضہ لے کر انہیں اس کی فوٹو اسٹیٹ دینا تو چاہیے۔"

"کل سویرے میرے ساتھ بینک چل۔ چیک کیش کرا کے رقم لے جانا۔ اگر وہ رقم کے بدلے میں فوٹو اسٹیٹ دے دیں تو لے آ۔"

ماجد کی والدہ نے کھانا تیار ہونے کی آواز لگائی تو وہ دونوں اٹھے۔ دوسری صبح اشرف، ماجد کو ساتھ لے کر بینک گیا۔ اس نے چیک کیش کرا کے ماجد کے حوالے کیا۔

اس شام ماجد خوش خوش لوٹا۔ وہ کہانی کی فوٹو اسٹیٹ لے آیا تھا۔ اسکرپٹ کے ساتھ "ون لائنر" بھی تھا۔ وہ اشرف نے ماجد کے سامنے ہی پڑھ ڈالا۔

"کہانی تو اچھی لگتی ہے یار! اب اسکرپٹ میں رات کو لیٹ کر اطمینان سے پڑھوں گا۔"

"اس میں تو اور مزہ آئے گا۔"

ماجد کا خیال درست ثابت ہوا۔ دوسری صبح اشرف بہت پُرجوش تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے ماجد سے کہا۔ "بالکل چلے گی یار! بالکل چلے گی۔ کہانی کب تک پوری ہو جائے گی؟"

"ظہیر اختر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں لگے گا۔"

"ایک گاؤں میں ہے ساری کہانی۔ بیچ میں تھوڑا سا حصہ ڈراؤنا بھی ہے۔ لوکیشن دیکھنے تو کل ہی چلتے ہیں۔ یاد ہے تجھے؟ جب ہم سیکنڈ ایئر میں تھے تو لڑکوں نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ گاؤں کے پیچھے جو دریا ہے، وہیں پکنک منائی تھی ہم لوگوں نے۔ چل کر دیکھتے ہیں اب کیسی رہے گی وہ لوکیشن۔"

"بارہ میل دور ہے۔ کوئی قریب کی جگہ کیوں نہ دیکھیں۔"

"وہیں چل کر دیکھتے ہیں۔" اشرف نے اصرار کیا۔

"سمجھ گیا۔" ماجد ہنسا۔

"کیا سمجھ گیا؟"

"گاؤں کی ایک الھڑ ناری تجھے بہت اچھی لگی تھی۔ تیرہ چودہ سال کی تھی وہ اس وقت! اب تو اٹھارہ سال کی ہو گی۔" ماجد نے بائیں آنکھ دبائی۔

"ہاں یار، اچھی تو لگی تھی وہ مجھے لیکن کیا پتا، شادی بھی ہو چکی ہو اب اس کی۔ ارے ہوتی ہے تو ہو جائے۔ ہمیں تو لوکیشن دیکھنی ہے۔"

"کل کی کسی ٹرین میں بکنگ کرا لوں؟"

"ارے ایکسپریس رکتی ہے اس گاؤں کے پاس! گاڑی میں ہی چلیں گے۔"

اشرف کو ڈرائیونگ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

"کس راستے سے؟" ماجد نے پوچھا۔

"پرانے نیشنل ہائی وے سے۔ بہت کم لوگ جاتے ہیں اب اس راستے سے۔ ہم تیز رفتاری سے نکل جائیں گے۔ دس گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"وہاں سے تو آٹھ گھنٹے کا راستہ ہے تیری ڈرائیونگ کے حساب سے۔"

"اتنی لمبی ڈرائیونگ میں تو میں بہت تھک جاؤں گا۔ بیچ میں دو گھنٹے آرام کر لیں گے۔ وہ حویلی یاد ہے نا تجھے!"

ماجد نے اثبات میں سر ہلایا پھر ہنس کر بولا۔ "اس کا مالک بھی کوئی سنکی ہے۔"

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ حویلی آدھے راستے کے بعد تھی۔ اس کا مالک کوئی وڈیرا تھا جو اب یورپ کے کسی ملک میں جا بسا تھا اور حویلی ایک ملازم کے حوالے کر دی تھی۔ اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس حویلی کو ریسٹ ہاؤس بنا لے۔ آنے جانے والے وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ ملازم انہی لوگوں سے اپنا خرچ چلائے۔

"مجھے یاد ہے۔" اشرف نے کہا۔ "ہم سب لڑکے

بھی وہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہرے تھے۔"

"بس سے گئے تھے اس لیے وہاں رکنا ہی پڑا تھا۔ عجیب سی حویلی ہے وہ جانی! مجھے تو ڈراؤنی سی لگی تھی۔"

"یہ بھی اچھا ہے۔" اشرف نے ہنس کر کہا۔ "ظہیر صاحب کی کہانی میں بھی تو ایک بنگلے کا ذکر ہے جو آس پاس کے لوگوں میں بھوت بنگلے کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ اس بنگلے میں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

"لیکن گاڑی ذرا آہستہ چلانا۔"

"وہ تو مشکل ہے۔ عادت پڑ گئی ہے تیز ڈرائیونگ کی۔"

"مرے گا کسی دن۔"

"تجھے دفنائے بغیر تو نہیں مروں گا۔" اشرف ہنسا۔

"اب یہ تو اللہ جانے کہ ہم میں سے کون کس کو دفنائے گا۔"

بعض اوقات انسان کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو ہو کر رہتی ہیں۔

☆☆☆

گھر میں ایک ملازمہ رکھ لی گئی تھی اس لیے ماجد کو اپنی ماں کی تنہائی کی فکر نہیں تھی۔

"پرسوں تک ہم واپس آجائیں گے اماں!" ماجد نے روانگی کے وقت ماں سے کہا تھا۔

"کار ذرا دھیرے چلانا بیٹا!" ماں نے اشرف سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں اماں!" اشرف نے تسلی دی۔ لیکن ماجد جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

گیارہ بجے تھے جب ان کی کار شہری حدود سے نکل کر ہائی وے پر پہنچی اور یہیں سے اشرف نے تیز رفتاری شروع کی۔

ماجد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "لگتا ہے، ہم دونوں ساتھ مریں گے۔ نہ میں تجھے دفنا سکوں گا، نہ تو مجھے دفنائے گا۔ کوئی اور ہی دفنائے گا ہم دونوں کو۔" اشرف ہنس کر اس کی بات ٹال گیا۔

"میں کچھ پڑھتا ہوں۔" ماجد بولا۔ "رفتار دیکھنے سے ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"کیا پڑھے گا؟"

"دو تین ناول لے آیا ہوں۔" ماجد نے ہینڈ بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ "کہیں ٹکر ہو جائے تو میری لاش کو بتا دینا کہ کس سے ٹکر ہوئی تھی۔"

اشرف پھر ہنس دیا۔ ماجد نے ابرام اسٹوکر کا ناول "دی مسٹری آف دی سی" نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی ریڈنگ اسپیڈ اچھی نہیں تھی۔ وہ پندرہ منٹ میں تیسرے صفحے تک پہنچا۔

"ذرا دیکھ تو۔" اچانک اشرف نے کہا۔

ماجد نے سر اٹھایا۔ "کیا ہے؟"

"دوربین لگا کر دیکھ..... کوئی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔"

اشرف دوربین ساتھ لایا تھا جو ڈیش بورڈ پر ہی پڑی تھی۔ ماجد نے وہ اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ کار تیز رفتاری سے فراٹے بھر رہی تھی۔ اس وقت تک انہیں اس راستے پر کوئی دوسری گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔

"اوہ۔" ماجد کے منہ سے نکلا۔ "لڑکی ہی ہے جانی..... اور بہت الٹرا ماڈرن لگ رہی ہے، لباس سے۔ اس کے قریب ہی کنارے پر ایک کار بھی کھڑی ہے۔"

"اکیلی ہے؟"

"اکیلی ہی لگ رہی ہے، کوئی اور تو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ہاں، اب تو مجھے بھی نظر آرہی ہے۔"

کار کی اسپیڈ ہی اتنی زیادہ تھی کہ اتنی سی دیر میں اتنا فاصلہ طے ہو گیا کہ لڑکی دوربین کے بغیر بھی دکھائی دینے لگی۔

"یہ اس ویران جگہ پر کیوں کھڑی ہے؟" ماجد بڑبڑایا۔

"شاید اس کی کار میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔"

"ہے تو یہ زبردست لڑکی۔" ماجد دوربین آنکھوں سے لگائے رہا تھا اس لیے لڑکی اب اسے بہت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا کہا؟ زبردست لڑکی؟"

"اوہ!" اشرف کے منہ سے نکلا۔ "وہ تو بیچ راستے پر کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کر رہی ہے۔" ساتھ ہی اشرف نے اسپیڈ کم کرنی شروع کر دی۔

"لفٹ مت دینا اسے۔" ماجد نے کہا۔ "ایسے ویرانے میں کوئی ایسی لڑکی دکھائی دے تو سمجھ لو کوئی چڑیل وڑیل ہے۔ بس تیزی سے نکل چل۔"

"چڑیلیں کار بھی رکھتی ہیں؟" اشرف ہنسا۔

"جادوگر ہوتی ہیں۔ ہمیں جہاز بھی نظر آسکتا ہے جو ہوگا نہیں۔"

"تو نے ناول پڑھنا شروع کر دیے ہیں لیکن تیرا دماغ اب بھی بچپن میں پڑھی ہوئی کہانیوں میں گھوم رہا ہے۔" اشرف نے رفتار بہت کم کر دی کیونکہ لڑکی اب بہت قریب آگئی تھی۔

"اس سے بچ کر نکل چل میری جان!" ماجد نے

Digitized by Google

گڑگڑانے والے انداز میں کہا۔ ''کیوں کسی مصیبت میں پڑے گا۔''

''ابرام اسٹوکر کے ناول پڑھتا ہے اور ڈرتا اتنا ہے۔'' اشرف نے لڑکی کے قریب جاکے کار روک دی۔

''جل تو جلال تو.....'' ماجد بڑبڑانے لگا۔

لڑکی کی عمر میں بائیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ جینز پر خاصے کشادہ گلے کی بنیان پہنے ہوئے تھی۔ سنہری بالوں پر سرخ ربن باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا جس میں ضرورت کا ہلکا پھلکا سامان ہوگا۔ وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کے قریب آئی۔

''شکریہ مسٹر!'' وہ انگریزی میں بولی۔ ''دراصل میں یہاں پریشانی کا شکار ہوگئی ہوں۔ میری کار میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ میں انجن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر آپ کار کے انجن کو چیک کرسکتے ہیں تو ذرا دیکھ لیجیے۔''

''نہیں۔'' اشرف نے اردو میں جواب دیا۔

''آپ بھی.....'' لڑکی نے ماجد کی طرف دیکھا اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے بولی۔ ''آپ کو تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔''

''فلم میں دیکھا ہوگا۔'' اشرف نے کہا اور اس فلم کا نام بھی بتایا جس میں ماجد کام کرچکا تھا۔

''اوہ!'' لڑکی خوش ہوئی۔ ''آپ ماجد ہیں؟''

''ہاں جی۔'' ماجد نے ٹھنڈی سانس لی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' ماجد نے کہا۔ ''میں بھی کار کے ڈھیلے انجر پنجر ٹھیک نہیں کرسکتا۔ چل بھائی!'' آخری دو لفظ اس نے اشرف سے کہے تھے۔

''اوہ!'' لڑکی مایوس نظر آئی۔ ''کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟ میری منزل بھی ادھر ہی ہے جدھر آپ جارہے ہیں۔''

''آپ کے پاس موبائل تو ہوگا۔'' اشرف نے کہا۔

''جی ہاں۔ میں اپنے گھر فون کرچکی ہوں۔ ڈیڈی میرے ہیں نہیں اور ڈرائیور کو مام نے کسی کام سے بھیج دیا ہے۔ وہ مام کی کار لے گیا ہے اور دو گھنٹے میں لوٹے گا۔ پھر یہاں آنے میں بھی اسے ایک گھنٹا تو لگے گا۔ موسم بھی کچھ خراب ہورہا ہے۔ بارش اور آندھی کا امکان ہے۔ بارش کی تو کوئی بات نہیں لیکن آندھی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ پلیز! بڑی مہربانی ہوگی آپ کی اگر مجھے لفٹ دے دیں تو۔''

ماجد نے آسمان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو بارش کے آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔''

''یقین کیجیے، میں ٹی وی پر سن چکی ہوں۔ محکمۂ موسمیات...''

''وہ تو بکتے ہی رہتے ہیں۔'' ماجد نے اس کی بات کاٹی۔

''پلیز!'' لڑکی گھگیائی۔ ''ابھی ایک کار گزری تھی مگر انہوں نے بھی لفٹ نہیں دی۔ آپ تو مجھے مایوس نہ کریں۔''

''چلو بیٹھ جاؤ پیچھے۔'' اشرف بول پڑا۔

''اوہ، تھینکس!'' لڑکی نے جلدی سے پچھلی سیٹ کے دروازے کا ہینڈل پکڑا۔

''کیا مصیبت مول لے رہا ہے۔'' ماجد بڑبڑایا۔

''باتوں میں وقت ضائع ہورہا تھا۔''

''تو.....'' ماجد کچھ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ لڑکی نے پہلے تو اپنا بیگ پچھلی سیٹ پر پھینکا اور پھر خود بھی بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔

اشرف نے کار آگے بڑھادی۔ اس نے انجن بند نہیں کیا تھا۔

''ایک بار پھر شکریہ۔'' لڑکی بولی۔ ''میرا نام شیریں ہے، شیریں جمال۔''

''یہ جمال آپ کے.....''

''میرے مرحوم والد۔'' شیریں نے اشرف کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا، پھر بولی۔ ''آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔''

''اشرف سعید۔''

''آپ بھی فلم میں کام کرتے ہیں؟''

اشرف ہنسا۔ ''میں نیا نیا فلم ڈائریکٹر بننے والا ہوں۔ فلم بنانے کا ارادہ ہے۔''

''ماجد صاحب ہی کو ہیرو لیجیے گا۔ ہیرو کو خوب صورت تو ہونا چاہیے۔''

''اب مجھ پر ڈورے ڈالے گی یہ چڑیل۔'' ماجد نے دل ہی دل میں کہا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''مزے کرتی ہوں۔'' شیریں نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولی۔ ''مطلب یہ کہ بس تفریح کرتی ہوں۔ ڈیڈی بہت کچھ چھوڑ کر گئے تھے دنیا سے۔ کاروبار ان کا اب بھی ہے جسے انکل سنبھالتے ہیں۔ آج کل وہ بزنس ٹور پر یورپ گئے ہوئے ہیں۔''

ماجد کبھی کبھی کن انکھیوں سے پیچھے دیکھ لیتا تھا، جیسے اسے ڈر ہو کہ یہ چڑیل کہیں اس کی گردن نہ دبوچ لے۔

''آپ بہت تیز کار چلاتے ہیں۔'' وہ کچھ توقف سے بولی۔

Digitized by Google

''ڈرلگ رہا ہے؟''

''ارے نہیں۔ میں خود بھی تیز ڈرائیونگ کرتی ہوں۔ آہستہ کار چلانے میں تو مزہ ہی نہیں آتا۔'' اشرف نے رفتار کچھ اور بڑھائی۔

''گڈ!'' شیریں چہکی۔

وہ بولتی بہت تھی۔ اس نے کسی بات پر اپنی یورپ کی سیاحت کے قصے چھیڑ دیے۔ بقول اس کے اس نے دو سال یورپ کے مختلف ممالک دیکھے تھے۔ باتیں اس کی دلچسپ تھیں لیکن ان میں دلچسپی اشرف ہی لے رہا تھا۔ ماجد نے چپ سادھ لی تھی۔ اسی میں اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ اس دوران میں سامنے سے صرف ایک کار آئی یا دو ٹرک لیکن انہیں دیکھ کر بھی اشرف نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ اس وقت ماجد کے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے لیکن شیریں بہت لطف اندوز ہوئی تھی۔

''ہمارے پیچھے سے کوئی گاڑی نہیں آئی۔'' شیریں بولی۔

''اتنی تیز رفتاری سے لوگ چلاتے نہیں ہیں نا لیکن اب ایک کار آتی دکھائی دے رہی ہے۔'' اشرف نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' شیریں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ ''ہاں آ تو رہی ہے۔''

''آہستہ چلا یار جانی!'' ماجد بدبدایا۔ ''بادل بھی آ رہے ہیں اب۔ ہوا بھی خاصی تیز ہو گئی ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا؟'' شیریں کو چہکنے کا موقع ملا۔ ''بارش کا امکان ہے آج۔''

''خراب موسم میں ہی تیز رفتاری خطرناک ہوتی ہے۔'' ماجد بولا۔

''بارش ہوگی تو رفتار کم کرلوں گا۔'' اشرف نے کہا۔

''ابھی سے کیا ضرورت ہے۔''

اسی وقت پیچھے سے آنے والی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

''ارے!'' شیریں بولی۔ ''یہ کار تو آپ کی تیز رفتاری کو چیلنج کر گئی ہے۔ میں ڈرائیو کر رہی ہوتی تو اسے پیچھے چھوڑتی۔''

''وہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔'' اشرف نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

''کیا کر رہے ہو جانی!'' ماجد ہولنے لگا۔ ''نکل گئی ہے وہ تو نکل جانے دے۔ ہمارا کچھ لے تو نہیں گئی۔''

''چیلنج تو کر گئی ہے وہ اشرف صاحب کو۔'' شیریں بولی۔

''کوئی چیلنج ویلنج نہیں کیا اس نے..... وہ کوئی ہوگا بہت جلدی میں۔''

''میں تو ایسی حرکت کو چیلنج ہی سمجھتی ہوں۔ آپ رفتار اور بڑھائیں اشرف صاحب۔''

اشرف بتدریج رفتار بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔ آگے نکل جانے والی کار اب ایک فرلانگ کے قریب آگے تھی۔

''پک اپ اشرف صاحب۔'' شیریں نے جوشیلے انداز میں کہا۔

''یہ اور آگئی مروانے۔'' ماجد بڑبڑایا۔

''اشرف صاحب!'' شیریں بولی۔ ''آگے نکلنے کے بعد پھر اسے آگے نہ نکلنے دیجیے گا۔''

''ارے حادثہ ہو جائے گا۔'' ماجد جھنجلا گیا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' شیریں بولی۔ ''اشرف صاحب کی مہارت کا اندازہ ہو گیا ہے مجھے۔''

آخر اشرف کی گاڑی اس کار سے آگے نکلنے لگی۔ اس کار کے شیشے سیاہ تھے اس لیے ڈرائیونگ کرنے والا دکھائی نہیں دیا۔

دفعتاً وہ کار کوئی ایک فٹ اچھل گئی۔ اتنی تیز رفتاری میں کار اتنی زیادہ اچھل جائے تو اسٹیئرنگ پر قابو رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ کار اپنی دائیں جانب مڑی تو اشرف کی گاڑی اس سے ٹکرا گئی۔ اس وقت اشرف کی مہارت کام آگئی۔ اس نے گاڑی قابو سے باہر نہیں ہونے دی اور اسے آگے نکال کر لے گیا حالانکہ گاڑی اس کی بھی اچھل گئی تھی۔

جس کار سے تصادم ہوا تھا، وہ اشرف کی لینڈ کروزر کی طرح بھاری نہیں تھی۔ اس ٹکراؤ نے اسے الٹ دیا اور وہ ایک طرف گھسٹتے گھسٹتے ایک قلابازی بھی کھا گئی۔

''مائی گاڈ!'' ماجد کے منہ سے نکلا۔

اس کے ساتھ شیریں بھی پیچھے دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں نے دیکھا کہ کار جب ایک جگہ رکی تھی تو اس کے گھومتے ہوئے پہیے آسمان کی طرف تھے۔ چھت زمین سے لگی ہوئی تھی اور کچھ پچک گئی تھی۔ اس کے دو دروازے کھل گئے تھے۔ اشرف نے تھبرا کر بریک لگائے۔

''یہ کیا کر رہے ہو!'' ماجد چیخا۔ ''بس بھاگ ہی لو یہاں سے ورنہ.....''

''ماجد صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شیریں جلدی سے بولی۔ ''رکیں گے تو پھنس جائیں گے کسی چکر میں..... کم از کم ڈرائیونگ کرنے والا تو مرا نہیں ہے۔ میں نے ہلکی سی جھلک دیکھی تھی، وہ زمین پر گھسٹتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ کوئی دے ہی دے گا اسے اتنی لفٹ کہ کسی ہاسپٹل تک پہنچا

Digitized by Google

دے۔ واپس جانا پڑے گا لفٹ دینے والے کو۔ آگے تو بہت دور تک کوئی ہاسپٹل نہیں ہے۔''

لینڈ کروزر کی رفتار کچھ کم ہوئی تھی لیکن ماجد اور شیریں کی باتوں کے باعث وہ رفتار میں مزید کمی نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے تذبذب بھی ظاہر ہو رہا تھا اور پریشانی بھی۔

''اب موقع ہے رفتار بڑھانے کا۔'' ماجد نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

''ہاں بس نکل ہی جانا چاہیے جلدی سے۔'' شیریں نے اس کا ساتھ دیا۔

اشرف اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''نکل چل جانی تیزی سے۔'' ماجد پھر بولا۔ ''رفتار بڑھا۔''

''اگر وہ زندہ بچ گیا ہے۔'' اشرف بڑبڑایا۔ ''تو اس نے ہماری گاڑی کا نمبر بھی دیکھ لیا ہوگا۔ وہ بتا دے گا پولیس کو۔''

''حادثے کی وجہ سے اس کا دھیان ہی نہیں گیا ہوگا نمبر کی طرف۔'' شیریں بولی۔

''یہ بات صحیح ہے۔'' اس مرتبہ ماجد نے شیریں کا ساتھ دیا۔ ''کیا ہم نے اس کی کار کا نمبر دیکھا تھا جبکہ اس وقت حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ رفتار بڑھا جانی!''

آخر اشرف نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

''تیزی سے نکل چل میری جان!'' ماجد پھر بولا۔

''بڑھا تو رہا ہوں رفتار۔'' اشرف کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''اب جان کیوں نکل رہی ہے۔'' ماجد نے کہا۔ ''میری بات نہیں مانی تھی، کہا تھا میں نے کہ اس تیز رفتاری میں حادثہ نہ ہو جائے۔''

''اب دیکھا جائے گا جو ہوگا۔'' شیریں نے کہا۔ ''رکنا تو اور مصیبت بن جاتا۔''

''پولیس پتا لگا لے گی یار!'' اشرف نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''پہلے سوچا ہوتا نا یہ۔'' ماجد نے اشرف کو گھورتے ہوئے کہا، پھر مڑ کر شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری وجہ سے ہوا ہے یہ!'' لڑکی سے اس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ اس کا سبب حادثے کی وجہ سے ذہن کو لگنے والا جھٹکا تھا۔

''میری وجہ سے کیوں؟'' شیریں نے تیوری چڑھائی۔

''تم ہی نے اکسایا تھا اشرف کو۔ پک اپ، پک اپ۔'' ماجد نے اس کی نقل اتاری۔

شیریں ہنس پڑی۔ ان حالات میں اس کا ہنسنا ماجد کو بڑا عجیب محسوس ہوا اور ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ چڑیلوں پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ تو کسی معاملے کو اہمیت ہی نہیں دیتیں۔

''یہ رفتار ٹھیک ہے۔'' ماجد نے کہا۔ ''جلد از جلد دور نکل جائیں گے۔''

''ہوں۔'' اشرف کی مسکراہٹ مرجھائی ہوئی تھی۔

''اب ڈر نہیں لگ رہا ہے؟''

''بڑی مصیبت سے جو بچتا ہے۔''

''مجھے ڈر ہے کہ بچ نہیں سکیں گے۔'' اشرف کے تفکر میں اضافہ ہوا۔

''بری فالیں منہ سے نکالنا ہی نہیں چاہئیں۔''

''کیا ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں شیریں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''کہ تم اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی۔''

''میں تمہاری گاڑی میں تھی ایکسیڈنٹ کے وقت۔ بتاؤں گی تو پولیس کیا مجھے چھوڑے گی؟''

اشرف چپ ہو گیا لیکن ماجد سوچنے لگا کہ شیریں نے کوئی مضبوط جواز نہیں دیا تھا، لیکن اس پر اعتماد کرنے کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

''بادل اب تیزی سے قریب آ رہے ہیں۔'' شیریں بولی۔ ''اور تیز چلاؤ اشرف!'' وہ اب بے تکلف ہو چلی تھی۔

عام حالات میں اشرف اور ماجد کو اس کی یہ بے تکلفی شاید پسند نہ آتی لیکن اس وقت دونوں ہی کا دماغ حادثے کی وجہ سے الجھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بے تکلفی کا آغاز تو اشرف ہی کر چکا تھا۔

اور پھر ماجد سوچنے لگا، وہ اس کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں۔ شاید وہ چڑیل ہی ہو۔

بادل واقعی بڑی تیزی سے آ رہے تھے۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

شیریں بولی۔ ''اگر ہم بارش سے پہلے حویلی پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔''

ماجد چونکا۔ ''تم اس راستے پر پہلے بھی آ چکی ہو؟''

''جب چھوٹی تھی، تب تو بہت آتی تھی۔ بعد میں ایک بار آئی ہوں۔ ویسے بھی انکل وہ حویلی چھوڑ چکے ہیں جب سے ڈیڈی کا کاروبار سنبھالا ہے۔''

''وہ حویلی.....'' ماجد بولا۔ ''جہاں کے منتظم یا چوکیدار نے اسے ریسٹ ہاؤس بنا دیا ہے؟''

''ہاں وہی۔'' شیریں نے کہا۔ ''میں وہیں تو جا رہی

Digitized by Google

تھی۔ ویسے شیخو بابا مجھے پسند نہیں ہیں۔ ہر وقت ایسے سنجیدہ رہتے ہیں جیسے..... مجھے تو وہ کبھی کبھی بدروح لگنے لگتے ہیں۔''

''شیخو بابا؟'' اشرف کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''وہی جن کو ماجد نے چوکیدار یا ملازم کہا تھا۔''

''تو وہ تمہارے انکل کی حویلی ہے؟''

''ہاں، عجیب ہیں وہ بھی..... حویلی کے چاروں طرف جنگل بنا دیا ہے۔ وہاں جو کسان کھیتی باڑی کرتے تھے، ان کا گاؤں حویلی کے پاس ہی تھا۔ انکل نے ان کا گاؤں دور بنا دیا تھا۔ یہ ساری زمین انہی کی ہے نا..... اور پھر حویلی کو ریسٹ ہاؤس بنانے کی کیا ضرورت تھی بھلا!''

''تمہارے شیخو بابا کا خرچ تو اسی سے چلتا ہے نا!'' ماجد بولا۔

''تم لوگ پہلے اس حویلی میں ٹھہر چکے ہو کیا؟''

''ہاں، لیکن بہت عرصہ ہو گیا۔''

''کیوں آئے تھے ادھر؟''

''کالج میں تھے اس زمانے میں۔ پکنک منانے آئے تھے۔''

''اوہ!'' شیریں کے منہ سے نکلا۔ ''شروع ہو گئی بارش!''

بارش بھی اچانک اور دھواں دھار شروع ہوئی تھی۔ بادل گرجنے لگے تھے، بجلی چمکنے لگی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اشرف نے ہیڈ لائٹس آن کر دی تھیں لیکن اس کی روشنی میں بھی زیادہ آگے تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اشرف کو رفتار بہت کم کرنا پڑی تھی۔

''ایک گھنٹا اور نہ ہوتی۔'' شیریں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''حویلی پہنچ جاتے ہم۔ تم لوگ کہاں جا رہے تھے؟''

''اسی گاؤں تک جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے۔''

''وہاں کیوں؟''

''فلم بنانے کا ارادہ ہے نا۔'' اشرف نے کہا۔ ''وہاں ایک لوکیشن دیکھنا ہے۔''

اس وقت اگر شیریں نہ ہوتی تو ماجد گاؤں کی اس لڑکی کا ذکر ضرور کرتا جو اشرف کو پسند آ گئی تھی۔

بارش نے راستے میں اب کیچڑ بھی کر دی تھی۔ اشرف رفتار کم کرتا رہا، پھر اسے گاڑی روکنا پڑی۔

''مشکل ہے اب۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''بارش رکنے کے بعد ہی اب آگے بڑھا جا سکتا ہے۔'' اس نے انجن بھی بند کر دیا۔

''رکنا ہی اچھا ہے۔'' ماجد نے کہا۔ ''بارش اتنی ہے کہ وائپر بھی صحیح طور پر ونڈ اسکرین صاف نہیں کر پا رہے ہیں۔''

گرج چمک اور بارش کا سلسلہ ایسا تھا جیسے آج کے بعد پھر نہیں برسنا۔

''کیا خیال ہے..... کچھ کھا پی لیا جائے؟'' ماجد پھر بولا۔

''ٹھیک ہے..... نکال۔''

کھانے پینے کی اشیا ایک چھوٹے بیگ میں تھیں جو پچھلی سیٹ پر رکھا تھا۔

''ایک فٹن تو میں بھی لے کر چلی تھی۔'' شیریں بولی۔

''چلو تم بھی نکالو۔'' اشرف نے کہا۔ ''ہمارا بیگ بھی تم ہی رکھ لو۔ اس میں ایک چھوٹا سا بیگ اور ہے۔ اس میں بس کھانے پینے کا سامان ہے۔''

ماجد کچھ ہنسا۔ ''ایکسیڈنٹ تو ہم بھول ہی گئے۔''

''بھول ہی جائیں تو اچھا ہے۔'' اشرف نے کہا۔ ''گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔''

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔'' شیریں بولی۔ ''ویران راستوں پر ایکسیڈنٹ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی کوئی پکڑا گیا ہے۔ جسے موقع ملتا ہے، وہ بھاگ ہی نکلتا ہے اور ہماری پولیس ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ جاتی ہے۔''

اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور باتیں بھی جاری رہیں۔

''تم آج کیوں جا رہی ہو وہاں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''نادر چیزیں جمع کرنا بھی ایک شوق ہے میرا۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''بس اتفاق سے معلوم ہو گیا کہ یہ شوق کبھی انکل کو بھی تھا۔ بہت چیزیں جمع کی تھیں انہوں نے۔ وہ سب حویلی کے ایک بڑے کمرے میں بند کر دی گئی ہیں۔ پرسوں فون پر انکل سے بات ہو رہی تھی تو انہیں بھی میرے اس شوق کا پتا چلا۔''

''تو وہ چیزیں دیکھنے جا رہی ہو؟''

''دیکھنے کیا، اگر کچھ پسند آیا تو لے بھی لوں گی۔ انکل نے اجازت دے دی ہے مجھے۔ انہیں تو بزنس میں پڑ کر اب ان چیزوں کا شوق ہی نہیں رہا۔ جب تک یہاں زمینداری کرتے رہے، یہ شوق بھی رہا۔''

''حویلی وہ بیچ بھی سکتے تھے..... واپسی کا ارادہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں اب وہ یہاں نہیں رہیں گے، لیکن جدی پشتی حویلی ہے۔ وہ اسے بیچنا نہیں چاہتے۔''

''ورثے میں ملی ہے؟''

''ہاں۔''

''تو تمہارے مرحوم والد کا بھی حق ہوگا اس پر اور

Digitized by Google

اب وہ نہیں رہے تو تمہارا بھی حق ہے اس پر!''

''ڈیڈی اور انکل میں بہت محبت تھی۔ بزنس ایسا ہے کہ ڈیڈی نے کبھی وراثت کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا۔ انکل کی سوچ بھی ایسی نہیں ہے۔''

ماجد کے دل سے اب چڑیل کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ اسے شیریں کی باتیں جھوٹ نہیں معلوم ہو رہی تھیں۔ آخر بارش رک گئی لیکن اس طرح کہ ہلکی سی پھوار کا سلسلہ باقی رہا۔

''اب تو نکل چل جانی۔'' ماجد نے اشرف سے کہا۔

''ہاں، چلنا ہی چاہیے لیکن.....'' اشرف نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اندھیرا تو بادلوں کی وجہ سے ہے لیکن حویلی تک پہنچتے پہنچتے رات ہو ہی جائے گی۔''

''اور اب وہاں صرف آرام کرنے کے لیے نہیں، رات گزارنے کے لیے رکنا پڑے گا۔''

''میں شیخو بابا سے کہہ دوں گی کہ تم لوگوں کا خاص خیال رکھے۔'' شیریں بولی۔ ''بلکہ یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اتنا ہی کہنا بہت ہوگا کہ تم دونوں میرے دوست ہو۔''

اشرف نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک تو ہمارے پیچھے کوئی نہیں آیا۔'' ماجد بولا۔

''دو ایک گاڑیاں ہوں گی بھی تو بارش کی وجہ سے انہیں بھی رکنا پڑا ہوگا۔'' شیریں نے جواباً کہا۔

''مجھے پولیس کا خیال آیا تھا۔''

''ایکسیڈنٹ کی وجہ سے؟''

''اور کس وجہ سے آئے گا۔''

''اتنی جلدی تو پولیس آ ہی نہیں سکتی۔''

''مت کرو ایکسیڈنٹ کی باتیں۔'' اشرف بول پڑا۔ ''گھبراہٹ ہونے لگی مجھے!''

''ارے کچھ نہیں ہوگا۔'' شیریں نے کہا۔ ''ان کی مٹھی گرم کر دی جائے تو وہ خود ہی آنکھیں چرا لیں گے۔''

گاڑی کم رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راستہ ہی اتنا خراب ہو گیا تھا کہ تیز رفتاری ممکن نہیں تھی۔ وہاں سے حویلی تک کا راستہ ایک گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن وہ کم رفتاری کے باعث دو تین گھنٹے میں حویلی پہنچے۔

تاریکی میں ڈوبی ہوئی حویلی کے صرف ایک کمرے کی دو کھڑکیاں روشن نظر آ رہی تھیں۔

''یہاں روشنی کا کیا بندوبست ہے؟'' اشرف نے پوچھا اور کہا۔ ''پچھلی بار ہم آئے تھے تو دن میں رکے تھے۔''

''بجلی ہے حویلی میں۔'' شیریں نے بتایا۔ ''گاؤں تک پہنچی ہوئی ہے۔ شیخو بابا صرف دو کمرے روشن رکھتے ہیں جہاں خود ہوتے ہیں۔ کوئی یہاں آ کے ٹھہرتا ہے تو کچھ اور کمرے روشن کر دیے جاتے ہیں۔''

''معقول بات ہے۔'' اشرف نے کہا۔ ''بلاوجہ بجلی کا استعمال کیوں ہو۔''

''لیکن یہاں کال بیل نہیں ہے۔'' شیریں ہنسی۔

''اچھا!'' ماجد نے حیرت سے کہا۔ ''ہم تو..... دن میں آئے تھے۔ کچھ لوگ حویلی میں پہلے سے بھی ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اب آج اس وقت تو یہاں شاید کوئی ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔''

''ہاں، صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی ہے۔'' اشرف نے کہا۔ ''پھاٹک تو بند ہوگا۔''

''زنجیر کھینچنا پڑے گی۔'' شیریں نے ہنس کر بتایا۔ ''انکل کے سوچنے کا انداز بھی عجیب ہی ہے۔ انہوں نے کال بیل نہیں لگوائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے اس حویلی کی قدامت مجروح ہوگی۔ بجلی کا بندوبست کرنا تو مجبوری تھی۔''

''یہ کتنی قدیم ہے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ بنی اسی وقت تھی جب بجلی نہیں ہوتی تھی۔ ارے اب اترو گے بھی یا گاڑی ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہو گے؟ یہاں کوئی ملازم تو ہوتا نہیں ہے۔ سامان بھی خود ہی اتارنا ہوگا۔''

اشرف نے گاڑی کا انجن بند کر دیا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''پہلے پھاٹک تو کھلوایا جائے..... وہ زنجیر تو بہت وزنی ہوگی شاید۔''

''تھوڑی سی طاقت تو لگتی ہے اسے کھینچنے میں۔'' شیریں بھی گاڑی سے اتر رہی تھی۔

''تو گھنٹی کہاں بجتی ہے؟'' ماجد بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

''گھنٹی نہیں، گھنٹا ہے۔ دوسری منزل کی چھت پر جو گنبد بنا ہوا ہے، گھنٹا اسی میں لگا ہے۔''

''بڑی زوردار آواز ہوگی اس کی تو۔''

''یہ تو اس پر ہے کہ زنجیر کتنی زور سے کھینچی جائے۔''

''کوئی اجنبی ادھر آتا ہوگا تو کال بیل نہ ملنے پر پھاٹک ہی دھڑ دھڑاتا ہوگا۔''

''نہیں، تم لوگوں نے غور نہیں کیا ہوگا۔ یہ دیکھو۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ تینوں پھاٹک کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اشرف

نے ٹارچ روشن کر کے اس طرف ڈالی جدھر شیریں نے اشارہ کیا تھا۔ پھاٹک کی بائیں جانب ایک چھوٹے سے بورڈ پر رکھا تھا۔

''یہاں کال بیل نہیں ہے۔ وہ زنجیر کھینچیں جو اس بورڈ کے قریب ہی ہے۔''

''کھینچو بھئی!'' اشرف نے ٹھنڈی سانس لی۔

ٹارچ کی روشنی میں زنجیر بھی دکھائی دے گئی تھی جس کی کڑیاں خاصی بڑی بڑی تھیں۔ ماجد نے زنجیر کو کھینچنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں کھنچے گی۔

شیریں ہنسی۔ ''تھوڑا سا زور تو لگاؤ۔''

اب ماجد نے کچھ زور لگایا تو زنجیر کھنچی۔ ساتھ ہی دوسری منزل کی چھت کے گنبد میں گھنٹا بجا۔ آواز زیادہ زوردار نہیں تھی، یا ان تک کچھ ہلکی ہو کر پہنچی تھی۔

''کیا زور سے کھینچوں؟'' ماجد نے منہ بنایا۔

''ضرورت نہیں۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''شیخو بابا سو بھی رہے ہوں گے تو ان کی آنکھ کھل گئی ہوگی۔ وہ گہری نیند نہیں سوتے۔ ذرا انتظار کرو۔''

وہ انتظار بہ مشکل ایک ڈیڑھ منٹ کا تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی کمروں میں روشنی ہوگئی تھی۔

''کہا تھا نا میں نے۔'' شیریں بولی۔ ''شیخو بابا ہی نے کی ہوگی روشنی۔ بس دو منٹ میں آجائیں گے پھاٹک تک۔''

''ہاں، احاطہ تو زیادہ بڑا نہیں ہے۔'' اشرف کو یاد تھا۔

جلد ہی انہوں نے قریب آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی۔

''کون ہے؟'' آخر اندر سے ایک کھرکھراتی ہوئی آواز آئی۔

''میں ہوں بابا! شیریں۔''

''بٹیا رانی؟'' تعجب سے پوچھا گیا۔

''ہاں۔''

پھاٹک آواز کے ساتھ کھلنے لگا۔ اس کے قبضوں میں زنگ خاصا لگ گیا تھا پھر ان تینوں پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔

''یہ کسے ساتھ لے آئی ہو؟'' شیخو بابا نے پوچھا۔

ٹارچ کی روشنی شیخو بابا کے چہرے پر مدھم ہو کر پہنچ رہی تھی اس لیے اس کے نقش و نگار دیکھے نہیں جاسکتے تھے۔

''دوست ہیں میرے۔'' شیریں نے جواب دیا پھر اشرف اور ماجد سے بولی۔ ''چلیں اب سامان اتار لیں۔''

''میں آؤں بٹیا رانی۔'' شیخو بابا نے پوچھا۔

''نہیں بابا! ہلکا پھلکا سامان ہے۔''

''گاڑی احاطے میں نہ لے چلیں؟'' ماجد نے پوچھا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' شیریں نے کہا۔ ''پھاٹک پورا کھول دو بابا!''

اشرف نے گاڑی میں جا کر انجن اسٹارٹ کیا۔ شیریں اور ماجد پھاٹک سے اندر داخل ہوگئے۔ شیخو بابا نے پورا پھاٹک کھول دیا۔ اشرف گاڑی اندر لے آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب ایک وسیع کمرے میں تھے جسے ڈرائنگ روم کہا جاسکتا تھا۔ اس کی آرائش حویلی ہی کی طرح قدیم طرز کی تھی۔ کمرا روشن تھا اس لیے شیخو بابا کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ لمبا کرتہ اور ٹخنوں سے اونچی شلوار تھی۔ کرتے پر واسکٹ بھی تھی۔ چہرے کے نقش و نگار سے اس کی عمر ستر سال معلوم ہوتی تھی۔ اس کی گھنی مونچھیں بالکل سفید ہو چکی تھیں۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ مجموعی طور پر چہرہ ستا ہوا سا تھا۔

''بس اب کمرے دکھا دو ہمیں۔'' شیریں بولی۔ وہ شیخو بابا سے مخاطب تھی۔

''ایک تمہارے لیے اور ایک ان کے لیے۔''

''ہمارے لیے دو۔'' ماجد بول پڑا۔

اشرف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ماجد زیر لب مسکرا دیا۔

''تم دونوں دوست ہو اور الگ الگ کمرے؟'' شیریں کو تعجب ہوا۔

ماجد نے بس سر ہلا دیا۔ شیخو بابا نے اوپری منزل پر ان کے لیے تین کمرے منتخب کر دیے جو ایک قطار میں تھے۔

''اب کل صبح ملاقات ہوگی۔'' شیریں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''میں سامان رکھ کر ابھی آتا ہوں تمہارے پاس۔'' اشرف نے کہا۔

شیخو بابا ان لوگوں کو چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔ اس کے چلنے کا انداز عجیب سا تھا۔ بادی النظر میں ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیر زمین سے لگے بغیر اٹھ رہے ہوں، آگے بڑھ رہے ہوں۔ ماجد کو شیریں کی بات یاد آگئی۔ اس نے شیخو بابا کے بارے میں کہا تھا کہ جیسے وہ کوئی بدروح ہو۔

جانے سے پہلے شیخو بابا نے ان تینوں ہی سے کھانے کے لیے پوچھا تھا لیکن ان تینوں ہی کے پاس ایک وقت کے کھانے کا بندوبست تھا۔

ماجد نے اپنے کمرے میں پہنچ کر چھوٹے سے سوٹ کیس سے ضروری چیزیں نکال کر ایک طرف رکھی ہی تھیں

Digitized by Google

کہ اشرف آ گیا۔

''یہ الگ الگ کمرے کی کیا سوجھی تجھے؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''کل بھی یہیں رکیں گے۔'' ماجد کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

''میں الگ الگ کمرے کی بات کر رہا ہوں اور تُو.....''

''شاید تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے۔''

''کس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع؟''

''شیریں سے۔''

''کیوں؟''

''مجھے اچھی لگی ہے وہ جانی!'' ماجد نے بائیں آنکھ دبائی۔

''بہت اچھے!'' اشرف نے طویل سانس لی۔ ''چڑیل یاد نہیں رہی؟''

''اس کے بارے میں اتنا کچھ سامنے آ چکا ہے۔ اب اسے چڑیل کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔''

''بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے وہ۔'' اشرف نے اسے گھورا۔

''میں بھی تو فلمی ہیرو ہوں۔'' ماجد ہنسا۔ ''گاڑی میں وہ میری خوبصورتی کی تعریف بھی کر چکی ہے۔''

''اس کا مطلب تو نے یہ لے لیا کہ اسے تجھ سے عشق بھی ہو جائے گا۔''

''اچھا اب دماغ نہ کھا میرا۔ جا کے آرام کر۔ میں بھی بہت تھک گیا ہوں۔''

''کوئی اوندھی سیدھی بات نہ کر بیٹھنا اس سے۔'' اشرف نے تاکید کرنے والے انداز میں کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

اس وقت کچھ ایسی آواز ہوئی تھی جیسے کمرے کے باہر کوئی ہو۔

''کون ہے؟'' اشرف نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

''کون ہے بھئی؟'' ماجد..... بھی بڑبڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

اشرف کمرے کے باہر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''ایسا لگا تھا جیسے یہاں کوئی ہو۔''

''وہی بدروح ہوگی۔'' ماجد ہنسا۔ ''شیریں نے کہا تھا نا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اشرف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ میرا وہم نہیں ہو سکتا۔''

''جا کے آرام کر جانی!'' ماجد نے کہا۔ ''جسم ٹوٹ رہا ہے تھکن سے۔''

اشرف نے پھر کچھ نہیں کہا اور چند قدم آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔

ماجد بھی اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر جا لیٹا۔

☆☆☆

اشرف اپنے کمرے میں جا کر پُرسکون نہیں رہ سکا اور فکرمندی کے ساتھ ٹہلتا رہا۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ ماجد کے کمرے کے دروازے پر کوئی تھا اور جو تھا، وہ اسی لیے ہو سکتا تھا کہ چھپ کر اس کی اور ماجد کی باتیں سنے۔ چھپنے والی بات اشرف کے ذہن میں اس لیے آئی تھی کہ وہ جو کوئی بھی تھا، حیرت انگیز سرعت سے غائب بھی ہو گیا تھا۔ اتنی سرعت سے غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اشرف کے خیال کے مطابق اتنی جلدی کوئی غائب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے دروازہ کھولا تھا۔ اسے تین سیکنڈ بھی نہیں لگے تھے۔ تو کیا یہ اس کا وہم تھا کہ وہاں کوئی تھا؟

یکا یک اشرف کے دماغ میں شیریں کا جملہ ابھرا جو اس نے بابا شیخو کے بارے میں کہا تھا۔ ''مجھے تو وہ کوئی بدروح لگنے لگے ہیں۔''

اشرف کو جھرجھری سی آ گئی، پھر ایک دھماکے کی آواز سن کر وہ اچھل ہی پڑا۔ اس کے ساتھ ہی بادل مسلسل گرجنے لگے تھے۔ کمرے میں جو کھڑکی تھی، اس کے شیشے بار بار جھلملانے لگے تھے۔ اب اشرف کو خیال آیا کہ اس نے جو دھماکا سنا تھا، وہ کہیں بجلی گرنے کا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا۔ اس نے باہر دیکھنے کے لیے کھڑکی کھولی اور پھر فوراً بند کر دی۔ پانی کی شدید بوچھاڑ پڑی تھی اس کے چہرے پر، قمیص بھی بھیگ گئی تھی۔ بارش کا آغاز پھر ہو گیا تھا اور شاید پہلے سے بھی زیادہ زوردار انداز میں ہوا تھا۔

اشرف نے فوراً اپنی قمیص بدلی جو بھیگ گئی تھی۔ بادل گرجتے رہے، بجلی کی کڑک سنائی دیتی رہی۔ اشرف ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ بارش سے پہلے جو خیالات اس کے دماغ میں سرسرا رہے تھے، وہ بدستور سرسراتے رہے۔ تھکن کے باوجود اس کی بھوک بھی اڑ گئی تھی حالانکہ ماجد سے یہ طے پایا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔

کھانا گرم کرنے کے لیے کمرے میں ایک اسٹوو موجود تھا۔

پھر چند ہی منٹ گزرے تھے کہ وہ تقریباً اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی اس کیفیت کا سبب دروازے پر ہونے والی

Digitized by Google

دستک تھی۔ اس نے کمرے میں آکر دروازہ بند کرلیا تھا۔

''کیا سو گیا جانی؟'' باہر سے ماجد کی آواز آئی۔

''کھولتا ہوں۔'' اشرف تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ ماجد نے کہا۔ ''کھانا نہیں کھائے گا؟ اور یہ دروازہ کیوں بند کرلیا تھا؟''

''تو نے نہیں بند کیا تھا؟..... میرا مطلب ہے اپنے کمرے کا دروازہ۔''

''نہیں، کیا ضرورت ہے اس کی۔'' ماجد اندر آگیا۔ ''چل کھانا گرم کر یار!''

کھانے کا سامان بھی بیگ میں تھا، وہ اشرف ہی اٹھا لایا تھا۔

''میری تو بھوک مر گئی ہے۔''

''کیوں؟''

''آخر وہ کون تھا تیرے کمرے کے باہر جو اتنی جلدی غائب بھی ہو گیا۔''

''وہم ہوا ہوگا تجھے..... ابھی تک تیرے دماغ میں بھی وہی بسا ہوا ہے؟''

''وہم والی بات تو میں نہیں مانوں گا۔''

''مجھے تو یہ حویلی اچانک بھوت گھر معلوم ہونے لگی ہے۔''

''یہ بات نکال اپنے دماغ سے۔ کھانا گرم کر!..... بارش بھی پھر شروع ہو گئی ہے۔ دو تین دن ہوتی رہے تو اچھا ہے۔''

''کیوں..... دو تین دن کیوں؟''

''ہمیں یہاں رکنے کا موقع مل جائے گا۔''

''کیا کرنا ہے یہاں رک کر؟''

''شیریں۔'' ماجد نے پھر بائیں آنکھ دبائی۔

اس موقع پر بھی اشرف نے اسے بس گھور کر دیکھا۔

''میں ہی گرم کرتا ہوں کھانا۔'' ماجد اس بیگ کی طرف بڑھا جس میں کھانے کا سامان تھا۔ اشرف کچھ بولے بغیر اپنے بستر پر جا بیٹھا۔

ماجد کھانا گرم کر کے پلیٹوں میں نکالنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی تو اشرف اچھل پڑا۔

''کچھ سنا تو نے؟'' وہ سرگوشی کرنے والے انداز میں بولا۔

اسی وقت کمرے کے باہر سے شیریں کی آواز آئی۔

''کیا تم بھی غائب ہو اشرف؟''

ماجد نے اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا، پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں کہیں غائب نہیں ہوا۔ میں یہاں ہوں۔''

''میں پہلے تمہارے کمرے کے دروازے پر گئی تھی۔ آواز بھی دی تھی۔''

''ارے!'' وہ دروازے کے قریب پہنچ کر بولا۔ ''دروازہ اندر سے بند تو نہیں ہے۔''

اس نے کمرے میں آنے کے بعد دیکھا نہیں تھا کہ اشرف نے دروازہ بند کیا تھا یا نہیں۔ بہرحال اس نے دروازہ کھول دیا۔ شیریں ٹرے لیے کھڑی تھی۔ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ''مجھے خیال آیا تھا کہ تم لوگوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہوگا تو چل کر میں بھی تم لوگوں کے ساتھ کھالوں۔ پہلے تو میں تمہارے ہی کمرے کی طرف گئی تھی۔ جواب نہیں ملا تو سمجھ گئی کہ سو گئے ہو یا ادھر آگئے ہو۔''

اس نے کھانے کی ٹرے وہیں رکھ دی جہاں ماجد پلیٹوں میں کھانا نکال رہا تھا۔

''یہ اچھا کیا تم نے کہ کھانا لے کر ادھر آگئیں۔'' ماجد نے کہا۔ ''اچھا لگتا ہے جب زیادہ افراد ساتھ بیٹھ کر کھائیں۔''

''اسی لیے تو آگئی۔''

وہ تینوں کھانے کے لیے بیٹھے۔

''تم کچھ گم صم سے ہو اشرف!'' شیریں کھانے کے دوران میں بولی۔

ماجد نے ہنستے ہوئے بتایا کہ اشرف کو کیا وہم ہو گیا ہے۔ وہ سب کچھ سن کر شیریں بھی ہنسنے لگی۔

''یہ کوئی بھوت بنگلا تو نہیں ہے۔'' شیریں نے کہا۔

''وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا نا۔''

''بعض لوگوں سے سنا تو ہے کہ بھوت ہوتے ہیں، مجھے تو یقین نہیں۔''

کھانے کے دوران میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

کھانے کے بعد شیریں بولی۔ ''چل کر بڑے کمرے میں بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔'' اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ''خبریں آنے والی ہوں گی، سن لیں۔''

''چلے گا؟'' ماجد نے اشرف سے پوچھا۔

انداز ایسا تھا جیسے چاہتا ہو کہ اشرف انکار کردے۔ اس طرح شیریں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جاتا لیکن اشرف تیار ہو گیا۔

''ایک ہی ٹی وی ہے اس حویلی میں؟'' ماجد نے بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے تو کئی کمروں میں تھے۔'' شیریں نے کہا۔ ''جب انکل نے حویلی چھوڑی تو بس اس کمرے میں ٹی وی چھوڑ گئے تاکہ

Digitized by Google

.... یہاں آ کر ایک دن رہنے والوں کو آسانی ہو جائے۔ ایک چھوٹا سا ٹی وی شیخو بابا کے کمرے میں بھی ہے۔"

شیریں نے خود ہی ٹی وی کھولا۔ اتفاق سے اسی وقت خبروں کا آغاز ہو رہا تھا۔

تینوں بیٹھ کر خبریں سننے لگے۔

ایک تازہ ترین خبر یہ سنائی گئی کہ پرانے نیشنل ہائی وے پر ایک الٹی ہوئی کار پائی گئی ہے۔ پولیس کی ابتدائی تحقیقات کے مطابق کار تیز رفتاری کے باعث الٹی ہوگی یا کوئی تصادم ہوا ہوگا۔ کار میں خون کے دھبے بھی پائے گئے ہیں، لیکن کوئی انسان اس کار میں نہیں پایا گیا۔ فوری طور پر پولیس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کار کس کی تھی۔

"میں نے کسی کو نکلتے تو دیکھا تھا کار سے۔" شیریں بولی۔

"ظاہر ہے کہ کار چلانے والا کوئی تو ہوگا۔" ماجد بولا۔ "لیکن وہ غائب کہاں ہو گیا؟"

"شاید کل تک اور کچھ باتیں سامنے آئیں۔"

"خون کے دھبوں کا مطلب ہے کہ وہ زخمی تو ہوا ہوگا۔" اشرف بولا۔ "اب میری خیریت اسی میں ہے کہ وہ مر نہ گیا ہو۔"

"مر گیا ہوتا تو اس کی لاش پائی جاتی۔" ماجد نے کہا۔

"لیکن یہ بات تو تعجب کی ہے کہ وہ غائب کہاں ہو گیا۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" اشرف بولا۔ "مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی ہے۔"

"چلو پھر سوتے ہیں چل کر۔"

شیریں نے ٹی وی بند کیا حالانکہ خبریں اس وقت بھی جاری تھیں۔

کمرے سے نکلتے ہوئے ماجد بولا۔ "اتنی شدید بارش کے باوجود بجلی نہیں گئی۔"

"حالانکہ بارش پھر شروع ہو گئی ہے۔" شیریں بولی۔ "لیکن اس خیال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ بجلی نہ چلی جائے۔ جنریٹر ہے یہاں۔"

"اس بار تو پہلے سے زیادہ تیز بارش ہے۔" ماجد نے کہا۔

وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے اس راہداری میں پہنچے جہاں ان کے کمرے تھے۔ پھر وہ تینوں اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اشرف کے دماغ میں یہ خیال گونجتا رہا کہ جو کار حادثے کا شکار ہو کر الٹی تھی، اسے چلانے والا اگر زندہ ہے تو کسی وقت پولیس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس کو اس کی کار کا نمبر بتا دے۔ ماجد نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ ایسے حادثے کے وقت کوئی بھی کار کا نمبر نہ دیکھ سکتا ہے، نہ یاد رکھ سکتا ہے۔

اس بارے میں سوچتے ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اشرف کو نیند نہیں آئی۔ وہ یہ سوچ کر اٹھا کہ بڑے کمرے میں جا کر ٹی وی دیکھے۔ اسی وقت اس نے کمرے کے باہر راہداری میں آہٹ سنی۔ اس کے ذہن میں پہلے سے جو خیال تھا، اس کی وجہ سے اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ دبے قدموں لیکن تیزی سے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ آہٹ اس کے دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔ اب اشرف نے بہت آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تھا، پھر بھی ہلکی سی آواز ہو گئی۔

راہداری میں شیریں ایک طرف جا رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"ابھی تک جاگ رہے ہو!" وہ خفیف سا مسکرائی۔

"میں تو اس لیے دبے قدموں چلتی ہوئی گزری تھی کہ میرے قدموں کی چاپ سے تمہاری آنکھ نہ کھل جائے۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اشرف نے پوچھا۔

"نیند مجھے بھی نہیں آ رہی تھی۔" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "سوچا کہ چل کر انکل کا عجائب خانہ دیکھ لوں۔ پہلے تو سوچا تھا کہ کل صبح دیکھوں گی لیکن اب نیند نہیں آئی تو....." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا، پھر بولی۔ "چاہو تو تم بھی چلو۔ دیکھ لو عجائب خانہ۔"

"ہاں نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی ہے۔ چلتا ہوں، ذرا چپل پہن لوں۔"

"اوہ، تم ننگے پیر ہو۔" اب شیریں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔

"ہاں، وہ تمہارے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن لی تھی اس لیے دبے قدموں دروازے پر آیا تھا۔"

"اچھا!" شیریں ہنسی۔ "دبے قدموں اس لیے کہ تمہارے قدموں کی آہٹ سن کر بھوت بھاگ نہ جائے۔"

اشرف کچھ جھینپ گیا۔ "آتا ہوں چپل پہن کر۔" وہ پلٹا پھر جلدی سے چپل پہن کر باہر نکلا۔ شیریں اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے سوچا تھا کہ عجائب خانہ ہی دیکھ کر اس کا ذہن شاید حادثے کی طرف سے ہٹ جائے۔

جب سامنے سیڑھیاں نظر آئیں تو اشرف بولا۔ "وہ کمرا نیچے ہے؟"

"نہیں۔" شیریں نے جواب دیا۔ "شیخو بابا نے بتا دیا تھا مجھے۔ وہ کمرا مقفل رہتا ہے، چابی شیخو بابا کے پاس

Digitized by Google

رہتی ہے۔ وہ لے لی ہے ان سے۔''

اشرف کو ساتھ لیے ہوئے شیریں سیڑھیوں سے آگے نکل گئی۔

''یہ ہے۔'' وہ ایک جگہ رک کر بولی اور چابی لگانے کے ساتھ ٹارچ بھی جلائی جو اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔

وہ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو اشرف کی سمجھ میں آیا کہ شیریں ٹارچ لے کر کیوں آئی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں سوئچ بورڈ دیکھا اور کئی بٹن دبا دیے۔ کمرا لقمۂ نور بن گیا۔

اس کمرے کو واقعی عجائب خانہ کہا جاسکتا تھا۔ وہاں نہ جانے کن کن لوگوں کے مجسمے تھے۔ دوسری بہت سی نادر چیزیں بھی تھیں جنہیں بڑے سلیقے سے شیشے کے شوکیسوں میں رکھا گیا تھا۔ اشرف کو عجیب سا لگا جب فرعون رامس کے مجسمے کے قریب ہی سات فٹ کا انگریزی طرز کا تابوت رکھا دیکھا۔

شیریں کو بھی تابوت دیکھ کر تعجب کا اظہار کرنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''اس میں کیا کسی کی ممی رکھی ہے؟'' اشرف بولا۔

''دیکھ لیتے ہیں کھول کر۔''

شیریں تابوت کے قریب بیٹھ گئی۔ اشرف بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ شیریں کو تابوت کا ڈھکنا اٹھانے میں طاقت صرف کرنا پڑی تھی۔

تابوت کھلتے ہی اس میں سے جو اٹھا، وہ دو بڑے دانتوں والا ڈریکولا تھا۔ خوف سے اشرف کی چیخ نکل گئی اور اسی وقت کمرے کی تمام روشنیاں بھی بجھ گئیں۔ گھپ اندھیرے میں اشرف اس طرح پلٹ کر بھاگا جیسے ڈریکولا اسے دبوچ کر اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کردے گا۔

اندھیرے کی وجہ سے اشرف کئی چیزوں کے علاوہ کسی مجسمے سے بھی ٹکرایا۔ مجسمہ گرا، اس کے ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی لیکن اشرف ایک پل کے لیے بھی نہیں رکا۔ خوف اس کے سارے جسم میں سرایت کر گیا تھا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

کمرے کے باہر بھی اندھیرا تھا لیکن اشرف ٹٹولتا ہوا پہلے کمرے کے دروازے پر جا رکا۔ وہ کمرا ماجد کو ملا تھا۔ اشرف نے اسے زور سے پیٹ ڈالا۔ ساتھ ہی آوازیں بھی لگائیں۔ ''ماجد!..... ماجد!..... ماجد!''

اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اس نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ شیریں پر کیا گزری۔

''کیا مصیبت ہے یار!'' اندر سے ماجد کی آواز آئی۔

''کمبخت بجلی چلی گئی تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

دروازے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

''ڈریکولا!'' اشرف ہانپ رہا تھا۔

ماجد نے اس کی آواز سن لی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

''کیا بک رہا ہے جانی!''

''ڈریکولا ہے اس بھوت گھر میں!'' اشرف نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور ماجد سے پہلے خود دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

''پاگل ہوگئے ہو کیا۔'' ماجد بولا۔ ''ڈریکولا کہاں سے آجائے گا اس گھر میں؟''

''عجائب خانے میں ہے۔'' اشرف کی سانسیں اب بھی اس کے قابو میں نہیں آئی تھیں۔

''کیا خواب دیکھ کر ڈر گئے ہو؟'' ماجد نے مضحکہ اڑایا۔

''میں..... میں قسم کھاتا ہوں۔'' اشرف نے اپنی سانسیں قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ ''عجائب گھر میں ہے اس کا تابوت۔''

''تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''شیریں دیکھنے جا رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا تھا۔''

''شیریں کہاں ہے؟''

''پتا نہیں..... پتا نہیں کہاں ہے۔ ڈریکولا نے دبوچ لیا ہوگا اسے۔''

اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ یہ ''کھٹ کھٹ'' کی آواز تھی جو ہیئل ہی کی ہوسکتی تھی۔

''کہاں ہو تم اشرف؟'' اس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

ماجد نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شیریں اس کے کمرے کے سامنے سے نکل گئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ پلٹی۔ ٹارچ اس کے ہاتھ میں بھی تھی۔ ماجد بھی ٹارچ لیے ہوئے تھا اس لیے خاصی روشنی ہوگئی تھی۔

''اشرف کہاں ہے؟'' وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

''اندر آجاؤ۔'' ماجد نے اس سے کہا۔

''وہ..... وہ..... ڈریکولا۔'' شیریں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے اشرف کو بھی دیکھ لیا تھا۔

''تم وہاں کیوں رک گئی تھیں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''مجھے تو سکتہ ہوگیا تھا۔'' شیریں نے جواب دیا

''پھر.....'' وہ یکلخت چپ ہوگئی کیونکہ بجلی آگئی تھی۔

''دیکھا..... دیکھا!'' اشرف نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا تم نے بھی فلم میں دیکھا ہوگا۔ فلم میں یہ بھی دکھایا گیا تھا نا کہ وہ روشنی سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے تابوت کھلتے ہی اور تابوت سے اس کے اٹھتے ہی بجلی چلی گئی تھی۔ وہ اس کی پراسرار طاقت سے گئی ہوگی۔ اب اتنی جلدی آ بھی گئی۔''

اب ماجد بھی کچھ پریشان ہوا۔ اس نے سوالیہ انداز میں شیریں کی طرف دیکھا۔

''مجھے سکتہ ہوگیا تھا۔'' شیریں نے دوبارہ بتایا۔ ''تابوت کا ڈھکنا خود ہی کھٹ سے بند بھی ہوگیا تھا۔ مجھ میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے اٹھنے میں کچھ وقت لگا۔ اس کمرے سے نکلنے کے بعد ہی میں دوڑ سکی۔''

''شکر کرو، تمہارا خون نہیں پیا اس نے۔'' اشرف ہونق نظر آرہا تھا۔

شیریں اس کا منہ تکنے لگی۔

''کیا وہ اب بھی تابوت میں ہوگا؟'' اشرف بدستور خوف زدہ تھا۔

''جا کر دیکھ لو۔'' شیریں جھنجلا سی گئی، پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''مجھے کیا معلوم؟ میں نے بس بند ہوتے دیکھا تھا تابوت کو۔ اس وقت تو وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ وہاں سے میرے آنے کے بعد وہ تابوت سے نکلا یا نہیں، یہ تو وہی جان سکتا ہے جو جا کر دیکھے اور اگر وہ نکل گیا تو گیا کہاں؟''

''ہماری جان تو بچ گئی۔ وہ جائے جہنم میں۔''

ماجد سوچتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اسے ڈریکولا ہی کیوں کہا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اشرف کی طرف دیکھ رہا تھا حالانکہ شیریں بھی یہ کہہ چکی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ ڈریکولا فلم تم نے بھی دیکھی ہوگی۔ میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا۔''

''ڈریکولا کا کردار کرسٹوفر لی نے ادا کیا تھا۔''

''وہی شکل تھی اس تابوت سے اٹھنے والے کی۔'' اشرف نے کہا، پھر بولا۔ ''ہمیں اس ڈراؤنی حویلی سے نکل جانا چاہیے، ابھی اور اسی وقت۔''

''کیسے جاؤ گے..... بارش کے تیور دیکھ رہے ہو؟'' شیریں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

کھڑکی کے شیشے بار بار آسمانی بجلی سے چمک اٹھتے تھے۔ بادلوں کی گرج بھی سنائی دے رہی تھی۔

''شیخو بابا سے پوچھا جائے۔'' ماجد بولا۔

''پوچھ لیتے ہیں۔'' شیریں نے کہا۔ ''میں بتانا بھول گئی تھی۔'' اس نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سرہانے ایک پتلی سی زنجیر لگی ہوئی ہے۔ اسے کھینچو..... شیخو بابا کے..... کمرے میں گھنٹی بج جائے گی۔''

ماجد نے اپنے بستر کے قریب جا کر وہ گھنٹی کھینچی۔

''آواز تو نہیں آئی گھنٹی کی۔'' وہ بولا۔

''چھوٹی سی گھنٹی ہے۔'' شیریں نے بتایا۔ ''وہ بس اسی کمرے میں سنی جاسکتی ہے۔''

اشرف نے پانی کی بوتل اٹھا کر کئی گھونٹ لیے۔ اس کی حالت ابھی تک پوری طرح نہیں سنبھلی تھی۔ شیریں نے خود پر قابو پالیا تھا۔

''کتنے کمروں میں ہے یہ زنجیر؟''

''جن کمروں میں لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے، ان سبھی کمروں میں ہے۔''

''تو شیخو بابا کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس نے بلایا ہے؟''

''جتنی زنجیریں ہیں، اتنی ہی گھنٹیاں ہیں شیخو بابا کے کمرے میں۔ معلوم ہوجاتا ہے کہ گھنٹی کس کمرے کی زنجیر کی ہے۔''

اشرف کھڑکی کی طرف گیا۔ وہ کھڑکی کھول کر موسم کے تیور دیکھنا چاہتا تھا۔

''کھڑکی مت کھولنا۔'' شیریں اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ ''ویسے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ بارش کتنی تیز ہے۔''

اشرف ایک طویل سانس لے کر واپس مڑا۔ اس وقت بھی اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ شیریں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج اور بارش کے شور سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ کیا صورتِ حال تھی۔

شیخو بابا نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ بھی جاگ ہی رہا ہوگا۔ اگر سو چکا ہوتا تو اتنی جلدی نہیں آپاتا۔

اشرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔ ''تم نے حویلی میں کبھی ڈریکولا کو دیکھا ہے؟''

''کون ڈریکولا صاحب!'' شیخو بابا کی دھندلی آنکھیں اشرف پر جم گئیں۔

''وہ جو ایک فلم بنی تھی۔'' اشرف نے کہا۔ ''ڈریکولا ہی نام تھا اس کا۔''

''سنیما ہال تو میں زندگی میں کبھی نہیں گیا اور ٹی وی پر اس نام کی کوئی فلم میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔'' شیخو بابا نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں صاحب؟''

''اس حویلی میں ڈریکولا ہے۔''

Digitized by Google

''یہ ڈریکولا کیا چیز ہے صاحب!'' شیخو بابا نے معصومیت سے پوچھا۔

''چیز نہیں، انسانوں کا خون پینے والا آدمی ہے۔''

''میں نے تو حویلی میں ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا صاحب۔''

''وہ تابوت میں لیٹا رہتا ہے۔ تابوت عجائب خانے میں ہے۔''

''میرے پاس اس کمرے کی چابی تو رہتی ہے لیکن میں کبھی اس کمرے میں گیا نہیں۔''

''کیوں سر پھوڑ رہے ہو اس بوڑھے سے۔'' ماجد نے اشرف کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں معلوم ہوگا اسے۔'' پھر اس نے شیخو بابا سے کہا۔ ''تم جاؤ بابا!''

شیخو بابا نے شیریں کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں۔'' شیریں بولی۔ ''تم جاؤ۔''

شیخو بابا اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا رخصت ہوگیا۔

''کیا انہی باتوں میں رات گزارنا ہے؟'' ماجد نے اشرف سے پوچھا۔

''میں تو جارہی ہوں اپنے کمرے میں۔'' شیریں بولی۔

''اکیلی ڈروگی نہیں؟'' اشرف بولا۔

''ڈر لگے بھی تو کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ ہمیں نقصان پہنچانا چاہتا تو میرا خون پی چکا ہوتا۔'' شیریں نے جواب دیا اور پھر سوچتی ہوئی دروازے کی طرف مڑ گئی۔

''میں بھی تیرے ساتھ اسی کمرے میں سوؤں گا۔'' اشرف نے ماجد سے کہا۔

''سوجا جانی!..... ویسے تم دونوں کی باتوں پر اب بھی یقین نہیں آرہا ہے مجھے۔''

''تو کیا ہم دونوں مل کر جھوٹ بولیں گے تجھ سے؟'' اشرف نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا قصہ ہے۔'' ماجد بڑبڑایا۔

''جب شیریں کو چڑیل سمجھ رہا تھا تو کیا حالت تھی تیری؟'' اشرف نے کچھ تلخی سے کہا۔

''وہ بات تو صاف ہوچکی۔ شیریں نے سب کچھ بتا دیا ہے اپنے بارے میں۔''

''اب ڈریکولا سے ڈر نہیں لگ رہا؟''

''میں وہی بات کہوں گا جو شیریں نے کہی تھی۔ ڈر لگے بھی تو کیا کیا جاسکتا ہے۔ اب تو پھنس گئے ہیں اس حویلی میں..... جو ہوگا، بھگتیں گے۔ چل اب سوجا۔'' ماجد بستر کی طرف بڑھ گیا۔

اشرف نے وہ رات ماجد ہی کے بستر پر اسی کے ساتھ گزاری۔ اسے کچھ دیر بعد نیند تو آگئی تھی لیکن خواب میں ڈریکولا کو دیکھ کر دو مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تھی۔

دوسری صبح وہ دیر سے اٹھے تھے اور تقریباً ساتھ ہی اٹھے تھے۔ اشرف ہی کی آنکھ پہلے کھلی تھی لیکن اس نے فوراً بستر نہیں چھوڑا تھا۔ گزشتہ رات کے واقعات اس کے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔ اسی دوران میں ماجد کی آنکھ بھی کھل گئی۔

''کب جاگا جانی؟'' اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''پانچ منٹ ہوئے ہوں گے۔''

''کافی دیر سو لیے۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔''

''سوئے بھی تو دیر سے تھے۔''

''اب ناشتے کی تیاری کی جائے۔'' ماجد نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''بس منہ دھولوں، نہانے کی ہمت نہیں ہے ابھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی ہے۔''

''بارش تو اب رک گئی ہے۔''

''یہ کیا؟'' ماجد چونکا۔ ساتھ ہی اس نے سرہانے کی تپائی سے ایک پرچہ اٹھالیا۔

''کیا ہے؟'' اشرف نے پوچھا۔

''شیریں۔'' ماجد نے جواب دیا۔ ''لکھا ہے، جیسے ہی اٹھو، فون کرلینا۔ اپنا موبائل فون نمبر بھی لکھا ہے۔''

''تو وہ آچکی ہے یہاں؟'' اشرف گھبرا کر اٹھا۔

''ظاہر ہے، ورنہ یہاں اس کا پرچہ کیسے ہوتا۔''

اشرف نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ''رات کو اسے بند کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اگر کوئی آجاتا؟''

''کون آتا؟''

اشرف چپ رہا۔

''ڈریکولا؟'' ماجد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''تم بہت جی دار ہو تو ذرا اس کمرے میں جاکر دکھاؤ۔'' اشرف نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''جاکر دیکھو، وہ اب بھی تابوت میں ہے یا نہیں۔''

ماجد اسے کوئی جواب دیے بغیر اپنے موبائل پر شیریں کا نمبر ملانے لگا۔

''تو اٹھ گئے تم؟'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔

''تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میرا ہی فون ہے؟''

''اپنا نمبر تم نے مجھے بتایا تو تھا۔''

''اچھا! مجھے تو یاد نہیں۔''

Digitized by Google

''یا دنہیں تو چھوڑ دو اور وہ اشرف.....''

''ابھی اٹھے ہیں ہم دونوں۔''

''تو ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا؟''

''اب تیار کرنے جارہا ہوں۔''

''اسی لیے پرچہ چھوڑ آئی تھی۔ اب کیوں باسی تباسی کھاتے ہو۔ شیخو بابا خانساماں بھی اچھے ہیں۔ ناشتا پندرہ منٹ میں تیار کردیں گے۔ ابھی میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ سوچ رہی تھی کہ تینوں ساتھ ہی کریں گے۔ میں شیخو بابا سے کہتی ہوئی آتی ہوں تمہارے کمرے میں۔''

''آجاؤ۔'' ماجد نے کہا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' اشرف نے پوچھا۔

''شیخو بابا! ابھی ناشتا تیار کرلائے گا۔ وہ بھی آرہی ہے۔''

''کل رات وہ وقتی طور پر خوف زدہ نظر آئی تھی۔ یہاں سے جاتے ہوئے تو بالکل نارمل تھی۔''

''مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔''

''مضبوط اعصاب کی یا.....'' اشرف کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''یا.....''

''چڑیل۔''

''واہ!'' ماجد ہنسا۔ ''یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا۔ یہ معاملہ تو صاف ہوگیا ہے جانی۔''

''اس کی باتوں سے؟''

''ہاں۔''

''وہ سب جھوٹ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم نے تو نہیں سنیں اس کی اور اس کی ماں کی باتیں۔''

''شیخو بابا نے اسے بٹیا رانی کہہ کر مخاطب کیا تھا، جب ہم حویلی کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔''

''وہ بھی کوئی بھوت ہوسکتا ہے۔ وہ خود کہہ چکی ہے۔''

''خود کہہ چکی ہے، اسی لیے تو یہ بات صحیح نہیں ہوگی۔''

''مجھے تو اب یہ سب کچھ پراسرار معلوم ہونے لگا ہے۔'' اشرف سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ ''یہ لڑکی یا..... اور وہ ڈریکولا..... وہ شیخو بابا یا بھوت۔ ہمیں اب اس حویلی سے نکل لینا چاہیے ماجے؟''

''موسم دیکھ رہا ہے؟''

''بارش تو اب رک گئی ہے۔''

''کھڑکی کے شیشے دیکھو، سورج کی روشنی نہیں ہے۔ بادل اب بھی چھائے ہوئے ہوں گے۔ مون سون کی بارشیں جلدی ختم نہیں ہوتیں۔''

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر شیریں دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

''کہہ آئی ہوں شیخو بابا سے۔'' وہ بولی۔ ''ابھی آجائے گا ناشتا۔ کچھ پیسے دے آئی ہوں انہیں۔ مفت خوری نہیں کریں گے ہم۔ یہ ہماری حویلی ہے تو اس سے کیا۔ شیخو بابا کا خرچ اسی سے چلتا ہے۔''

''تمہاری کار؟'' اشرف نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے راستے میں چھوڑ آئی تھیں؟''

''ابھی ممی سے بات ہوچکی ہے میری۔ ڈرائیور جلدی ہی آگیا تھا۔ ٹیکسی میں ایک مکینک کو بھی ساتھ لایا تھا۔ معمولی خرابی تھی، گاڑی گھر چلی گئی ہے میری۔''

''تو کیا تمہیں واپس نہیں جانا؟''

''اس موسم میں گاڑی یہاں آتو جائے گی لیکن خاصی مشکل سے۔ مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ جب ممی کو فون کروں گی وہ بھیج دیں گی گاڑی اور پھر تم دونوں کو بھی واپس تو جانا ہی ہے۔ تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

''شوق سے۔'' ماجد چہکا۔ ''خوب صورت لڑکیوں کی رفاقت میں سفر اچھا کٹ جاتا ہے۔''

شیریں ہنسی۔ ''یہاں آتے ہوئے میں نے گاڑی میں تمہارے بارے میں یہ بات کہی تھی، اس کا حساب چکا رہے ہو۔''

''اس قسم کے حساب تو چکانا ہی چاہئیں۔'' ماجد کے لہجے کی چہکار برقرار رہی۔ شیریں نے اپنی تعریف کا برا نہیں مانا تھا، اس لیے ماجد کا حوصلہ اور بڑھ سکتا تھا۔

شیریں بولی۔ ''اس قسم کے حساب چکانے میں بات بڑھ بھی جاتی ہے۔''

''تو کیا حرج ہے۔''

اشرف ان دونوں کے منہ تکتا رہا۔ وہ ماجد سے سن ہی چکا تھا کہ شیریں اسے پسند آگئی تھی۔ اشرف نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب شیریں کے بارے میں اس کے خیالات بدل چکے تھے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ ماجد کے حق میں بہتر ہوگا کہ وہ شیریں کے قریب ہونے کی کوشش نہ کرے۔ اس وقت ان دونوں میں جو گفتگو ہورہی تھی، اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ ماجد کو شیریں سے رسپانس بھی مل رہا تھا۔

ان دونوں میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری ہی تھی کہ شیخو بابا ان لوگوں کے لیے ناشتا لے آیا۔ ناشتا گرم گرم تھا۔ اشرف سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اتنے کم وقت میں اتنا ناشتا تیار

Digitized by Google

کرنا کیا کسی عام انسان کے بس کی بات ہو سکتی ہے؟

ناشتا رکھ کر وہ چلا گیا۔

''آدھے گھنٹے بعد آ کر برتن لے جانا۔'' شیریں نے اس سے کہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد شیریں نے کہا۔ ''میں بابا کو دوپہر کے کھانے کی ہدایت بھی دے چکی ہوں۔ یہ تو ممکن نظر نہیں آتا کہ آج بھی تم دونوں یہاں سے جا سکو۔ مون سون کا موسم بہت غیر یقینی ہوتا ہے۔''

''سوچوں گا۔'' اشرف بات ٹال گیا لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر ڈیڑھ دو گھنٹے بارش نہ ہوئی تو یہاں سے نکل ہی جانا چاہیے۔

ماجد نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ناشتے کے بعد باہر نکل کر موسم سے لطف اندوز کیوں نہ ہوا جائے..... کوئی اور کام تو ہے نہیں۔''

''مجھے تو ہے۔''

''تم کیا کرو گی؟''

''عجائب خانے جاؤں گی۔ میں یہاں آئی ہی اس لیے ہوں کہ انکل کے جمع کیے ہوئے نوادرات دیکھ سکوں اور اگر کچھ پسند آئے تو لے جاؤں۔''

اشرف چونکا۔ ''اور ڈریکولا؟''

''میں تابوت نہیں کھولوں گی۔ دن میں تو ڈریکولا باہر نکلتا نہیں ہے۔ میں نے ابرام اسٹوکر کا وہ ناول بھی پڑھا ہے اور اس ناول پر بننے والی فلم بھی۔ اسٹوکر کو مرے ہوئے بھی سو سال ہو چکے ہیں۔ کہانی کا پس منظر اس نے اپنے عہد سے سو سال پہلے کا رکھا ہے کیونکہ اس نے اس کہانی کے لیے چھ سات سال ریسرچ بھی کی تھی جو خون آشام چمگادڑوں کے بارے میں تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے عہد سے سو سال پہلے کے ایسے کسی کردار کا علم بھی ہوا ہو جسے اس نے اپنے ناول کا کردار بنایا ہو۔''

اشرف نے پلکیں جھپکائیں۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ دو سو اور دو سو سال پہلے واقعی کوئی ڈریکولا تھا؟''

''اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔''

''گویا تم سمجھتی ہو کہ اب وہ ہمارے عہد میں بھی آ گیا ہے؟''

''میں اپنا جملہ دہراؤں گی۔ اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔''

''اسی لیے تم سمجھ رہی ہو کہ وہ دن میں باہر نہیں نکلے گا؟''

''ابرام اسٹوکر نے یہی لکھا تھا۔''

''اور تمہیں اس کے لکھے پر یقین ہے؟''

''میں تم سے تو نہیں کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔'' شیریں جیسے چڑ گئی۔ اشرف چپ ہو گیا۔

''تم چلو گے میرے ساتھ؟'' اس بار شیریں ماجد سے مخاطب ہوئی تھی۔

''ہاں ہاں۔'' ماجد نے قدرے توقف سے کہا۔

''گڈ!'' شیریں خوش ہو گئی۔

اشرف نے ماجد کو گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔

ناشتے کے بعد شیریں نے کہا۔ ''ابھی چلتے ہیں، میں اپنے کمرے سے ٹارچ لے آؤں۔ کمرے میں تو بہت گہرا اندھیرا ہو گا۔ تمہاری ٹارچ زیادہ طاقتور نہیں ہے۔''

''لے آؤ۔'' ماجد نے کہا۔

شیریں کے جانے کے بعد اشرف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خوب صورت لڑکیوں پر اپنی دلیری کی دھاک بٹھانے کو میں بے وقوفی سمجھتا ہوں لیکن ڈر تو تجھے بھی لگا تھا وہاں جانے کے خیال سے..... رک کر جواب دیا تھا تو نے۔''

''ہاں جانی!..... تھوڑا سا ڈر تو ہے۔'' ماجد نے کچھ جھینپ کر کہا۔

''تو نہ جا!''

''اب کہہ چکا ہوں اس سے تو جانا ہی ہو گا۔''

''پھر وہ سچ مچ عشق کرنے لگے گی تجھ سے۔'' اشرف نے طنز کیا۔

''مجھے پسند تو کرنے لگی ہے وہ۔'' ماجد نے مسکرا کر کہا۔

اشرف نے خاموشی اختیار کر لی۔

شیریں جلد ہی ٹارچ لے کر آ گئی۔

ماجد نے کمرے سے جاتے ہوئے اشرف سے کہا۔ ''تم آرام کرو، میں آتا ہوں ابھی گھنٹے پون گھنٹے میں۔''

اشرف نے سر ہلا دیا۔

ماجد شیریں کے ساتھ کمرے سے نکلا۔

''جی کڑا کر کے چلو۔'' شیریں بولی۔ ''میں تمہارے چہرے پر فکر مندی دیکھ رہی ہوں ماجد۔''

''ارے نہیں۔'' ماجد ہنسا۔ ''میں اشرف کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ کل رات سے وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہے۔''

''تم تو نہیں جاؤ گے اس کے ساتھ؟'' شیریں نے اسے لگاوٹ سے دیکھا۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اس خراب موسم میں نکلنے کا۔ اسے جانا ہو گا تو اکیلا چلا جائے گا۔ کہہ دوں گا اس سے کہ جب گاؤں سے لوکیشن دیکھ کر نکلے تو مجھے بھی یہاں

Digitized by Google

سے لیتا جائے۔"

"تمہیں کوئی اور گاؤں نہیں ملا شہر کے قریب؟"

"مقدر میں تھا کہ تم سے ملوں۔" ماجد نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا، پھر ہنس کر کہا۔ "اس گاؤں میں جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جب ہم پہلی بار اس گاؤں میں گئے تھے تو ایک نوخیز لڑکی پسند آگئی تھی اشرف کو۔ اب وہ جوان ہوگئی ہوگی۔ اشرف اس کو دیکھنے وہاں جانا چاہتا ہے۔"

"اگر اس کی شادی ہوگئی ہو تو؟ گاؤں میں لڑکیوں کی شادی جلدی ہوجاتی ہے۔"

"اب یہ اشرف کا مقدر۔" ماجد نے ہنس کر کہا۔

"اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہوگی تو کیا تمہارا دوست اس سے شادی کرنا چاہے گا..... ایک گنوار لڑکی سے؟"

"وہ کہتا ہے کہ خود اسے پڑھائے گا۔"

"ویسے گاؤں کے لوگ بھی اپنی لڑکیوں کو شہروں میں بیاہنے سے بچتے ہیں۔"

"اب جو بھی ہو۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے جسے انہوں نے عجائب گھر کہنا شروع کردیا تھا۔

شیریں نے اسے چابی سے کھولا۔ ماجد دھڑکتے دل کے ساتھ شیریں سے ایک قدم پیچھے رہا۔ پیچھے رہنے کا جواز بھی تھا کہ شیریں پہلے کمرے میں روشنی کردے۔

روشنی ہونے کے بعد ماجد اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس کی نظر کمرے کے بالکل آخر میں، لیکن بالکل سامنے رکھے ہوئے تابوت پر پڑی۔

"اس کی طرف دھیان نہ دو ابھی۔" شیریں بولی۔ "کمرے کا جائزہ لے لیا جائے پہلے۔ بعد میں دیکھیں گے اسے۔"

"تو کیا کھول کر دیکھو گی؟"

"ہاں، میں یقین کرنا چاہتی ہوں کہ وہ روشنی میں باہر نہیں نکلے گا۔ کل اس نے روشنی ہی کی وجہ سے اپنا تابوت فوراً بند کرلیا تھا۔"

ماجد نے اپنی کیفیت چھپانے کے لیے ٹوٹے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "واقعی بہت خوبصورت مجسمہ ہے۔"

"مارلن منرو تھی ہی خوبصورت۔"

"لیکن بالکل ویسا ہی مجسمہ بنانا کمال تو ہے۔"

"یہ تو پتھر کا ہے۔" ماجد نے ٹوٹے ہوئے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن خوبصورت تو یہ بھی ہے۔"

"یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ اس کے تین ٹکڑے ہوئے۔ میں نے شکاگو میں جو مجسمہ دیکھا تھا، وہ بھی تین حصوں میں بنایا گیا ہے۔ سر الگ، پیر الگ، دھڑ الگ۔"

"چلو اب دوسری چیزیں دیکھیں۔"

کمرے میں غیر معمولی نوادرات کے علاوہ دنیا کے آٹھ مشہور عجائبات کے ماڈل بھی تھے۔ ماجد کو وہ بھی پسند آئے۔ وہ سب چیزیں دیکھنے میں پون گھنٹا گزر گیا۔

"جو چیزیں مجھے پسند آئی ہیں، وہ تو میں لے کر ہی جاؤں گی۔ چلو اب تابوت دیکھ لیں۔"

"دیکھو!" ماجد اگرچہ شیریں اور اشرف کا مذاق اڑاتا رہا تھا لیکن اس وقت اس کے اعصاب میں بھی تناؤ آگیا تھا۔ وہ صرف شیریں کی وجہ سے تابوت کے قریب گیا۔

"اب مجھ پر سکتہ طاری نہیں ہوگا۔" شیریں نے کہا۔ "ایک بار تجربہ ہوچکا ہے، تابوت کا ڈھکنا بھی خود بند ہوگیا تھا۔"

ماجد کچھ نہیں بولا۔ شیریں تابوت کھولنے کے لیے فرش پر بیٹھی۔ ماجد صرف گھٹنوں کے بل جھکا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

شیریں اس وقت پھر سکتے میں رہ گئی جب تابوت کھولنے پر اس نے دیکھا کہ وہ خالی تھا۔ ماجد تو ڈھکنا اٹھتے ہی بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا تھا لیکن خالی تابوت دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

"کہا تھا نا میں نے!" ماجد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "وہم تھا وہ تمہارا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" شیریں سوچتے ہوئے بولی۔ "ایک ہی وہم مجھے بھی ہوا اور اشرف کو بھی۔"

ماجد ہنسا۔ "اب بھی یقین کر رہی ہو کہ تم نے ڈریکولا ہی دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ بیک وقت دو افراد کو ایک ہی وہم نہیں ہوسکتا۔"

"تو پھر وہ رات کو چہل قدمی کے لیے نکل گیا ہوگا کہیں۔" ماجد نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ "رات کو کمرے میں لائٹ تو جلتی نہیں۔ اندھیرے ہی میں باہر نکلتا ہے نا ڈریکولا؟"

شیریں نے تابوت کا ڈھکنا بند کردیا۔

"لیکن۔" ماجد سوچتے ہوئے بولا۔ "رات کو تم یہاں سے بھاگی تھیں تو لائٹ تو آف نہیں کی ہوگی۔"

Digitized by Google

''ظاہر ہے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش کہاں رہا تھا۔''

''لیکن ابھی جب ہم آئے ہیں تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ تم ہی نے روشنی کی تھی۔''

''ہاں۔'' شیریں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہارے کہنے پر مجھے خیال آرہا ہے کہ یہاں تو رات سے اب تک روشنی ہونی چاہیے تھی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔''

''اب اکیسویں صدی ہے نا!'' ماجد نے پھر مذاق اڑایا۔ ''اس صدی کا ڈریکولا روشنی میں بھی باہر نکلنے لگا ہوگا۔ چلا گیا ہوگا کہیں گھومنے۔''

اس سے پہلے کہ یہ بات آگے بڑھتی، انہوں نے اس گھنٹے کی آواز سنی جو اس منزل کے اوپر برج میں بجتا تھا۔

''کوئی آیا ہے۔'' شیریں جلدی سے بولی اور اس کے قدم دروازے کی طرف بڑھے۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' ماجد نے بڑبڑاتے ہوئے شیریں کے ساتھ قدم بڑھائے۔

''کبھی کبھی کوئی آتا ہی رہتا ہے۔'' شیریں نے کہا۔

ماجد کے ذہن میں پولیس کا خیال آیا تھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

اس موقع پر شیریں کمرے کی روشنیاں بجھانا نہیں بھولی تھی۔ اس کے ساتھ ماجد بھی باہر نکلا۔ اسی وقت انہوں نے دیکھا کہ اشرف بہت تیزی سے ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کے انداز میں گھبراہٹ بھی تھی۔

''میں تمہیں ہی بتانے آرہا تھا۔'' اشرف جلدی سے بولا۔ ''پولیس آئی ہے۔''

''اتنی جلدی تمہیں کیسے معلوم ہوگیا؟'' شیریں نے پوچھا۔

''میں کھڑکی میں کھڑا تھا۔'' اشرف نے بتایا۔ ''کھڑکی کا رخ پھاٹک ہی کی طرف ہے نا..... پھاٹک کے باہر بھی دکھائی دیتا ہے۔ پولیس کی گاڑی دیکھی تھی میں نے۔ انہی لوگوں میں سے کسی نے گھنٹا بجایا ہے۔ دو ہی پولیس والے اترے تھے گاڑی سے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' شیریں نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ ''شیخو بابا تو پھاٹک کھولنے چلے گئے ہوں گے۔''

''تمہاری گاڑی میں ڈینٹ تو پڑا ہے۔'' ماجد نے اشرف سے کہا۔

''وہ میں نے ایسے رخ سے کھڑی کی ہے کہ یہاں آنے والے کی نظر ڈینٹ پر اس وقت تک نہیں پڑے گی، جب تک وہ گاڑی کے قریب جا کر نہ دیکھے۔''

''کدھر جا رہی ہو؟'' ماجد چونکا۔

''بڑے کمرے کی طرف۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''اگر پولیس اس حادثے کے سلسلے میں آئی ہے تو ہمیں چھپنا نہیں چاہیے۔ اس طرح ان کا شک اور بڑھے گا۔''

شیریں کی بات غیر معقول نہیں تھی۔

وہ تینوں بڑے کمرے میں پہنچے۔ وہاں کی دو کھڑکیاں پھاٹک کی طرف کھلتی تھیں۔ شیریں نے ایک کھڑکی کھولی۔ اس کے پیچھے ماجد اور اشرف بھی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی پھاٹک سے اندر آرہی تھی اور شیخو بابا پھاٹک بند کر رہا تھا۔

پولیس کی گاڑی حویلی کے مرکزی دروازے پر آرکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ ان میں سے ایک باوردی اور دوسرا سادہ لباس میں تھا۔ وہ گاڑی کے قریب ہی رک کر شیخو بابا کی طرف دیکھنے لگے جو پھاٹک بند کر کے لوٹ رہا تھا۔

''میں نے گاڑی بائیں جانب کھڑی کی ہے۔'' اشرف بولا۔

''معلوم ہے مجھے۔ تمہارے ساتھ ہی تھا میں۔'' ماجد نے کہا۔

پولیس والوں نے گاڑی کی طرف دیکھا تو تھا لیکن اچٹتی سی نظر سے۔

شیریں نے کھڑکی بند کی اور ٹی وی کھولا۔

''اطمینان سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھو۔ شیخو بابا انہیں لے کر یہیں آئیں گے۔ پولیس کی وردی دیکھ کر بھی چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہونے دینا۔''

''ابھی تو وہ گاڑی کی طرف نہیں گئے لیکن جاسکتے ہیں۔'' اشرف کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اگر وہ ڈینٹ دیکھ لیں اور اس کے بارے میں کوئی بات کریں تو یہی کہنا کہ راستے میں گاڑی کسی درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ تم لمبی ڈرائیونگ کی وجہ سے اس وقت نیند میں تھے۔''

اشرف سر ہلا کر رہ گیا۔ شیریں نے ریموٹ سے ٹی وی کا ایک ایسا چینل لگایا جس پر مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا۔

جلد ہی کئی قدموں کی آہٹیں سنائی دیں، پھر شیخو بابا کے ساتھ پولیس والے اندر آئے۔ دوسرا آدمی سادہ لباس میں تھا لیکن باوردی آفیسر کے ساتھ تھا اور اترا بھی پولیس کی گاڑی سے تھا اس لیے قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی پولیس ہی سے تعلق رکھتا ہوگا۔

''آپ تشریف رکھیں۔'' شیخو بابا نے ان دونوں سے کہا۔ ''میں کافی بنا کے ابھی لاتا ہوں۔'' پھر اس نے اشرف

Digitized by Google

وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ لوگ بھی کچھ.....''

''ہاں شیخو بابا!'' شیریں بول پڑی۔ ''موسم کچھ ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ کافی تو مزہ دے گی۔'' شیخو بابا چلا گیا۔

شیریں نے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ لوگوں کو مزاحیہ پروگرام پسند نہ ہوں تو میں چینل بدل دوں یا ٹی وی ہی بند کردوں؟''

''نہیں، چلنے دیں۔'' باوردی پولیس آفیسر بولا۔ ''ابھی شیخو بابا نے بتایا کہ آپ لوگ بارش کی وجہ سے رک گئے ورنہ آج چلے جاتے۔''

''جی ہاں، ارادہ تو یہی تھا ان کا۔'' شیریں نے اشرف اور ماجد کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہیں تو گاؤں جانا تھا اپنی فلم کے لیے کوئی لوکیشن دیکھنے کے لیے۔ میں یہیں رکتی بلکہ رکوں گی۔ یہ حویلی میرے انکل کی ہے۔ آپ لوگ یہاں کیسے رک گئے؟''

''ہمیں بھی گاؤں ہی جانا ہے۔ ایک کیس کا معاملہ ہے۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''رکے تو اس لیے کہ ڈرائیونگ نے تھکا دیا تھا۔ ذرا دیر رک کر چلے جائیں گے۔''

''کیا گاؤں میں کوئی واردات ہوگئی ہے؟'' ماجد نے بولنے کی ہمت کی۔

''گزشتہ پندرہ دنوں میں اس راستے پر کئی وارداتیں ہوچکی ہیں۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''وہ کوئی لڑکی یا عورت ہے۔ راہ چلتے کسی گاڑی کو دیکھ کر اس سے لفٹ مانگتی ہے اور پھر اسے قتل کردیتی ہے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا کہ لفٹ مانگتی ہے اور پھر قتل کردیتی ہے؟'' اشرف نے جلدی سے پوچھا۔

''ایک آدمی کسی طرح بچ گیا تھا وقتی طور پر۔ ہاسپٹل جاکے مرا لیکن مرنے سے پہلے اس نے یہ بیان دیا تھا۔ اسی بیان کی وجہ سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ شاید قتل ہونے والے دوسرے لوگ بھی لفٹ دے کر ہی مارے گئے ہوں۔''

''کیا کئی قتل ہوئے ہیں؟'' شیریں نے پوچھا۔

''چار ہوچکے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''اسی لیے پولیس نے اس ہائی وے کے شروع ہی میں... بورڈ لگا دیا تھا کہ اس راہ پر سفر کرنے والے کسی لڑکی یا عورت کو لفٹ نہ دیں۔''

شیریں ہنس کر بولی۔ ''میری گاڑی راستے میں خراب ہوگئی تھی۔ میں تو انہی سے لفٹ لے کر یہاں تک پہنچی ہوں۔'' اس نے اشرف اور ماجد کی طرف اشارہ کیا۔

''ہماری نظر اس بورڈ پر نہیں پڑی تھی۔'' اشرف بولا۔

''اچھا ہوا نا!'' شیریں پھر ہنسی۔ ''ورنہ تم لوگ مجھے لفٹ نہیں دیتے۔''

''آپ لوگ آپس میں خاصے بے تکلف ہیں۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''بس کچھ وقت ساتھ گزارنے کی وجہ سے بے تکلفی ہوگئی۔''

''آپ غالباً فلم میں ہیرو آچکے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے اس مرتبہ ماجد کی طرف دیکھا۔ ''میں نے کسی رسالے یا اخبار میں تصویر دیکھی تھی آپ کی۔''

''میں تو ان کی فلم بھی دیکھ چکی ہوں۔'' شیریں بولی۔

''آپ۔'' اشرف بھی بولا۔ ''کس کیس کی تفتیش کرنے گاؤں جارہے ہیں؟..... کیا کوئی سراغ ملا ہے کہ وہ عورت اس گاؤں میں ہے؟''

''جی نہیں۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''پہلی بار تو وہاں ایک اور کیس کے سلسلے میں گیا تھا۔ ایک باپ نے اپنی بیٹی کو اس لیے قتل کردیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی شادی کر بیٹھی تھی۔''

''یہ عجیب روایت چل پڑی ہے یہاں۔'' ماجد نے کہا۔ ''اس قسم کی خبریں اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں تو پھر آپ نے باپ کو گرفتار کرلیا ہوگا۔''

''جی ہاں۔ وہ اب جیل میں ہے۔''

''تو اب.....''

''اب اس عورت کا معاملہ ہے۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''جس نے چار قتل کیے ہیں۔ گاؤں میں ایک پولیس چوکی ہے۔ ایک کانسٹیبل کو کسی طرح پتا چلا ہے کہ وہاں کے ایک دکاندار سے ایک عورت نے ایک بغدا خریدا تھا۔ قتل اسی سے کیے گئے ہیں۔ اس کی اطلاع ہمیں کل دی گئی تھی۔ آج میں وہاں اس دکاندار سے ملنے جارہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ میرے محکمے کے آرٹسٹ ہیں۔ یہ اس دکان سے اس عورت کا حلیہ پوچھ کر اس کا خاکہ بنائیں گے۔'' جواب دیتے ہوئے پولیس آفیسر نے شیریں کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

''وہ عورت تو شاید کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہوگی۔'' شیریں نے کہا۔ ''خوامخواہ قتل کرنا تو اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

''پولیس کا بھی یہی خیال ہے۔''

''ہم نے راستے میں ایک گاڑی الٹی ہوئی دیکھی تھی۔'' ماجد بولا۔ ''غالباً کوئی ایکسیڈنٹ بھی ہوچکا ہے اس

Digitized by Google

ہائی وے پر۔"

"جی ہاں۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ "اس گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کی ٹکر سے وہ گاڑی الٹی۔"

"ہم نے ٹی وی پر خبروں میں بھی سنا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کار میں نہ کسی کی لاش ملی، نہ کوئی زخمی ملا۔"

"اس گاڑی کا دعویدار بھی سامنے نہیں آیا۔ ہم نے اپنے طور پر معلوم کرلیا ہے کہ وہ گاڑی کس کی تھی۔ کوئی مسز حارث ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ ان کے شوہر نے ان کے دو سالہ بیٹے کو گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔"

"یعنی اپنے ہی بیٹے کو؟" اشرف نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ عجیب جبلی لوگ ہوتے ہیں۔ موصوف کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد نہ ہو لیکن مسز حارث اولاد کی خواہش مند تھیں۔ بچے کو وہ حضرت بڑی نفرت سے دیکھا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے موقع پا کر اس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ ان پر بھی مقدمہ چل رہا ہے۔ ضمانت بھی نہیں ہوئی ہے۔"

بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ شیخو بابا کافی لے آیا تھا۔

"موسم کی کیا پوزیشن ہے؟" پولیس افسر نے شیخو بابا سے پوچھا۔

"بادل تو ہیں صاحب!..... بارش کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ بادل نہ بھی ہوں تو اچانک آتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں۔"

"ہمیں بس کافی پی کر نکل ہی جانا چاہیے۔" پولیس آفیسر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ وہ بہت خاموش رہنے والا انسان تھا۔

"مسز حارث کہاں ہے؟" ماجد نے پوچھا۔

"وہ غائب ہے۔ پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ وہ اپنا دماغی توازن کھونے لگی تھی۔"

"بیٹے کے صدمے سے؟"

"ہاں اور اکثر گاڑی لے کر پاگلوں کی طرح پھرتی رہتی تھی۔ کچھ دن سے غائب ہے۔ مکان مقفل پڑا ہے۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولا۔ "کیا آپ اسے اپنی کہانی کا تھیم بنانا چاہتے ہیں؟"

"ابھی تک تو ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"سوال تو آپ نے کچھ ایسے ہی کیا تھا جیسے اس میں خاص دلچسپی لے رہے ہوں۔"

"نہیں، بس ایسے ہی۔ یہ بات عجیب معلوم ہو رہی ہے کہ اس کی گاڑی تو الٹی ہوئی ملی لیکن وہ اس میں نہیں تھی۔"

"شاید وہ ایکسیڈنٹ نہ ہو۔" پولیس آفیسر نے خیال ظاہر کیا۔ "پڑوسیوں ہی سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کرنے لگی تھی۔ خود ہی الٹ بیٹھی ہو اپنی گاڑی۔"

"لیکن خود کہاں گئی؟"

"چلی گئی ہوگی کہیں، دماغی توازن تو بگڑ ہی رہا تھا اس کا۔"

"خون تو پایا گیا ہے گاڑی میں۔ ٹی وی پر سنا تھا۔"

"معمولی زخمی ہوگئی ہوگی۔"

"تو اسے بھی ڈھونڈا جارہا ہوگا؟"

"وہ تو ظاہر ہے۔"

"زیادہ امکان تو شاید یہی ہے کہ تیز رفتار گاڑی اس کے قابو میں نہ رہی ہو۔" اشرف نے کہا۔

"دیکھیں کیا سامنے آتا ہے۔ چھان بین تو ہو رہی ہے۔"

"جلدی پی لیں کافی۔" سادہ لباس والا پہلی بار بولا۔ "نکل ہی لیا جائے تو اچھا ہے۔ بارش ابھی رکی ہوئی ہے۔"

"وہ تو راستے میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس وقت رفتار کم رکھنی پڑے گی۔"

پولیس آفیسر نے اس سے اتفاق کیا۔

شیریں سادہ لباس والے سے بولی۔ "آپ بالکل صحیح تصویر بنا لیتے ہیں؟"

"اگر حلیہ صحیح طور پر بتایا جائے تو بہتر فیصد درست تصویر بنتی ہے۔"

کافی پی کر ان دونوں نے شیخو بابا کو ادائیگی کی اور جانے کے لیے اٹھے۔

"واپسی کب تک ہوگی آپ لوگوں کی؟" شیریں نے پوچھا۔

"اگر موسم زیادہ خراب ہوگیا تو رکنا پڑے گا گاؤں میں..... کیوں؟"

"یہ لوگ شاید چلے جائیں۔" شیریں نے اشرف اور ماجد کی طرف اشارہ کیا۔ "ایسی صورت میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"آپ نے ان لوگوں سے کہاں لفٹ لی تھی؟"

"ہائی وے پر ہی لی تھی۔ میری گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔"

"اور کوئی گاڑی تو ہمیں راستے میں دکھائی نہیں دی۔"

"ڈرائیور لے گیا۔ میں نے اپنی ممی کو بتا دیا تھا فون پر۔" شیریں نے جواب دیا۔ "اگر یہ لوگ بھی چلے گئے اور آپ کو بھی موسم کی وجہ سے گاؤں میں رکنا پڑ گیا تو مجھے پھر ممی کو فون کرنا پڑے گا اور گاڑی منگوانا پڑے گی۔"

پولیس آفیسر نے سر ہلا دیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد اشرف نے سکون کی سانس لی۔

Digitized by Google

''ابھی تک تو خیریت رہی ہے۔'' وہ بولا، پھر اس نے پوچھا۔ ''اور ہاں! ڈریکولا دیکھ آئے تم؟'' وہ ماجد کی طرف متوجہ تھا۔

''وہ تو غائب ہے تابوت سے۔'' ماجد نے کہا، پھر مسکرا کر شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کہیں تفریح کرنے نکل گیا ہوگا موسم اچھا دیکھ کر۔''

''دیکھا۔'' شیریں نے اشرف سے کہا۔ ''یہ اب تک سمجھ رہے ہیں کہ ہم دونوں کو وہم ہوا ہوگا۔''

''اچھا بابا! اب چھوڑو یہ باتیں۔'' اشرف نے کہا۔ ''پولیس کو دیکھ کر تو میری جان نکل گئی تھی۔''

شیریں اپنی عادت کے مطابق ہنسی۔ ''تم نہیں پکڑے جاؤ گے۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔''

''کیوں نہ ڈرا دیر کو باہر نکلا جائے۔'' ماجد نے کہا۔ ''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ موسم کا کچھ مزہ لینا چاہیے۔''

''میں تو عجائب گھر جا رہی ہوں۔''

''کیوں؟ دوبارہ کیوں؟''

''ان چیزوں کی فہرست بناؤں گی جو مجھے پسند آئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے روانگی کے وقت کوئی چیز بھول جاؤں۔''

''تو جاؤ، تم فہرست بناؤ جا کر۔ میں اور اشرف ذرا باہر جاتے ہیں۔''

شیریں انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ ماجد اور اشرف نے باہر کا رخ کیا۔

''موسم واقعی اچھا لگ رہا ہے۔'' ماجد نے کہا۔

''ہوں۔'' اشرف سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جانی! پولیس تو جا چکی۔ اب کس فکر میں ہے؟''

''تو نے دو ایک باتوں پر غور نہیں کیا۔''

''کن باتوں پر؟''

''مسز حارث کا نام آنے پر ایک لمحے کے لیے شیریں کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔''

''تو؟'' ماجد نے اسے گھور کر دیکھا۔

''مسز حارث لوگوں سے لفٹ لے کر انہیں قتل کرتی رہی ہے اور شیریں بھی ہمارے ساتھ اس لیے ہے کہ اس نے ہم سے لفٹ لی تھی۔''

ماجد نے طویل سانس لی۔ ''تیرا مطلب ہے کہ وہی قتل کرتی پھر رہی ہے؟''

''سچی بات ہے کہ اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا ہے اس سے۔'' اشرف نے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات اور بھی کھٹک رہی ہے۔ شیریں کو یہ فکر بھی تھی کہ پولیس آرٹسٹ کس حد تک صحیح خاکہ بناتا ہے۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ پولیس والے کب لوٹیں گے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ پہلے تو میں ہی ڈرا تھا اس سے کہ وہ چڑیل ہے۔ اب تو اسے نفسیاتی پاگل سمجھ رہا ہے۔''

''وہ ہمیں ڈرا ڈرا کر مارنا چاہتی ہے۔''

''یہ نئی بات کیوں سوجھی؟''

''یہ جویلی اسی کی ہے۔''

''تو پھر؟''

''اس نے مصنوعی ڈریکولا بنا رکھا ہوگا۔ اسی سے مجھے ڈرایا۔''

''کیا تو اسے مسز حارث سمجھ رہا ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا سمجھوں!..... سب کچھ الجھا ہوا سا ہے۔''

''بے کار ہی دماغ خراب کر رہا ہے اپنا۔''

اشرف کچھ نہ بولا لیکن اس کی سنجیدگی اور فکرمندی میں کمی نہیں آئی تھی۔ ماجد کا منہ بن گیا۔

''میں سوچ رہا ہوں۔'' اشرف کچھ توقف سے بولا۔ ''گاؤں چلا جاؤں۔''

''چلا جا۔'' ماجد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''لیکن میں اس موسم میں تیرا ساتھ نہیں دوں گا۔ میں یہیں رکوں گا۔''

''میری جان..... شیریں کا خیال دل سے نکال دے۔''

''میں بے وقوفانہ انداز میں نہیں سوچ سکتا۔''

اس قسم کی بات پر دونوں دوستوں میں کبھی کبھی اچھی خاصی جھڑپ بھی ہو جاتی تھی لیکن دو ڈھائی گھنٹے بعد دونوں ہی سب باتیں بھول کر شیر و شکر ہو جاتے تھے لیکن اس وقت اشرف نے فوری طور پر کوئی منفی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

''لے دیکھ!'' ماجد نے ایک طرف انگلی اٹھائی۔ ''بادل چھائے ہوئے ہیں، اوپر سے کالی گھٹا بھی بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ خوفناک بارش کا امکان ہے۔ اب کیسے جائے گا؟''

اشرف نے بھی کالی گھٹا آتی ہوئی دیکھی اور ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اب اس کی روانگی مشکل ہوتی۔

''اندر چل!'' ماجد نے کہا۔

دونوں اندر چلے آئے۔ پندرہ منٹ بعد ہی بارش کا آغاز ہو گیا۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے ساری فضا گونجنے لگی۔

اشرف، ماجد کے ساتھ اسی کے کمرے میں آ گیا تھا۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ شیریں بھی دستک دے کر کمرے

Digitized by Google

میں آ گئی۔

''اس بار تو بارش اس طرح شروع ہوئی ہے جیسے قیامت ساتھ لے کر آئی ہو۔'' اس نے آتے ہی کہا پھر ہنسی۔ ''پولیس والوں کی تو ایسی تیسی ہوگئی ہوتی۔ اب تو شاید وہ صبح سے پہلے گاؤں پہنچیں گے بھی نہیں۔''

''تم تو خوش ہوگی اس پر؟'' اشرف بول پڑا۔

''کیوں؟'' شیریں نے اس کی طرف دیکھا۔

''بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔'' اشرف نے بات بدلی۔ اسے خیال آیا تھا کہ پولیس والوں کو تصویری خاکہ بنوا کر لوٹنے میں یقیناً دیر لگتی جو اس کے خیال میں شیریں کے لیے خوش آئند بات تھی۔

شیریں نے بھی اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کی اور ماجد کو وہ فہرست دکھانے لگی جو وہ عجائب گھر سے بنا کر لائی تھی۔

''واہ!'' ماجد نے کہا۔ ''تم نے تو آدھا عجائب خانہ خالی کرنے کا ارادہ کر لیا۔''

''انکل نے مجھے اجازت دے دی ہے۔''

''کبھی انکل سے ہماری بات بھی کراؤ۔'' اشرف نے کہا۔ ''تعارف ہی ہو جائے گا۔''

''مشکل ہی ہے۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''صبح ان سے فون پر بات ہو چکی ہے۔ بتا رہے تھے کہ آج ان کی کئی میٹنگز ہیں۔ بہت مصروف رہیں گے اس لیے موبائل بھی بند کر دیں گے۔''

یہ جواب اشرف کے ذہن میں جم کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب شیریں اپنے کمرے میں چلی گئی تو اس نے ماجد سے کہا۔ ''دیکھا..... وہ اپنے انکل سے بات بھی نہیں کرانا چاہتی۔''

''کاروباری لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا جانی!..... تو اس کی ہر بات کو جھوٹ سمجھنے پر کیوں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔''

''کوئی انکل ہوگا تو بات کرائے گی نا!'' اشرف نے تلخی سے کہا۔

''دفع۔'' ماجد نے کہا اور چادر اوڑھ لی۔

اشرف خاموش لیٹا رہا۔ وہ دل ہی دل میں بارش کو کوس ..... رہا تھا۔ اگر یہ کمبخت نہ آتی تو گاؤں چلا جاتا، وہ سوچ رہا تھا۔

دن گزرا، رات آ گئی۔ بارش تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوتی ہی رہی۔ کبھی تیز، کبھی ہلکی۔ رات ہونے کے بعد رک ہی گئی۔

معمول کے مطابق تینوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔

''تم بہت چپ چپ رہنے لگے ہو اشرف!'' شیریں بولی۔

''نہیں..... نہیں تو!'' اشرف نے جلدی سے کہا۔

شیریں کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے اشرف کے جواب پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں وہ ایک دو پل کے لیے زیر لب مسکرا دی۔

کھانے کے بعد شیریں نے کہا۔ ''میں تو عجائب گھر میں جا رہی ہوں۔ دل لگ گیا ہے میرا وہاں۔ ان چیزوں کی مختصر تاریخ بھی تو لکھی ہوئی ہے، وہ پڑھ رہی ہوں۔''

''حیرت ہے۔'' اشرف بولا۔ ''وہاں تو گھبراہٹ ہونی چاہیے۔''

''ایسی تو کوئی چیز نہیں ہے وہاں۔''

''ڈریکولا کا وہ تابوت.....؟''

ماجد ہنس کر بولا۔ ''وہ تو کہیں گھومنے چلا گیا ہے۔''

''خالی تابوت دیکھ کر اس خیال سے ہی گھبراہٹ ہونی چاہیے کہ وہ ڈریکولا کا مسکن ہے۔''

''جب وہ تھا، تب بھی اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔'' شیریں ہنسی۔

''اس کے بعد تم نے تابوت کھول کر دیکھا؟''

''نہیں۔'' شیریں نے کہا۔ ''اب تم نے دھیان اس طرف دلایا ہے تو اس وقت دیکھوں گی۔ میں تم سے کہتی چلنے کے لیے۔'' شیریں نے ماجد سے کہا۔ ''لیکن تم نے ان چیزوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ میرے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکو گے۔''

''ہاں۔'' ماجد نے تائید کی۔ ''میں وہاں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا۔''

''اوکے..... میں تو چلی۔'' شیریں نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

''اسے وہاں ڈر کیوں لگے گا؟'' شیریں کے جانے کے بعد اشرف بولا۔ ''یہ خود نہ جانے کیا ہے۔''

''چڑیل۔'' ماجد مسکرایا۔

اشرف اسے گھور کر رہ گیا۔ ان دنوں اس کی کیفیت ایسی ہی ہوگئی تھی۔ ماجد کی کسی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہنا ہوتا تھا تو بس گھور کر رہ جاتا تھا۔ وہ کچھ رک کر بولا۔ ''میں پھر سوچ رہا ہوں کہ نکل ہی لوں۔ بارش تو اب رک گئی ہے۔''

''راستے بالکل بے کار ہو گئے ہوں گے۔'' ماجد نے کہا۔ ''ان پولیس والوں پر بھی نہ جانے کیا بیتی ہو۔ ابھی گاؤں پہنچے بھی ہوں گے کہ نہیں۔'' وہ جواب دیتے ہوئے کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر دیکھا۔

Digitized by Google

''اوہو!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''بادل تو اب چھٹنے لگے ہیں لیکن راستے تو خراب ہی ہوں گے۔ اگر کل سورج نکل آئے اور تیز دھوپ پڑے تو راستے کچھ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔''

''اگر کل سورج نکل آیا اور دوپہر تک دھوپ رہی تو میں نکل ہی جاؤں گا۔''

''میں تو رکوں گا۔ شیریں سے اب تک تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

اشرف چپ رہا۔

ماجد کھڑکی بند کر کے لوٹا اور بستر کی طرف بڑھا۔ ''دس تو بج چکے ہیں۔ اب سو جانا چاہیے۔ شیریں تو لوٹی نہیں ابھی۔ اگر اپنے کمرے میں بھی جاتی تو معلوم ہو جاتا۔ اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ صاف سنائی دیتی ہے۔''

اشرف سر ہلا کر رہ گیا۔

ماجد نے چادر اوڑھ لی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے بھی ماجد کے برابر میں لیٹ کر چادر تو اوڑھ لی مگر اسے ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

بارہ بجے کے قریب شیریں کے سینڈلوں کی آواز سنائی دی جو دروازے پر آ کر رکی تھی۔ ہلکی سی دستک دے کر شیریں نے باہر ہی سے پوچھا۔ ''سوئے تو نہیں ہو ابھی تم لوگ؟''

ماجد سو چکا تھا۔ اشرف نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ آگے بڑھ گئی۔

نہ جانے کتنا وقت اور گزرا تھا کہ اشرف پر بھی غنودگی طاری ہو گئی لیکن پھر اس نے چونک کر پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ اسے کچھ آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ قدموں کی چاپ تھی جو دور ہوتی جا رہی تھی۔ شیریں ہوتی تو کھٹ کھٹ کی آواز ہوتی۔

اشرف پھرتی سے اٹھا اور ننگے پیر ہی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولنے میں بھی اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ اس نے باہر جھانکا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔

'کوئی گزرا تو ہے.....' اشرف کو خیال آیا۔ پھر وہ کمرے سے نکل کر راہداری کی ایک جانب بڑھا۔ وہ ننگے پیر ہونے کے باوجود اتنا بے قدموں چل رہا تھا کہ ذرا بھی آہٹ نہ ہو لیکن بڑھا وہ تیزی سے تھا۔

وہ وہاں تک پہنچ گیا جہاں زینے تھے۔ اب اس نے پھر قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی سیڑھیوں سے اتر کر نیچے جا چکا تھا۔

اشرف کا دل دھڑک رہا تھا لیکن وہ ہمت کر کے زینے اترنے لگا۔ اب بھی اس کے انداز میں تیزی تھی۔ جب وہ نیچے پہنچا تو چاپ زیادہ واضح سنائی دینے لگی۔ اشرف اسی طرف بڑھا اور پھر اسے یوں لگا جیسے اس کی سانسیں رکنے لگی ہوں۔

وہ شیریں ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے جبکہ عام طور پر وہ بال سمیٹ کر رکھتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کا اتنا لمبا لبادہ پہنے ہوئے تھی کہ اس کے پیر نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ چلنے کا انداز بھی کچھ ایسا تھا جیسے ''سلوموشن'' میں چل رہی ہو۔

شیخو بابا نے اس رات کئی کمروں کی لائٹ آن رکھی تھی جس کی تھوڑی سی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا۔

شیریں حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا اس لیے اشرف بھی باہر نکل گیا۔ اس کے پیر کیچڑ میں لتھڑ چکے تھے لیکن اس وقت اس کا دھیان پوری طرح شیریں ہی کی طرف تھا۔

احاطے سے گزر کر شیریں پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔ بادل کافی حد تک چھٹ چکے تھے اس لیے زمین پر تاروں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ کسی وقت ایک دو سیکنڈ کے لیے چاند بھی نکل آتا تھا۔

''کیا یہ ڈریکولا سے ملنے کہیں اور جا رہی ہے؟''

اشرف کے دماغ میں بے تکا سا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے چند گھنٹے پہلے کا وقت یاد آیا۔ کھانے کے وقت شیریں اپنی گردن پر مفلر کی طرح بڑا رومال باندھے ہوئے تھی جبکہ عجائب خانے جاتے ہوئے اس کی گردن پر کپڑا نہیں تھا۔ تو کیا وہ ڈریکولا کے دانتوں کے نشان چھپانا چاہتی تھی؟

ان خیالات میں اس کا ذہن کچھ بھٹکا ہی تھا کہ شیریں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اشرف نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس کے تعاقب میں اشرف حویلی سے کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ دور نکل آیا تھا۔

شیریں دکھائی نہیں دی تو وہ حویلی کی طرف واپس چل پڑا۔ اس کے دماغ میں وہی سوال کھڑا رہا کہ کیا وہ ڈریکولا سے ملنے گئی ہے؟

لیکن کہیں اور کیوں؟ اس نے خود سے ہی جرح کی۔ وہ ڈریکولا سے عجائب خانے میں بھی تو مل سکتی ہے..... اس وقت وہ گئی بھی تھی وہاں۔

دفعتاً وہ چونک کر رکا۔ کچھ فاصلے سے جھاڑیوں میں اسے کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہاں کوئی ہو۔ وہ رک کر غور سے جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاند بادلوں کی اوٹ سے نکلا۔ اس کی روشنی میں اشرف کو جھاڑیوں سے جھانکتی ہوئی صرف

Digitized by Google

دو آنکھیں دکھائی دیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں شدید نفرت بھی تھی جسے محسوس کیا جاسکتا تھا۔

شیریں کی آنکھیں..... وہ شیریں کی آنکھیں تھیں۔

اشرف کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ مخصوص بناوٹ تھی شیریں کی آنکھوں کی۔ ان آنکھوں میں نفرت تھی یا شاید غصہ تھا۔ وہ اس لیے غصے میں آسکتی تھی کہ اشرف نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

ان آنکھوں سے اشرف اتنا خوف زدہ ہوا کہ بے تحاشا حویلی کی طرف دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے ریوالور بھی نکال لیا تھا۔ گزشتہ شام ہی اس نے سامان میں سے اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا تھا اور مستقل رکھے رہا تھا۔ ماجد کے ساتھ لیٹتے وقت اس نے شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا اس لیے اس وقت بھی ریوالور اس کی جیب میں تھا۔

اس نے عجیب سی غراہٹ اس وقت سنی جب وہ حویلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ خوف کے عالم میں اس نے ایک ہوائی فائر بھی کر ڈالا۔ مڑ کر دیکھتے وقت اسے ایسا لگا تھا جیسے کوئی تیزی سے ایک جھاڑی کے پیچھے چلا گیا ہو۔

اشرف اس جھاڑی پر بھی گولیاں برسا سکتا تھا لیکن اس طرح وہ کسی کے قتل کا مرتکب ہوجاتا۔ ریوالور تو وہ صرف حفظ ماتقدم کے طور پر رکھتا تھا۔

ہوائی فائر کرنے کے بعد وہ تیزی سے دوڑ کر حویلی کے پھاٹک تک پہنچ گیا تھا۔ بارش کے باعث کیچڑ اتنی تھی کہ اشرف کے دوڑنے سے خاصی آواز ہو رہی تھی۔

اسی وقت دروازے سے شیخو بابا اور ماجد گھبرائے ہوئے باہر نکلے۔ ''اشرف!'' ماجد چیخا۔

''ہاں..... ہاں.....'' اشرف کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''یہ تو باہر کیسے نکل گیا تھا؟ گولی چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ تجھے کمرے میں نہ پاکر میں گھبرا گیا۔''

اشرف ان کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس کی سانس اب بھی پھولی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل بتا سکا کہ فائر اس نے ہی کیا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے کوئی جانور اس پر حملہ کرنے والا ہو۔

وہ شیخو بابا کے سامنے شیریں کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

شیخو بابا بولا۔ ''اس علاقے میں کوئی ایسا جانور تو نہیں ہے جو لوگوں پر حملہ کرے۔''

''وہم ہوا ہوگا تجھے۔ چل اندر چل!'' ماجد نے اس کا بازو پکڑا۔ ''ننگے پیر ہی باہر نکل گیا تھا۔ کیچڑ میں بھرے ہوئے ہیں تیرے پیر۔ یہ کیچڑ حویلی میں بھی پھیلے گی۔''

''اس کی فکر نہ کریں صاحب!'' شیخو بابا بولا۔ ''میں صفائی کرلوں گا۔''

''کیا ہوا ہے؟'' کسی طرف سے شیریں بھی آگئی۔ اب وہ اپنے عام لباس میں تھی۔ ''یہ فائر کی آواز کیسی تھی اور یہ تمہاری حالت۔'' شیریں نے اشرف کے پیروں کی طرف دیکھا۔

''گولی میں نے ہی چلائی تھی۔'' اشرف بولا۔

''کیوں؟''

اشرف نے وہی جواب دیا جو شیخو بابا اور ماجد کو دے چکا تھا۔

''یہاں کوئی جانور.....!'' شیریں بڑبڑا کر رہ گئی۔

اشرف کے دماغ میں سوال گونج رہا تھا کہ شیریں یہاں پہلے ہی سے کیسے موجود ہے؟ کیا یہ اسی وقت لوٹ آئی تھی جب اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی؟..... لیکن پھر..... وہ دہکتی ہوئی آنکھیں؟ جھاڑی میں وہ آنکھیں؟

اشرف کا دماغ الجھ گیا..... ان دونوں کے ساتھ شیریں بھی کمرے میں آگئی۔

''اپنا حلیہ ٹھیک کر۔'' ماجد نے اشرف سے کہا۔ ''پیر دھولے۔''

اشرف باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ ماجد کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن شیریں کے سامنے اس کی زبان بند ہی رہی۔

باتھ روم میں اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد بھی اشرف فوراً نہیں نکلا۔ کب جائے گی یہ منحوس؟ وہ سوچ رہا تھا۔

لیکن شیریں ماجد سے باتیں کرتی رہی۔ آخر اشرف کو باہر نکلنا ہی پڑا۔ شیریں اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اشرف بول پڑا۔

''میں اب فوراً سو جانا چاہتا ہوں۔'' وہ بستر کی طرف بڑھا اور لیٹ کر نہ صرف چادر اوڑھ لی بلکہ دوسری طرف کروٹ بھی لے لی۔

ماجد اور شیریں میں قیاس آرائیاں ہوتی رہیں، پھر شیریں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اشرف اٹھ بیٹھا اور ماجد سے بولا۔ ''دروازہ بند کردے۔''

ماجد کچھ کہے بغیر اٹھا اور دروازہ بند کر کے بستر کی طرف لوٹا۔

''کچھ بتانا چاہتا ہے مجھے؟'' ماجد بولا۔ ''اور شیریں کے سامنے نہیں بتانا چاہتا تھا۔''

''ٹھیک سمجھا تو نے۔ یہ لڑکی..... یہ عورت..... جو دل چاہے، کہہ لے..... یہ اب میرے لیے معما بن گئی ہے۔ نہ

Digitized by Google

جانے کون ہے، کوئی چڑیل، ڈائن، کوئی خون آشام یا پھر وہ..... کیا نام تھا... ہاں، مسز حارث۔''

''اچانک تو اتنا ڈسٹرب کیوں ہو رہا ہے؟..... باہر کیوں نکلا تھا۔''

''اس پراسرار لڑکی یا عورت کا تعاقب کر رہا تھا۔''

''کیوں؟'' ماجد الجھا ہوا نظر آیا۔

''یہ اس طرح باہر جا رہی تھی جیسے انسان نہیں، کچھ اور ہو۔'' اشرف نے کہا۔ ''زیادہ خیال تو مجھے یہ آ رہا ہے کہ یہی مسز حارث ہے۔ یہ مجھے یا تجھے..... یا ہم دونوں ہی کو قتل کر دے گی، جیسے ہی اسے موقع ملا۔ مجھ پر کسی جانور نے حملہ نہیں کرنا چاہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایک جھاڑی میں اس کی آنکھیں دیکھی تھیں، شعلے کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے غصے میں ہو کہ میں نے اس کا تعاقب کیوں کیا؟''

''حملہ کرنے والی بات کیا ہے؟'' ماجد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس مرتبہ اشرف نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا، پھر بولا۔ ''بس کل صبح ہمیں نکل جانا چاہیے۔''

''وہ آنکھیں کسی خرگوش کی بھی ہو سکتی ہیں۔ ایسے چھوٹے موٹے جانور تو یہاں ہوں گے۔''

اشرف جھینپا۔ ''کیا میں انسانی آنکھ اور خرگوش کی آنکھ میں تمیز نہیں کر سکتا؟''

''جب ذہن پر کوئی خیال مسلط ہو جائے تو سب کچھ اسی طرح دکھائی دیتا ہے۔''

''تو..... تو نہیں چلے گا یہاں سے؟''

''نہیں۔'' ماجد سنجیدگی سے بولا۔

''تجھ پر جادو کر دیا ہے اس نے۔''

''وہ حسین بھی ہے اور دلیر بھی۔'' ماجد نے کہا۔ ''ابھی تو نے چادر اوڑھ کر کروٹ لے لی تھی۔ شاید ہماری باتیں دھیان سے بھی نہیں سن رہا تھا۔''

''میں ہر بات سن رہا تھا۔''

''ڈریکولا کی بات سنی تھی؟''

''ڈریکولا کی بات؟''

''کہا تھا میں نے! تو دھیان سے نہیں سن رہا تھا۔ اس نے ابھی بتایا تھا مجھے..... آج بھی اس نے تابوت کھول کر دیکھا تھا۔ ڈریکولا تھا اس میں۔''

''کیا؟'' اشرف کے منہ سے نکلا۔

''ہاں، لیکن تابوت خود ہی بند بھی ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں نے ابھی کہا تھا کہ وہ دلیر بھی ہے۔ کم از کم میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ تابوت کھول کر دیکھوں۔''

''نہ جانے کیا چیز ہے یہ!'' اشرف نے سر جھٹکا۔

''تیرا دماغ بالکل منتشر ہے اس وقت۔'' ماجد نے لیٹتے ہوئے کہا۔ ''سو جا بس! اب کل صبح کریں گے بات۔''

''میری جگہ تو ہوتا تو تیری بھی یہی حالت ہوتی۔'' ماجد کچھ نہیں بولا۔ اشرف کو بھی سوچتے سوچتے آخر نیند آ ہی گئی۔

دوسری صبح شیریں نے اسی کمرے میں آ کر ناشتا کیا۔ اشرف کو بھی گزشتہ رات کے حوالے سے چھیڑنا چاہا لیکن اشرف بالکل چپ اور سنجیدہ رہا۔ شیریں نے سوالیہ نظروں سے ماجد کی طرف دیکھا۔

''دھوپ تو نکل آئی ہے آج۔'' ماجد نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے شیشے سورج کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ ''آج نہیں رکے گا یہ.....'' اس نے اشرف کی طرف اشارہ کیا۔

''مصیبت میں پڑیں گے یہ۔'' شیریں نے کہا۔ ''آج اگر سارے دن تیز دھوپ رہے، تبھی راستے کچھ ٹھیک ہوں گے۔''

''میں سمجھا چکا ہوں۔''

شیریں نے اشرف کی طرف دیکھا اور اس طرح دھیرے سے ہنس پڑی جیسے اشرف کو احمق قرار دے رہی ہو۔

اشرف نے ناشتا کرنے کے بعد اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔

''تم تو نہیں جا رہے ہو نا؟'' شیریں نے ماجد سے پوچھا۔

''نہیں۔'' ماجد نے جواب دیا۔ ''راستے میں کسی جگہ گاڑی دھنس گئی تو یہی بھگتے وہ مصیبت.....''

''یہ ہو تو سکتا ہے۔'' شیریں نے کہا۔ ''بعض جگہ تو زمین بالکل دلدلی ہو گئی ہو گی۔''

اشرف کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔ وہ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

''چل، تجھے گاڑی تک تو چھوڑ آؤں۔'' ماجد بولا۔ اس نے اشرف کے ہاتھ سے ایک بیگ بھی لینا چاہا تھا۔ ان دونوں ہی کے پاس بس دو دو بیگ تھے۔

''اتنے وزنی تو نہیں ہیں یہ۔'' اشرف نے بیگ اسے نہیں دیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا۔

''ناراض ہو گیا؟'' ماجد بولا۔

''نہیں، ناراض کیوں ہوں گا۔''

Digitized by Google

''میں آتا ہوں ابھی۔'' ماجد نے شیریں سے کہا اور اشرف کے پیچھے قدم بڑھایا۔

شیریں نے بے پروائی کے انداز میں شانے اچکائے تھے۔

''جا رہے ہیں صاحب؟'' شیخو بابا سامنے آ گیا۔

''نہیں۔'' ماجد نے اسے جواب دیا۔ ''میں تو ابھی رکوں گا۔ بس میرا دوست جا رہا ہے۔''

شیخو بابا سر ہلا کر ان کے پیچھے چلنے لگا۔ اسے پھاٹک کھولنا اور بند کرنا تھا۔

حویلی سے نکل کر ماجد اشرف کے ساتھ اس طرف بڑھا جہاں گاڑی کھڑی کی تھی۔ شیخو بابا پھاٹک کی طرف بڑھ گیا۔

''کب تک لوٹے گا؟'' ماجد نے پوچھا۔

''غیر یقینی سوسم میں جا رہا ہوں۔'' اشرف نے کہا۔ ''لیکن واپس اب اسی وقت لوٹوں گا جب یقین ہو جائے گا کہ اب موسم کی خرابی کا کوئی فوری امکان نہیں۔''

''عجیب صورتِ حال بن گئی ہے۔'' ماجد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ تو نے غلط نہیں کہا تھا کہ شیریں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ گرویدہ ہو گیا ہوں میں اس کا۔''

اشرف نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے بیگ گاڑی میں رکھ رہا تھا تو اس نے ماجد کی چونکی ہوئی آواز سنی۔ ''ارے! دو پہیوں میں تو ہوا ہی نہیں ہے۔''

اشرف نے پلٹ کر دیکھا اور پہیوں پر نظر دوڑائی۔ دو پہیوں کے ٹائر زمین سے چپکے ہوئے تھے۔ اشرف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے ذہن میں خیال ہی ایسا آیا تھا۔

''ہوا کیسے نکل گئی؟'' ماجد بولا۔

''نکالی گئی ہے۔'' اشرف کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''کوئی نہیں چاہتا کہ ہم یہاں سے جائیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ حویلی کے قریب آتے آتے گاڑی میں دو تین کانٹے لگ گئے ہوں جو دھیرے دھیرے ٹیوب تک پہنچ گئے۔''

اشرف ایک بیگ گاڑی میں رکھ چکا تھا۔ وہ اس نے اتارتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''شاید ہم مرنے ہی کے لیے یہاں آئے ہیں۔''

''تیرے دماغ کے ریکارڈ پر سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔''

اشرف نے کچھ نہیں کہا۔

ان دونوں کو واپس حویلی کی طرف جاتے دیکھ کر شیخو بابا دور سے ہی بولا۔ ''کیا ارادہ بدل دیا صاحب؟''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

9,000

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

0301-2454188
0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

Digitized by Google

''گاڑی کے دو پہیوں کی ہوا نکل گئی ہے۔'' ماجد نے اسے جواب دیا۔

''اوہ..... یہ تو..... یہ تو بڑی مصیبت ہوگئی؟''

''ہاں۔'' ماجد نے کہا۔ ''کسی کو شہر سے بلوانا پڑے گا۔'' وہ حویلی میں پہنچ گئے۔

اشرف نے کمرے میں اپنا مختصر سا سامان رکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''اتنا پریشان نہ ہو۔'' ماجد بولا۔ ''کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس کا کوئی حل نہ ہو۔''

''میری باتوں کو نظر انداز نہ کرما جے!'' اشرف بولا۔ ''بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ہم دونوں کو۔ پہیے ضرور پنکچر کیے گئے ہیں۔''

''چل ٹھیک ہے۔ میں بحث نہیں کروں گا۔''

''بحث کرنا بھی نہیں چاہیے۔ میری باتوں کو وہم نہ سمجھ۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور شیریں کی آواز آئی۔ ''کیا میں اندر آجاؤں؟''

''آجاؤ۔ دروازہ بند نہیں ہے۔'' ماجد نے کہا۔

شیریں اندر آگئی اور اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ابھی شیخو بابا نے بتایا کہ تمہاری گاڑی کے پہیے پنکچر ہوگئے ہیں؟''

''دیوالور ہے میرے پاس!'' اشرف نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی جان پر کھیل جاؤں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شیریں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جو بات ہے، وہ سامنے تو آئے گی۔''

''نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔'' اس مرتبہ اشرف نے خاموشی اختیار کی۔

''بندوبست تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔'' شیریں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس موسم ایسا ہی رہے جیسا آج ہے۔''

''ہوں۔'' ماجد نے سر ہلا دیا۔

''تمہارا دوست مجھ سے کچھ ناراض ناراض سا رہنے لگا ہے۔'' شیریں کا اشارہ اشرف کی طرف تھا۔

''چلو ذرا باہر چلو۔'' ماجد کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''کہاں؟''

''آؤ تو۔'' ماجد نے اصرار کیا۔

''چلو!'' شیریں نے کہا اور ماجد کے ساتھ دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اشرف خاموشی سے ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

شیریں نے کمرے سے نکل کر کہا۔ ''بات کیا ہے ماجد!''

''میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اشرف سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو۔ اس کے دماغ میں اوندھے سیدھے خیالات بھر گئے ہیں۔''

شیریں دھیرے سے ہنسی، پھر بڑی بے تکلفی سے ماجد کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''آؤ، میرے کمرے میں چلو۔ میں تمہیں کچھ بتاتی ہوں۔''

ماجد کے لیے وہ بڑا خوشگوار لمحہ تھا جب شیریں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس نرم و ملائم ہاتھ نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا۔

شیریں اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

''دراصل وہ ڈر گیا ہے مجھ سے۔'' شیریں نے کمرے میں پہنچ کر ماجد کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''ادھر بیٹھو!''

''تم سے ڈر گیا ہے؟'' ماجد نے اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔'' شیریں مسکرا رہی تھی۔ ''میں اتفاقاً دو ایک مرتبہ تم دونوں کی باتیں سن چکی ہوں۔ وہ میرے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا ہوں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

''نہیں۔'' ماجد نے طویل سانس لی۔ ''لیکن کل رات اسے ایک خطرناک وہم ہوا ہے۔ اس سے وہ بہت ڈر گیا ہے اور اسی لیے جلد از جلد یہاں سے چلا جانا چاہتا ہے۔''

''کل رات اسے کوئی وہم نہیں ہوا۔'' شیریں مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' ماجد چونکا۔

''اشرف نے کسی کا تعاقب کیا تھا نا؟''

''تعاقب؟ میں تو اس کا وہم سمجھ رہا ہوں۔ اسے یہ خیال بھی ہے کہ وہ تم تھیں۔''

''وہ میں ہی تھی۔'' شیریں نے سر ہلایا۔

ماجد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔'' شیریں مسکرائی۔ ''ایک پراسرار مذاق کی سوجھی تھی مجھے اور وہ بھی اس لیے کہ رات جب میں تمہارے کمرے میں آئی تھی تو اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایسا بن گیا تھا جیسے سو رہا ہو حالانکہ میں نے اس طرف آتے ہوئے اس کے کھانسنے کی آواز بھی سنی تھی۔''

''انسان سوتے میں بھی کھانستا ہے۔''

Digitized by Google

''لیکن مجھے یہی خیال آیا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ میرا یہ خیال ٹھیک بھی ثابت ہوا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر ایک لمبا چوغہ پہنا اور ننگے پیر دبے قدموں تمہارے کمرے کے سامنے سے گزری لیکن اتنے دبے قدموں بھی نہیں کہ بالکل آواز نہ ہو۔ آہٹ کا وہم اسے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ میں یہی چاہتی تھی کہ وہ آہٹ سن کر باہر نکلے۔ میری یہ خواہش پوری بھی ہوئی۔ میں نے اپنے بال بھی بکھرا لیے تھے اور بن کر اس طرح چل رہی تھی جیسے کوئی خواب میں چلتا ہے۔ وہ میرے پیچھے لگا ہوا حویلی کے باہر تک آگیا۔ چاند بھی کچھ دیر بعد نکل رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چھپا اور تاریکی بڑھی تو میں نے جلدی سے ایک درخت کی آڑ لے لی۔ پھر آڑ ہی آڑ میں تیزی سے چلتی ہوئی حویلی میں واپس آگئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خوف زدہ ہوا ہوگا۔ اس کا بزدل ہونا تو مجھ پر اسی دن ظاہر ہو گیا تھا جب تابوت کھلنے پر اس نے ڈریکولا دیکھا تھا۔ رات کو بھی وہ اتنا ڈرا کہ ہوائی فائر کر بیٹھا۔''

ماجد حیرت سے منہ پھاڑے یہ سب کچھ سنتا رہا پھر جیسے ہی شیریں ذرا سا رکی تو وہ بول پڑا۔ ''وہ تم سے زیادہ ان آنکھوں سے خوف زدہ ہوا تھا جو اسے ایک جھاڑی میں دکھائی دی تھیں۔ ایسی آنکھیں جو شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ انہی سے ڈر کر وہ تیزی سے حویلی کی طرف لوٹنا چاہ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے لیکن تعاقب کرنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ اسی وقت اس نے ایک فائر کر دیا۔ یہ سب کچھ میں نہیں کہہ رہا ہوں، میں نے اشرف کا بیان دہرایا ہے۔''

''وہ آنکھیں تو کسی خرگوش کی ہوں گی۔ اس علاقے میں یہ چھوٹے چھوٹے جانور تو خاصے ہیں۔''

''بالکل یہی بات میں نے اس سے کہی تھی۔''

''خیر!..... رات وہ بہت خوف زدہ ہوا تھا۔ اسی لیے آج یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ بہت بزدل ہے وہ لیکن تم بہادر ہو ماجد!..... تم جب میرے ساتھ عجائب خانے میں گئے تھے تو اس وقت خوف زدہ نہیں ہوئے تھے جب میں وہ تابوت کھول رہی تھی۔ تم خوب صورت بھی ہو اور بہادر بھی۔'' اس نے پھر اپنا ہاتھ ماجد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ اس نے مزید کہا۔ ''اسی لیے میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ مرد کو بہادر ہونا چاہیے ماجد! میں نے تمہاری آنکھوں سے محسوس کیا ہے کہ تم بھی مجھے پسند کرنے لگے ہو۔''

''واقعی؟'' ماجد ریشہ خطمی ہو گیا۔ ''واقعی تم مجھے پسند کرنے لگی ہو؟'' چند لمحوں کے لیے وہ ساری کہانی بھول گیا تھا جو شیریں نے اس وقت سنائی تھی۔

''کیسے یقین دلاؤں؟'' شیریں ذرا سا آگے جھکی اور ماجد کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ کپکپا بھی رہے تھے۔

ماجد نے ذرا سا پہلو بدل کر اپنے دونوں ہاتھ شیریں کے شانوں پر رکھ دیے۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے۔'' اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم نے بھی مجھے پسند کیا ہے۔''

جب اظہارِ محبت ہو جائے تو بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی ہے، تاہم غالباً ان دونوں ہی نے اس کا خیال رکھا کہ بات ایک ''خاص حد'' سے آگے نہ بڑھے۔ پھر وہ دونوں اس وقت چونکے جب اشرف کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

''کہاں ہے ماجد؟''

''میں یہاں ہوں، شیریں کے کمرے میں۔'' ماجد نے بھی بلند آواز میں جواب دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اشرف کو نہ جانے کیا جلدی تھی کہ ماجد سے پہلے ہی اس نے شیریں کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

''چل میرے ساتھ۔'' اس نے ماجد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیریں پر اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اشرف!'' شیریں بولی۔

''وقت نہیں ہے میرے پاس کچھ سننے کا۔'' اشرف نے کہا اور ماجد کا بازو پکڑے اسے کمرے سے نکال لے گیا۔

''میں جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بس سامان اٹھانا ہے۔''

''کیسے جائے گا؟'' ماجد نے حیرت سے پوچھا۔

''خوش قسمتی ہے میری کہ ایک گاڑی مل گئی ہے۔''

''گاڑی..... کہاں؟''

اشرف اسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اس نے اپنا سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کے جانے کے بعد میں کھڑکی میں کھڑا دوربین سے باہر کا سارا منظر دیکھ رہا تھا تو بہت دور سے مجھے ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ وہ آگے ہی جا رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ نکل جاؤں۔ لفٹ مل سکتی تھی ان سے۔'' وہ سامان اٹھا کر ماجد کو ساتھ لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ ''میں دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ شمبو بابا کو بھی نہیں پکارا۔ خود ہی حویلی سے نکل کر پھاٹک کی طرف لپکا۔ پھاٹک کھول کر جب میں سڑک پر پہنچا تو گاڑی کچھ آگے نکل گئی تھی۔ اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔

Digitized by Google

پرانی سوزوکی ہے۔ میرے چیخنے چلانے پر انہوں نے مجھے آئینے میں دیکھ لیا ہوگا۔ انہوں نے گاڑی روکی اور ریورس کر کے پیچھے آئے۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟" ماجد کو بمشکل بولنے کا موقع مل سکا کیونکہ اشرف بہت تیزی سے بولے ہی جا رہا تھا۔

"گاؤں ہی کے دو آدمی ہیں۔" اشرف نے حویلی سے نکلتے ہوئے کہا۔ وہ تقریباً دوڑنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ "گاؤں والوں کے لیے شہر سے سامان لانا لے جانا ہی ان کا ذریعۂ معاش ہے۔ وہ کھاد لینے گئے تھے۔ بارش کی وجہ سے بروقت نہیں لوٹ سکے۔ اب موسم ٹھیک ہوا تو....."

شیخو بابا سے سامنا ہوگیا۔ "کیا پیدل جائیں گے صاحب؟" اس کا سوال سامان کی وجہ سے حق بجانب تھا۔

"نہیں، ایک گاڑی گاؤں کی طرف جاتی دکھائی دے گئی تھی کھڑکی سے....." اس نے شیخو بابا کو بھی وہی جواب دیا جو ماجد کو دے چکا تھا۔

اب وہ حویلی سے باہر نکل رہے تھے۔

"میں نے انہیں اپنی پتا سنائی۔" اشرف نے مزید بتایا۔ "گاؤں کے لوگوں کی اکثریت اچھی ہی ہوتی ہے۔ وہ میری پریشانی جان کر مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ انہوں نے پوچھا ضرور تھا کہ میں ادھر کیوں جا رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ مجھے فلم بنانا ہے۔ وہاں لوکیشن دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات سن کر وہ خوش بھی ہوئے کہ ان کا گاؤں فلم میں آئے گا۔"

وہ حویلی کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ شیخو بابا بھی ساتھ ساتھ تھا۔ کھلے ہوئے پھاٹک کے باہر سوزوکی موجود تھی۔ دو افراد سوزوکی کے باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر تھا۔ نوجوان قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا لیکن ادھیڑ عمر شخص دیہاتی لباس میں تھا۔ شاید وہ باپ بیٹے ہوں۔ ان دونوں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

ماجد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "راستے میں کہیں دلدلی زمین بھی ہوگی۔"

"ہم چپے چپے کو جانتے ہیں اس علاقے کے۔" ادھیڑ عمر شخص نے جواب دیا۔ "ہمیں پتا ہے کہ کدھر سے نکلنا ہے۔"

نوجوان نے خود اشرف کے ہاتھ سے سامان لیا اور سوزوکی کے پچھلے حصے میں رکھنے لگا۔

"آپ ہمارے ساتھ آگے ہی بیٹھنا صاحب!" ادھیڑ عمر بولا۔ "تھوڑی سی تنگی تو ہوگی لیکن گزارا ہو جائے گا۔"

"تو بھی چلا چل ماجے!" اشرف نے کہا۔

"نہیں۔" ماجد نے کہا۔ "میں انتظار کروں گا تیرا۔"

"چار آدمیوں کا بیٹھنا مشکل ہے صاحب جی!" نوجوان بولا۔ "پیچھے کھاد بھری ہوئی ہے۔ آپ کا سامان بھی مشکل سے آیا ہے۔"

ماجد جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اشرف سے کہا۔ "خیال رکھنا اپنا۔"

"چلیں صاحب!" ادھیڑ عمر شخص بولا۔

"اچھا!" اشرف نے ماجد سے مصافحہ کیا۔ "چلتا ہوں۔"

"خدا حافظ۔" ماجد نے آہستہ سے کہا۔

شیخو بابا چپ چاپ ایک طرف کھڑا رہا۔ ماجد ان دونوں کے ساتھ سوزوکی میں بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔

"واپس چلیں صاحب!" شیخو بابا نے ماجد سے کہا۔

"چلتا ہوں۔" ماجد نے کہا اور جاتی ہوئی سوزوکی کو دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ماجد مڑا۔

"آؤ شیخو بابا!" وہ بولا۔

وہ دونوں حویلی میں لوٹے۔ شیریں تیزی سے ان کے قریب آئی۔

"آخر چلا ہی گیا تمہارا دوست!" وہ بولی۔ "سوزوکی مل گئی اسے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔"

"کھانا کب کھائیں گی بٹیا رانی؟" شیخو بابا نے پوچھا۔

"ابھی تو نہیں۔" شیریں بولی۔ "جب بھوک لگے گی تو بتا دوں گی۔"

شیخو بابا سر ہلا کر رخصت ہوگیا۔

"آخر حضرت چلے ہی گئے۔" شیریں مڑی۔

ماجد اس کے ساتھ چلنے لگا۔ "جب وہ کمرے میں آیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں اس سے کچھ کہنا ہے۔"

"لیکن وہ رکا ہی نہیں۔"

"کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"میں اس کے دل سے خوف نکالنا چاہتی تھی۔"

"کس طرح؟"

"میں بتاتی کہ کل رات میں نے اس کے ساتھ شرارت کی تھی۔"

"یعنی تسلیم کر لیتیں کہ وہ تم ہی تھیں؟"

"ہاں۔"

"وہ تسلیم نہیں کرتا کہ تم نے صرف شرارتاً وہ حرکت کی تھی۔"

Digitized by Google

''اس کے بعد میں اسے ڈریکولا کی حقیقت بھی بتاتی۔''

''یہ کہاں لے جارہی ہو؟'' ماجد چونک کر رکا۔

''عجائب خانے میں۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''وہ تو چلا گیا، تمہیں ہی بتادوں اس ڈریکولا کی حقیقت۔''

''کیا حقیقت ہے اس کی؟''

''وہ ڈریکولا کی ڈمی ہے۔ ایک حیرت انگیز ڈمی۔ وہ انکل نے فرانس سے خریدی تھی۔ جب میں یہاں آئی تھی، تب بھی معلوم تھا مجھے۔ جب میں نے یہاں آنے کا ارادہ کیا تھا، تبھی بتادیا تھا انکل نے مجھے کہ کہیں ڈر کر میرا ہارٹ فیل ہی نہ ہوجائے۔'' شیریں ہنسی۔

''ایسی ڈمی؟'' ماجد کے لہجے میں غیر یقینی کی کیفیت تھی۔

''ہاں ماجد!'' شیریں نے جواب دیا۔ ''دو اسپرنگ ہیں جو تابوت کا ڈھکنا کھلنے سے اسے بٹھادیتے ہیں لیکن بہت کم وقت کے لیے۔ ڈمی پھر لیٹ جاتی ہے اور ایک تیسرے اسپرنگ کی وجہ سے تابوت کا ڈھکنا بند ہوجاتا ہے۔''

''جب تمہیں یہ معلوم تھا تو تم کیوں ڈری تھیں؟''

''صرف دکھاوے کے لیے۔'' شیریں مسکرائی۔ ''دراصل میں نے وہ حرکت کی ہی اس لیے تھی کہ اشرف کے بارے میں اندازہ لگاسکوں۔''

''کیا اندازہ لگاسکو؟''

''یہی کہ وہ خوف زدہ ہوگا یا نہیں۔''

''اور..... اور جب تم نے مجھے وہ تابوت کھول کر دکھایا تھا تو تابوت خالی تھا۔ تمہارے بقول وہ ڈمی اس میں نہیں تھی۔''

''ہاں۔'' شیریں مسکراتی رہی۔ ''میں تمہیں بھی آزمانا چاہتی تھی۔ تمہیں وہاں لے جانے سے پہلے اس تابوت کا ڈھکنا مضبوطی سے پکڑ کر اسے ناکارہ کردیا تھا۔ پھر دوسرے اسپرنگ بھی الگ کرنے کے بعد ڈمی تابوت سے نکال لی تھی۔ اسے کچھ چیزوں کے پیچھے چھپادیا تھا۔ میں اس بارنے میں بھی تمہارا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔''

''اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو اب تم مجھے کیا دکھانے لے جارہی ہو؟''

''وہی سب کچھ جو میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے۔'' شیریں نے ماجد کا ہاتھ پکڑا اور قدم بڑھانے لگی۔

ماجد اب بھی تذبذب کا شکار تھا لیکن شیریں کے نرم وگداز ہاتھ کے لمس سے مدہوش سا آگے بڑھنے لگا۔ کچھ سبب یہ بھی تھا کہ شیریں اس سے اظہارِ محبت کرچکی تھی۔

عجائب خانے میں داخل ہوکر شیریں نے وہاں روشنی کی اور ماجد کو تابوت کے قریب لے گئی۔ ماجد کے دل کی دھڑکنیں خفیف سی بڑھ گئیں۔ وہ کوشش کررہا تھا کہ ہر صورت میں خود کو سنبھالے رکھے۔ وہ شیریں کے ذہن میں خیال نہیں آنے دینا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں خوف کا کچھ نہ کچھ عنصر ہے۔

شیریں نے ایک بار مسکرا کر ماجد کی طرف دیکھا اور پھر تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔ فوراً دو بڑے بڑے دانتوں والا وہ وجود اٹھ کر بیٹھ گیا جو ڈریکولا تھا یا شیریں کے بیان کے مطابق ڈریکولا کا مجسمہ یا ڈمی!

پھر اس سے پہلے کہ ڈھکنا بند ہوجاتا، شیریں نے ڈھکنے کو مضبوطی سے پکڑلیا۔

اب خوف ناک وجود لیٹ نہیں سکا۔ شیریں نے ایک ہاتھ تابوت میں ڈال کر کچھ کیا اور پھر ڈھکنا چھوڑ دیا۔ خوف ناک وجود بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا جبکہ شیریں نے اب ڈھکنے پر اپنی گرفت بھی ختم کردی تھی۔

''دیکھا تم نے؟'' شیریں نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ماجد نے بس حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''اسے چھو کر دیکھو۔'' شیریں پھر بولی۔

ماجد کو شیریں کی خاطر یہ بھی کرنا پڑا۔ خوف ناک وجود بے حس وحرکت تھا، تاہم ماجد کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے وجود کو چھوا۔

''دبا کر دیکھو۔'' شیریں پھر بولی۔

ماجد کو یہ بھی کرنا پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی سخت ربر دبا رہا ہے۔

''کیسا لگا؟'' شیریں نے پوچھا۔

''کوئی سخت ربر ہے۔'' ماجد نے کہا۔

''ہاں۔ یہ ربر کا بنا ہوا ہے۔ اسی لیے اس کا وزن بھی کم ہے۔ میں نے اسے یہ آسانی تابوت سے نکال لیا تھا۔ تمہیں دکھاتی ہوں۔'' اس مرتبہ اس نے دونوں ہاتھ تابوت میں ڈالے اور لگ بھگ ایک منٹ تک کچھ کرتی رہی۔ مصنوعی ڈریکولا جھٹکے سے لیٹ گیا لیکن اس کا ڈھکنا بند نہیں ہوا۔

''دیکھا تم نے؟'' شیریں بولی۔ ''اب میں اسے باہر نکالتی ہوں۔''

''تم نے اس کا ڈھکنا بڑی مضبوطی سے پکڑا تھا۔'' ماجد نے کہا۔ ''تابوت الٹ جانا چاہیے تھا۔''

''تم نے غور نہیں کیا۔'' شیریں نے جواب میں کہا۔ ''اسے فرش میں گڑا ہوا سمجھو۔ بہت مضبوط بولٹ ہیں۔''

Digitized by Google

ماجد نے واقعی غور نہیں کیا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ تابوت کے کناروں پر مضبوط بولٹ تھے۔

''اب میں اسے باہر نکالتی ہوں۔''

ماجد نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ شیریں اس کی یہ حرکت نہیں دیکھ سکی کیونکہ وہ مصنوعی ڈریکولا کو اٹھانے میں مصروف ہوگئی تھی۔

ماجد کے دیکھتے ہی دیکھتے شیریں نے اسے اٹھا کے فرش پر ڈال دیا۔

''بس یہ ہے اس کی حقیقت۔'' شیریں ہنس کر بولی۔

''اس رات اچانک لائٹ چلی گئی تھی۔'' ماجد نے کہا۔ ''اور تم نے بتایا تھا کہ ڈریکولا روشنی برداشت نہیں کرسکتا اس لیے اس کی پراسرار طاقت نے بجلی غائب کروا دی تھی۔ کچھ اس قسم کے الفاظ تھے تمہارے۔''

''بجلی جانا محض اتفاق تھا۔'' شیریں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بارش کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ خرابی ہوگئی تھی۔''

''اچھا اب چلو یہاں سے۔''

''اب میں اسے واپس تابوت میں سیٹ تو کردوں۔''

''وہ تم پھر کسی وقت کرلینا۔ یہاں کا ماحول ایسا ہے کہ مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''اچھا۔'' شیریں نے کہا۔ ''چلو پھر چلتے ہیں۔''

وہ ماجد کو لے کر کمرے سے نکل آئی۔ اس نے وہاں کی لائٹس آف کردی تھیں۔

''تو یہ ہے وہ ڈریکولا۔'' شیریں اب بھی مسکرا رہی تھی۔

ماجد نے کہا۔ ''جو چیزیں تم یہاں سے لے جانا چاہتی ہو، ان میں یہ تابوت بھی ہوگا؟''

''یقیناً۔'' شیریں نے جواب دیا۔ ''جو چیزیں میں یہاں سے لے جانا چاہتی ہوں، ان میں سب سے اہم تو یہ تابوت ہی ہے۔''

شیخو بابا جیسے واقعی بھوت تھا۔ اچانک سامنے آجاتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔

''اب کھانا لے آؤ شیخو بابا!'' شیریں نے اس سے کہا۔

شیخو بابا نے سر ہلایا اور جانے لگا۔

''میرے ہی کمرے میں لے آنا۔'' شیریں نے پھر کہا۔

ماجد خوش ہوا کہ شیریں کے ساتھ کچھ اور وقت گزار سکے گا۔

شیریں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر میں اشرف کو یہ سب کچھ دکھا دیتی تو اس کا ڈر نکل جاتا۔''

''مجھے تم سے اتفاق نہیں ہے۔''

''تو کیا اب وہ واپس نہیں آئے گا؟''

''نہیں، واپس تو آئے گا۔''

''لیکن میں جو یہاں موجود ہوں۔''

ماجد فوراً جواب نہیں دے سکا۔ شیریں کی بات نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

''اچھا ایک بات سنو!'' شیریں بولی۔

ماجد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے پہلے کبھی شیریں کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا جتنی وہ اس وقت نظر آئی تھی۔

''تم کبھی کبھی موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے حویلی سے باہر جانا چاہتے ہو۔ آئندہ ایسا ہو تو مجھے بھی ساتھ لے لینا۔''

''اچانک تمہیں یہ خیال کیوں آگیا؟''

''میں بھی موسم سے لطف اندوز ہولوں گی۔'' اس بار شیریں مسکرائی۔

''تم نے بات بدلی ہے۔'' ماجد نے زور دے کر کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کچھ اور خیال ہے۔''

''ارے نہیں۔ وہی موسم کی بات ہے۔''

''میں نہیں مان سکتا۔ کوئی اور بات ہے۔ تمہیں بتانا پڑے گا کیا خیال آیا ہے تمہیں۔''

شیریں نے پھر ٹالنے کی کوشش کی تو ماجد نے کہا۔ ''اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں اکیلا ہی باہر نکلوں گا۔''

''ضدی بھی ہو۔'' شیریں کی مسکراہٹ بے جان سی تھی۔

''بتاؤ؟'' ماجد نے پھر زور دیا۔

''اشرف کی ایک بات نے مجھے کچھ شبہے میں ڈال دیا تھا۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت میں نے وہ بات اشرف کا وہم کہہ کر ٹال دی تھی۔''

''کون سی بات؟'' ماجد کا تجسس بڑھا۔

''اس نے جھاڑیوں میں سرخ آنکھیں دیکھی تھیں۔''

''تم نے انہیں خرگوش کی آنکھیں قرار دیا تھا۔ خود میں نے بھی اشرف سے یہی کہا تھا۔''

''لیکن میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔''

''کیا سوچتی رہی ہو؟''

''وہ آنکھیں۔'' شیریں نے رک کر کہا۔ ''مسز حارث کی بھی ہوسکتی ہیں ماجد!''

چند لمحوں کے لیے ماجد اس کا منہ تکتا رہا، پھر بولا۔ ''کیا کسی عورت کی آنکھیں سرخ بھی ہوسکتی ہیں؟''

''زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے ماجد! اب سرخ لینس

Digitized by Google

بھی ملنے لگے ہیں۔ شروع میں شاید یہ فلمی ضروریات کے لیے بنائے گئے ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اب بازار میں عام ہو چکے ہیں۔''

''یعنی مسز حارث سرخ لینس بھی استعمال کرتی ہے یا کرسکتی ہے؟''

''ہاں۔''

''لیکن وہ ہم لوگوں کے پیچھے کیوں آئے گی؟''

''شاید انتقامی جذبے کے تحت۔''

''کیسا انتقام؟''

''تمہیں یاد نہیں؟ پولیس آفیسر نے کہا تھا کہ مسز حارث کا دماغی توازن اتنا بگڑ چکا ہے کہ وہ ڈرائیونگ بھی بہت تیز کرنے لگی ہے۔''

''اوہ!'' ماجد کے منہ سے نکلا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ وہ گاڑی بہت تیز رفتاری سے چلاتی جارہی تھی جو اشرف کی لینڈ کروزر سے ٹکرا کر الٹی تھی۔

''شاید تم میرا اشارہ سمجھ گئے ہو۔'' شیریں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ خیال آیا ہے کہ اس گاڑی میں شاید مسز حارث ہو اور اب ہم سے اس بات کا انتقام لینا چاہتی ہے کہ ہم نے اس کی گاڑی الٹ دی تھی؟''

''ہاں۔'' شیریں نے کہا۔ ''بس یہی خیال آیا ہے مجھے!''

''تب تو وہ ہم تینوں ہی کی دشمن ہوسکتی ہے؟''

شیریں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کہا۔ ''ہمیں یہ امکان نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خیال غلط بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے اشرف کی گاڑی کا نمبر نہیں دیکھا ہوگا۔ شاید وہ پاگلوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتی پھری ہو اور یہاں اسی وقت پہنچی ہو جب اشرف کی گاڑی حویلی کے دروازے پر رکی تھی۔ یہاں بھی اس نے نمبر دیکھ لیا ہوگا۔''

''تم نے تو مجھے بہت پریشان کر دیا۔ اشرف اکیلا ہی نکل گیا ہے۔''

''میں اسے روکنا چاہتی تھی۔ ساتھ ساتھ رہیں تو خطرہ کم رہے گا۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اکیلے باہر نہ نکلنا۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''تم دونوں ہی کے پاس موبائل فون ہیں نا؟''

''ہاں۔''

''تو اشرف کو فون کرو۔ اسے واپس بلانے کی کوشش کرو۔ کیا معلوم وہ اس کے پیچھے لگ گئی ہو۔''

''وہ پوچھے گا کہ مجھے یہ خیال کیسے آیا؟''

''میرا نام تو لینا مت! وہ کچھ الٹا ہی سمجھنے لگے گا۔ ظاہر کرنا کہ تمہیں ہی یہ خیال آیا ہے۔''

''ابھی تم نے مجھے ضدی کہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت ضدی ہے۔ شاید میری بات نہ مانے..... میرا مطلب ہے، واپس نہ آئے۔''

''کوشش کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔''

ماجد متفکر اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔

☆☆☆

گاؤں والوں کی گاڑی اپنی مخصوص دھیمی رفتار میں گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نوجوان تھا جس نے اپنا نام کمال دین بتایا تھا۔ اس کے باپ کا نام اللہ بخش تھا جو اپنے بیٹے اور اشرف کے درمیان میں بیٹھا تھا۔

باپ بیٹے شہر کے بارے میں ماجد سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے شہر کے لیے لچائے ہوئے ہوں۔

''ہم جاہل لوگ ہیں نا۔'' کمال دین بولا۔ ''وہاں اپنی دال تو گلے گی نہیں!''

''دال گل جائے تو؟'' اشرف نے کہا۔

''ہم تو شہر چلے جائیں۔''

''پھر گاؤں والوں کے لیے سامان کون لائے لے جائے گا؟''

''کوئی اور کر لے گا یہ کام۔ ہم گاڑی اسے بیچ جائیں گے۔ شہر میں فوراً تو کوئی کام ملے گا نہیں۔ خرچ کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں فلم بنانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں صاحب جی!''

''تو میں دفتر بھی بناؤں گا۔ میں تم دونوں کو وہاں ملازم رکھ لوں گا۔''

اس بات پر کمال دین ہی نہیں، اس کا باپ اللہ بخش بھی خوش نظر آیا۔ اشرف نے ان سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ان سے گاؤں میں اسے کچھ سہولت حاصل ہو سکے۔

''کچھ سال پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ تم مجھے جانے پہچانے سے لگ رہے ہو۔'' اشرف نے اللہ بخش سے کہا۔

''آپ بھی مجھے جانے پہچانے سے لگے ہو صاحب!'' اللہ بخش نے کہا۔ ''تب آپ کی عمر کم تھی۔''

''کم تو تمہاری بھی تھی۔ ہم نے کہیں ایک دوسرے کو دیکھا ہوگا۔''

''ایسا ہی ہوا ہوگا صاحب!'' اللہ بخش نے کہا۔ ''اور نوجوان بھی تھے آپ کے ساتھ۔ خیمہ لگایا تھا آپ نے۔''

''ہم کچھ دوست یہاں پکنک منانے آئے تھے۔''

''آپ وہاں کب تک رکیں گے؟''

''دو تین دن لگ سکتے ہیں لوکیشن ڈھونڈنے میں۔''

اشرف نے یہ جواب صرف بات ختم کرنے کے لیے دیا تھا ورنہ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے کیا کرنا ہے اور گاؤں میں کتنے دن رکنا ہے۔ یہ سب سوچنے کی طرف اس کا دماغ مائل ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے تو بس حویلی چھوڑنے کی جلدی ہوگئی تھی۔ وہ شیریں سے دور ہوجانا چاہتا تھا جس کی شخصیت اس کے لیے بہت پراسرار بن چکی تھی۔

''صاحب!'' اللہ بخش بولا۔ ''جب تو آپ لوگ خیمہ لائے تھے۔ اب دو تین دن رکیں گے تو کہاں رہیں گے؟''

''بتایا تھا نا، ہماری گاڑی پنکچر ہوگئی ہے۔ سوچا تھا کہ اسی میں آرام کرلیا کریں گے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ گاؤں میں دکانیں تو ہوں گی۔''

''بس کھانے پینے کی دکانیں ہیں اور تو کچھ نہیں ملتا۔''

''دری چادر کی دکان نہیں ہے؟''

''نہیں صاحب! اس طرح کا سامان تو لوگ شہر سے منگواتے ہیں۔ دری چادر کی بات کیوں کی آپ نے؟''

''بس ایک دری ایک چادر ہوتی تو کسی درخت کے نیچے پڑ کر سو رہتا۔'' اشرف نے کہا۔ ''کیا تمہارے گھر میں کوئی دری چادر ہے؟..... وہ میں جاتے ہوئے واپس کر جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ صاحب؟..... ہم گاؤں والے تو مہمانوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ جتنے دن بھی رکیں، ہمارے گھر میں رہیے گا۔''

''ارے نہیں۔ تم لوگوں کو تکلیف ہوگی۔'' اشرف نے کہا حالانکہ وہ ان لوگوں سے کچھ اسی قسم کی توقع کر رہا تھا۔

''کوئی تکلیف نہیں ہوگی صاحب جی!'' اس مرتبہ کمال دین بول پڑا۔ ''ایک کمرا خالی کردیں گے آپ کے لیے۔''

''یہی تکلیف تو میں نہیں دینا چاہتا۔''

''بہت بڑا مکان نہیں ہے ہمارا لیکن بہت چھوٹا بھی نہیں ہے۔ ایک کمرا ایسا ہے کہ بس تھوڑا سا سامان ہے۔ وہ کہیں بھی رکھ دیا جائے گا۔ ایک دو بستروں کا بندوبست تو ہم رکھتے ہی ہیں۔ کبھی کبھار گاؤں سے کوئی جاننے والا آجاتا ہے تو ضرورت پڑتی ہے۔''

''اگر تم لوگوں کو تکلیف نہیں ہوگی تب تو یہ میرے لیے بہت اچھا رہے گا۔''

''کوئی تکلیف نہیں ہوگی صاحب!'' اللہ بخش بول پڑا۔

اس طرح اشرف اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس نے ان دونوں کو شہر میں ملازمت دینے کی بات اسی لیے کی تھی کہ گاؤں میں ان لوگوں کی وجہ سے کچھ سہولت حاصل ہوسکے۔

جیب میں پڑے موبائل کی آواز نے اشرف کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ کال کرنے والا ماجد تھا۔

''ہاں ماجے!'' اشرف نے ماؤتھ پیس میں تیزی سے کہا۔ ''خیریت ہے نا؟''

''خیریت کیوں نہیں ہوگی؟''

''وہ پراسرار عورت جو ہے وہاں۔''

''تجھے اب کیا کہوں۔ بار بار وہم کی بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ شیریں کے بارے میں تو خوامخواہ بدگمان ہوا ہے۔ میرے دماغ میں اب کچھ اور خیالات آئے ہیں۔''

''کیسے خیالات؟''

''تیری یہ بات صحیح ہوسکتی ہے کہ وہ دہکتی ہوئی آنکھیں کسی خرگوش کی شاید نہ ہوں۔''

''اب بھی شاید کی بات ہے۔'' اشرف کا منہ بنا۔

''دراصل کچھ اور خیالات آئے ہیں میرے ذہن میں۔''

''وہ کیا؟''

اب ماجد نے وہ سب کچھ کہنا شروع کیا جو دراصل شیریں کے خیالات تھے۔ اشرف تحمل سے سنتا رہا۔ اس کی خاموشی کی وجہ سے ماجد کو ایک بار ''ہیلو'' کہنا پڑا تھا۔

''میں سن رہا ہوں۔'' اشرف نے کہا تھا۔ ''بات جاری رکھ اپنی۔ رک مت۔''

ماجد نے باقی سب کچھ بھی کہہ ڈالا۔

''تو پھر؟'' ماجد کے خاموش ہونے پر اشرف بولا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ..... اچھا پہلے یہ بتا کہ ابھی کہاں ہے؟''

''میرے اندازے سے آدھا راستہ طے ہوگیا ہے۔''

''آپ کا اندازہ ٹھیک ہے صاحب جی!'' کمال دین بول پڑا۔

''تیرے اکیلے جانے سے میں فکرمند ہوگیا ہوں۔ واپس آجا۔ کچھ پیسے دے گا تو یہ سوزوکی والے تجھے واپس چھوڑ جائیں گے۔''

''فکرمند کیوں ہوگیا ہے؟''

''مسز حارث شاید تیرے پیچھے لگ گئی ہو۔''

''میں تو تیرے لیے پریشان ہوں۔ تو وہاں رہ گیا ہے۔ مسز حارث تو شاید تیرے ہی ساتھ ہے اور تو اس کا دیوانہ بھی بنا ہوا ہے۔ اسے اور آسانی سے موقع مل جائے گا۔''

''اب اسے میں تیرا وہم کہوں گا۔ تابوت کی ساری کہانی تجھے سنا چکا ہوں۔ رات کو بھی اس نے تیرے ساتھ بس شرارت کی تھی۔''

''یہ باتیں اس نے بے وقوف بنانے کے لیے کی ہوں گی۔ اب بات سمجھ میں آرہی ہے میرے۔ اسی نے تجھ سے کہا ہوگا کہ مجھے واپس بلا لے۔''

''میں یہ سب کچھ اپنے طور پر کہہ رہا ہوں۔''

''میں یقین نہیں کرسکتا اور اگر ایسا ہے بھی تو میں واپس نہیں آؤں گا۔ اگر شیریں مسز حارث نہیں ہے، کوئی اور ہے تو اب میں پہلے سے زیادہ محتاط رہوں گا۔ ریوالور ہے میرے پاس اور بھرا ہوا ہے۔ مجھے اچھے میزبان مل گئے ہیں۔'' اشرف جواب دیتے ہوئے کمال دین اور اللہ بخش کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا۔

''میزبان؟''

''ہاں۔'' اشرف نے جواب دینے کے بعد کمال دین اور اللہ بخش کے بارے میں بتایا۔

ماجد نے سب کچھ سن کر کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ واپس آجا۔''

''بہتر تو یہ ہوگا کہ تو گاؤں آنے کی کوشش کر کسی طرح۔ شاید کوئی اور گاڑی مل جائے اور لفٹ دے دے۔ جان بچا کر نکل وہاں سے۔'' پھر مزید کہا۔

''میں شیریں کے بارے میں کوئی غلط بات اب سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''تو ٹھیک ہے..... کچھ اور کہنا ہے تجھے؟''

''نہیں، بس یہی چاہتا ہوں کہ کسی طرح واپس آجا۔''

''میں نہیں آؤں گا۔'' اس مرتبہ اشرف نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

''کس کی جان خطرے میں ہے صاحب جی؟'' کمال دین بولا۔

''شہر میں ایک دوست ہے میرا۔'' اشرف نے بات بتائی۔ ''وہی پھنس گیا ہے ایک معاملے میں جو میرا خیال ہے کہ خطرناک ہے۔''

''کسی شیریں نام کی لڑکی کا چکر ہے؟''

''ہاں، لیکن وہ دوسری شیریں ہے۔'' اشرف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''شیریں تو اس لڑکی کا نام بھی ہے جو حویلی میں ہمارے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ کبھی نام سنا ہے اس کا؟''

''نہیں صاحب!'' اللہ بخش نے کہا۔ ''نام تو یہ بہت ہوتا ہے لیکن ہمارا کبھی کسی شیریں سے سابقہ نہیں پڑا۔''

''حویلی کے مالک کو جانتے ہو؟''

''وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں صاحب! ہمیں تو بہت دکھ ہوا تھا یہاں سے ان کے جانے کا۔''

''ان کی ایک بھتیجی بھی ہے۔''

''اس کا ہمیں پتا نہیں۔ کیا حویلی میں وہی ہے آپ کے ساتھ ہے؟''

''ہاں۔ وہ پہلے بھی آتی رہتی ہے اس حویلی میں۔''

''ہم نے کبھی نہیں دیکھا صاحب!''

اب اشرف کا ذہن ایک اور راستے پر چل پڑا۔ شیریں اس حویلی کے مالک کی بھتیجی نہیں تھی اور شیخو بابا اس سے ملا ہوا تھا۔ اس نے شیریں کو ''بٹیا رانی'' کہا تھا جس کا یہ مطلب غالباً نہیں تھا کہ وہ اس حویلی کے مالک کی بھتیجی تھی۔ یہ ان دونوں میں پہلے ہی سے طے ہو چکا ہوگا۔

اشرف کا ذہن شیریں ہی کو مسز حارث سمجھنے پر تل گیا تھا جبکہ ماجد کے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اپنے انہی خیالات کی وجہ سے وہ ماجد کے لیے فکرمند بھی تھا۔

کچھ دیر بعد اشرف کو سکوت گراں گزرا تو وہ بولا۔ ''آپ لوگوں کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟''

''بس تین۔'' اللہ بخش نے جواب دیا۔

''ایک تمہاری بیوی ہوگی۔''

''ارے نہیں صاحب!'' اللہ بخش نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ تو دو سال ہوئے سدھار چکی ہے دنیا سے۔''

''یہ سن کر افسوس ہوا اللہ بخش۔''

''اللہ کی امانت تھی صاحب! لے لی اس نے واپس۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''ہمارے ساتھ بس میری چھوٹی بیٹی ہے۔ کمال دین کی چھوٹی بہن۔ ماشاء اللہ گیارہ سال کی ہوئی ہے اب۔ نام تو رضیہ ہے لیکن سارے گاؤں میں راجی کہلاتی ہے۔ بڑا اچھا مزاج ہے صاحب اس کا۔ کوئی مہمان آئے تو بہت خوش ہوتی ہے۔ کھانا بھی پکا لیتی ہے اتنی کم عمری میں۔''

''کھانے کے سلسلے میں تو کوئی فکر نہیں ہے مجھے۔ خشک غذا کے بند ڈبے کافی ہیں میرے بیگ میں۔ پانی کی بوتلیں بھی ہیں۔''

''کیا ضرورت ہے صاحب جی ڈبوں کا کھانا کھانے کی۔'' جمال دین بول پڑا۔ ''راجی تین آدمیوں کا کھانا تو پکاتی ہی ہے۔ اس میں ایک آدمی بڑھ جائے گا تو اس سے کیا

فرق پڑے گا۔''

''اگر تم لوگ اتنی ہی اچھی میزبانی کرنے کے خواہش مند ہو تو پھر میں چپ ہوا جاتا ہوں۔''

''ہاں صاحب! اس معاملے میں اور کچھ نہ کہیں۔ یہ تو ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی کہ کوئی ہمارے گھر میں مہمان ہو اور کھانا کھائے بنا ڈبوں کا۔''

اشرف ہنس کر چپ ہو گیا لیکن اس کی ہنسی میں کوئی جان نہیں تھی۔ حویلی سے نکلنے کے بعد سے وہ اب تک ماجد کے لیے فکر مند ہی رہا تھا بلکہ اب تو اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا تھا۔ کسی بھی طرح ماجد کو بھی اپنے ساتھ لے آتا تو اچھا تھا۔ تھوڑی سی زبردستی کرنی پڑتی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ماجد پر اس کا اتنا حق تو ہے۔ بہت پرانے دوست تھے دونوں۔ بھلا برا وقت دونوں نے ساتھ ہی گزارا تھا۔

گاڑی کی رفتار کم ہونے کی وجہ سے گاؤں اس وقت پہنچا جا سکا جب رات ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ ایک اجنبی کو کمال دین اور اللہ بخش کی گاڑی میں دیکھ کر گاؤں کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

گاڑی ایک ایسے گھر کے سامنے رکی جو اس گاؤں میں سبھی گھروں سے اچھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی ایک لڑکی دوڑتی ہوئی قریب آئی۔ اشرف کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔

''شہر سے آئے ہیں۔'' کمال دین نے اسے بتایا۔

''ہمارے مہمان رہیں گے۔ سلام کرانہیں۔'' لڑکی نے سلام کیا۔ اشرف سمجھ گیا کہ وہ کمال دین کی چھوٹی بہن راجی تھی۔

''تو کھاد دے کر آ۔'' اللہ بخش نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ''میں مہمان کا کمرا ٹھیک کرتا ہوں۔''

''کھاد بعد میں دے آؤں گا۔ دیر تو ہو ہی گئی ہے۔ پہلے تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں کمرا ٹھیک کرنے میں۔''

''وہ ایسا کون سا کام ہے۔ ہو جائے گا۔ راجی جو ہے، چوبرجی کی طرف جو کمرا ہے، اس میں سامان ہی کتنا ہے۔''

''اس کمرے کی صفائی تو میں ہی کر دوں گی بابا!'' راجی بولی۔

''تو جا.....'' اللہ بخش نے کمال دین سے پھر کہا۔

اشرف اپنے بیگ اٹھا کر گاڑی سے اتر آیا تھا۔ جمال دین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''لاؤ صاحب! ایک بیگ مجھے دے دو۔'' اللہ بخش نے ہاتھ بڑھایا۔

''کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔''

اشرف نے کہا لیکن اللہ بخش نے ایک بیگ اس سے لے ہی لیا۔

وہ مکان میں داخل ہوئے جس کی دیواریں سرخ مٹی کی اینٹوں کی تھیں۔ وہ بس وقت گزارے لائق مکان تھا۔

اللہ بخش نے جس کمرے کی صفائی کی، وہ آٹھ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا کمرا تھا۔ اس میں ایک کھڑکی بھی تھی جس کے پاٹوں کی لکڑی سانخوردہ تھی۔ اس کی صفائی میں راجی نے اپنے باپ سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اشرف نے بھی اس کا ہاتھ بٹانا چاہا لیکن راجی نے اسے روک دیا۔

''نہیں چاچا! ہم مہمانوں کو کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ کیوں بابا؟'' اس نے اللہ بخش کی طرف بھی دیکھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے صاحب!'' اللہ بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر یہاں کام بھی کتنا ہے۔ پندرہ منٹ میں یہ سامان اٹھا کر دوسری جگہ پہنچا دیا جائے گا۔ صفائی کرنے میں بھی راجی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائے گی۔ اس کے بعد بس ایک پلنگ لا کر یہاں ڈالنا ہے اور اس پر بستر بچھا دینا ہے۔''

''یہ سب تو یوں ہو جائے گا..... یوں.....'' راجی نے چٹکی بجانے کی کوشش کی جو بجی نہیں۔

''راجی بہت تیز ہے صاحب!.....'' اللہ بخش نے کہا۔ ''آپ ابھی تو آئے ہو۔ چند گھنٹے گزر جائیں پھر یہ تم سے بے تکلف بھی ہو جائے گی۔''

اشرف خفیف سا مسکرا دیا۔ وہ راجی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ پہلی بار یہاں آیا تھا تو اس نے راجی کو بھی دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی، دماغ پر خاصا زور دینے سے اسے یاد آ گیا کہ اس نے راجی کو چنبیلی کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنبیلی وہ لڑکی تھی جسے اشرف نے پسند کیا تھا۔ اگر حالات نارمل ہوتے تو یہ یاد آ جانے پر اشرف کو بہت خوشی ہوتی۔ راجی اسے چنبیلی کے بارے میں ساری تفصیل بتا سکتی تھی۔

''بابا!'' اشرف بولا۔ ''ابھی گھر میں آنے سے پہلے تم نے کسی چوبرجی کا ذکر کیا تھا۔''

''ہاں بابو صاحب! بہت پرانی چوبرجی ہے۔ کھڑکی کھولو نظر آ جائے گی۔ پتا نہیں کب بنی ہوگی یہ۔ اب تو بس کھنڈر لگتی ہے۔ دن میں گاؤں کے بچے کبھی کبھی وہاں کھیلنے چلے جاتے ہیں۔''

اشرف نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ وہ چوبرجی واقعی تقریباً کھنڈر بن چکی تھی۔ ایک میل دور تو ہوگی۔ وہ کھڑکی سے صاف اس لیے نظر آ گئی کہ گاؤں کے دوسرے گھر اس طرف

نہیں تھے۔ گاؤں کے بالکل کنارے پر تھا اللہ بخش کا مکان! جلد ہی وہ کمرا بالکل ٹھیک ہوگیا۔ چارپائی لاکر اس پر بستر بھی لگا دیا گیا۔

''اب آپ آرام کرو صاحب!'' اللہ بخش نے کہا۔ ''کمال دین آجائے تو ہم چاروں یہیں کھانا کھائیں گے۔''

''یہاں کوئی پولیس چوکی بھی تو ہے، کسی سے سنا تھا میں نے!''

''کچھ ہی دن پہلے بنی ہے یہ چوکی۔ پہلے تو یہاں کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا کہ پولیس ہو۔ اب تو شاید وہ اس لیے بنائی گئی ہے کہ پچھلے دنوں شہر سے آنے والی سڑک پر کئی قتل ہو چکے ہیں۔ پولیس والوں ہی سے سنا تھا کہ قاتل کوئی پاگل عورت ہے۔''

''آج یہاں دو پولیس آفیسر بھی آئے ہوں گے۔'' اشرف نے کہا۔ ''وہ حویلی میں ملے تھے ہمیں۔''

''مجھے ابھی تو نہیں معلوم صاحب!..... ابھی آپ کے ساتھ ہی تو آیا ہوں گاؤں۔''

''پولیس چوکی کس طرف ہے؟''

''گاؤں سے دور نہیں ہے۔ دس منٹ کا فاصلہ بھی نہیں۔ کیوں بابو صاحب؟''

''حویلی میں ملاقات ہوئی تھی نا ان پولیس والوں سے۔'' اشرف نے کہا۔ ''اگر وہ واپس لوٹتے تو ہمیں ان کی گاڑی نظر آجاتی۔ یوں ہی ان سے ملنے چلا جاؤں گا ٹہلتا ہوا۔''

''کھانے کے بعد چلے جانا۔ راجی پہنچا دے گی تمہیں چوکی تک۔''

''ہاں اور کیا۔'' راجی بولی۔ ''میں تو ہر طرف گھومتی پھرتی ہوں۔'' اشرف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب تم آرام کرلو کچھ دیر۔'' اللہ بخش نے دوبارہ کہا اور راجی کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔

اشرف کو پولیس افسر سے ملنے کی خواہش یوں تھی کہ اس سے کچھ معلومات حاصل ہو جاتیں جس کے لیے وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے مصور کو ساتھ لایا تھا۔ اس کی کار واپس جاتی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی کسی وجہ سے اس کا کام نہیں ہو سکا تھا۔

کھانے کے بعد اشرف نے کہا۔ ''ذرا دیر آرام کر کے جاؤں گا میں پولیس چوکی۔''

''کتنی دیر میں جاؤ گے چاچا؟'' راجی نے پوچھا۔

کھانے کے دوران میں بھی وہ خوب بولتی رہی تھی، شہر کے بارے میں پوچھتی رہی تھی کہ وہاں کیسا لگتا ہے۔ اس نے باپ کی موجودگی ہی میں اس کی شکایت بھی کی تھی کہ وہ اسے کبھی شہر نہیں لے گیا۔

''میری بیٹی کو شہر کی ہوا نہیں لگنا چاہیے۔'' اللہ بخش نے کہا۔

''لیکن کیوں بابا؟'' اللہ بخش یہ سوال ٹال گیا۔ کھانے کے آدھے گھنٹے بعد راجی آگئی۔

''چلیں چاچا!'' اس نے پوچھا۔

اشرف فوراً تیار ہوگیا۔ اللہ بخش مسکراتے ہوئے انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ کمال دین اس وقت گھر پر نہیں تھا۔

''راجی!'' اشرف نے پولیس چوکی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔''

''کیسے چاچا؟'' راجی کو حیرت ہوئی تھی۔

''کئی سال ہوگئے جب ہم کچھ دوستوں کے ساتھ یہاں گھومنے آئے تھے۔ تم زیادہ نہیں بدلی ہو۔ میں پہچان گیا تھا تمہیں۔ میں نے تمہیں کئی بار کچھ لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام اس لیے یاد رہ گیا ہے کہ ایسے نام ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔ اب تو وہ جوان ہوگی۔ شاید شادی ہو چکی ہوگی۔ چنبیلی نام ہے اس کا۔''

''چنبیلی دیدی۔'' راجی چہکی۔ ''میں تو ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔ وہ بھی چاہتی ہیں مجھے۔ شادی بھی ہو جاتی ان کی لیکن..... بس.....'' راجی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح آہ بھری۔

اشرف کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چنبیلی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

''کیوں؟'' اشرف مسکرایا۔ ''تم نے آہ کیوں بھری؟''

راجی کی باتوں نے اشرف کا تفکر خاصی حد تک کم کر دیا تھا۔

''وہ چاچو۔'' راجی نے افسردگی سے کہا۔ ''بہت دن ہوئے، ان کے بابا مر گئے تھے۔''

''ارے! یہ تو افسوس کی بات ہے۔'' اشرف نے کہا۔ ''چنبیلی اکیلی رہ گئی لیکن ماں تو ہوگی اس کی۔''

''ایک بڑا بھائی بھی ہے۔ اس کی شادی ہوگئی تھی۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے۔ بہت تنگ کرتی ہے چنبیلی دیدی کو۔''

''دیدی!'' اشرف چونکا۔ ''یہ لفظ تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟''

''ٹی وی ہے ہمارے گھر میں۔ اس پر کھیل تماشے آتے ہیں نا!..... اس میں بڑی بہن کو دیدی کہتے ہیں۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں تو انہیں چنبیلی دیدی ہی کہتی ہوں۔''

اشرف سمجھ گیا کہ راجی بھارتی ڈرامے بہت دیکھتی ہوگی۔

''چنبیلی کے ساتھ کیا زیادتی ہوتی ہے؟'' اشرف کو کچھ بے چینی ہوئی۔

''ان کی بھابی ان سے گھر کا کام بھی کرواتی ہے اور کھیتوں میں کام کرنے بھی بھیج دیتی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات نہیں۔ چنبیلی کا بھائی کیا کرتا ہے؟''

''اس کی بیوی اسے گھر میں بٹھائے رکھتی ہے۔ کھیتوں پر کم کم جانے دیتی ہے۔''

''اسے برا نہیں لگتا بہن کا کھیتوں میں کام کرنا؟''

''اسے تو اس کی بیوی نے اپنے پلو سے باندھ رکھا ہے چاچا!''

اشرف پھر بے ساختہ مسکرا دیا۔ راجی کا بڑھیوں کی طرح بات کرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔

''وہ ہے چنبیلی دیدی کا گھر۔'' راجی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اشرف نے غور سے گھر کی طرف دیکھا، پھر پوچھا۔

''ان لوگوں کے کھیت کہاں ہیں؟''

''وہ بھی دکھا دوں گی تمہیں اگر کل بھی دھوپ نکلی رہی، بارش نہیں ہوئی۔ تم پہچان لوگے چنبیلی دیدی کو؟''

''میرا خیال ہے، میں تو پہچان لوں گا۔ وہ شاید مجھے نہ پہچان سکے۔''

''میں بتا دوں گی انہیں کہ تم پہلے بھی یہاں آئے تھے اور انہیں دیکھا تھا۔''

''کل چلیں گے کھیتوں کی طرف بھی۔'' اشرف نے بظاہر سرسری انداز میں کہا۔

''ہاں ہاں۔ چلنا، کھانا پکا لوں گی تو لے چلوں گی۔ لو وہ چوکی آ گئی۔''

''بہت قریب ہے۔''

''ہاں تو اور کیا؟''

پھر اشرف نے وہاں وہ کار بھی کھڑی دیکھ لی جس میں پولیس افسر حویلی آیا تھا۔

''تمہیں راستہ یاد رہے گا..... میں اب جاؤں؟''

''ہاں تم جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

راجی کے جانے کے بعد اشرف پولیس چوکی میں داخل ہوا۔ وہاں دو کمرے تھے۔ ایک کمرا نو وارد پولیس آفیسر کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ چونکے۔

''نکل آئے آپ ادھر؟'' پولیس افسر نے کہا۔

''ہاں، لفٹ مل گئی تھی۔ کھاد لے کر آ رہی تھی ایک سوزوکی شہر سے۔''

''اچھا وہ..... اللہ بخش کی؟''

''جانتے ہیں آپ اسے؟''

''اس کیس کی تفتیش کی وجہ سے آ چکا ہوں نا یہاں پہلے بھی۔ گاؤں کے کافی لوگوں کو جان گیا ہوں۔ آپ اکیلے آئے ہیں؟''

''ہاں۔ ماجد اس موسم میں ادھر کے سفر کا چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔''

''آپ ٹھہرے کہاں ہوں گے؟''

''میں نے تو کچھ اور سوچا تھا لیکن اللہ بخش نے اپنے گھر میں ٹھہرا لیا ہے۔''

''اچھے لوگ زیادہ ہیں اس گاؤں میں۔''

''میں آپ سے یہ پوچھنے کے لیے چلا آیا کہ آپ کا وہ کام ہو گیا؟ شاید نہیں ہوا ہوگا ورنہ آپ یہاں سے جا چکے ہوتے۔''

''ٹھیک سمجھا آپ نے۔'' پولیس افسر نے جواب دیا۔ ''جس آدمی سے ملنا تھا، اسے بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر سکتا۔''

''تو آپ کے کام میں تاخیر ہو جائے گی؟''

''یقینی بات ہے۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''اگر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میں اسے شہر لے جاؤں گا۔ وہاں اس کا بہتر علاج ہو جائے گا۔ یہاں تو ایک حکیم علاج کر رہا ہے اس کا۔ وہ کہہ تو رہا ہے کہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن میں اس کی زندگی کے بارے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''صحیح سوچ رہے ہیں آپ..... ایک ہی تو ایسا آدمی ملا ہے جو اس قاتل عورت کو دیکھ چکا ہے۔''

''جی ہاں۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''میں فون پر اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بھی اطلاع دے چکا ہوں کہ میری واپسی میں تاخیر کا امکان ہے۔''

''میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔''

اسی قسم کی دو چار باتیں کر کے اشرف پولیس چوکی سے نکل آیا اور اللہ بخش کے گھر پہنچا۔ راجی سو چکی تھی۔ کمال دین نے بتایا کہ صبح وہ فجر کے وقت اٹھ جاتی ہے اس لیے سوتی بھی جلدی ہے۔ اس کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ دن میں بھی اگر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائے تو اسے نیند آ جاتی

ہے۔

''چلتے پھرتے تو نہیں سوجاتی؟'' اشرف مسکرایا۔

''نہیں صاحب جی! اتنا بھی نہیں۔''

''کل دن میں اگر بارش نہیں ہوئی تو میں گاؤں گھوموں گا۔ اپنی فلم کے لیے لوکیشن ڈھونڈنا ہے مجھے۔ راجی مجھے یہاں کی ہر چیز کے بارے میں بتا سکتی ہے۔ اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

''مجھے تو کچھ نہیں صاحب جی! بس بابا سے اور پوچھ لیں۔''

''ابھی میں پولیس چوکی گیا تھا تو بابا نے خود ہی راجی کو میرے ساتھ بھیج دیا تھا۔''

''کل بھی بھیج دیں گے لیکن بڑے ہیں نا وہ گھر کے۔ انہیں بتانا تو چاہیے۔'' کمال دین کی بات معقول تھی۔

دوسری صبح اشرف کے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اشرف نے اللہ بخش سے راجی کے بارے میں بات کی جو وہ کمال دین سے کر چکا تھا۔ توقع کے مطابق اللہ بخش کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ راجی اس کے لیے پہلے ہی تیار تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکلے۔

''دن تو بڑا اچھا ہے چاچا!'' راجی بولی۔

''تم مجھے گاؤں کی ہر جگہ کے بارے میں بتاتی رہنا۔ مجھے اپنی فلم کے لیے کوئی جگہ بھی دیکھنی ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' راجی خوش ہو کر بولی۔ ''بابا نے بتایا تھا مجھے۔ کیسی جگہ بناؤ گے فلم؟''

''ابھی تو ہر طرف گھوم پھر کر دیکھوں گا۔ اس کھنڈر بنی ہوئی چوبرجی کی طرف بھی جانا ہے کسی وقت۔''

گاؤں کے لوگ ادھر ادھر جاتے ہوئے ان دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ ان سبھی کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اللہ بخش کے گھر شہر سے کوئی مہمان آیا ہے۔

راجی بڑے شوق سے فلموں کی بات کر رہی تھی اور اپنا پسینا بھی پونچھتی جا رہی تھی۔ دھوپ بڑی تیز تھی۔ خود اشرف بھی رومال ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور اپنا چہرہ صاف کرتا رہا۔

''یہاں سے دیدی کا کھیت شروع ہو رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے راجی ایک پگڈنڈی پر چل پڑی۔ کھیت میں دور تک سناٹا نظر آ رہا تھا۔

اشرف نے دوربین آنکھوں سے لگا کر ہر طرف کا جائزہ لیا۔ وہ کافی فاصلے پر اسے نیلے کپڑوں میں ملبوس کھیت میں کام کرتی دکھائی دی، لیکن دوربین کے باوجود ابھی اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راجی نے بتا دیا تھا کہ کھیت میں کام کرنے چنبیلی ہی آتی ہے اس لیے اشرف نے سمجھ لیا تھا کہ وہ چنبیلی ہی ہوگی۔

پگڈنڈی سے ہٹ کر کھیت میں قدم رکھتے ہوئے اشرف کے جوتوں میں کیچڑ لگنے لگی۔ کھیت میں کئی جگہ درخت بھی تھے اور زیادہ تر امرود کے تھے۔

''میں امرود بہت کھاتی ہوں۔'' راجی نے بتایا۔

''پتھر مار کے توڑتی ہوگی امرود۔''

''نہیں، میں تو پیڑ پر چڑھ جاتی ہوں۔''

''اچھا!''

باتیں کرتے ہوئے اشرف ذہنی طور پر راجی کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی ساری حسیات چنبیلی کی طرف سمٹی ہوئی تھیں۔

اب درمیانی فاصلہ بھی کم رہ گیا تھا۔ دوربین کے بغیر بھی چنبیلی نظر آنے لگی تھی۔ وہ خود بھی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ متوجہ ہونے کا سبب اشرف ہی ہو سکتا تھا۔

''دیکھو دیدی! ہمارے گھر مہمان آئے ہیں۔'' راجی قریب جا کر بولی۔

چنبیلی غور سے اشرف کی طرف دیکھنے لگی۔ اشرف بھی اسی کی طرف متوجہ تھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

چنبیلی جب چھوٹی تھی، تبھی اشرف کو اچھی لگی تھی۔ اب تو وہ بھرپور جوان ہو گئی تھی۔ رنگ بھی نکھر آیا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی گندی جگہ پر کنول کھل گیا ہو۔ بال کسی قدر الجھے ہوئے تھے۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ ہاتھوں میں تو اچھی خاصی مٹی لگی ہوئی تھی اور چہرے پر بھی مٹی کے داغ تھے۔

راجی اسے بتانے لگی کہ اشرف وہاں فلم بنانے کے لیے کوئی جگہ دیکھنے آیا ہے۔ چنبیلی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ راجی کی باتیں سن ہی نہیں رہی ہو۔ وہ بولی۔

''راجی!..... آج گھر سے چلی تھی تو کچھ پکا ہوا نہیں تھا۔ یوں ہی آ گئی تھی۔ اب زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ امرود توڑ کر لا دے۔''

''اچھا، تم چاچا سے باتیں کرو۔'' راجی نے کہا اور ایک طرف دوڑ گئی۔

''میں تمہیں جانتی ہوں بابو!'' چنبیلی نے اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

Digitized by Google

''کیسے؟'' اشرف کو تعجب ہوا۔
''تم پہلے بھی اس گاؤں میں آچکے ہو نا؟''
''یاد ہے تمہیں؟ چھوٹی تھیں تم اس وقت۔''
''ایسی بچی بھی نہیں تھی۔ میں بھولی نہیں ہوں۔ جب میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی تو تم بس مجھے ہی دیکھا کرتے تھے۔''
''تو تمہیں یاد ہے۔'' اشرف مسکرایا۔ ''تم مجھے اچھی لگتی تھیں۔''
''اب کیسی ہوں؟'' اس نے نظریں جھکالیں۔
''پہلے سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔''
''جب تو میں نے کچھ نہیں سوچا تھا لیکن تم مجھے یاد رہے۔ جب بڑی ہوئی تو میں سوچنے لگی، میں تمہیں بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ اگر میں اس وقت جوان ہوتی تو..... تو.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
''تو؟'' اشرف نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔
''سچ بتانا بابو!'' وہ بولی۔ ''تم یہاں اپنے کام سے آئے ہو یا تمہارا جی چاہا تھا مجھے دیکھنے کو؟''
''دونوں ہی باتیں ہیں چنبیلی! کام سے بھی آیا ہوں اور تمہیں دیکھنا بھی چاہتا تھا۔''
''میں بڑی تکلیف میں جی رہی ہوں بابو!'' چنبیلی کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگانے لگے۔
اشرف نے اسے شروع ہی سے اداس دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ تڑپ گیا۔ ''تمہیں کیا تکلیف ہے چنبیلی؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔
''باپ کے مرنے کے بعد مجھے چین نہیں ملا۔ میرا بھائی اور اس کی بیوی.....''
''یہ سب معلوم ہے مجھے۔'' اشرف نے اس کی بات کاٹی۔ ''راجی مجھے تمہارے گھر کی ساری باتیں بتا چکی ہے۔''
چنبیلی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مسجد کے مولوی صاحب کہتے ہیں، خود ہی اپنے آپ کو مار ڈالنا اللہ میاں کو پسند نہیں۔ بس اسی لیے میں زندہ ہوں ورنہ کسی کنوئیں میں ڈوب مرتی۔''
''اچھا ہوا۔'' اشرف نے کہا۔ ''اگر تم ایسا کر گزرتیں اور یہاں آکر مجھے یہ بات معلوم ہوتی تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔''
''مجھے اس دوزخ سے نکال کر لے جاؤ بابو!'' اس کے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''میں تمہاری نوکرانی بن کر زندگی گزار لوں گی۔''
ان باتوں نے اشرف کو جذباتی کر دیا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھ کر چنبیلی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا لیکن اسے راجی کی موجودگی کا خیال تھا۔ وہ نظر تو اس لیے نہیں آرہی تھی کہ کسی درخت پر چڑھ گئی ہوگی لیکن وہ انہیں دیکھ سکتی تھی۔
''نوکرانی کیوں؟'' وہ بولا۔ ''میں تمہیں اپنی رانی بنا کر رکھ سکتا ہوں۔'' اشرف نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ راجی دوڑی چلی آرہی تھی۔ چنبیلی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔
''میں اندازہ لگا چکا ہوں۔'' اشرف دھیمی آواز میں جلدی سے بولا۔ ''مجھ سے یہ باتیں کرنے ہی کے لیے تم نے اسے ٹالا تھا اور امرود لینے بھیج دیا تھا لیکن بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب میں اسے ٹالوں گا۔'' وہ راجی کی طرف دیکھنے لگا۔
راجی قریب آگئی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تین امرود سنبھالے ہوئے تھی۔ اگر وہ دوپٹا اوڑھتی تو اس میں باندھ کر زیادہ لے آتی۔
''ارے!'' اشرف بولا۔ ''بس تین ہی امرود لائی ہو، ایک تو میں ہی کھا جاؤں گا۔''
''میرے لیے دو بہت ہیں۔'' چنبیلی اشرف کا مقصد نہیں سمجھی تھی۔
''گھر بھی تو لے جانا ہے۔'' اشرف نے کہا۔ ''میں تو کھانے کے بعد دو ایک امرود کھاتا ہوں۔ ہاضم ہوتا ہے۔''
''زیادہ توڑ لا۔'' چنبیلی نے اس کی طرف ایک کپڑا بڑھایا جو وہ نہ جانے کس مقصد سے لائی ہوگی۔
''بہت سے لے آتی ہوں۔'' راجی نے کپڑا لیا اور دوڑ گئی۔
''یہ کپڑا کیوں لے آئی تھیں؟'' اشرف بولا۔
''میں بھی امرود توڑ کر لے جاتی۔ کبھی گھر پر بھی کھانا نہیں ملتا۔''
''اف خدایا! اتنی اذیت میں زندگی گزار رہی ہو تم؟''
''اسی لیے تو اس دوزخ سے نکل جانا چاہتی ہوں۔''
''میں تمہیں یہاں سے نکال تو لے جاؤں مگر.....'' اشرف رک کر بولا۔ ''اس میں ایک گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ تمہارا بھائی تو اغوا کی رپورٹ کرائے گا۔ اس کا حل ایک ہی ہے، اگر تم چاہو۔''
چنبیلی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟''

چنبیلی کی نظریں جھک گئیں۔ ''یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی۔ میں تو تمہارے پاؤں کی جوتی بننے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''تو پھر تمہارا بھائی کچھ نہیں کر سکے گا۔ تم بالغ ہو۔ بس گاؤں والے نہ جانے کیا باتیں بنائیں۔''

''کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا۔ سب جانتے ہیں کہ میری زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ مجھے کسی طرح اس دوزخ سے چھٹکارا مل جائے۔ کوئی بھی میرے بھائی کو پسند نہیں کرتا۔''

''تو میں سوچتا ہوں کہ کیا کیا جائے۔''

''مجھے جلدی سے نکال لے جاؤ بابو!'' چنبیلی گڑگڑائی۔

''تم اندازہ نہیں لگا سکتیں چنبیلی کہ میرے جذبات اب کیا ہیں۔ میں یہاں تم کو صرف دیکھنا ہی چاہتا تھا لیکن اب تمہارے حالات جان کر، تم سے باتیں کر کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے لیے ہی بنی ہو اور میں تمہارے لیے۔ میرے دل میں تمہاری محبت بھڑکنے لگی ہے چنبیلی!''

''تو پھر سوچنے کی بات کیوں کی؟''

''میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔'' اشرف نے جواب دیا اور گاڑی نہ ہونے کا سبب بھی بتایا۔

''ایک طرح سے ہو سکتا ہے۔ تم موٹر سائیکل تو چلا سکتے ہو نا؟''

''موٹر سائیکل کہاں سے آئے گی؟''

''میں شاید اس کا بندوبست کر لوں۔''

''کیسے؟''

''باپ کی زندگی میں طے پا گیا تھا کہ میری شادی گاؤں کے ایک نوجوان دین محمد سے ہو جائے گی لیکن شادی سے پہلے ہی باپ دنیا سے چلے گئے۔ میرے بھائی نے اس شادی سے انکار کر دیا۔ اس کا افسوس دین محمد کو بھی ہوا تھا۔ وہ اس بات سے خوش تھا کہ اس کی شادی مجھ سے ہو جائے گی۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ اب تو اس کی شادی بھی اس کی چچا کی بیٹی سے طے ہو گئی ہے لیکن مجھے وہ اب بھی پسند کرتا ہے۔ میرا ہمدرد بھی ہے۔ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے، میں اس سے کہوں گی تو دے دے گا وہ..... بعد میں اسے واپس کر دیں گے۔''

''گاؤں کے لوگوں کے پاس موٹر سائیکل ہے؟''

''کئی کے پاس ہے۔ وہ شہر جاتے آتے ہیں۔ وہاں نوکری کر رکھی ہے ان لوگوں نے۔''

''تو تم دین محمد کے ساتھ گاؤں سے کیوں نہیں چلی گئیں۔''

''وہ اپنے ماں باپ کی ناراضگی نہیں چاہتا۔''

''تو وہ یہ گوارا کر لے گا کہ تم اس کی موٹر سائیکل پر میرے ساتھ نکل جاؤ؟''

''میری خاطر وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس کی خواہش بھی ہے کہ مجھے اس گاؤں سے چھٹکارا مل جائے۔''

''اسے جلن نہیں ہوگی کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی؟''

''ایسا شاید نہیں ہوگا۔''

''اگر تمہیں اس کا یقین ہے تو اس سے بات کر کے دیکھو۔''

''یقین تو نہیں پر امید تو ہے۔ میں کچھ اور بھی سوچوں گی کوئی تدبیر۔''

''کب بتاؤ گی؟''

اس وقت ان دونوں ہی نے راجی کو آتے دیکھا۔

''کھیت کے علاوہ بھی کہیں مل سکتی ہو مجھ سے؟'' اشرف نے جلدی سے پوچھا۔ ''اندھیرا ہونے کے بعد گھر سے نکل سکتی ہو؟''

''دس بجے تک سارا گاؤں ہی سو جاتا ہے۔ مجھے چپکے سے نکلنا پڑے گا۔''

''تو آج رات کو چوبرجی کے کھنڈر میں آنا۔ میں انتظار کروں گا۔''

راجی قریب آ گئی تھی اس لیے، چنبیلی جواب نہیں دے سکی۔

''لو چاچا۔'' راجی نے کپڑے کی چھوٹی سی گٹھری زمین پر رکھی۔

''یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔'' اشرف نے کہا اور اپنی بات کا جواب لینے کے لیے سوالیہ نظروں سے چنبیلی کی طرف دیکھا۔

چنبیلی نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب دیر ہو گئی چاچا!'' راجی بولی۔

''ہاں، اب چلنا چاہیے۔''

جاتے جاتے بھی اشرف نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے چنبیلی کی طرف دیکھا۔ اس بار بھی چنبیلی نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

واپسی پر اشرف خوش بھی تھا اور فکرمند بھی۔ اس کے

خیال میں چنبیلی کو یہاں سے نکال لے جانا شاید آسان نہ تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ دین محمد کے معاملے میں چنبیلی کو خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

جب وہ اور راجی گھر پہنچے تو کمال دین سے سامنا ہوا۔

''وہ پولیس آفیسر آیا تھا صاحب جی!'' وہ بولا۔ ''تم کل جس سے ملنے گئے تھے۔ تمہارا دوست ہے کیا؟''

''ہاں، کچھ کہہ رہا تھا کیا؟''

''تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تم اپنی فلم کے کام کے لیے گاؤں گھومنے نکلے ہو۔ وہ کچھ پریشان سا لگا۔ بہت جلدی میں لگ رہا تھا۔ اس نے کہا، ڈھونڈنے میں تو دیر لگ سکتی ہے اور اسے فوراً کہیں پہنچنا ہے۔ تمہارے لیے بس یہ پیغام دے گیا ہے کہ جلد از جلد حویلی واپس لوٹو۔''

اشرف سر ہلا کر سوچتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں چاچا!'' اس نے اپنے عقب میں راجی کی آواز سنی تھی۔

اشرف بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ میں یہ سوال تھا کہ اسے جلد از جلد حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا گیا تھا اور وہ اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟ رات ہی تو اس نے کہا تھا کہ اسے جس سے ملنا ہے، وہ سرسامی کیفیت میں مبتلا ہے لہٰذا اس سے وہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا جو لیا جانا تھا۔

اشرف نے سوچا، کیا اسے کوئی زیادہ اہم اطلاع مل گئی تھی جس کے سبب وہ اچانک واپس چلا گیا؟

اشرف کے لیے یہ پیغام بھی عجیب تھا کہ وہ جلد از جلد حویلی پہنچے۔ آخر کیوں؟ کیا اسے اچانک معلوم ہونے والی بات سے خیال آیا تھا کہ وہاں ماجد کی زندگی خطرے میں ہے؟

ماجد کے لیے خطرہ صرف شیریں ہی بن سکتی تھی۔ اشرف کے دماغ میں بسا ہوا یہ خیال ختم نہیں ہوا تھا۔

اگر وہ کمال دین سے کہتا کہ وہ اپنی سوزوکی میں حویلی چھوڑ آئے تو وہ شاید انکار نہیں کرتا لیکن اشرف نے اس انداز میں سوچا کہ کم رفتار سے چلنے والی کمال دین کی گاڑی اسے جلدی حویلی نہیں پہنچا سکتی تھی۔ پولیس آفیسر اس سے پہلے پہنچ چکا ہوتا۔ اگر ماجد کے لیے کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا ہونے کا امکان تھا تو پولیس افسر اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی صورتِ حال سنبھال چکا ہوتا۔

''میرے جانے سے کیا فرق پڑے گا؟'' اشرف زیرِ لب بڑبڑایا۔

فوری طور پر حویلی جانے کا ارادہ کرنا اشرف کے لیے یوں بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ رات کو اسے چنبیلی سے ملنا تھا۔ وہ یہ موقع کسی قیمت پر گنوا نہیں سکتا تھا۔ وہ یہاں صرف چنبیلی کو دیکھنے آیا تھا لیکن یہ جاننے کے بعد کہ چنبیلی وہاں اذیت میں زندگی گزار رہی ہے، وہ اس سے نہ صرف ہمدردی محسوس کرنے لگا تھا بلکہ اس کے دل میں محبت کی تڑپ بھی پیدا ہو گئی تھی۔

کچھ سوچ کر اس نے موبائل پر ماجد سے رابطہ کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ ماجد نے موبائل بند کر رکھا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اشرف کے دماغ میں سوال ابھرا۔ ''کیا اب اس نے شیریں کی بہت زیادہ قربت حاصل کر لی ہے اور نہیں چاہتا کہ اس وقت کوئی اسے ڈسٹرب کرے؟''

'اسے میرے فون کا خیال بھی ہو سکتا ہے۔' اشرف نے سوچا۔

اشرف کے ان خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب راجی اس کے لیے چائے لے کر آئی۔

☆☆☆

ماجد شیریں کی محبت سے سرشار تھا۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ ماجد چاہتا تھا کہ یہ سرشاری بڑھتی ہی رہے۔ اسی لیے اس نے اپنا موبائل بند کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈسٹرب ہو۔

''محبت کا جذبہ بھی عجیب ہی ہوتا ہے۔'' شیریں اس سے کہہ رہی تھی۔ ''انسان جذبات کے سمندر میں بہتا ہی رہتا ہے، دور نکل جاتا ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ وہ سمندر میں پوشیدہ کسی چٹان سے ٹکرا جائے گا، ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔''

ماجد نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تم کیا فلسفہ لے بیٹھیں؟''

''تم میرا اشارہ نہیں سمجھے۔''

''کوئی اشارہ بھی ہے ان باتوں میں؟''

''یقیناً ہے۔''

''وہ کیا؟ مجھے سمجھاؤ۔''

''ہماری محبت کے بیچ میں کوئی رقیب بھی آ سکتا ہے، رقیب کو میں نے چٹان کہا ہے۔''

''میرا رقیب کون ہوگا؟ اشرف تو ویسے ہی ڈرتا ہے تم سے۔''

''انسان کے بجائے کسی قسم کے حالات بھی رقیب بن سکتے ہیں۔''

Digitized by Google

''فضول باتوں میں وقت نہ خراب کرو۔''

''میں تو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔''

''اچھا تو کیا وہ اشارہ تمہاری والدہ اور تمہارے انکل کی طرف ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''یعنی وہ تمہارے لیے مجھے قبول نہیں کریں گے؟''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر فی الحال صبر کرو۔ وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔''

''کب آئے گا وقت؟''

''اسے غیر یقینی سمجھو۔'' شیریں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ وقت کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ وہ نہ جانے کب لوٹیں۔''

''کون؟''

''وہی!..... پولیس والے۔''

''ان سے ہمارا کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے۔''

''تمہاری باتیں میرا ذہن الجھا رہی ہیں شیریں!''

''تو چلو چھوڑو یہ باتیں۔''

''بارش آج نہیں ہوئی۔ شاید جتنا برسنا تھا، برس گئے بادل۔''

''یہ نہ کہو، مون سون ہے یہ۔'' شیریں بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''کسی وقت بھی، کوئی پہلے سے زیادہ بڑا طوفان بھی آسکتا ہے۔''

''طوفان؟''

''میرا اشارہ پہلے سے بھی زیادہ تیز بارش کی طرف ہے۔'' شیریں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ ''لیکن وہ طوفان بھی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''اس وقت تم کئی بار عجیب سی باتیں کر چکی ہو۔ طوفان بھلا کیا بگاڑ لے گا تمہارا؟''

''یہی تو کہہ رہی ہوں۔ کچھ نہیں بگاڑ سکتا میرا۔ عجائب گھر سے مجھے جو کچھ لے جانا ہے، وہ تو میں لے کر ہی جاؤں گی۔''

''ظاہر ہے، بارش کتنی بھی تیز ہو جائے، کسی وقت تو رکے گی۔''

''ہوں۔''

اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گھنٹے کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

''کیا اشرف لوٹ آیا؟'' ماجد کہتا ہوا اٹھا اور کھڑکی کی طرف گیا۔

پھاٹک صاف نظر آرہا تھا۔ شیریں بہت غور سے ماجد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''لو!'' ماجد کے منہ سے نکلا۔ ''آ گئے پولیس والے۔''

''ہوں۔'' شیریں پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگی۔

''اب معلوم ہوگا۔'' ماجد نے کھڑکی کی طرف سے لوٹتے ہوئے کہا۔

''کیا معلوم ہوگا؟''

''وہی جو تم نے کہا تھا کہ ان کی واپسی سے کوئی گہرا تعلق ہے تمہاری باتوں کا۔'' شیریں چپ رہی۔

''بڑے کمرے میں چلیں؟'' ماجد بولا۔

''تم چلو! میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

ماجد کمرے سے نکل کر بڑے کمرے میں پہنچا اور ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ پولیس والوں کو اندر آنے میں ابھی دو چار منٹ تو لگتے۔

اور جب وہ آئے تو پولیس افسر نے فوراً کہا۔ ''آپ اکیلے ہی ہیں؟''

''میرا دوست تو چلا ہی گیا ہے نا گاؤں۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔ چوکی پر آکے مل چکے ہیں وہ مجھ سے۔ میں ان خاتون کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''شیریں؟ وہ بھی آرہی ہے۔ گھنٹے کی آواز ہم دونوں ہی نے سن لی تھی۔ کھڑکی سے میں نے آپ کی گاڑی بھی دیکھ لی تھی۔''

پولیس آفیسر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسی وقت شیخو بابا اندر آیا۔ اس نے پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟''

''ابھی نہیں، کچھ دیر بعد دیکھا جائے گا۔''

شیخو بابا سر ہلا کر چلا گیا۔

''کوئی خاص خبر؟'' پولیس آفیسر نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے ماجد سے پوچھا۔

''ابھی ایک بریکنگ نیوز ختم ہوئی ہے۔ کسی دکان کا گیس سلنڈر پھٹ گیا۔ ایک آدھ شخص زخمی ہوا ہے۔'' ماجد نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ ٹی وی والے نہ جانے کس قسم کی

Digitized by Google

ذہنیت رکھتے ہیں۔ معمولی معمولی واقعات کو بھی بریکنگ نیوز بنا دیتے ہیں۔''

''سنسنی پھیلا کر اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔''

''افسوس ناک بات ہے۔ انسان کوئی خاص کام کرتے کرتے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔''

پولیس آفیسر کچھ نہیں بولا۔ اس نے پھر اپنی گھڑی دیکھی تھی۔

''خاتون آئی نہیں۔'' پولیس آفیسر کے لہجے میں بے چینی تھی۔

ماجد کو اس کی بے چینی عجیب سی لگی۔ اسے شیریں کی بات بھی یاد آئی۔ پولیس والوں کی واپسی سے کسی تعلق کی بات کی تھی اس نے۔

''ہاں آ تو جانا چاہیے تھا۔'' ماجد نے کہا۔

''مجھے زیادہ دیر تو نہیں لگی۔'' شیریں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ لوگ چاہتے تھے کہ میں جلدی آؤں؟'' وہ پولیس آفیسر کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔ کوئی بات ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

شیریں آ کر ماجد کے قریب بیٹھ گئی۔

''اتفاق ہے کہ میں جلدی آ گیا۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''جس شخص سے مجھے خاکہ بنوانا تھا، اس کی حالت خاصی خراب تھی۔ مجھے وہاں دو تین روز رکنا پڑ سکتا تھا لیکن آج صبح اطلاع ملی کہ اس کی حالت اب بالکل ٹھیک ہے، گاؤں کا حکیم بہت تجربہ کار معلوم ہوتا ہے۔''

''تو آپ کامیاب لوٹے ہیں؟'' شیریں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

پولیس آفیسر نے آتے ہی ایک بڑا لفافہ تپائی پر ڈال دیا تھا۔ اب وہ اس نے اٹھایا۔

''خاکہ بن گیا ہے مسز حارث کا۔'' پولیس آفیسر نے لفافے میں سے ایک کاغذ نکال کر شیریں کی طرف بڑھایا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ بھی دیکھنا پسند کریں گے۔''

شیریں نے سنجیدگی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور خاکہ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ ماجد نے بھی اس کی طرف جھک کر خاکہ دیکھا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سارا جسم سنسنا گیا ہے۔

وہ خاکہ شیریں کا معلوم ہو رہا تھا۔

''پسند آیا؟'' پولیس آفیسر کا لہجہ طنزیہ سا تھا۔

''مجھے اسی کی توقع تھی۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے خاکہ پولیس آفیسر کو واپس دے دیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ابھی تک زندہ کیسے ہیں؟'' پولیس آفیسر نے ماجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماجد کو اس کی بات عجیب سی لگی۔

''کیوں؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جھک کر خاکہ تو آپ نے بھی دیکھ لیا ہے۔''

ماجد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تم اب خود کو زیر حراست میں سمجھو مسز حارث!'' پولیس آفیسر نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''مجھے اندازہ تھا اس کا۔'' شیریں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی مجھے یہاں آنے میں تھوڑا سا زیادہ وقت اسی لیے لگا کہ میں اپنے وکیل کو فون کر رہی تھی۔''

''ہم تمہارے وکیل کا انتظار نہیں کر سکتے۔'' پولیس آفیسر کے لہجے میں سختی تھی۔

''میری گرفتاری کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟'' شیریں نے کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے۔

ماجد اس وقت ہکا بکا بیٹھا ہوا تھا۔

''میں وارنٹ کے بغیر تمہیں پوچھ گچھ کے لیے بھی پولیس اسٹیشن لے جا سکتا ہوں۔''

''نہیں لے جا سکتے تم!'' اس بار شیریں کا انداز بھی جارحانہ ہو گیا۔

پولیس آفیسر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا پھر یکایک اس نے ہتھکڑیاں نکال لیں۔ شیریں کے جارحانہ انداز پر اسے غصہ آ گیا تھا اور اس نے وارنٹ کے بغیر ہی شیریں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

اشرف اندھیرا پھیلتے ہی چوبرجی پہنچ گیا تھا۔ نارنج اس کے پاس تھی لیکن وہ چند موم بتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ اس نے کھنڈر چوبرجی کا ایک ایسا حصہ تلاش کر لیا جہاں ہوا کا گزر تیزی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں اس نے موم بتیاں جلا لیں جہاں بیٹھ کر چنبیلی سے بات کر سکے۔ پھر وہ کھنڈر کے باہر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے چنبیلی کو دیکھ سکے۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چنبیلی سے ملنے کے بعد سے اب تک اشرف مستقبل کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ چنبیلی جوان ہو کر اتنی ہی حسین ہو گئی تھی کہ اس سے شادی کرنا اشرف کے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہوتی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ فلم بنانے سے پہلے

وہ چنبیلی کے ساتھ بیرونِ ملک جا کر ہنی مون منائے گا اور اسے ہی اپنی فلم کی ہیروئن بنائے گا۔

ایک آہٹ اس نے اس وقت سنی جب وہ اس کے عقب میں بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

''چنبیلی!'' وہ سرگوشی کرتا ہوا تیزی سے مڑا۔

''میں تیری موت ہوں۔'' کسی عورت کی تیز سرگوشی سنائی دی۔

اشرف نے تیزی سے ریوالور نکالا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ وار اس کے بازو پر ہوا جس ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور تو گرا لیکن ساتھ ہی بڑے زور کی چیخ نکل گئی۔ بازو کا گوشت ہی نہیں، ضرب اس کی ہڈی تک پہنچی تھی۔ اس کا بازو بے جان ہو کر جھول گیا۔ شدید تکلیف سے اس کی آنکھوں میں اس سے زیادہ اندھیرا چھانے لگا جتنا اندھیرا اس وقت تھا۔

وہ ضرب بغدے ہی کی ہو سکتی تھی۔

اشرف کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین اس کے دائیں بائیں اوپر نیچے ہو رہی ہو لیکن دراصل خود اس کی یہ کیفیت تھی۔ دماغ پر اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کا دماغ بالکل تاریکی میں چلا جاتا، اس نے ایک چیختی ہوئی نسوانی کراہ سنی۔ اس کے بعد وہ ذہنی طور پر مکمل تاریکی میں چلا گیا۔

بے ہوشی کے بعد ہوش میں آنے پر انسان کو نہ تو فوری طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس پر کیا گزری تھی اور نہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ کتنی دیر میں کھلی۔ وہ یہ بھی نہیں جان پاتا کہ کہاں ہے، یہی کیفیت اشرف کی تھی۔

''ہوش آ گیا ہے ڈاکٹر صاحب؟'' اشرف نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔

''میں دیکھ رہا ہوں ماجد صاحب! نرس کو ہدایت دے دی ہے میں نے۔''

اشرف نے دائیں بازو میں تکلیف محسوس کی۔ بے اختیار اس کا بایاں ہاتھ دائیں بازو کی طرف اس جگہ گیا جہاں شانے کا جوڑ تھا۔ اسے وہیں تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ شانے ہی پر رہ گیا۔ بازو تو تھا ہی نہیں۔

''میرا ہاتھ۔'' وہ چیخ پڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس نے کمرے میں دو نرسوں اور ایک ڈاکٹر کے علاوہ ماجد کو بھی دیکھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ اس پر کیا گزری تھی۔ کسی عورت نے اس کے بازو پر کوئی تیز دھار وزنی چیز اتنی زور

عقل کے اندھے

آج کا انسان موت سے زیادہ غریبی سے ڈرتا ہے۔ مال کی محبت انسان کو رشتوں سے اندھا اور فرائض سے غافل کر دیتی ہے۔ اس کی آنکھ تب کھلتی ہے جب ہمیشہ کے لیے بند ہونے کا وقت نزدیک آ جاتا ہے..... ہم پر غریبی نازل ہونا شروع ہوتی ہے تو ہم مایوس ہونے لگتے ہیں مگر جب دولت برستی ہے تو ہم دوسروں کو زندگی سے مایوس کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

انسان اپنے مطلب کے مقام پر سرنگوں ہوتا ہے۔

خواہش پر مرتا ہے۔ ہر آرزو پر بھیک مانگتا ہے اور نہیں مانگتا تو اس سے نہیں مانگتا جس کے پاس زمین و آسمان کے تمام خزانے ہیں، ہم اپنی خوش فہمی کو آگاہی کہتے ہیں اور دوسروں کی آگاہی کو غلط سمجھتے ہیں، ہم خود کو نیک سمجھتے ہیں اور دوسروں کو دوزخ کا ایندھن حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

☆☆☆

چشم دید

بینک میں ڈکیتی کے دوران ڈاکو نے ایک گاہک سے پوچھا کہ کیا وہ واردات دیکھ رہا تھا، اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکو نے اس کی پیشانی پر گولی ماروی پھر وہ دوسرے کے پاس گیا تو اس نے جلدی سے کہا۔

''میں نے کچھ نہیں دیکھا باہر میری بیوی بیٹھی ہوئی ہے، اس نے پوری ڈکیتی دیکھی ہو گی۔''

☆☆☆

مایوسی

پرانا سامان خریدنے والے کباڑیے نے دروازے پر آواز لگائی۔ ''کیوں صاحب! ہے کچھ پرانا کباڑ؟'' صاحب نے جواب دیا۔

''بیوی گھر پر نہیں ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

سے ماری تھی کہ.....

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ اسے یاد نہیں آسکا کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

''میرا ہاتھ..... میرا ہاتھ.....'' وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اپنا ہاتھ غائب ہونے کے خیال سے اپنی تکلیف کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

''لیٹے رہیے۔'' یہ نسوانی آواز تھی جو کسی نرس ہی کی ہوگی۔ شاید اس نے اس کے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا تھا۔

انجکشن لگتے ہی دماغ پر اندھیرے کی یلغار تیزی سے بڑھی۔

''میرا ہاتھ..... میرا ہاتھ..... میرا ہاتھ.....'' اس کی آواز دھیمی پڑتی چلی گئی۔ وہ چوتھی مرتبہ، میرا ہاتھ کی تکرار نہیں کرسکا۔ اس کا دماغ مکمل اندھیرے میں جا چکا تھا۔

اسے جب دوبارہ ہوش آیا تو شانے کی تکلیف بہت کم تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے دماغ نے کام کیا۔ اسے یاد آگیا کہ چوبرجی کے کھنڈر میں کسی نے اس کے بازو پر وار کیا تھا جس میں وہ زیوالور پکڑے ہوئے تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ تکلیف کے باعث وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

کمرے میں اس وقت صرف ایک نرس تھی یا ماجد جس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ سو نہیں سکا تھا۔ اس کی کرسی اشرف کے بستر کے قریب ہی تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہا ہے اشرف؟'' اس نے سنجیدہ اور افسردہ لہجے میں پوچھا۔

''اب مجھے سب یاد آگیا ہے۔'' اشرف کی آواز میں نقاہت تھی۔ وہ نقاہت ہی محسوس کر کے اس نے کہا۔ ''میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔''

''خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔''

''میرا ہاتھ ماجے!'' اس مرتبہ اشرف کی آواز ابھری۔

''کاٹنا پڑا۔'' ماجد اب بھی افسردہ ہی رہا۔ ''ہڈی آدھی سے زیادہ کٹ گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ تمہارا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔''

''اب میری زندگی اسی طرح گزرے گی؟''

''زندگی تو ان کی بھی گزر جاتی ہے جانی جن کے دونوں ہاتھ نہیں ہوتے۔ تمہارے پاس پیسا ہے اور اب مصنوعی ہاتھ بھی بننے لگے ہیں۔'' ماجد نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ ''کوشش کی تھی میں نے اکیلے گاؤں نہ جاؤ لیکن تم نہیں مانے۔''

''وہ وہاں بھی پہنچ گئی۔'' اشرف نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اور تم نے مجھے فون پر بتایا بھی نہیں کہ وہ وہاں سے کہیں روانہ ہوگئی ہے۔''

''تم پر وار کرنے والی مسز حارث تھی۔''

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ تم نے مجھے اطلاع نہیں دی کہ وہ.....''

''تم شیریں کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''اور کس کے بارے میں کہوں گا۔''

''شاید میں دہرا رہا ہوں کہ تمہارے دماغ کے ریکارڈ پر سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔ شیریں ہی کو جانے کیا کیا سمجھتے رہے ہو۔ وہ مسز حارث نہیں ہے۔''

اشرف اس کا منہ تکنے لگا۔

''وہ اس وقت حوالات میں ہوگی۔'' ماجد نے بتایا۔

اشرف اب بھی ماجد کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آرہا ہو۔

ماجد پھر بولا۔ ''شیریں کا جرم صرف یہ ہے کہ اس نے پولیس کو مسز حارث کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کی سوتیلی بہن ہے لیکن سوتیلی ہونے کے باوجود ان دونوں میں خاصی مشابہت ہے۔''

ماجد کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان باتوں کی وجہ سے اشرف اب اپنے ضائع شدہ ہاتھ کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ ان باتوں میں اس کا دھیان بٹ گیا تھا لیکن ماجد کا یہ خیال غلط بھی ہوسکتا تھا۔ اشرف کے دماغ میں اب بھی یہ خیال ہوسکتا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ اب نہیں رہا۔

''میں کس اسپتال میں ہوں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''ہم اپنے شہر میں نہیں ہیں۔'' ماجد نے جواب دیا۔ ''ضروری تھا کہ تمہیں جلد از جلد طبی امداد ملے۔ تمہیں اس گاؤں کے قریب کے دو شہروں میں سے کسی میں لایا گیا ہے۔ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آیا اور مجھے بھی یہ ہوش نہیں رہا کہ کسی سے شہر کا نام پوچھتا۔''

''مجھے یہاں لایا کون؟'' اشرف نے پوچھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں چنبیلی کا خیال بھی تھا لیکن وہ اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ کوئی اور بری خبر نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس نے بے ہوشی سے قبل ایک نسوانی چیخ سنی تھی۔

''یہاں تمہیں اسی شہر کی پولیس لائی ہے۔'' ماجد نے جواب دیا۔ ''ہمیں یہاں پہنچنے اور پھر اپنے شہر لے جانے میں خاصا وقت لگ جاتا۔ تمہارے بارے میں پوری خبر ملتے ہی پولیس آفیسر نے یہاں کی پولیس کو فون کیا تھا۔ وہی

لوگ ایمبولینس لے کر وہاں پہنچے تھے۔ میں تو بعد میں آیا ہوں۔ وہ پولیس آفیسر بھی میرے ساتھ آیا تھا لیکن ذرا دیر بعد چلا گیا تھا۔ کسی وقت پھر آئے گا۔''

''اطلاع کس نے دی تھی؟''

''تمہارے میزبان کمال دین نے۔ اسے تمہارے قریب تمہارا موبائل پڑا ہوا مل گیا تھا۔ اس نے اس میں تمہارا نمبر تلاش کرلیا۔ مجھے یاد نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میں نے ہی بتایا ہوگا۔ تم آخر اس ویران کھنڈر میں گئے ہی کیوں تھے؟''

''چنبیلی سے ملنے گیا تھا۔'' اشرف نے جواب دیا، پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''وہ کیسی ہے؟''

''کیوں؟''

''میں وہاں اسی سے ملنے گیا تھا۔ میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے اس کی کراہ سنی تھی۔ کیا وہ بھی.....''

''نہیں، وہ ٹھیک ہے۔ اگر وہ ٹھیک نہ ہوتی تو شاید تم اب زندہ نہ ہوتے۔ اسی نے ایک اینٹ اٹھا کر مسز حارث کے سر پر ماردی تھی۔ اسی سے وہ بے ہوش ہوئی۔ اس کے بعد ہی چنبیلی دوڑتی ہوئی تمہارے میزبان کے گھر گئی اور انہیں بتایا کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ اس نے ان لوگوں کو بعد میں یہ بھی بتایا کہ وہ کسی سہیلی کے گھر جارہی تھی کہ اس نے ایک عورت کا سایہ دیکھا جو چوبرجی ہی کی طرف جارہی تھی۔ چنبیلی نے دبے قدموں اس کا تعاقب کیا اور بروقت ہی قریب پہنچی۔''

''اور شیریں؟''

''اسے تھوڑی دیر میں آجانا چاہیے۔ ابھی بتا چکا ہوں تمہیں۔ وہ مسز حارث کی بہن ہے۔ اس نے پولیس سے یہ بات چھپائی تھی۔ یہی اس کا جرم تھا۔ وہ اپنی ضمانت کے لیے عدالت گئی تھی۔ ضمانت ہوگئی ہے اس کی۔ ابھی اس نے مجھے فون پر بتایا ہے۔''

''تو وہ شروع سے جانتی تھی اپنی بہن کے بارے میں؟''

''ہاں اور اسے اس بات کا بھی یقین ہوگیا تھا کہ وہ تمہارے پیچھے لگ گئی ہے۔ یقین کی وجہ تمہارا سرخ آنکھوں والا بیان تھا۔ شیریں جانتی ہے کہ اس کی بہن سرخ لینس استعمال کرنے لگی تھی۔ اس کا کوئی خاص سبب نہیں تھا۔ ذہنی توازن کا بگاڑ سمجھ لو اسے۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''حوالات میں ہے۔ اسے جلدی ہوش آجاتا لیکن کمال دین نے اسے رسی سے باندھ دیا تھا۔'' ماجد نے جواب دیا، پھر بولا۔ ''وہ ہمیں بچانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں حویلی سے اکیلا باہر نہ نکلوں۔ اس کی موجودگی میں مسز حارث حملہ نہیں کرتی۔''

''وہ خاص طور سے ہمارے پیچھے کیوں لگ گئی تھی۔ سنا تو یہ تھا کہ وہ بس کسی کو بھی قتل کرتی ہے اور بھاگ جاتی ہے۔''

''ہم سے وہ انتقام لینا چاہتی تھی۔''

''اس کی گاڑی الٹ دی تھی ہم نے اس لیے؟''

''دوسری وجہ بھی تھی جو یہاں کی پولیس کے ذریعے میرے علم میں آئی ہے۔ حوالات میں وہ بڑبڑاتی رہتی ہے کہ اس نے جو نیا بچہ پالا تھا، اسے بھی ہم لوگوں نے ہلاک کردیا۔ پولیس نے اس سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی تو بات سامنے آئی۔ اس نے بازار سے ایک گڈا خرید لیا تھا جو کسی دو سال کے بچے کی طرح لگتا تھا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ حادثے میں وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ پولیس نے وہ قبر تلاش کرلی ہے جس میں مسز حارث نے وہ ٹوٹا پھوٹا گڈا دفن کیا تھا۔''

ان کی باتوں کا سلسلہ رک گیا کیونکہ ڈاکٹر آگیا تھا۔ اس نے اشرف کا معائنہ کیا اور اسے مبارک باد بھی دی کہ وہ زندہ بچ گیا۔ پھر نرس کو کچھ ہدایات دینے کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔

''پولیس نے چنبیلی سے پوچھ گچھ تو کی ہوگی؟''

''اس نے پولیس کو بھی اتنا ہی بتایا جتنا کمال دین کو بتایا تھا۔ یہ ظاہر نہیں کیا کہ اسے وہاں تم سے ملنا تھا۔ میرا خیال ہے جب مسز حارث پر مقدمہ چلے گا تو اسے گواہی کے لیے بلایا تو جائے گا۔''

''وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔'' اشرف نے کھوئے کھوئے سے انداز میں بتایا۔ ''بہت مظلوم ہے وہ۔ باپ مر چکا ہے، بھائی اور بھابی اس پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ میں اس سے شادی کرلیتا لیکن اب.....'' اشرف نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک ہاتھ والے سے وہ کیوں شادی کرے گی۔''

ماجد کچھ نہیں بولا۔

''تو شیریں کے بہت قریب ہوگیا تھا۔''

''ہم ایک دوسرے سے شادی کا وعدہ بھی کرچکے ہیں۔''

''کب کر رہے ہو شادی؟''

''تیرے ٹھیک ہونے کے بعد۔''

''یعنی ایک ٹنڈے کو بھی شریک کرو گے اپنی شادی میں۔'' اشرف پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

Digitized by Google

''فضول بات نہ کر۔ میں آج ہی مصنوعی ہاتھ کے لیے آرڈر دے دوں گا۔ وہ لوگ آ کر دیکھیں گے کہ تیرا ہاتھ کس طرح کا بننا چاہیے۔''

قدموں کی آہٹ سن کر ان دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھول کر اندر آنے والی شیریں تھی۔

''کیسے ہو اشرف اب؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

''بس ایک ہاتھ کا رہ گیا ہوں۔'' اشرف کے لہجے میں تلخی تھی۔

''تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تکلیف میں نہیں ہو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہاتھ کٹا ہو اور تکلیف نہ ہو۔ بس ضبط کر رہا ہوں۔ باتیں کر کے دھیان بٹا رہا ہوں۔ جو ہو جائے، اس پر صبر تو کرنا پڑتا ہے۔''

''میں آتی رہوں گی تمہیں دیکھنے۔''

ماجد نے اپنا ٹھکانا اسی کمرے میں بنا لیا تھا۔ وہ وی وی آئی پی روم تھا۔ آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ ایک اضافی بستر بھی تھا۔ ماجد نے یہ اقدام خاص طور سے اس لیے کیا تھا کہ اشرف کو تنہائی میں اپنے ہاتھ سے محرومی کے بارے میں سوچنے کا زیادہ موقع نہ ملے۔

وقت گزرتا رہا۔ اشرف کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہوتا جا رہا تھا۔

ایک صبح وہ جاگا تو ماجد اس کے بستر ہی پر بیٹھا تھا۔ اسے جاگتے دیکھ کر وہ اس کے سرہانے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جاگنے کا انتظار زیادہ نہیں کرنا پڑا۔''

اشرف نے سر گھما کر دیکھا کہ ماجد نے کسے مخاطب کیا تھا۔ وہ کمال دین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''سامنے آ جاؤ۔ سرہانے کیوں کھڑے ہو؟''

کمال دین سامنے آ گیا۔ ''مجھے بہت افسوس ہوا ہے بابو جی!..... گاؤں میں ہی معلوم ہو گیا تھا۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی تو وہ بھی آئیں گے تمہیں دیکھنے۔''

''ہاں۔'' اشرف نے کہا۔ ''اب ایک ہاتھ والے مہمان کو بھی دیکھ لیں۔''

''تمہارے لیے دوسرا ہاتھ بھی لایا ہوں۔''

''دوسرا ہاتھ؟'' اشرف نے تعجب سے کہا۔

''ہاں۔'' کمال دین نے کہا اور اس نے بھی سرہانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو بھی ادھر آ جانا۔''

اشرف دم بخود رہ گیا جب شرمائی شرمائی چنبیلی سامنے آئی۔

''عدالت نے گواہی کے لیے بلایا ہے اسے۔'' کمال دین نے بتایا۔ ''اس موقع پر تبھی اس کے بھائی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اس کے ساتھ آتا۔ یہ مجھے بھی ہمیشہ سے بھائی کہتی ہے۔ میرے ساتھ آ گئی۔ اس پر اس کے بھائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور یہ اچھا ہی ہوا۔ اس نے مجھے اپنے اور تمہارے بارے میں سب بتا دیا۔ اچھا ہے کہ یہ وہاں کی مصیبت سے نکلے۔ تمہیں جلد از جلد کوئی ایسا بندوبست کرنا پڑے گا کہ اس کا بھائی تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کر سکے۔''

اشرف کمال دین کی باتیں سن رہا تھا لیکن اس کی نظریں چنبیلی ہی پر جمی رہی تھیں جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

''چنبیلی!'' اشرف افسردگی سے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے، میں اب ایک ہاتھ کا آدمی ہوں؟''

''سارے گاؤں کو معلوم ہو چکا ہے بابو جی۔'' کمال دین بولا پھر چنبیلی سے مخاطب ہوا۔ ''تو بھی کچھ بول۔''

چنبیلی نے نظریں اٹھا کر اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپے لیکن وہ کچھ بول نہیں سکی۔ اس نے پھر نظریں جھکا لیں۔

''ارے بول نا!'' کمال دین نے اسے اکسایا۔

چنبیلی نے پھر نظریں اٹھائیں۔ ''اب میں تمہارا بازو بنوں گی بابو!'' اس نے لرزیدہ سی آواز میں کہا۔

ماجد جو اتنی دیر تک خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا تھا، یکا یک چہکا۔ ''یہ ہوئی نا بات!..... آؤ ذرا ہم دونوں باہر چلیں۔'' اس نے کمال دین سے کہا۔ وہ اشرف اور چنبیلی کو اکیلے میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

اس وقت نرس بھی کمرے میں نہیں تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد اشرف بولا۔ ''میرے قریب آؤ چنبیلی!''

چنبیلی دو قدم آگے بڑھ کر بستر کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

اشرف کے شانے پر چادر پڑی ہوئی تھی، وہ اس نے ہٹائی اور بولا۔ ''دیکھو! یہ ہاتھ اب نہیں ہے میرے پاس۔''

''میں نے کہا نا بابو!'' چنبیلی نے کہا۔ ''میں بن جاؤں گی تمہارا بازو۔'' اور پھر اس نے جھک کر بڑے جذباتی انداز میں اپنا سر اشرف کے سینے پر رکھ دیا۔

Digitized by Google